باب اول:

موضوعِ تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید:

i۔ موضوع کا تعارف (INTRODUCTION)

انشائیہ ایک اہم نثری صنف ہے اور انشائیہ کا آغاز اردو ادب میں ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ ہوا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کا لفظ ستمبر ۱۹۵۹ء میں پہلی بار اپنے انشائیہ "چھکڑا" کے لیے استعمال کیا اس دور میں انشائیہ کے دو دبستان، دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور نمایاں ہوتے ہیں دبستان سرگودھا کے نمایاں انشائیہ نگاروں میں ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، مشتاق قمر، جمیل آزر، اکبر حمیدی، انور سدید، سلیم آغا قزلباش، حیدر قریشی، انجم نیازی اور حامد برگی وغیرہ شامل ہیں۔ دبستان لاہور کے نمائندہ انشائیہ نگار ڈاکٹر سلیم اختر، مشکور حسین یاد، نظیر صدیقی، شہزاد قیصر، صلاح الدین حیدر، ارشد میر، حسرت کاسنگجوی، اختر اورینوی، ڈاکٹر محمد حسنین اور شکیلہ رفیق وغیرہ شامل ہیں۔ اگرچہ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے اختلاف کی اصل وجہ یہ ہے کہ مشکور حسین یاد انشائیہ کو انگریزی کے ایسے کا ترجمہ کہتے ہیں اور ایسے انگریزی میں باقاعدہ صنف ادب ہے اور اردو میں یہ کیونکر صنف ادب نہیں ہو سکتی اور ڈاکٹر وزیر آغا نے پرسنل ایسے کو انشائیہ کہا ہے اور مشکور حسین یاد کہتے ہیں اسے پرسنل ایسے کہنے سے انشائیہ کو بلاوجہ چھوٹا قرار دے دیا گیا ہے اور "اوراق" کے نقاد مشکور حسین یاد کو سرے سے انشائیہ نگار ہی تسلیم نہیں کرتے جبکہ ڈاکٹر سلیم اختر مشکور حسین یاد کے اسلوب اور انشائیہ نگاری کا دفاع کرتے ہیں دبستان لاہور کے نمایاں اوصاف درجہ ذیل ہیں دبستان لاہور کے انشائیے میں طنز و مزاح کے ذریعے اصلاح کرنے پر زور دیا جاتا ہے اور یہ انشائیوں میں گہرے فلسفے اور سنجیدگی کے بھی قائل ہیں ان کے انشائیوں میں کلبیت اور قنوطیت کے زاویے بھی دکھائے گئے ہیں ان کے انشائیوں میں انکشاف ذات کی کمی اور خارج کی حقیقت زیادہ ہے موضوع کو ذات کا حصہ نہیں بناتے عام پہلوؤں کا انتخاب کرتے ہیں تجربے اور مشاہدے کے ذریعے دائرہ بناتے ہیں۔ نکتہ آفرینی کا عنصر مفقود ہے اور اختصار کو پسند کرتے ہیں۔

دبستان سرگودھا کے نمایاں اوصاف درجہ ذیل ہیں کہ طنز و مزاح انشائیہ کا حصہ نہیں ہے قاری ان کے انشائیے پڑھنے سے حظ اٹھاتا ہے اور مسرت زیر لب محسوس کرتا ہے ان کے انشائیوں میں بوجھل سنجیدگی اور گہرے

فلسفے نہیں ہوتے یاس و امید کو انشائیوں کا حصہ سمجھتے ہیں اور کلبیت اور قنوطیت کو انشائیوں کے لیے حرام قرار دیتے ہیں موضوع کو ذات اور انکشاف ذات کے لیے برتا جاتا ہے۔ انوکھے پہلوؤں کو سامنے لانے کا اہتمام کیا جاتا ہے اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں ان کے انشائیوں میں خارج سے زیادہ داخلیت پائی جاتی ہے۔ موضوعات کے مخفی گوشوں کی طرف جھانکنے کا رجحان زیادہ ہے وہ مسائل پر براہ راست واعظ یا مصلح کے طور پر کام نہیں کرتے اور نکتہ آفرینی اور اختصار کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ مجوزہ تحقیق میں ہم دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے پانچ پانچ انشائیہ نگاروں کا فکری، اسلوبیاتی اور تکنیکی تقابل کریں گے۔ انشائیہ کی فکر میں ہم مصنف کی سوچ، اس کے موضوعات جن میں فلسفہ، نفسیاتی، معاشرتی، ادبی، تہذیبی، ثقافتی، معاشی، داخلی، خارجی، روحانی غرض ہر پہلو کو زیر بحث لاتے ہیں جبکہ اسلوب سبک اور اسٹائل کا مترادف ہے اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کی وہ انفرادی طرز نگارش ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے ممیز کرتا ہے اسے انسان اور انسانی شخصیت کا ترجمان بھی کہا جاتا ہے اسلوب کی تشکیل میں درجہ ذیل عناصر کار فرماہوتے ہیں۔ مصنف، ماحول، موضوع، زبان، مقصد اور مخاطب۔ تکنیک ایک یونانی لفظ ہے جس کے لغوی معانی فن یا طریقہ کار ہے ارسطو کہتا ہے تکنیک سے مراد ہے وہ طریقہ جس سے فنکار اپنے موضوع کو پیش کرتا ہے۔ تقابل میں ایک ہی صنف سے تعلق رکھنے والی دو اصناف کا تقابل کیا جاتا ہے اس کے داخلی اور خارجی محرکات کا جائزہ لیا جاتا ہے اشتراکات و افتراقات واضح کرنے کے بعد تعین قدر اخذ کی جاتی ہے اس تحقیق میں ہم انشائیہ کے دونوں دبستانوں کا فکری، اسلوبیاتی اور تکنیکی تقابل کریں گے دبستان سرگودھا میں ڈاکٹر وزیر آغا کی چار انشائیوں کی کتابوں "خیال پارے" (۱۹۶۱ء) ، "چوری سے یاری تک" (۱۹۶۶ء)، "دوسرا کنارہ" (۱۹۸۶ء)، "سمندر اگر میرے اندر گرے" (۱۹۸۹ء)، غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کی کتاب "نرم دم گفتگو" (۱۹۹۲ء)، مشتاق قمر کی انشائیوں کی کتاب "ہم ہیں مشتاق" (۱۹۷۰ء) ، جمیل آزر کی تین انشائیوں کی کتابوں "شاخ زیتون" (۱۹۸۱ء) ، "رت کے مہمان" (۱۹۹۴ء) اور "وقت اے وقت" (۲۰۰۷ء) اور اکبر حمیدی کی پانچ انشائیوں کی کتابوں "جزیرے کا سفر" (۱۹۸۵ء) ، "پہاڑ مجھے بلاتا ہے" (۲۰۰۳ء)، "جھاڑیاں اور جگنو" (۱۹۹۴ء)، "اشتہاروں بھری دیواریں" (۲۰۰۷ء) اور "تتلی کے تعاقب میں" (۱۹۹۴ء) شامل ہیں جبکہ دبستان لاہور میں مشکور حسین یاد کی دو انشائیوں کی کتابوں "بات کی اونچی ذات" (۱۹۸۲ء) ، "جوہر اندیشہ" (۱۹۷۵ء) ، "، نظیر صدیقی کی ایک کتاب "شہرت کی خاطر" (۱۹۶۱ء) ، شہزاد قیصر کی تین کتابوں "کلیرنس سیل" (۱۹۸۰ء) ، "صاف چھپتے بھی نہیں" (۱۹۸۲ء) ، "آئینہ بنے ہے پیرہن" (۱۹۸۹ء) ، اور صلاح الدین کی ایک انشائیوں کی دو کتابیں "حماقتیں میرے مقدر کی" (۱۹۷۸ء)،

اورڈرا اور ڈراما (۱۹۸۷ء) اوراس کے علاوہ ارشد میر کی کتاب موڈ (۱۹۸۹ء) شامل ہے۔ مجوزہ تحقیق میں ہم دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے منتخب انشائیہ نگاروں کا فکری، اسلوبیاتی تکنیکی اور موضوعاتی تقابل کریں گے۔

ii۔ بیان مسئلہ (Statement of Problem/ THESIS STATEMENT)

انشائیہ ایک اہم نثری صنف ہے اور ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کو پرسنل ایسے کا نام بھی دیا ہے اور مشکور حسین یاد نے اسے انگریزی ایسے کے مترادف کہا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کے لیے ایک واضح تصور اور خیال کے ساتھ انشائیہ کے فروغ، اسکی سمت گری اور سمت نمائی وضع کی ہے جبکہ مشکور حسین کا دبستان طنز و مزاح اور سنجیدگی کے پہلو رکھتا ہے دبستان لاہور میں ڈاکٹر سلیم اختر، مشکور حسین یاد، نظیر صدیقی، شہزاد قیصر، صلاح الدین حیدر اور ارشد میر وغیرہ شامل ہیں اور دبستان سرگودھا میں ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، مشتاق قمر، جمیل آزر، اور اکبر حمیدی شامل ہیں تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کا فکری، اسلوبیاتی تکنیکی اور موضوعاتی تقابل کیا جائے تاکہ ان کے اشتراکات، افتراقات اور امتیازات واضح ہوسکیں۔

iii۔ مقاصد تحقیق (RESEARCH OBJECTIVES)

مجوزہ موضوع پر مقاصد یہ ہوں گے۔

۱۔ نثری متون کے تقابلی مطالعے کے لیے طریقہ کار وضع کرنا۔

۲۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے اختصاصی زاویوں کے بارے میں جاننا۔

۳۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کے فکری، اسلوبیاتی اور تکنیکی عناصر کو زیر بحث لانا اور ان کا تقابل کرنا۔

۴۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے اہم انشائیہ نگاروں کے باہمی اشتراکات اور امتیازات کی نوعیت کو منظر عام پر لانا۔

iv۔ تحقیقی سوالات (RESEARCH QUESTIONS)

۱۔ نثری متون کے تقابلی مطالعے کے لیے کونسا طریقہ کار قابل ترجیح ہے؟

۲۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے اختصاصی زاویوں کی نوعیت کیا ہے؟

۳۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کے فکری، اسلوبیاتی اور تکنیکی جہات کیا ہیں اور انہیں کن زاویوں سے زیر بحث لایا جاسکتا ہے اور ان کا تقابل کیا جاسکتا ہے؟

۴۔ دبستان سر گودھا اور دبستان لاہور کے اہم انشائیہ نگاروں کے باہمی اشتراکات اور امتیازات کی نوعیت کیا ہے؟

v۔ نظری دائرہ کار (THEORETICAL FRAMEWORK)

انشائیہ کی صنف کو ادب میں ڈرامائی انداز میں مونتین نے سولھویں صدی کے ربعِ آخر میں متعارف کروایا اور اسی صدی میں مونتین کے ہم عصر بیکن نے انگلستان میں اس صنف سخن کو اپنایا۔ اٹھارویں صدی میں ایڈیسن اور سٹیل نے پیریوڈیکل ایسیز لکھے انیسویں صدی میں پرسنل ایسیز کا آغاز چارلیس لیمب ہیزلیٹ وغیرہ نے کیا بیسویں صدی میں ایسیز لکھنے والوں میں میکس بیر بھوم چسٹرٹن، رابرٹ لینڈ، جان جے، جیروم کے جیروم اور ورجینیا وولف وغیرہ شامل ہیں اردو میں انشائیہ کے ابتدائی نقوش کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وجہی کے ہاں ابتدائی نقوش ملتے ہیں خواجہ احمد فاروقی اور ماسٹر رام چندر کی تقدیمی حیثیت کو لائق احترام قرار دیتے ہیں۔ بعض ناقدین میرزا غالب کی نثر پر انشائیہ نگاری کا گمان کرتے ہیں ہمارے ادب میں بظاہر ایسیز کا آغاز سرسید سے ہوتا ہے۔ اسلوب سبک اور اسٹائل کا مترادف ہے اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کی وہ انفرادی طرز نگارش ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے ممیز کرتا ہے اسے انسان اور انسانی شخصیت کا ترجمان بھی کہا جاتا ہے اسلوب کی تشکیل میں درجہ ذیل عناصر کارفرما ہوتے ہیں جن میں مصنف، ماحول، موضوع، زبان، مقصد اور مخاطب شامل ہیں۔ تکنیک ایک یونانی لفظ ہے جس کے لغوی معانی فن یا طریقہ کار ہے ارسطو کہتا ہے تکنیک سے مراد ہے وہ طریقہ جس سے فنکار اپنے موضوع کو پیش کرتا ہے تاہم تقابلی ادب کا آغاز فرانس سے ہوتا ہے اسے انگریزی میں comparative کہا جاتا ہے اور ہنری ولیم شیکسپیئر نے اسے ہنری ۴ میں سب سے پہلے استعمال کیا سب سے پہلے یونان اور اور روم کی دو قوموں کے درمیان ادبی اختلاط اور ارتباط کے ساتھ ساتھ ادبی بالا دستی کی جدوجہد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جسے تقابلی ادب کا نقش اول کہا جاتا ہے انیسویں صدی میں اس لفظ کا عام استعمال ہونے لگا مگر ادب میں یہ آنے میں بہت وقت لگا فرانسیسی ناقد ولے مین نے ۱۸۲۹ء میں سب سے پہلے یہ اصطلاح استعمال کیا اور بعد میں سینٹ بونے اسے مشتہر کیا اور اس کے اصول بنائے تقابلی ادب کے تین سکول آف تھاٹ ہیں۔ فرنچ سکول آف تھاٹ، جرمن سکول آف تھاٹ اور امریکہ سکول آف تھاٹ۔ فرنچ سکول آف تھاٹ ابتدائی کام کا درجہ رکھتا ہے اور دبستان کا دائرہ کار یورپی اقوام تک محدود تھا اور جرمن سکول آف تھاٹ انیسویں صدی کے آخر میں دکھائی دیتا ہے اس کی بنیاد ساختیات اور اپلائیڈ لٹریچر پر رکھی گئی ہے امریکہ سکول آف تھاٹ فرنچ سکول آف تھاٹ کے رد عمل کے طور پر سامنے آیا اس میں تمام دنیا کے ادب کو تقابل میں شامل کیا گیا ہے اور گوئٹے کو اصول پر اس کی بنیاد ہے۔ تقابلی ادب میں بنیادی

حیثیت موازنے کو حاصل ہے نہ کہ ادیب ادبیات اور ممالک وغیرہ کی تعداد کو، نیز موازنے کے لیے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ہر ہر حرف اور ہر ہر لائن اور ہر ہر صفحے کا تقابل و توازن ہو بلکہ محض یہ ضروری ہے کہ دو یا دو سے زیادہ ادیبوں کے درمیان جو تقابل کیا جائے اس کا مجموعی تاثر موازناتی ہو مختصر یہ کہ تقابلی ادب، ادب کا وہ مطالعہ ہے جو نہ صرف دو یا دو سے زیادہ ممالک کے ادب پر محیط ہوتا ہے بلکہ تاریخی اعتبار سے زمانوں کا بھی احاطہ کر سکتا ہے اس میں نہ صرف ادب کی مشترک قدروں کو سامنے رکھا جاتا ہے بلکہ تاثر، قبول، پیروی اور نقل وغیرہ جیسے عمل کو بھی مد نظر رکھنا چاہیئے موازنے کے ساتھ تطہیر کا عمل دخل بھی ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر تقابلی ادب دو تہذیبوں کی ثقافتوں کو واضح کرتی ہے اس میں مختلف ادبی پہلو، تعلقات، انسانی مزاج، اور رویوں کے نقوش بھی تلاش کیے جاتے ہیں تقابلی ادب میں دو یا دو سے زیادہ ادبی روایتوں کے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے مماثلت اور اختلاف کا کوئی بھی گوشہ ان کی توجہ سے محروم نہیں ہوتا۔ تقابل کی دو اقسام ہیں بیانیہ تقابل اور تعین قدر۔ بیانیہ تقابل میں صنف کی ظاہری ساخت اور خدوخال پر بات کی جاتی ہے جبکہ تعین قدر میں خالص ادب کے حوالے سے بات کی جاتی ہے۔ داخلی اور خارجی محرکات کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے داخلی محرکات میں شخصیت، خاندانی حالات، داخلی کیفیات اور تجربات شامل ہیں اور خارجی محرکات میں ادب جس عہد میں تخلیق کیا گیا اس عہد کے سیاسی سماجی اور تہذیبی حالات کا جائزہ لیا جاتا ہے اس میں ضروری ہے کہ دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا ایک ہی صنف سے تعلق ہو اس کے داخلی اور خارجی محرکات کا تجزیہ کرنے کے بعد ان کا تقابل کیا جاتا ہے اس کے بعد ایک معیار مقرر کر کے فن پارے کے جمالیاتی، حسن، نظریاتی، نفسیاتی، روحانی، فلسفیانہ غرض تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا جاتا ہے تمام مراحل سے گزرنے کے بعد تعین قدر اسے بہتر ثابت کرنے میں مددگار ہوتی ہے تاہم مجوزہ تحقیق میں دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کا فکری، اسلوبیاتی، تکنیکی اور موضوعاتی حوالے سے تقابل کریں گے اشتراکات اور افتراقات واضح کرنے کے بعد تعین قدر اخذ کی جائے گی۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار (RESEARCH METHODOLOGY)

تحقیق کا موضوع "دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کا انشائیہ۔ فکری، اسلوبیاتی اور تکنیکی تقابل (منتخب انشائیہ نگاروں کے حوالے سے)" ہے جس میں سرگودھا دبستان میں ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، مشتاق قمر، جمیل آزر اور اکبر حمیدی شامل ہیں اور انشائیہ کے دبستان لاہور میں مشکور حسین یاد، نظیر صدیقی، شہزاد قیصر، صلاح الدین حیدر، ارشد میر شامل کیے گئے ہیں لہذا موضوع سے متعلق مطبوعات کی جمع آوری، ترتیب اور مطالعہ و تجزیہ کرنا ہو گا۔ اس ضمن میں تجزیاتی، دستاویزی اور تقابلی طریقہ کار معاون ہو گا اور تقابلی طریقہ کار میں

دبستان لاہور اور دبستان سرگودھا کے منتخب انشائیہ نگاروں کا داخلی و خارجی تقابل کیا جائے گا اس کے علاوہ ان کا فکری، اسلوبیاتی اور تکنیکی تقابل کیا جائے گا تقابلی ادب میں ضروری ہے کہ دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا ایک ہی صنف سے تعلق ہو اور اس میں مماثلت اور اختلاف کا کوئی گوشہ ان کی توجہ سے محروم نہیں ہو تا تقابل کی دو اقسام ہیں بیانیہ تقابل اور تعین قدر۔ بیانیہ تقابل میں صنف کی ظاہری ساخت اور خدوخال پر بات کی جاتی ہے۔ داخلی اور خارجی محرکات کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے۔ داخلی محرکات میں شخصیت، خاندانی حالات، داخلی کیفیات اور تجربات شامل ہیں اور خارجی محرکات میں ادب جس عہد میں تخلیق کیا گیا اس عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کا جائزہ لیا جاتا ہے اس کے داخلی اور خارجی محرکات کا تجزیہ کرنے کے بعد ان کا تقابل کیا جائے گا اس کے بعد ایک معیار مقرر کر کے فن پارے کے جمالیاتی حسن، نظریاتی، نفسیاتی، روحانی، فلسفیانہ غرض تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے گا ان کے اشتراکات و افتراقات واضح کیے جائیں گے اور اس کے بعد تعین قدر اخذ کی جائے گی بنیادی ماخذات میں ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، مشتاق قمر، جمیل آزر اور اکبر حمیدی، مشکور حسین یاد، نظیر صدیقی، شہزاد قیصر، صلاح الدین حیدر، ارشد میر کی انشائیوں کی کتابیں جبکہ ثانوی ماخذات میں مذکورہ بالا مصنفین سے متعلق چھپنے والے مضامین، کتب اور رسائل کا مطالعہ کیا جائے گا۔ جن تک رسائی کے لیے لائبریریوں سے رجوع کرنے کے علاوہ انٹر نیٹ اور دیگر ماخذات سے بھی حسب ضرورت استفادہ کیا جائے گا۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق (WORKS ALREAD Y DONE)

ساٹھ کی دہائی کو اردو انشائیہ کا دور زریں بھی کہا جاتا ہے تاہم اردو ادب میں وزیر آغا اور مختلف انشائیہ نگاروں کے مختلف جہات اور ان کے فن و فکر پر پاکستان اور پاکستان سے باہر مختلف جامعات میں تحقیقی و تنقیدی کام ہو چکا ہے.

۱۔ وزیر آغا کا فن، بہار یونیورسٹی بھارت، مقالہ پی ایچ ڈی، ۱۹۸۹ء

۲۔ وزیر آغا کی انشائیہ نگاری، مارواڑی کالج بھاگلپور، مقالہ پی ایچ ڈی ۱۹۹۲ء

۳۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ حیات و ادبی خدمات، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پی ایچ ڈی، ۲۰۰۸۔ ۲۰۱۳ء

۴۔ سائرہ بتول، ڈاکٹر، پاکستانی انشائیہ نگاروں کے اسالیب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ۱۹۶۰ء تا حال، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

۵۔ وزیر آغا کی انشائیہ نگاری اور اس کی جہتیں، باباصاحب بھیم راو امبیڈکر بہار یونیورسٹی، مظفر پور، پی ایچ ڈی، بہار، ۲۰۱۴ء

۶۔ اردو میں انشائی ادب کا ارتقاء، قدیم انشائیے سے جدید انشائیے تک، پنجاب یونیورسٹی، پی ایچ ڈی، ۱۹۸۲ء

۷۔ غلام جیلانی اصغر۔ حیات و ادبی خدمات پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ایم فل، ۲۰۰۳۔۲۰۰۵ء

۸۔ جمیل آزر، احوال و آثار، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ایم فل، ۲۰۰۸ء

۹۔ وزیر آغا کی تنقید نگاری، جے پور یونیورسٹی بھارت، مقالہ ایم فل، ۱۹۹۲ء

۱۰۔ وزیر آغا کی انشائیہ نگاری، اسلامیہ یونیورسٹی، پشاور، ۲۰۰۵ء

۱۱۔ وزیر آغا کے انشائیے، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، ۲۰۱۲ء

تاہم ایسا کام ابھی منظر عام پر نہیں آیا جس میں دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے منتخب انشائیہ نگاروں کا فکری، اسلوبیاتی اور تکنیکی تقابل کیا گیا ہو۔

viii۔ تحدید (DELIMITATION)

مجوزہ تحقیق میں دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے منتخب انشائیہ نگاروں کا فکری، اسلوبیاتی اور تکنیکی تقابل کیا جائے گا دبستان سرگودھا کے منتخب انشائیہ نگاروں میں ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، مشتاق قمر، جمیل آزر اور اکبر حمیدی شامل ہیں اور دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں مشکور حسین یاد، نظیر صدیقی، شہزاد قیصر، صلاح الدین حیدر اور ارشد میر کو شامل کیا گیا ہے۔ دبستان سرگودھا میں ڈاکٹر وزیر آغا کی چار انشائیوں کی کتابوں "خیال پارے"، "چوری سے یاری تک"، "دوسرا کنارہ"، "سمندر اگر میرے اندر گرے" غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کی کتاب "نرم دم گفتگو" مشتاق قمر کی انشائیوں کی کتاب "ہم ہیں مشتاق"، جمیل آزر کی تین انشائیوں کی کتابوں، "شاخ زیتون"، "رت کے مہمان" اور "وقت اے وقت" اور اکبر حمیدی کی پانچ انشائیوں کی کتابوں "جزیرے کا سفر"، "پہاڑ مجھے بلاتا ہے"، "جھاڑیاں اور جگنو"، "اشتہاروں بھری دیواریں" اور "تتلی کے تعاقب میں" شامل ہیں جبکہ دبستان لاہور میں مشکور حسین یاد کی دو انشائیہ کی کتابوں، "بات کی اونچی ذات"، "جوہر اندیشہ"، نظیر صدیقی کی ایک کتاب "شہرت کی خاطر" شہزاد قیصر کی تین کتابوں "کلیرنس سیل"، "صاف چھپتے بھی نہیں"، "آئینہ بنے ہے پیرہن" اور صلاح الدین کی ایک انشائیوں کی کتاب "حماقتیں میرے مقدر کی"، "ڈر اور ڈراما" جبکہ ارشد میر کی انشائیوں کی کتاب "موڈ" شامل ہیں۔ مجوزہ تحقیق میں ہم دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے منتخب انشائیہ نگاروں کا فکری، اسلوبیاتی، تکنیکی اور موضوعاتی تقابل کریں گے۔

ix۔ پس منظری مطالعہ(LITERATURE REVIEW)

کسی بھی تنقیدی اور تحقیقی کام کے لیے پس منظری مطالعے کا ہونا بہت ضروری ہے۔ مجوزہ موضوع پر تحقیق کے لیے ان تمام عام و خاص کتب و مضامین کا مطالعہ کیا جائے گا جن میں متعلقہ مواد کا ملنا ممکن ہو۔ ساتھ ہی ان رسائل و جرائد کی بھی ورق گردانی کی جائے گی جن کے سہارے تحقیقی کام آسان ہو۔ مختلف جائزاتی مطالعے، متفرق تحقیقی خاکے اور مقالے بھی اس سلسلے میں کار آمد ثابت ہوں گے۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح کے تحقیقی کاموں سے بھی استفادہ کیا جاے گا نیز ان تمام اسکالرز اور اساتذہ سے بھی رابطہ کیا جائے گا جو اس موضوع پر بھی دسترس رکھتے ہوں۔ پس منظری مطالعے کو مد نظر رکھتے ہوے مختلف مباحثوں، سیمینارز، ویب سائٹس، انٹرنیٹ مواد، لغات، اخبارات، انسائیکلوپیڈیاز سے بھی فیض اٹھایا جائے گا۔

x۔ تحقیق کی اہمیت(SIGNIFICANCE OF STUDY)

انشائیہ اردو ادب کی اہم نثری صنف ہے۔ساٹھ کی دہائی میں انشائیہ نگاروں کی ایک نئی کھیپ پیدا ہو گئی انشائیہ کے اس دور کو اردو انشائیہ کا دور زریں کہا جاتا ہے۔اس دور میں انشائیہ نگاروں کے دو دبستان ،دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور نظر آتے ہیں تاہم ان دونوں دبستانوں کا انشائیہ کے بارے میں نظریہ اوران کے نکتہ نظر میں اختلاف نظر آتا ہے اس تحقیق میں دونوں دبستانوں کے تقابل کرنے سے ان کے اشتراکات، افتراقات اور امتیازات واضح ہو جائیں گے علاوہ ازیں تقابلی ادب سے دو ادیبوں کے کام میں امتیاز کرنا آسان ہو جاتا ہے تقابلی مطالعے سے ادباء کے ان پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے جو کسی بھی ادیب کے انفرادی کام کرنے سے نہیں پڑتی ادبی تحقیق کے نئے گوشے سامنے آتے ہیں اور ادباء کے مقام کا تعین کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

ب۔ انشائیہ اور اس کے متعلقات:

انشائیہ کا لفظ انشاء سے نکلا ہے۔اور انشاء کے لغوی معنی ”پیدا کرنے “کے ہیں۔انشاء عربی زبان کا لفظ ہے۔اور اس کے معنی تحریر ،دل سے بات پیدا کرنا، طرز تحریر ،صنائع بدائع، انداز بیان کے ہیں۔انگریزی میں انشائیہ کو Essay کہا جاتا ہے اور Essay کا لفظ فرانسیسی زبان کے لفظ Essai سے نکلا ہے تاہم سعی اور انشاء دونوں ہی عربی زبان کے الفاظ ہیں سعی کے معنی ”کوشش کرنے“ کے ہیں تاہم Essai کا لفظ فرانسیسی کا لفظ نہیں بلکہ یونانی سے فرانسیسی میں آیا ہے اگر اس بات پر تحقیق کی جائے تو جوبات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جنوبی فرانس پر عرب والوں کی تہذیب و ثقافت اور زبان نے نمایاں اثر کیا اور اس وجہ سے فرانسیسی زبان میں اس کے واضح اثرات ملتے ہیں۔

انشائیہ کو انگریزی میں Light Essayاور Personal Essay بھی کہا جاتا ہے۔ انشائیہ کو ادب میں ایک خاص ادبی مقام حاصل ہے۔ انشاء کا لفظ قران پاک میں بھی بہت سی جگہوں میں آیا ہے۔

سورت ملک میں ارشاد ربانی ہے۔

قُل ھو الذی انشاکم

ترجمہ: کہہ دو وہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا۔[1]

تاہم انشاء کا لفظ (نشا) سے نکلا ہے۔ جس کے معنی "پیدا کرنے" کے ہیں اور جب فارسی زبان رائج ہوئی تو عربی زبان کا یہ لفظ زبان زد عام ہو گیا۔

ڈاکٹر وحید قریشی انشائیہ کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہیں۔

"انشا کا لفظ ابتدا میں ایک دفتری اصطلاح تھا اس کا اطلاق سرکاری فرامین اور مکتوبات کے رف ڈرافٹ پر ہوتا تھا اور صاف شدہ مسودے کو تحریر کے نام سے پکارا جاتا تھا اس نے دیوان اور انشاء کا نام پایا۔ رفتہ رفتہ فرامین اور مکتوبات کی تحریر و ترتیب کے لیے انشاء کا لفظ مستعمل ہو گیا، درباری کے زیر اثر فارسی نثر میں نثر سادہ کے پہلو بہ پہلو مصنوع (نثر رنگین) ساسانی دور سے ہی رائج ہو چکی تھی یہی نثر احکام و فرامین اور مکتوبات کی زبان قرار پائی۔ اس نثر میں خطابت کا عنصر جزو اعظم تھا۔ اس سے انشاء پردازی کی وہ نہج وجود میں آ گئی جس کو ہم انشائیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔"[2]

اگرچہ انشاء کا لفظ فارسی زبان میں سرکاری تحریروں میں استعمال ہونے لگا تاہم فارسی ادب نے عبارت آرائی اور دیگر ادبی خصوصیات کے ادبی معنوں کو واضح کیا ہے مگر یہ انشائیہ جیسی ادبی صنف کو پیش کرنے میں کوئی کردار ادا نہیں کرتا بلکہ یہ سراسر مغرب کی پیش کردہ صنف ہے۔ ڈاکٹر آدم شیخ کہتے ہیں:

"فارسی ادب اپنے رومانوی اور تصوراتی مزاج کی وجہ سے ایسی تحریروں کی تخلیق کا باعث بنا جن کے کچھ حصے صنف انشائیہ سے مماثلت رکھتے ہیں تاہم فارسی کو قدیم نثری سرمائے میں کہیں بھی ایسی کوشش کا پتا نہیں چلتا جس میں انشائیہ کو ایک صنف کی حیثیت سے ترقی دینے کی کوشش کی گئی ہو۔"[3]

بایں ہمہ یہ صنف مغرب کی ہی پیداوار ہے۔ اور مغرب کی پیروی کے بعد اس کے تصورات مشرق میں بھی واضح ہوئے ہیں اس وجہ سے مشکور حسین یاد نے اسے امکانی صنف اور ام الاصناف کہا ہے۔ گویا انشائیہ کے لیے

انشائیہ کا ادبی اسلوب خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ انشائیہ استعاراتی انداز، عبارت آرائی، لطیف خیالات اور شعری انداز سے مزین ہوتی ہیں اور یہ کوئی نیا تصور نہیں ہے بلکہ انشائیہ کا یہ تصور اور اسلوب کافی پرانا ہے۔

انشائیہ Essay کی تعریف انسائیکلوپیڈیا برٹینکا میں ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"The English mind the true essay is a composition of moderate length ,usually in prose which deals in a easy,cursoryway with the chosen subject and with the relation of that subject to the writer."[4]

مانتین اپنی انشائیوں کی کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ "اس کتاب کا موضوع میں خود ہوں" تاہم یہ بات کسی حد تک درست ہے کہ انشائیہ کا موضوع انشائیہ نگار کی ذات ہے تاہم ذات کا اظہار انشائیہ نگار کی اصل ہے اور یہ انشائیہ کی مرکزیت ہے۔ کلیم الدین احمد انشائیہ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں کہ

"انشائیہ کوئی نئ صنف نہیں، یہ وہی صنف ہے جسے انگریزی میں ایسے کہتے ہیں خط کی طرح انشائیہ بھی اپنی تلاش اور اپنی دریافت ہے۔ جس میں اس کی شخصیت کے متضاد عناصر ابھر آتے ہیں۔ یہ انمل، بے جوڑ اور ہم آہنگی سے عاری نظر آتی ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو ابھارتا ہے وہ اس طرح ان سے نجات پا لیتا ہے اس کا اصل موضوع اس کی شخصیت اور اس کی آزادی ہے کیونکہ دانش مند وہی ہے جو اپنی شخصیت کو پالے اور فطری آزادی کو ہاتھ سے جانے نہ دے۔"[۵]

کلیم الدین احمد کی اس تعریف میں بھی ذات کی انشائیہ میں مرکزیت کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور انشائیہ کی ذاتی حیثیت بیان کی گئی ہے۔ اس طرح ڈاکٹر آدم شیخ اس بارے میں کہتے ہیں۔

"انشائیہ ایک ذہین، رنگین مزاج، ترقی پسند اور روایت شکن فنکار کے جذبات اور احساسات کا پرتو ہی ہوتے ہیں ایک انشائیہ میں لکھنے والے کے ان دبے ہوئے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ جن کی راہ میں اس کے عہد کی سماجی، مذہبی اور اخلاقی رکاوٹیں ہوتی ہیں انشائیہ مروجہ اور فرسودہ روایتوں سے مانوسیت اور مطابقت پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اس کے انفرادی نظریات اور ذہنی کشمکش اظہار کے ذرائع ڈھونڈتی ہے۔ ادیب اس اظہار کے لیے زبان اور تحریر کا سہارا لیتا ہے۔ لیکن اصناف ادب میں بھی تحریریں انشائیہ نگار کے لیے معنی خیز خیالات کی حامل ہوتی ہیں اپنے مواد، ہیئیت اور انداز بیان کی وجہ سے دوسری تحریروں سے منفرد ہوتی ہیں۔"[۶]

تاہم ڈاکٹر آدم شیخ کے مطابق انشائیہ مروجہ اقدار سے مانوسیت پیدا نہیں کر سکتا نیز ذہنی کشمکش اور ادیب کے انفرادی خیالات کا فنی اظہار بھی کرتا ہے۔ اس ضمن میں نظیر صدیقی اپنی رائے دیتے ہیں

”انشائیہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں حکمت سے لے کر حماقت تک کی ساری منزلیں طے کی جاتی ہیں۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کیے جاتے ہیں اور با معنی باتوں کی مہملیت اجاگر کی جاتی ہے Sense میں Non Sense اور Non Sense میں Sense ڈھونڈا جاتا ہے یہ وہ صنف ہے جس میں لکھنے والا غیر سنجیدہ ہونے کے باوجود سنجیدہ اور سنجیدہ ہونے کے باوجود غیر سنجیدہ یعنی با الفاظ لکھنے والے کی بے خودی پائی جاتی ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں کہیں سچ میں جھوٹ اور کہیں جھوٹ میں سچ کی آمیزش ہوتی ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے۔ جس میں نہ صرف اپنا نام اور دوسروں کی پگڑی اچھالی جاتی ہے بلکہ اپنی پگڑی اور دوسروں کا نام بھی۔“[7]

نظیر صدیقی طنز و مزاح کو انشائیہ کا اہم جزو گردانتے ہیں علاوہ ازیں نظیر صدیقی انشائیہ کو تضاد خیالات کا مجموعہ گردانتے ہیں اور اس ضمن میں خود بھی تضاد کا شکار نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر انشائیہ کو ذہن کی تخلیق کہتے ہیں اور اسے مکمل طور پر دماغ کی تخلیقی سرگرمی کہتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر بیان کرتے ہیں۔ ”بیدار ذہن کے حامل تخلیقی شخصیت کی زندگی کے تنوع سے دلچسپی کے بامزہ نثر کے مختصر اور لطیف اظہار کا انشائیہ قرار دیا جاسکتا ہے۔“[8]

اس طرح مشکور حسین یاد انشائیہ کو ”ام الاصناف“ کہتے ہیں۔ اور مزید کہتے ہیں کہ ہر ادیب اس کا خالق ہے۔ اور اپنی کتاب ”ممکنات انشائیہ“ میں کہتے ہیں۔

”انشائیہ ادب کا فطری اظہار ہے۔ اس لیے ہر ادیب اس کا موجد ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں جب اس کے ادب کا آغاز ہوا تو انشائیہ وجود میں آیا۔ اس لیے کسی کا دعویٰ کرنا کہ صرف وہی انشائیہ کا موجد ہے کھلی حماقت کے سوا اور کچھ نہیں۔ انشائیہ کی تعریف لفظوں میں نہیں ہوا کرتی۔ انشائیہ کی تعریف یا تو انشائیہ پڑھنا ہے یا انشائیہ لکھنا۔“[9]

تاہم انشائیہ کے بارے میں بعض انشائیہ نگار کہتے ہیں اور جب کسی انشائیہ نگار کے دماغ میں آزاد تلازمہ خیال وارد ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی حیاتیاتی وحدت کا وجود بھی ہوتا ہے تو اس طرح انشائیہ بکھرنے سے بچ جاتا ہے فکری و جذباتی عناصر سے انشائیہ ایک نئی لے سے چمک اٹھتا ہے۔

غلام جیلانی اصغر اس بارے میں رقمطراز کرتے ہیں۔

”انشائیہ ایک ایسی نثری صنف ہے جو اتنی ہی بے ربط ہے جتنی کہ زندگی خود اور جس طرح زندگی کے آخر میں حیاتیاتی وحدت میں وجود میں آتی ہے اسی طرح انشائیہ کے منتشر اجزاء میں دیکھتے ہی دیکھتے ایک وحدت تاثر پیدا ہو جاتی ہے۔زندگی خود کئی اجزاء سے عبارت ہے۔انشائیہ کی یہی خوبی اور خصوصیت ہے یہ اجزائے فکری بھی ہوتے ہیں اور جذباتی بھی یعنی انشائیہ سوچنے پر بھی مجبور کرتا ہے اور محسوسات کے وسیع امکانات بھی چھوڑ جاتا ہے۔جب آپ انشائیہ ختم کرلیتے ہیں تو آپ کی سوچ کو ایک نیا اور غیر رسمی سازاویہ مل جاتا ہے۔“[۱۰]

غلام جیلانی اصغر انشائیہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ فکر، سوچ، جذبہ اور تخیل انشائیہ لکھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اس بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کی تعریف بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کے بارے میں کہتے ہیں۔

”انشائیہ اس نثری صنف کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیاء و مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور پر گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آکر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔“[۱۱]

ڈاکٹر وزیر آغا کی اس تعریف پر غور کیا جائے تو انشائیہ میں درج ذیل خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

۱۔ تازگی

۲۔ اشیاء و مظاہر کے مخفی مفاہیم پر گرفت۔

۳۔ نسانی شعور کا اپنے مدار سے ایک قدم باہر آکر ایک نئے مدار کو وجود میں لانا۔

دراصل ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کو بطور ایک الگ صنف منوانا چاہتے ہیں۔وہ مغرب میں لائٹ ایسے اور پرسنل ایسے کو پیش نظر رکھتے ہیں اگر وزیر آغا کی درج بالا تعریف کا جائزہ لیا جائے تو یہ تعریف Self Expression سے عاری نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کے خدوخال میں یوں بیان کرتے ہیں:

”اسلوب کی تازگی برقرار رہے۔ مضمون نہ اتنا گھٹا ہوا ہو کہ احساس کے پر قطع ہو جائیں اور نہ اتنا پھیلا ہوا کہ احساس کے پر قطع ہو جائیں اور نہ اتنا پھیلا ہوا کہ یہ ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جائے اس پر کہانی کا عنصر محیط نہ ہو کہ کہانی آغاز اور انجام کی حدود میں جھکڑی ہوتی ہے اور انشائیہ اس قسم کے رکھ رکھاو اور نظم و ضبط کا متحمل نہیں ہو سکتا اس میں ایک نیا اور تازہ زاویہ ابھرے جیسے آپ کسی شے کو زندگی میں پہلی بار دیکھ رہے ہیں مگر یہ زاویہ نگاہ کسی نظریہ یا فلسفہ کی تبلیغ کا روپ نہ دھارے وغیرہ۔“[۱۲]

ڈاکٹر وزیر آغا اس کی مثال یوں دیتے ہیں کہ ہزاروں لوگ سمندر کا معائنہ اور مشاہدہ کرتے ہیں اور اس میں سے ہر ایک کا اپنا زاویہ نگاہ ہے کہ شاعر جب مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اسے انسانی زندگی محدود لگتی ہے اور سمندر بہت پھیلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک بزنس میں سمندر کی موجوں سے لطف اندوز ہونے کی بجائے بحری جہازوں کی آمدورفت میں زیادہ دلچسپی لے گا۔ ایک عام آدمی سمندر کی موجوں اور تازہ ہوا سے لطف اندوز ہو گا عاشق و معشوق سمندر کی موجوں میں اپنے جذبات کا عکس دیکھے گا لیکن ایک انشائیہ نگار ان سے مختلف اور نئے انداز سے دیکھے گا وہ سمندر کی جانب پیٹھ کر کے اپنی ٹانگوں میں سے سمندر میں سے دیکھے گا اور یہ سمندر کا مشاہدہ کرنے کا نیا انداز نظر ہے اور یہی انشائیہ کی اصل ہے تاہم ہر شخص اپنے مرکز سے جڑا ہے اور انشائیہ کا وجود تب ہوتا ہے جب آپ اپنے آپ کو اس مرکز سے جدا کر کے ایک نیا مرکز تخلیق کر لیتے ہیں اور اس طرح سے آپ ایک نئے زاویہ نگاہ سے ہر چیز کو دیکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ انشائیہ کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا جاتا ہے کہ ایک شخص اپنے آفس سے چھٹی لے کر گھر آتا ہے۔ تنگ اور گھٹا ہوا لباس اتار کر نرم اور ڈھیلا ڈھالا لباس زیب تن کر کے ایک نرم موڑھے پر نیم دراز لیٹ جاتا ہے اور حقے کی نے سے کش لگاتا ہوا اپنے دوستوں سے گپ شپ کرتا ہے تاہم انشائیہ اسی شگفتہ انداز سے تخلیق ہوتا ہے۔اس طرح انشائیہ معمولی موضوعات پر لکھے گئے جیسے روزمرہ کی اشیاء میز، کرسی، کتاب، قلم، ہوا، چلنا، بیٹھنا وغیرہ تاہم ایک اچھے مصنف کے لیے ضروری ہے کہ انشائیہ کے اندر چھپے ہوئے معنی کو منظر عام پر لائے ڈاکٹر وزیر آغا تو انشائیہ نگار کو مقناطیس سے تشبیہ دیتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس چیز میں مقناطیس جیسی صلاحیت ہو گی اس شے کو وہ فوراً اپنا موضوع بنا لے گا۔ تاہم اگر انشائیہ پر غور کیا جائے تو اس کی کوئی ایک تعریف نہیں ہے بلکہ ہر تعریف سے انشائیہ کی ظاہری و باطنی خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں اگرچہ اس صنف کا مغرب میں بھی اختلاف رائے ہے اور اس وجہ سے مغرب میں بھی اس کے خدوخال خاص طور پر نمایاں نہیں کیے گئے۔ دوسرا یہ کہ انشائیہ صدیوں کے سفر سے گزرا اور اس کے اسلوب اور رنگ و آہنگ میں بہت تبدیلیاں ہوئیں اور اس سے انشائیہ میں بہت لچک پیدا ہوئی اور اس سے انشائیہ کی سرحدیں بھی وسعت اختیار کر گئیں۔

انشائیہ کے ارتقائی مراحل میں لطیف قسم کا آراء کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہڈسن کی نظر میں ”انشائیہ ذہن اور شخصیت کو واضح کرتا ہے“ آلڈس ہکسلے کے خیال میں ”انشائیہ ذات سے لے کر وسیع کائنات تک بہت سی دنیاؤں کا سفر چھپا ہے۔“ ڈبلیو ای ولیم کے نزدیک انشائیہ نگار کی نگاہ تمثیلی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ معاشرہ کو ایک فلسفی کی نگاہ سے جانچتا ہے۔

اگر ہم انشائیہ کے بارے میں سب مصنفین کی تعریفوں کا جائزہ لیں تو ان میں مغربی ادباء و ناقدین کے خیالات کی ہی ترجمانی ملتی ہے۔ اردو انشائیہ میں اختلاف کبھی کھل کر سامنے نہیں آیا اور یہ اختلاف ہمیں جزئیات کا اختلاف لگتا ہے۔ انشائیہ میں اختلاف کے بہت سے اسباب ہیں۔

اس میں انشائیہ کو الگ صنف کے طور پر ماننا، اس کے فن اور اسلوب میں اختلاف اور حدود اربعہ کا اختلاف شامل ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر اور ان کے پیروکاروں سے ان کا نکتہ نظر واضح نظر آتا ہے۔ تاہم مشکور حسین یاد کی تعریف مختلف ہے اور اسے ام الاصناف کہتے ہیں۔ اور ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے یہ ہے کہ انشائیہ کی تمام نثری اصناف میں جہاں جہاں انشائی عناصر ملتے ہیں اسے انشائیہ کہتے ہیں۔ نظیر صدیقی طنز و مزاح اور سنجیدگی جیسے تضاد عناصر میں توازن رکھنے کے حق میں ہیں۔

ج۔ انشائیہ کی اصطلاح:

انشائیہ لفظ کب اور کیسے استعمال کیا گیا اور اس لفظ کو رواج دینے میں کونسے اہم عناصر تھے اس سوال کے جواب میں یہ بات خاصی اہم ہے جب آزادی ہندوستان کا وقت تھا تب خاص قسم کی تحریروں کو انشائیہ کے نام سے پکارا جانے لگا اس وقت انشائیہ کی حیثیت ایک چھوٹی سی کلی کی مانند تھی اور اس کے نقوش ابھی واضح نہیں تھے تاہم اس کی پہچان آزادی ہند کے قریب ہوئی۔

انشائیہ فطری طور پر جس نوع سے تعلق رکھتا ہے اس کو عام کرنے میں فورٹ ولیم کالج کا اہم کردار ہے۔ فورٹ ولیم کالج کا ۱۸۱۸ء میں قیام ہوا اور یہیں سے نثر باضابطہ طور پر پروان چڑھی اور یہیں اسے مسجع اور مقفیٰ عبارت سے آزادی ملی اگرچہ مضمون کو متعارف کروانے میں اہم کردار سرسید احمد خان اور ماسٹر رام چندر نے کیا مگر انشائیہ کو فطری طور پر پروان چڑھانے میں اہم کردار فورٹ ولیم کالج نے ہی کیا۔ فورٹ ولیم کالج میں باغ و بہار جیسی کتابیں لکھی گئیں۔ اس کے بعد جب فورٹ ولیم کالج جب بند ہوا تو ۱۸۲۵ء میں دہلی کالج کا آغاز ہوا تو اس کے مقاصد بھی فورٹ ولیم کالج سے ملتے جلتے تھے ان دونوں اداروں نے مغربی ادب سے استفادہ حاصل کیا اور اسی کے اثر سے مقالہ لکھنے کا رواج ہوا اس طرح دہلی کالج میں ایک مقالے کا پرچہ بھی مخصوص کر دیا گیا اس دور میں مضمون نگاری پر بھی مقابلے کا رواج پروان چڑھ گیا اور کامیاب ہونے والے زیادہ لوگ وہ تھے جنہوں نے عہد سرسید میں پائی جانے والی خوبیوں کو اپنے مضامین میں استعمال کیا۔ سرسید کا رسالہ تہذیب الاخلاق اس ضمن میں نہایت اہم ہے کہ اس نے وسعت قلب اور دعوت فکر کو عام کیا اس رسالے کا آغاز ۱۸۷۰ء میں ہوا۔ تاہم سرسید نے انگریزی ایسے کو

متعارف کروانے میں اہم کردار ادا کیا اس طرح انگریزی ایسے کے محاسن اردو ایسے میں بھی در آئے۔ اور انگریزی کے مختلف قسم کے مضامین جن میں تحقیقی، علمی، تنقیدی، طنزیہ، مزاحیہ اور سماجی و فلسفیانہ مضامین شامل ہیں اردو ایسے میں در آئے علاوہ ازیں اس روایت میں لِاٹ ایسے اور پرسنل ایسے بھی شامل ہیں۔ بیکن، ہزلٹ، لیمب، چسٹرٹن، بیکن، ایڈیسن، اسٹیل اور چیسٹرٹن نے جب مضامین لکھے تو ان کے یہ مضامین شخصی مضامین تھے تاہم علمی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین تکنیکی لحاظ سے مختلف بھی ہیں مگر ان سب کے لیے ایک ہی لفظ ایسے کا استعمال کیا گیا ہے۔ اسطرح شخصی مضامین کے لیے پرسنل ایسے اور لائٹ ایسے کا لفظ برتا گیا ہے۔

سید ظہیر الدین مدنی اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

> "ایسز کو دو قسموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ پہلی قسم میں سماجی، سیاسی، مذہبی، ادبی، سوانحی وغیرہ ایسز کو شامل کیا گیا اور انہیں فارمل یعنی تکلفی اور رسمی کا نام دیا ہے۔ دوسری قسم کے ایسز کو فیمیلر یعنی ذاتی اور شخصی کہا ہے۔"[۱۳]

اسطرح اردو میں ایسے کے لیے جو الفاظ استعمال ہوئے وہ مضمون اور مقالہ تھا۔ اور کافی عرصے کے لیے شخصی مضامین کو بھی ایسے کے نام سے ہی پکارا جاتا رہا تاہم شخصی مضامین کی طرف کم ہی توجہ دی گئی لیکن جب اس کی طرف خصوصی دھیان دیا گیا تو اس کے لیے انشائیہ کا لفظ مخصوص کیا گیا تاہم سرسید کے بعد جو ان کے اسالیب تھے ان کے لیے مخصوص لفاظ استعمال کیے جانے لگے جیسے کہ ادب لطیف، گلابی اردو، طیفیہ، شاعرانہ نثر، مطائبات ادب وغیرہ کی اصطلاحیں عام ہونے لگیں۔

اس حوالے سے ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں۔

> "انشائیہ کا لفظ سب سے پہلے مخصوص معنوں میں غالبا مہدی افادی نے استعمال کیا۔ ڈاکٹر جاوید وشسٹ نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ ان کی تحقیق کے مطابق مہدی افادی نے انشائیہ کا لفظ سرے سے استعمال ہی نہیں کیا البتہ لفظ مضمون اور آرٹیکل ان کے ہاں موجود ہیں۔"[۱۴]

تاہم اردو میں انشائیہ کا لفظ سب سے پہلے ۱۹۴۴ء میں اختر اورینوی نے استعمال کیا اور یہ لفظ اکبر علی قاصد کے مجموعے ترنگ کے مقدمے میں استعمال ہوا۔ اور اس کے لیے وہ اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> "انشائیہ نگاری مضمون نویسی کی ہی ایک خاص صنف ہے۔ اس کا چرچا مغربی ادب میں تو خاصا ہے۔ مگر میں یہ پھلجڑی چھوٹتی نظر نہیں آتی۔ اردو دنیا میں مضمون نگاری کی کمی نہیں رہی۔ حالی۔ شبلی، شرر اور حسن نظامی کے مضامین اور مقالے تو بکثرت ہیں اور ان میں سے بعض مضامین میں انشائیہ کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔"[۱۵]

تاہم چناچہ اختر اور رینوی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انگریزی ایسے انشائیہ کا ہی مترادف ہے۔ حتی کہ یہ لفظ ۱۹۵۸ء تک شخصی مضامین کے لیے استعمال کیا جاتا رہا اور اس حوالے سے سید محمد حسنین کے ایک انتخاب کی جب اشاعت ہوئی تو اس کا نام انشائیہ اور انشائیے رکھا گیا۔ انشائیہ ۱۹۵۵ء میں ادب لطیف میں ایک مضمون گرمی کی آغوش شائع ہوا تو مرزا ادیب نے اسے لائٹ ایسے کے زمرے میں ٹھہرایا اور انشائے لطیف کے مخصوص نام سے شائع کروایا۔

۱۹۵۹ء میں رسالہ ادیب کا علیگڑھ سے انشائیہ نمبر شائع ہوا تو جو اس میں مقالات شامل کیے گئے تھے اسے انشائیہ کا نام دیا گیا۔ اگرچہ ۱۹۶۱ء میں جب وزیر آغا کے مضامین کا مجموعہ خیال پارے شائع ہوا تو انشائیہ کیا ہے؟ اس بات پر کھل کر بحث کی گئی اس کے علاوہ ادب لطیف میں مرزا ادیب نے لائٹ ایسے کو متعارف کروایا اور اس کی تحریک بھی چلائی اور اسی کو وزیر آغا نے ماہنامہ اوراق میں بہت سے انشائیہ شائع کیے اور بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں انشائیہ کا لفظ رائج ہو گیا اور اسی طرح انشائیہ نگاروں کی ایک نسل سامنے آگئی۔

د۔ انشائیہ اور مضمون میں فرق:

انشائیہ اور مضمون میں بہت کم فرق ہے بلکہ دونوں کو ایک ہی چیز سمجھا جاتا ہے تاہم انشائیہ مضمون کی ہی ایک قسم ہے۔ انشائیہ مضمون سے اگرچہ مختلف ہے۔ اردو میں مضامین کا آغاز سر سید کے دور میں ہوا۔ اور سر سید کے دور میں ہی ایسے کے خطوط پر بہت کے مضامین کو لکھا گیا سر سید کے علاوہ ماسٹر رام چندر اور مولوی ذکاء اللہ وغیرہ نے یہ مضامین لکھے اس کے علاوہ تحقیقی و علمی مضامین کو بھی مضامین کے زمرے میں شامل کیا جاتا تھا مگر مضامین کی صفات کا جائزہ لیا جائے ان میں قطعیت اور استدلال شامل ہیں مگر انشائیہ اس سے بہت مختلف چیز ہے۔

اس بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر کہتے ہیں۔

> "انشائیہ کو بالعموم مضمون سے خلط ملط ہوئے مزاحیہ، طنزیہ یا پھر تاثراتی مضمون قسم کی شے سمجھ لیا جاتا ہے۔ جو کہ قطعی غلط ہے۔ مضمون ایک عمومی اصطلاح ہے نہ ہی اپنی انفرادی حیثیت سے مضمون کوئی جداگانہ صنف ہے۔ مضمون کی کئی اقسام ہیں۔ مگر مضمون بذات خود قسم نہیں ہے۔ اس لیے مزاحیہ اور طنزیہ مضمون کی منصوبہ بندی اور ادبی مقاصد قطعی طور سے انشائیہ کے مقابلے جداگانہ نوعیت رکھتے ہیں۔"[۱۶]

بارے تاہم ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے ڈاکٹر سلیم اختر سے بالکل مختلف ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کو مضمون کی ایک قسم ماننے کی بجائے انشائیہ اور مضمون کو االگ الگ صنف مانتے ہیں۔ تاہم بہت سے ناقدین انشائیہ کو مضمون کی ہی ایک قسم مانتے ہیں جیسے انگریزی میں لائیٹ ایسے اور پرسنل ایسے دونوں ایسے کی ہی اقسام ہیں۔بس ان کی اقسام کو تخصیص کرنے کے لیے اسے مختلف متعارف کروایا گیا ہے۔اس طرح لائیٹ ایسے اور پرسنل ایسے کو ہی اردو میں انشائیہ کا نام دیا گیا ہے۔اور دیگر مضامین سے شخصی تحریروں کو علیحدٰہ کرنے کے لیے غیر رسمی طریقہ کاربرتا گیا ہے۔

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی لکھتے ہیں۔

> ”ایسز کو دو قسموں میں تقسیم کر دیا گیا۔پہلی قسم میں تمام سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، سوانحی وغیرہ ایسز کو شامل کیا گیا اور انہیں Formal فارمل یعنی تکلفی اور رسمی کا نام دیا ہے اور دوسری قسم کے ایسز کو فیمیلیئر Familiar یعنی ذاتی اور شخصی کہا ہے۔پہلی قسم کے ایسز کی مثال ایسی ہے جیسے ایک موضوع پر طول طویل مقالہ بھی لکھا جا سکتا ہے اور اس موضوع پر پندرہ منٹ میں ختم ہونے والی ریڈیائی تقریر بھی ہو سکتی ہے جو مربوط ہوتی ہے مگر مختصر اور نا مکمل رہتی ہے۔“[۱۷]

مقالات اور انشائیہ میں کافی امتیاز پایا جاتا ہے۔انشائیہ میں ذاتی اور شخصی حوالے سے لکھا جاتا ہے اس میں موضوع کے کسی ایک پہلو کو روشن کرکے ایک نئی راہ دکھائی جاتی ہے۔اور اس تصویر کو سمجھنے کا کام قاری پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔اور یہ عدم تکمیل انشائیہ کی خوبی ہے جبکہ مضمون یا مقالہ میں عدم تکمیل ایک برائی سمجھی جاتی ہے۔ مضمون میں نفس مضمون کو اچھے طریقے سے لکھا جاتا ہے۔اس میں نفس مضمون کے ساتھ انصاف بنیادی شرط ہے۔اس کے علاوہ علمی و تخلیقی پہلوؤں کو انصاف کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے جبکہ انشائیہ میں بے ترتیبی ہی انشائیہ کی خوبصورتی ہے۔تاہم انشائیہ نگار دیگر موضوعات کے ذریعے انشائیہ کے عنوان پر لکھ سکتا ہے۔علاوہ ازیں انشائیہ نگار اپنے ذاتی خیالات و تاثرات کو بھی انشائیہ میں بیان کرکے اسے ایک نئی صورت دے دیتا ہے۔اور اس وجہ سے اسے اشارے کنائے سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔اختصار کو بھی پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ جبکہ مضمون میں قطعیت سے کام لیا جاتا ہے۔ اور تفصیلات کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔اس وجہ سے انشائیہ اور مضمون دو مختلف چیزیں ہیں۔

اگرچہ منصوبہ بندی ہر تخلیقی اصناف میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جیسے ڈرامہ لکھتے ہوئے اس کے پلاٹ کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے اس طرح مضمون لکھتے ہوئے بھی اس کے نتائج پہلے سوچ لیے جاتے ہیں تاہم انشائیہ میں اس کے نتائج پہلے نہیں طے کیے جاسکتے اور نہ ہی انشائیہ کا خاکہ پہلے کسی کے ذہن میں پہلے موجود ہوتا ہے۔

سید محمد حسنین لکھتے ہیں۔

"مقالہ پڑھنے کے بعد ہم کچھ سیکھتے یا پاتے ہیں ایسی بات یا ایسا خیال جس سے ہماری علمیت میں گوں نا گوں اضافہ ہوتا ہے۔ جس سے ہماری شخصیت میں علم کی تابندگی آتی ہے۔ انشائیہ پڑھنے کے بعد ہم کوئی گم کردہ شے پالیتے ہیں ایسی شے جو روزانہ کی سادہ اور سپاٹ زندگی میں آنکھوں سے روپوش رہتی ہے ایسی شے جو ٹھوس اور ناقابل انکار حقیقتوں میں اوجھل رہتی ہے۔"[۱۸]

اس طرح انشائیہ مضمون سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ تاہم انشائیہ میں فنی نزاکت پائی جاتی ہے۔ اس طرح انشائیہ دیگر مضامین سے انتہائی مختلف چیز ہے۔

ہ۔ انشائیہ کی فکر تکنیک اور اسلوبیاتی عناصر:

ا۔ انشائیہ کی تکنیک:

انشائیہ انگریزی زبان میں تکنیک کو Techniqe کہا جاتا ہے اور یہ یونانی زبان کے لفظ Technikos سے نکلا ہے اور اس کے معنی ڈھنگ اور طریقہ کار کے ہیں۔ اگر تکنیک کے معانی کا بغور جائزہ لیا جائے تو درجہ بالا معنی کسی کام کی منصوبہ بندی کی وضاحت کرتے ہیں۔ ارسطو تکنیک کی تعریف یوں کرتا ہے۔"وہ طریقہ کار جس سے فنکار اپنے موضوع کو پیش کرتا ہے۔"[۱۹]

ادب پارے میں جس طرح فن پارے کی تعمیر میں مواد کا ستعمال کیا جاتا ہے۔ اسے ہی تکنیک کہا جاتا ہے۔ تاہم جب کوئی مصنف اپنے ذہن میں کوئی خیال لاتا ہے اور اسے اپنے ذہن میں توڑ پھوڑ کے عمل سے گزارتا ہے اور اپنے ذہن میں اس کی منصوبہ بندی کرتا ہے اور اپنے ذہن میں اسے کئی حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ جیسے ابتداء، وسط اور اختتام وغیرہ۔ تاہم مصنف کے اندر اس کی منصوبہ بندی کرنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ اور اس طرح مصنف کے اندر اس کی منصوبہ بندی کرنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ اور اس عمل کو تنقیدی شعور بھی کہا جاتا ہے۔ اس طرح کسی تخلیق کا ذہن میں یہ خیال آنے سے لے کر اس خیال کو صفحہ ارطاس پر سمونے تک کے عمل کو تکنیک کی تلاش کا وقت کہا جائے تو بجا نہ ہو گا جب کوئی مصنف اسے اپنے الفاظ میں لکھتا ہے تو اس وقت اس نے منصوبہ بندی کرلی ہوتی ہے کہ اسے کس انداز میں لکھنا ہے اس میں کونسا صیغہ استعمال کرنا ہے اور اس کے لیے کونسا طریقہ استعمال کرنا ہے۔ بیانیہ، علامتی، تجریدی، خط، ڈائری، روزنامچہ، تلازمہ خیال، سنجیدہ اور فلسفیانہ انداز، خود کلامی، زیر لب تبسم، شعری احساس، تمثیلی انداز، افسانے ڈرامے کی تکنیک یا مکالمے کی تکنیک وغیرہ۔

تاہم جب تخلیق کار یا مصنف اپنے ذہن میں آنے والے خیال یا مواد کو بیان کرنے کے لیے کوئی روش ،طریقہ یا منصوبہ بناتا ہے اسے ہی اس فن پارے کی تکنیک کہا جاتا ہے۔ تکنیک کا کسی بھی فن پارے میں استعمال کرنا کسی امتحان اور کشمکش سے کم نہیں ہے۔ تاہم یہ مصنف پر منحصر ہے کہ وہ فن پارے کے لیے کونسی تکنیک کو منتخب کرتا ہے اور تکنیک کو منتخب کرتے وقت وہ اپنی فنی ریاضت، ظاہر و باطن کے مشاہدے اور افتاد طبع کا استعمال کرتا ہے۔

تاہم ہر فن پارے کی اپنی تکنیک ہوتی ہے۔ اور اس تکنیک میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ ہر دور میں اسے بدلا جاسکتا ہے۔ اور اس کے لیے اپنی مرضی سے انتخاب کیا جاسکتا ہے۔

کسی فن پارے کے موضوع کے مطابق تکنیک کا انتخاب ہی اس کا اصل مقصد ہے تاہم یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ جب کوئی موضوع منتخب کیا جاتا ہے تو یہ ہی اپنے ساتھ تکنیک کو منتخب کر لیتا ہے تاہم کوئی بھی تکنیک کسی دوسری تکنیک سے کم درجہ نہیں رکھتی وہ ہی فن پارہ کامیاب ہے جس کی تکنیک اس کے موضوع کے مطابق ہے ایک چیز بہت ضروری ہے کہ کہ ہر موضوع کے لیے الگ تکنیک ہوتی ہے۔ تاہم انشائیہ کے دوسرے عناصر ترکیبی کی طرح تکنیک بھی موضوع کو اعلیٰ طریقے سے پیش کرنے کا ایک آلہ ہے۔

انشائیہ کی تکنیک جتنی اچھی اور چست ہو گی اتنا ہی انشائیہ اعلیٰ ہو گا گویا تکنیک کے ذریعے ہی مواد کی پیش کش ہوتی ہے۔ اگرچہ انشائیہ کی تکنیک دوسری تصانیف کی تکنیک سے منفرد ہوتی ہے تاہم وقت اور حالات ادب پر نمایاں اثر ڈالتے ہیں اور بعض دفعہ اس سے تکنیک بھی متاثر ہوتی ہے۔ اور اس طرح تکنیک کے طور طریقے بھی بدل جاتے ہیں لہٰذا تکنیک کوئی جامد چیز نہیں ہے بلکہ یہ بھی وقت کے زیر اثر ہے اور وقت کے ساتھ اس میں بہت تبدیلیاں آئیں اس طرح انشائیہ میں بھی وقت کے ساتھ تبدیلیاں آتی رہیں جیسے ڈاکٹر وزیر آغا کے دبستان کے انشائیے، مشکور حسین یاد اور نظیر صدیقی کے انشائیے کی تکنیک میں فرق اس کی عمدہ مثال ہیں۔ تاہم انشائیہ کے لیے صرف ایک ہی تکنیک استعمال نہیں ہوتی۔ انشائیہ نگار کے ذہن میں خیال کے مطابق ہی تکنیک روپذیر ہوتی ہے دراصل جب کوئی خیال ذہن میں آتا ہے تو یہ خیال ذہن میں ڈھانچہ بنالیتا ہے اور جب یہ تحریری صورت میں کاغذ پر لکھا جاتا ہے تو رائج الوقت تکنیکوں کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ بعض دفعہ فن اور تکنیک کو آپس میں گڈ مڈ کر دیا جاتا ہے فن تجربات اور جذبات کو اچھے انداز میں لکھنے اور معاشرے کے سامنے پیش کرنے کو کہا جاتا ہے اور اس سے قاری کو بہت انبساط اور خوشی ملتی ہے جبکہ تکنیک میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس فن کو پیش کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اور اسے

کس طریقہ اور انداز سے پیش کیا جاتا ہے تاہم فن اور تکنیک آپس میں گہرا تعلق رکھتے ہیں لہٰذا یہ چولی دامن کا ساساتھ رکھتے ہیں۔

تاہم خام مواد سے لے کر اس کی اصل شکل بننے تک جو طریقہ عمل ہوتا ہے اسے تکنیک کہتے ہیں اس طرح اگر انشایئے کو دیکھا جائے تو انشائیہ نگار کے ذہن میں موضوع یا خام مواد آتا ہے پہلے مصنف اس پر غور و فکر کرتا ہے سوچتا ہے بعد ازاں اس کے ذہن میں ایک ڈھانچہ تیار ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ یہ ڈھانچہ ایک تسلسل سے سامنے آتا ہے۔ تو جب اس ڈھانچے کو کاغذ پر لکھا جاتا ہے تو یہ ڈھانشہ ہو بہو کاغذ پر نہیں لکھا جاتا بلکہ رائج الوقت کسی بھی ہیئت اور ڈھانچے کی صورت میں ڈھل جاتا ہے تاہم اس عمل میں تکنیک برتی جاتی ہے جو کہ گزرتے وقت کے ساتھ ہمارے تجربے کا حصہ بن چکی ہوتی ہے۔ انشائیہ کی تکنیک میں آزادانہ تفکر اس کا اہم جزو ہے۔ انشائیہ میں مخفی مفاہیم کو بیان کیا جاتا ہے۔ اس امر کو ڈاکٹر وزیر آغا اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> "انشائیہ دوسرے کنارے کو دیکھنے کی ایک کاوش تو ہے مراد محض یہ نہیں کہ آپ دریا کا پل عبور کر کے دوسرے کنارے پر پہنچیں اور اس سے لطف اندوز ہوں اپنی جگہ یہ بات بھی نہیں مگر اصل بات یہ ہے کہ جب آپ کنارے پر پہنچتے ہیں تو آپ کا ہر روز کا دیکھا بھالا پہلا کنارہ دوسرا کنارہ بن کر آپ کے سامنے ابھر آتا ہے اب آپ اسے حیرت اور مسرت کے ساتھ دیکھنے لگتے ہیں جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ انشائیہ نگار یہی کرتا ہے وہ شے یا مظہر کو سامنے سے دیکھنے کی بجائے عقب سے اس پر نظر ڈالتا ہے اور اس کی معنویت کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے جو ہمہ وقت ایک ہی مانوس زاویہ سے مسلسل دیکھنے کے باعث اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔"[۲۰]

داخلیت بھی انشائیہ نگار کی ایک اہم خوبی ہے اور داخلی تکنیک اور طریقہ کار کی وجہ سے نہ صرف اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانکتا ہے بلکہ اپنے دل اور دماغ دونوں کو استعمال میں لاتا ہے۔ تاہم اگر انشائیہ کی داخلیت میں جھانکا جائے تو یہ ہیجان خیز ہوتی ہے۔ سید محمد حسنین اس بارے میں کہتے ہیں۔ "انشائیہ کی داخلیت صرف دل کو ہی نہیں چھیڑتی یہ دماغ کو بھی قلابازیاں کھلاتی ہے یہاں واردات قلب سے زیادہ محشر خیال کا جادو چلتا ہے۔"[۲۱]

انشائیہ کو اگر ذاتی قسم کی تحریر کہا جائے تو بجا نہ ہو گا اس میں داخلیت کی تیزی پائی جاتی ہے۔ اور اس میں ذاتی جذبات کی ترجمانی بھی پائی جاتی ہے علاوہ ازیں انفرادیت اور شخصیت کا بہترین ترجمان ہے۔ انشائیہ نگار آزاد

ہوتا ہے اور اس کے لکھنے پر بھی کوئی پابندی نہیں ہوتی وہ آزادانہ لکھتا چلا جاتا ہے۔ انشائیہ نگار ہر موضوع پر قلم اٹھا سکتا ہے۔ اور اسے عنوان کے انتخاب میں کسی پابندی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا انشائیہ نگار کے لکھنے کا طریقہ کار اس طرح کا ہوتا ہے کہ وہ بہت آرام دہ طریقہ سے گپ شپ لگا رہا ہوتا ہے۔ اس کا انداز درس دینے کی طرح کا نہیں ہوتا وہ پر تکلف انداز سے گفتگو کرتا ہے اور اس کی گفتگو خوش گفتار ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اصلاح یا کسی مسلک کی تبلیغ کر رہا ہوتا ہے۔ بلکہ پر تکلف اور ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو کی جاتی ہے۔

انشائیہ کبھی بھی قصہ کہانی کی مانند نہیں ہوتا انشائیہ میں بکھرے ہوئے تاثرات پائے جاتے ہیں اس میں منتشر خیالات پائے جاتے ہیں۔ انشائیہ میں سالمیت نہیں ہوتی اس میں انتشار خیالات پائے جاتے ہیں۔ اس میں واقعات سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ سید محمد حسنین اس بارے میں کہتے ہیں۔

> "انشائیہ میں واقعہ سے مصرف لیا جا سکتا ہے۔ مگر واقعہ سازی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ انشائیہ نگار غیر سالم واقعات کے چھینٹے اڑا سکتا ہے لیکن سالم و ہموار واقعات کے گھروندے نہیں بنا سکتا۔"[۲۲]

انشائیہ اگر غور کیا جائے تو ہر قسم کے واقعات میں چھوٹے چھوٹے اور ناہموار ٹکڑے ضرور ہوتے ہیں یہ ناتواں سے ٹکڑے ہوتے ہیں کہ سیاق و سباق کے بغیر ان کا وجود قائم نہیں رہ سکتا ان ٹکڑوں کو لطیفے اور چٹکلے بھی کہا جاتا ہے۔ مگر ادب میں اسے محاضرات کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ انشائیہ میں محاضرات خاصی اہمیت رکھتے ہیں اور اس سے انشائیہ کی رنگارنگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ انشائیہ میں محاضرات کے علاوہ اچھے اشعار اور قول محال بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انشائیہ نگار دور از کار تعمیمات سے بھی خاصا کام لیتا ہے۔

انشائیہ میں نہ ہی تھیم اور نہ کوئی مرکزی خیال ہوتا ہے اور نہ ہی سیرت نگاری کی اس میں کوئی جگہ ہوتی ہے۔ تاہم یہ اردو ادب کی ایسی صنف ہے جو کہ کہانی وغیرہ کے لیے بہت ہی نامناسب اور ناموزوں ہے۔ اس میں زیادہ تر نہ منظم خیالات پائے جاتے ہیں اور یہ غیر سنجیدہ تاثرات سے بھرپور ہوتا ہے۔ انشائیہ میں ظرافت اس کا اہم جزو ہے اور سید محمد حسنین اس کی اہمیت بتاتے ہوئے کہتے ہیں۔ "صنف انشائیہ میں ظرافت جوہر ہی نہیں، جوہر اعظم ہوتا ہے۔ یہ انشائیہ نگار کی خوش گفتاری کا خمیر ہے اور اس کے فن کا جلوہ صد رنگ۔"[۲۳]

انشائیہ میں دو طرح کا مزاح ہجو اور ظرافت پایا جاتا ہے اچھا اور اعلیٰ مزاح نامطابق خیالات لکھنے سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ نامطابق خیالات کے اجتماع کی بجائے نامطابق خیالات کی آویزش سے ظاہر ہوتا ہے۔ اگرچہ بہترین مزاح تبسم شیر لب ہوتا ہے اور اس میں ہجو اور ظرافت عمدہ طریقے سے پائی جاتی ہے اور ایک کامیاب انشائیہ نگار وہ

ہو تا ہے جو اپنے طرف سے کچھ نہیں کہتا بلکہ دوسرے کے ذریعے اپنی بات کہلواتا ہے تاہم یہاں مزاح اور ہجو کی ترسیل کے تین طریقے ہیں پہلا یہ کہ انشائیہ نگار لطیفے اور چٹکلے اس قسم کے بیان کرتا ہے کہ جس کے پس منظر میں دوسروں کی سربلندی عیاں ہوتی ہے۔ دوسرا یہ کہ کبھی انشائیہ نگار ہماری شخصیت پر تنقیدی اور چبھتے اشعار کہتا ہے۔ تیسرا یہ کہ کبھی انشائیہ نگار خود بے پردہ ہو کر ہمیں منفعل کر دیتا ہے۔ لہٰذا وہ طنز و ہجو سے کام لے کر خود کو مصلح کہلانے کا حقدار بھی ثابت ہو جاتا ہے۔

انشائیہ میں نا قنوطیت، سوختگی اور سرکوبی ہوتی ہے بلکہ یہ رجائیت سے مالا مال ہو تا ہے۔ خوش فکری، زندہ دلی اور شگفتہ بیانی اس کی خوبیاں ہیں۔ اگرچہ انشائیہ میں ظرافت مثبت توانائی قائم رکھتا ہے۔ انشائیہ آوارہ اور وحشی خیالات کو پیش کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے اور اس سے ذہنی آسودگی ملتی ہے۔ انشائیہ تکنیکی لحاظ سے غیر سالم صنف ہے۔ انشائیہ کا تحریری لحاظ سے کوئی ڈھانچہ یا پیٹرن مقرر نہیں ہوتا اس میں خیالات و تاثرات کے تسلسل کی یکتائی نہیں پائی جاتی انشائیہ میں زیادہ باتیں آغاز سے اختتام تک منتشر ہی رہتی ہیں اور یہ کبھی بھی مرتب نہیں ہوتیں اور ڈاکٹر جانسن اسے افکار پریشان کے نام سے پکارتے ہیں اور اردو زبان میں اس کے لیے ایک مخصوص لفظ ترنگ برتا جاتا ہے۔ سید محمد حسنین اس بارے میں کہتے ہیں:

> "متکلم کی زبان و بیان سے سامعین گوش بر آواز رہتے ہیں ساعتیں گزرتی جاتی ہیں لیکن یہ بے تکلف و برجستہ خوش گپی تشنگی دور نہیں کرتی؛ جیسے وہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی؛_ آپ غور کریں کہ موضوعات کی بو قلمونی اور گفتگو کے تسلسل میں ایک مخصوص تیور یا ترنگ بھی ضرور ہو گا۔ یہی "لاشعوری تسلسل" روح انشائیہ ہے۔"[۲۴]

اگرچہ انشائیہ میں باتیں بے ترتیبی سے ہوتیں ہیں مگر غیر سالم ہونے کی بنا پر اس کی ساخت میں نرمی اور لچک پیدا ہو جاتی ہے۔ انشائیہ کو تکنیکی لحاظ سے مختصر لکھا جاتا ہے اور اختصار اس کی خوبی ہے تاہم اس کا طریقہ کار غیر رسمی ہی رکھا جاتا ہے نیز عدم تکمیل ہی اس کی خوبی ہے اور اسے بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ایسے ہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ تلازمہ خیال انشائیہ کی نمایاں تکنیک ہے کہ جس طرح بکھرے ہوئے خیالات انشائیہ نگار کے دماغ میں آتے جاتے ہیں وہ اسے بہت عمدہ طریقے سے لکھتا جاتا ہے۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار کبھی ماضی سے بکھرے ہوئے واقعات اور منتشر خیالات کو استعمال میں لاتا ہے اور کبھی زمانہ حال کے۔ اس طرح تلازمہ خیال انشائیہ کی اہم تکنیک ہے۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار خود کلامی کی تکنیک بھی استعمال کرتا نظر آتا ہے اور اپنے آپ سے کلام کرتا ہے اور اپنے آپ سے خطاب کرتے ہوئے بہت سی باتیں کرتا ہے۔ تاہم انشائیہ کی تکنیک دوسرے اصناف سخن سے بہت مختلف ہے۔

۲۔ انشائیہ کے اسلوبیاتی عناصر:

انشائیہ اسلوب کو انگریزی میں Style کہتے ہیں اور اسلوب کا مترادف لفظ سبک ہے اور سبک کے لغوی معنی ٹکڑوں میں تقسیم کرنے اور پگھلانے کے ہیں۔ اسلوب کے اصطلاحی معنی یہ ہیں مصنف کی سوچ، سمجھ، فکر کا کوئی خاص انداز بیان یا طریقے سے بیان کرنا اسلوب ہے تاہم اسلوب لغوی و معنوی لحاظ سے فن پر اچھا انداز ہوتا ہے اگرچہ اسلوب کے معنی کافی وسیع ہیں۔

فرہنگ آصفیہ میں اسلوب کے معنی یہ ہیں۔ "طرز۔ انداز۔ طریقہ۔ ڈھنگ۔ وضع۔"[۲۵]

فیروز اللغات میں اسلوب کے معنی درج ذیل ہیں۔ "روش۔ طرز۔ طریقہ۔"[۲۶]

علمی اردو لغات کے مطابق اسلوب کے معنی یہ ہیں۔ "راہ۔ طریقہ۔ روش۔ طرز۔ صورت۔"[۲۷]

تاہم اسلوب کو لغوی معنی کے علاوہ مصنف کی ذات سے بھی جوڑا جاتا ہے اگرچہ اسلوب کا تعلق صرف اندا ز بیان سے ہی نہیں بلکہ اس کا تعلق مصنف اور ادیب کے طرز تحریر سے بھی ہوتا ہے۔ سید عابد علی عابد اس کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں۔ "اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کی وہ انفرادی طرز نگارش ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے ممیز کرتا ہے اس انفرادیت میں بہت سے عناصر شامل ہوتے ہیں۔"[۲۸]

سید عابد علی عابد اس کی تعریف پر اگر غور کیا جائے تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلوب انسان کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔ اس کی انفرادیت کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت کو ظاہر کرتا ہے یعنی اگر اس مصنف کی تحریر باقاعدہ پڑھی جائے تو اس تحریر سے مصنف کی شخصیت جھلکتی ہے اس لیے تحریر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کسی مصنف، کسی تصنیف، فن پارہ یا تحریر میں اس کی شخصیت جھلکتی ہے اور یہ اس کے کردار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد اسلوب کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں کچھ اس طرح سے ذکر کرتے ہیں۔

> "میں نے اسلوب کو انکشاف ذات اور اظہار ذات کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ گویا اسلوب ذات، شخصیت کا اظہار ہے۔ تنقید میں اسلوب سے مراد لکھنے کا وہ رویہ اور انداز ہے۔ جس سے ل؛ کھنے والے کی شخصیت کے ساتھ اس کے عصر کا مزاج بھی واضح ہو گا گویا اسلوب شخصیت اور روح عصر کے ساتھ خیال کے اظہار کا وسیلہ بھی ہے۔"[۲۹]

تاہم مصنف جب کسی تصور یا سوچ کو اپنے الفاظ میں لکھتا ہے تو اس عمل کے دوران اسے کافی کانٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے اور رد و قبول کے عمل کے بعد جب وہ اسے کوئی شکل دیتا ہے تو اس میں ادیب کی شخصیت بھی ساتھ تحلیل ہو جاتی ہے اور پھر یہی فن پارہ اس مصنف یا ادیب کی شناخت ہوتا ہے۔

تاہم اسلوب اپنی روایت سے اخذ ہوتا ہے اور روایت سے لوگ واقف ہوتے ہیں اور بہت سے لوگ اسے سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں اور وہ ہی لوگ اسے قبول کرتے اور مانتے ہیں اگرچہ روایت انسان کی طبع سلیم سے تعلق رکھتی ہے۔روایت متوازن،خوشگوار اور معتدل چیز بھی ہے تاہم روایت کو بنانے میں صرف دو افراد ہی اہم کردار ادا نہیں کرتے بلکہ کبھی کبھار پورا معاشرہ،لوگ روایت کو بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور یہ ایک عہد سے دوسرے عہد تک حرکت کرتی نظر آتی ہے۔

اگر ہم کسی شخص کو صاحب اسلوب کہیں تو گویا ہم اپنی روایت کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں ہم اسلوب سے متاثر بھی ہوتے ہیں اور متاثر ہونے کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ مصنف روایت سے انحراف کرتا ہے اور اس کی تحریر روایت کے برعکس ہو گی کیونکہ اس کے فن پارے کی خوبیاں روایت میں موجود نہیں ہوں گی جب اس فن پارے میں کوئی نئی چیز موجود ہوتی ہے جو کہ اس تحریرع کا انوکھا پن ہوتا ہے اور یہ انوکھا پن ہی اس کا اسلوب ہوتا ہے اور جب لکھنے والا لفظوں کو اس کی تحریر کے مطابق برتتا ہے تو اسے اس کا ابلاغ کہا جاتا ہے تاہم اسلوب کی پہلی خوبی یہی ہے کہ یہ انفرادی اور شخصی ہوتا ہے جبکہ روایت وسیع پھیلی ہوتی ہے اور اجتماعی ہوتی ہے اور وہ اپنے خاص طریقے سے عید بہ عہد چلتی ہے اور جب تک اس روایت کے اصولوں میں بدلاو نہیں آتا نیا اسلوب پیدا نہیں ہوتا۔

اسلوب کی تشکیل میں موضوع،ماحول،مقصد اور قاری کو نظر میں رکھا جاتا ہے تو اس ضمن میں فن اور فکر اسلوب کے بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔اصل میں اسلوب وہی ہے جو تخلیق کی ادبیت اور ابلاغ کو بالکل بھی مجروح نہ ہونے دے علاوہ ازیں اس میں شخصی خصائص بھی موجود ہوں۔پروفیسر منظر نقوی اس بارے میں بتاتے ہیں۔"اسلوب بیان کی تشکیل میں پانچ عناصر کارفرما ہوتے ہیں مصنف،ماحول،موضوع،مقصد اور مخاطب۔"[۳۰]

تاہم ہر مصنف ایک خاص سطح کے قاری کے لیے لکھتا ہے۔اور اس میں چقافت بہت اچر انداز ہوتی ہے کونکہ جیسی ثقافت ہو گی وہ ادیب پر اچر انداز کرے گی اور ادیب بھی اسی ثقافت کا حصہ ہوتا ہے اور وہ اسی ثقافت کے مطابق لکھے گا اور وہ اسی ثقافت میں سے الفاظ،محاورے،روز مرہ اور ضرب الامثال کو منتخب کرے گا کیونکہ ثقافت ہمارے رسوم و رواج،اعمال،طبعی وجود سے ہی پروان چڑھتی ہے اور اسی ثقافت میں سے بھی الفاظ کو منتخب بھی کیا جاتا ہے اس طرح ایک لفظ کے بھی کئی معنی ہیں۔یہ سراسر ادیب پر انحصار کرتا ہے کہ وہ کس طرح کے الفاظ کا چناو کرتا ہے بعض ادیب الفاظ کے معنی کو دیکھ کر لفظ کا انتخاب کرتے ہیں جیسا کہ مقالہ کے لیے شعری یا افسانوی زبان کا استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

مصنف کی شخصیت بھی ادب پارہ کو لکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے اس لیے ادیب کی شخصیت کو بھی دیکھا جاتا ہے آیا کہ وسیع ذہن کا مالک ہے یا تنگ نظر رکھتا ہے اسطرح روایت کے ساتھ ساتھ جدت کو بھی دیکھا جاتا ہے اس لیے یہ ادیب پر منحصر ہے کہ وہ کیسا دماغ رکھتا ہے علاوہ ازیں تجربے اور مشاہدے پر بھی نظر رکھی جاتی ہے اور ان چیزوں کو مد نظر رکھ کر ہی اسلوب کی تشکیل ہوتی ہے۔ اسلوب اس کے علاوہ ماحول بھی اہم کردار ادا کرتا ہے اس ماحول کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات اس کے اسلوب میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں ادیب اپنے آپ کو جتنا منفرد اور الگ رکھنے کی سعی کرے پھر بھی وہ ماحول کے اثرات سے بچ نہیں سکتا۔ موضوع بھی اسلوب میں خاصا اہم ہے جس طرح کا موضوع ہو گا ویسی ہی اس موضوع کی زبان ہو گی اس لیے الفاظ کا چناو سوچ سمجھ کر کیا جائے گا اسلوب میں مقصد بھی بہت اہم ہے کہ مصنف لوگوں کو کیا پیغام پہنچانا چاہتا ہے۔

اسلوب کی تشکیل میں اہم عنصر مخاطب بھی ہے لہٰذا یہ دیکھا جاتا ہے کہ ادیب بچوں کے لیے لکھ رہا ہے یا کسی اخبار کے لیے۔ جیسے کہ اگر بچوں کے لیے لکھ رہا ہے تو الفاظ بھی نرم لہجے کے برتے گا۔ اسلوب اور زمانہ ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور جیسے جیسے زمانے میں تبدیلی ہو گی تو یہ اسلوب پر اثر انداز ہو گی کیونکہ الفاظ ،زبان اور گفتگو وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی جائے گی۔ ممتاز شیریں لکھتی ہیں:

> "ایک برتن بنانے والے کے لیے سب سے پہلے مٹی کی ضرورت ہوتی ہے اسے مواد سمجھ لیجیے پھر اس میں رنگ ملایا جاتا ہے۔ یہ "اسلوب" ہے۔ پھر کاریگر مٹی اور رنگ کے مرکب کو اچھی طرح گوندھتا، توڑتا، مروڑتا، دباتا، کھینچتا، کسی حصے کو گول، کسی کو چوکور، کہیں سے لمبا، کہیں سے گہرا کرتا اور مخصوص شکل پیدا ہونے تک اسی طرح ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ تکنیک کی یہ موٹی سی مثال ہے اور آخر میں جو شکل پیدا ہوتی ہے، اسے ہیئت کہتے ہیں۔"[۳۱]

اگرچہ ممتاز شیریں اسلوب کو کسی ٹھوس شے کے مترادف قرار دیتی ہیں اور کسی دوسرے مواد میں شامل کر کے اسے ایک الگ شکل دے دی جاتی ہے۔ اس طرح فکر، اسلوب اور تکنیک الگ الگ چیزیں ہیں۔ اسی طرح اس؛لوب اور نوع میں بھی نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ فارم میں ادیب اپنی صنف یا تخلیق کو ادبی شکل دیتا ہے جیسے کہ افسانے کی انواع یا ناول کی انواع تاہم ان دونوں کے اسلوب میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔

اسلوب میں دو چیزیں ہوتی ہیں ا۔ فکر ۲۔ اسلوب۔ اور اسلوب انہیں دو چیزوں سے بنتا ہے۔ اسلوب کی تین صفات۔ سادگی، اختصار اور قطعیت انتہائی اہم ہیں اور اسلوب کی جمالیاتی صفات کو دیکھا جائے تو ترنم اور نغمہ اہم ہیں۔ اگر اسلوب کی سادگی کو دیکھا جائے تو یہ صنف کی تخلیق میں بہت اہم ہے۔ اس میں اس کے معنی بھی سادہ

ہوتے ہیں۔اور یہ کسی تحریر کا اہم محرک بھی ہوتا ہے جب الفاظ اور معنی دونوں سادہ ہوتے ہیں تو اس سے مبہم مطلب واضح ہوتا ہے اور تحریر میں سادگی اور روانی پیدا ہوتی ہے ۔اس کے بعد قطعیت اہم ہے جس کے لیے Clarity کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔سید عابد علی عابد اس بارے میں کہتے ہیں۔

> "سادگی کے مقابلے میں قطعیت اسلوب کی وہ صفت خاص ہے جس میں فکر کے سر رشتے پیچیدہ اور جذبے کے پہلو دقیق ہوتے ہیں ان کی آمیزش طبعاً ایسے الفاظ کا تقاضا کرتی ہے ،جو چاہے مطلق پیچیدہ ہوں ،لیکن وضاحت طلبی کے اعتبار سے وہ کسی طرح سادگی سے کم نہ ہوں۔"[۳۲]

اسلوب جذبے اور فکر میں اتنی سادگی ہو کہ ان کی وضاحت اچھی طرح سے ہو جائے اس طرح اختصار بھی اسلوب کی خوبی ہے اختصار کے ساتھ ساتھ ایجاز بھی بہت ضروری ہے۔ایجاز سے بہتر لکھا جاتا ہے اور اس سے تحریر میں حسن،خوبصورتی اور روانی پیدا ہوتی ہے اور ایجاز کی وجہ سے عبارت میں جھول پیدا نہیں ہوتا اور ایجاز کی وجہ سے فقرے معنی خیز ہو جاتے ہیں۔اس طرح ایجاز و ابہام آپس میں کہیں نہ کہیں مل جاتے ہیں اس کے لیے بہت احتیاط کرنی پڑتی ہے تاکہ خیالات اور احساسات کا کھل کر اور واضح طور پر اظہار کیا جاسکے اگر وضاحت میں ابہام ہو گا تو پھر اسلوب بھی ناقص ہی ہو گا۔اسلوب کی اہم خوبی تخیلی بھی ہوتی ہے۔تخیلی صفات میں تجسیم خیالات اور تصورات کو سامنے رکھا جاتا ہے اور تخلیق کے پورے عمل میں سب سے اہم چیز تخیل ہے۔

یہ پیکر تراشنے کے علاوہ علامتوں کا متلاشی ہے تمثال ہائے کی اہم خوبی خیال پیدا کرنا ہے اور اس سے بات کرنے کا ایسا انداز پیدا ہوتا ہے جس سے عام آواز شعر کو ارفع ترین درجے پر لے جاتی ہے۔ متجسم اسلوب کی ایسی خوبی ہے جو تمثال اور پیکر تراشنے کے کام آتی ہے اور یہ لطیف اور باریک خیالوں کو الفاظ فراہم کرتی ہے۔استعارہ مجاز ہے اس لیے یہ تجسیم کہلاتا ہے۔اسی طرح لفظ کے بھی دو طرح کے معنی بنتے ہیں ایک میں حقیقت ہوتی ہے اور دوسرے میں مجاز حقیقت پائی جاتی ہے ۔جو معنی لغت سے تلاش کیے جائیں وہ حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں اور مجاز حقیقت میں لفظ کے دلالتی یا وصفی معنی تلاش کیے جاتے ہیں۔اسی طرح مغربی نقادوں نے خیال افروزی کے بارے میں Suggestion کو پوشیدہ خوبی گردانا ہے اور اس کا مفہوم دوسروں تک پہنچانا تقریباً ناممکن سی بات ہے۔عابد علی عابد اس صفت افروزی کے بارے میں بتاتے ہیں۔

"یہ اسلوب کا شیوہ خاص ہے اور نگارش کی وہ شعبدہ گری ہے جس کے اسرار ورموز صرف تخلیقی فنکار کو معلوم ہوتے ہیں، تخلیقی عمل کا یہ مرحلہ پر اسرار ہے، جہاں باریک بین نقادوں کی ژرف نگاری ہنر اور فن کے سامنے سپر ڈال دیتی ہے۔"[۳۳]

اگرچہ اسلوب کے اس پہلو سے صرف ادیب ہی آگاہ ہوتا ہے۔ قاری تک یہ پہلو بعد میں پہنچتا ہے اور اس کے بعد ہی تصویریت کا پہلو سامنے آتا ہے۔اس طرح ترنم اور نغمگی بھی نثر کی جمالیاتی صفات ہیں۔ اسطرح انشائیے کے اسلوب کی بھی مختلف مصنفین کی اپنی آراء ہیں۔ سید محمد حسنین انشائیے کا رشتہ آفرید گی اور زائید گی سے منسلک کر دیتے ہیں مشکور حسین یاد بھی ان سے متاثر ہوتے ہیں اور انشائیے کے لیے ان کے ذہن میں بھی یہی معنی رو پذیر ہوتے ہیں مشکور حسین انشائیے کے بارے میں کہتے ہیں۔

"میں انشائیہ کو ادب کی ام الاصناف کہا کرتا ہوں۔ انشائیہ ادب کا فکریا اظہار ہے اس لیے ہر ادیب اس کا موجد ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں جب اس کے ادب کا آغاز ہوا تو انشائیہ وجود میں آیا۔"[۳۴]

اس تعریف سے ظاہر ہوتا ہے کہ انشائیے کے لیے کسی بھی چیز کو منتخب کیا جا سکتا ہے تاہم انشائیہ میں سچ اور جھوٹ کا احتمال نہیں پایا جاتا اس میں انسان کے ذاتی تاثرات موجود ہوں تحقیقی و استدلالی انداز نہ پایا جاتا ہو اور اسلوب شگفتہ ہو مگر اس تعریف کو بھی مکمل نہیں سمجھا جا سکتا انشائیے میں تازگی ضرور موجود ہونی چاہئیے اور موضوع دلچسپی سے بھرپور ہونا چاہئیے خیالات اور ان کا انداز قاری کے لیے نیا ہونا چاہئیے وزیر آغا کہتے ہیں۔

"تازگی سے مراد موضوع اور نکتہ نظر کا وہ انوکھا پن بھی ہے جو ناظر کو زندگی یکسانیت اور ٹھہراؤ سے اوپر اٹھا کر ماحول کا از سر نو جائزہ لینے پر مائل کرتا ہے۔"[۳۵]

اگرچہ ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ میں تازگی اور یکسانیت کی منفرد تعریف پیش کرتے ہیں اسطرح انشائیہ کو زبان زدعام ہونے میں کافی عرصہ لگا ہر صنف انشائیے کا ایک الگ انداز اور اسلوب رکھتا ہے ڈاکٹر سلیم اختر اپنی رائے کچھ اس انداز سے دیتے ہیں۔ "ہم میں سے ہر ایک شخص ایک مرکز سے بندھا ہوا ہے۔ انشائیہ اس وقت وجود میں آتا ہے جب آپ اس مرکز سے خود کو منقطع کر کے اپنے لیے ایک اور مرکز دریافت کر لیتے ہیں اور آپ کو اپنا ماحول بالکل نئے روپ میں نظر آنے لگتا ہے۔"[۳۶]

تاہم ڈاکٹر وزیر آغا مرکز سے علیحدگی کے قائل ہیں اور اسی سے نئے مفاہیم سامنے آتے ہیں وہ انشائیہ میں طنز و مزاح کے قائل نہیں ہیں اور نہ ہی سنجیدہ، خشک، کھردرے اور فلسفیانہ خیالات کو تسلیم کرتے ہیں تاہم وہ

انشائیہ کو ایک الگ صنف تسلیم کرتے ہیں۔ڈاکٹر انور سدید بھی ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں مگر انشائیہ کے لفظ کی حدود قائم کرنا ٹھیک نہیں ہے اس طرح صنف انشائیہ کی کوئی جامع تعریف نہیں کی جاسکتی ڈاکٹر وزیر آغا جس بات کی مخالفت کرتے ہیں کہ انشائیہ نگار اپنے نکتہ کی وضاحت کے لیے مدلل اور استدلالی انداز کو کیوں تسلیم کرے آپ انشائیہ کے لیے اپنے تاثرات اور انداز کو سیدھے سادے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ انشائیہ نگار اپنے انشائیے میں اپنی بات کو منوانے کے لیے زیادہ زور نہ دے انشائیہ میں شخصی زاویے کو واضح کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں مصنف اپنے تاثرات وخیالات کو بیان کرتا ہے اس میں مصنف کی شخصیت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے ااور قاری اس سے بہت مسحور بھی ہوتا ہے۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی مزید کہتے ہیں۔

"انشائیے کے سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ناول ،افسانہ یا مضمون کے برعکس انشائیے کا انداز غیر رسمی ہوتا ہے۔اس میں روایتی ترتیب کا خیال نہیں رکھا جاتا۔انشائیے کو اگر کسی خاص ترتیب کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے تو اس کی انفرادیت مجروح ہوگی انشائیہ نگار افتادِ طبع یا اندازِ تحریر کے مطابق انشائیے کو کہیں سے شروع کر کے کہیں بھی ختم کر سکتا ہے۔"[۳۷]

انشائیہ نگار منفرد ،ہلکے پھلکے، منفرد اور انوکھے موضوع کا انتخاب کرتا ہے۔انشائیہ میں کسی بھی چیز کو موضوع کے لیے منتخب کیا جاسکتا ہے۔اختصار انشائیہ کی بنیادی صفت ہے۔انشائیہ میں مصنف کے ذاتی تاثرات زیادہ اور دوسروں کے خیالات بہت کم پیش کیے جاتے ہیں۔انشائیہ کا ایک اپنا خاص مزاج ہوتا ہے جس سے یہ پہچانا جاتا ہے۔جمیل آزر بھی ڈاکٹر انور سدید کی مانند ہی انشائیہ کی حدود قائم کرتے ہیں اور اس کے معنی بھی اخذ کرتے ہیں ڈاکٹر بشیر سیفی اپنی رائے یوں دیتے ہیں:

"میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ انشائیہ بنیادی طور پر ایسے ہی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزی ادب میں ایسے کی اصطلاح بے حد وسعت کی حامل رہی ہے اوراس کے تحت خالص ایسے (انشائیہ) کے علاوہ ہر قسم کے سنجیدہ،طنزیہ ،تنقیدی،اصلاحی اور فلسفیانہ مضامین لکھے جاتے رہے ہیں یہی وجہ ہے انگریزی ایسیز کے انتخابی مجموعوں میں ہر قسم کے مضامین نظر آجاتے ہیں۔"[۳۸]

تاہم مذکورہ تمام مصنفین کی آراء سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نثر کی صنف ہے اور گزرتے وقت کے ساتھ اس میں بہت سی تبدیلیاں آتی رہیں اور اس میں انفرادی اختلافات بھی موجود ہیں تاہم انشائیہ ایک خوبصورت اور دلکش صنف ہے اس صنف نے نہ صرف ناقدین کی ادبی دشنہ کو بھی کھلے دل سے قبول کیا بلکہ اس صنف کے چاہنے والوں کو دل کھول کر تجربات کی کھٹالی سے گزارنے پر راضی ہو گئی اردو ادب میں صنف انشائیہ کو لے کر بہت اختلافات ہوئے اتنے شاید ہی اردو کی کسی صنف پر ہوئے ہوں ان اختلافات کی ہی وجہ سے اب انشائیہ نگاری اردو ادب میں اپنا خاص مقام رکھتی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کی تخلیق کے بارے میں کہتے ہیں کہ انشائیہ اس وقت تخلیق ہوا کہ جب زبان اپنے تخلیق کے تمام مرحلوں کو آسانی سے پار کر لیتی ہے اور ڈاکٹر رشید امجد کہتے ہیں کہ انشائیہ کو تکنیکی پہلو سے آزاد رکھ کر سوچ کو اس طرح واضح کیا جائے کہ قاری روحانی مسرت سے فیضیاب ہو جائے تو اسے انشائیہ کہا جاتا ہے اگرچہ انشائیہ میں علمیت اور فلسفیانہ پہلو موجود نہیں ہوتے بلکہ ہلکے پھلکے موضوعات اور شگفتہ تحریر ہوتی ہے اس میں نئے مفاہیم، سوچ، فکر، نئے پہلو، انکشاف ذات، گہرا مشاہدہ اور کفایت لفظی موجود ہوتی ہے غیر رسمی انداز ہی اسے دوسری اصناف نثر سے ممیز کرتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق براہینی و دلائلی طریقہ کار انشائیہ کے لیے غیر موزوں ہے اور انشائیہ کے لیے غیر رسمی طریقہ کار اختیار کرنا چاہیئے اس طرح انشائیہ میں نہ کوئی تمہید باندھی جاتی ہے اور نہ ہی کوئی نتیجہ یا انجام اخذ کیا جاتا ہے اور قاری کو کسی چیز کے نئے پہلو سے بھی آشنا کروانا چاہیئے انشائیہ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ کسی ایک موضوع یا نکتے کا پابند نہیں ہونا چاہیئے بلکہ پوری کائنات کے کسی بھی نکتے کا انتخاب کر کے اپنی سوچ اور فکر کے دائرے کو وسیع کرنا چاہیئے۔انشائیہ میں خارجیت کی بجائے داخلیت پر زور دیا جاتا ہے۔انشائیہ میں اشیاء کے مخفی مفاہیم اخذ کیے جاتے ہیں اس سے جذبوں کو تہذیب دینے میں مدد ملتی ہے اور اس سے مخفی جذبے دب جاتے ہیں اور انہیں توازن کرنے میں مدد ملتی ہے۔

ر۔تقابلی مطالعے کے اصول:

تقابل کو انگریزی میں comparative کہتے ہیں اور تقابلی مطالعہ کو انگریزی میں comparative studies کہتے ہیں جس میں ہم دو علوم یا دو اشیاء میں سے اشتراکات یا افتراقات کو ڈھونڈ کر اس کا باقاعدہ معیار مقرر کرتے ہیں۔سوزن بیسنیٹ تقابل کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

"تقابلی ادب مختلف ثقافتوں کے متون کا مطالعہ ہے۔ایک کثیر العلمی مضمون ہے جس کا تعلق زمان اور مکان کے بعد میں پیدا ہونے والے ادب کے درمیان رشتوں کے نقوش کے متعلق ہے۔"[39]

ابو الاعجاز حفیظ صدیقی کشاف تنقیدی اصلاحات میں تقابلی جائزے کی کچھ یوں تعریف کرتے ہیں۔

"موازنہ مشترک بنیاد رکھنے والی دو چیزوں کا تقابلی مطالعہ ہے۔اصولا موازنہ میں ترجیح کا سوال شامل نہیں لیکن بالعموم موازنہ کرنے والا ناقد ایک فنکار یا فن پارے کی دوسرے فنکار یا فن پارے پر ترجیح ثابت کرنے کی خواہش سے کلی اجتناب نہیں برت سکتے۔بعض اوقات نقاد کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ایک ادب پارے کی دوسرے ادب پارے یا ایک فنکار کی دوسرے فنکار پر ترجیح ثابت کی جائے۔"[40]

ویکیپیڈیا میں تقابل کی تعریف کچھ یوں ہے۔

"Acomaparative research is a research methodology in the social Sciences that aims to make comparisons across different countries And cultures."[41]

محمد حسن مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ میں کہتے ہیں:

"تقابلی ادب محض اس ادب سے عبارت نہیں جس میں محض کسی بھی دو فنکاروں کا تقابل کیا جائے یا کسی دو مختلف زبانوں یا ادبیات کے درمیان تقابلی مطالعہ کیا جائے بلکہ وہ ادب جو دو فنکاروں اور دو زبانوں کی ادبیات کے درمیان مختلف سطحوں کے لین دین، تطابق اور تخالف کا مطالعہ کرکے اس دور رس محرکات کو بے نقاب کرتا ہو اور وسیع تر عالمی آگاہیوں کو سامنے لاتا ہو۔"[42]

Steven Tostoy اپنی کتاب Comparative literature میں تقابل کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں۔

"Comparative literature remains an embattled approach and discipline of the study of literature.Yet, it produces that

meaningful dialogue between cultures and literatures that is its mark theoretically,In applicaton and in basic as well as higher level education."[43]

تاہم تقابلی مطالعہ میں ایسی ادبی تحریروں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ جس میں دو مختلف تہذیبوں کے اشتراکات و اختلافات کا جائزہ لیا جاتا ہے اور اس میں زبان، لوگوں کا مزاج اور رویے وغیرہ شامل ہیں۔ تقابل انسان کی جبلت میں شامل ہے۔ کیونکہ وہ ہر چیز کو تقابل یا موازنہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ انسان ہمیشہ سے خوب سے خوب تر کی تلاش کرتا رہا ہے اور اس میں تقابلی جبلت نے اہم کردار ادا کیا ہے اگر ابتدائی ادب میں تقابل کو تلاش کیا جائے تو پہلی صدی قبل مسیح کے مشہور شاعر ہوریس کی شاعری میں تقابل کے عناصر ملتے ہیں۔ تقابلی ادب اپنے معنوں میں ایک نئی اصطلاح ہے مگر حقیقت میں اس ادب کا تعلق کافی پرانا ہے یونان کے ادباء ارسطو اور لانجائنس وغیرہ ابتدا ہی سے شعراء اور ڈرامہ نگاروں کے اسلوب، لسانی خوبیوں اور تخلیقات کا تقابل کرتے رہے ہیں مگر اس وقت تقابل کا دائرہ یونان کی زبان تک ہی محدود تھا۔ لاطینی زبان کے ماہر، ناقد اور شاعر ہوریس نے یونانی اور لاطینی زبان کی تخلیقات کا تقابلی جائزہ لیا۔ دانتے نے اطالوی ادب کا مزید ان زبانوں کے ساتھ تقابل کیا بعد ازاں ڈرائیڈن اور فرانس کے بوبلو سینت بیو، جرمنی سے گوئٹے اور اشیگل بھی اس میدان میں وارد ہو گئے اور تقابلی ادب کو وسیع کرتے ہوئے تقابل کی حدود کو وسیع کیا۔ اسطرح ہندوستان میں بھی سنسکرت ادب کے مختلف ادباء کی تخلیقات کا تقابل دیکھنے کو ملتا ہے۔ ۱۸۸۶ء میں پوسینٹ نے اپنی کتاب Comparative literature لکھ کر پہلی بار تقابلی ادب کے تصور کو واضح کیا تاہم تقابلی ادب کی اصطلاح کے متعلق بہت سے اختلافات بھی رہے کارنیل یونیورسٹی کے پروفیسر لین کوپر نے اس اصطلاح کو مہمل قرار دیا تاہم اس اختلاف سے قطع نظر تقابلی ادب کا ایک آزاد شعبہ اور مطالعہ کے ایک خاص طریقہ کار کا نام ہے تاہم تقابلی ادب کا دائرہ کار بہت وسعت رکھتا ہے۔ اس میں اور بھی وسعت پیدا کی جاسکتی ہے۔ اول یہ کہ کسی ایک زبان کے اندر ہی مختلف اسالیب کا تقابل کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ دو یا دو سے زائد زبانوں میں رائج اسالیب اور موضوعات کے درمیان تقابل کیا جاسکتا ہے۔ دو ملکوں کی زبان کا بھی تقابل کیا جاسکتا ہے۔ آزادی کے بعد تخلیق ہونے والے ادب کا بہجی تقابل کیا جاسکتا ہے اگرچہ تقابلیادب کے بارے میں مختلف نظریات بھی ہیں جیسے ایک ملک یا مختلف علاقوں کا ادب ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مفتوحہ قوم کا ادب غلام قوم کے ادب پر یا غلام قوم کا مفتوحہ قوم کے ادب کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اس طرح قدیم ادب حالیہ ادب پر اپنے اثرات ضرور مرتب کرتا ہے اور ایسا ہونا فطری ہے تاہم بعض ادباء تقابلی ادب اور ادب کے ارتقاء کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔

مغرب میں تقابلی ادب پر بہت سا کام ہو رہا ہے اور مغرب تقابلی ادب کو فروغ دینے کے لیے مختلف ادارے اور شعبے متعارف کروا رہا ہے۔ مختلف قسم کی معلومات کو ملک کی اپنی زبان میں ترجمہ کر کے تقابل کیا جا رہا ہے اور اس طرح معیار قائم کیا جا رہا ہے۔۔ تقابلی ادب ایک بین الشعبہ جاتی مضمون کی حثییت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور مغرب میں اس کے تین دبستان موجود ہیں۔

۱۔ فرنچ سکول آف تھاٹ:

یہ دبستان تقابلی مطالعے کے حوالے سے ابتدائی کا درجہ رکھتا ہے۔ اس سکول کا نظریہ یہ تھا کہ ایک قوم کا نظریہ دوسری قوم تک کیسے پہنچتا ہے اور نظریہ منتقل ہونے کے پس منظر میں کیا محرکات پوشیدہ تھے اور یہ دبستان یورپی اقوام سے تقابل کرتا تھا اس دور میں ماخذات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ جرمن سکول آف تھاٹ:۔ اس دبستان کا آغاز انیسویں صدی کی آخرہ دہائی میں دکھائی دیتا ہے اور یہ دور ۱۹۳۹ء سے ۱۹۹۵ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور کی بنیاد ساختیات کے نظریے پر قائم تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ان کے مزاج میں تبدیلی آگئی اور موجودہ وقت میں اس کی بنیاد اطلاقی ادب پر رکھی گئی ہے۔

۲۔ امریکن سکول آف تھاٹ:

اس دبستان کا وجود فرنچ سکول آف تھاٹ کے رد عمل کے طور پر وجود میں آیا اس دبستان میں دنیا کے تمام موجودہ ادب شامل ہیں چاہے وہ عربی ادب ہو یا چینی ادب ہو اس دبستان میں تہذیبوں اور زبانوں کی کوئی قید نہیں رکھی گئی ہے اور تقابل کی بنیاد تحقیق کی بجائے ادبی تنقید پر رکھی گئی ہے۔ تقابل کی دو اقسام بھی ہیں پہلی بیانیہ تقابلDescriptive comparison جس میں چیزوں کی ظاہری شکل و صورت اور خدوخال کو جانچا جا سکتا ہے اور دوسری قسم تعین قدر Normative Comparison ہے جس میں صرف ادب کے حوالے سے ہی تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ تقابلی مطالعے کے کچھ تقاضے بھی ہیں جن میں اشتراکات، اختلافات اور تعین قدر شامل ہیں۔ تقابلی مطالہ کے کچھ اصول بھی ہیں جو کہ درجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اگر کسی فن پارے کا جانچا جائے تو اس میں سیاسی، معاشی، معاشرتی، نفسیاتی، جنسی اور تہذیبی و ثقافتی عناصر ضرور موجود ہوتے ہیں اور فن پارے کی تخلیق میں تکنیک، ہئیت، زبان اور اسلوب وغیرہ کو بھی برتا جاتا ہے لہٰذا تقابل کرنے کے لیے ان تمام پہلوؤں کی تمام سطوح کے مطالعے کو بھی زیر نظر رکھنا ہو گا۔

۲۔ تقابلی مطالعے کے موضوع کو جب منتخب کیا جائے تو یہ بات ذہن میں رکھی جائے جس دو مختلف ادب کی زبان، ادب یا کسی ایک ہی ادب کے دو فن پاروں کے زبان و ادب کا تقابل کیا جائے تو ان میں کوئی خصوصیت ضرور

مشترک ہو جیسے زبان مشترک ہو یا تکنیک کی خصوصیت مماثلت رکھتی ہو یا ان کا عہد بالکل ایک جیسا ہو یا فن پارہ کسی ایک ہی تحریک کے زیر اثر لکھا گیا ہو وغیرہ۔ اگر اس اصول کے زیر اثر تقابل کیا جائے گا تو بہتر تقابل کیا جا سکے گا۔

۳۔ تقابل کرنے کے لیے غیر جانبدرانہ ہونا بہت ضروری ہے اور فن کا غیر جانبدرانہ طریقے سے تقابل کیا جائے اور فنکار اور اس کی شخصیت سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے

۴۔ تقابل کرنے کے لیے دو فن پاروں کو برابر سمجھنا چاہیئے ایک کو کمتر اور دوسرے کو اعلیٰ نہیں سمجھنا چاہیئے اصل مقصد صرف قدر تعین کرنا اور درجہ بندی کرنا ہے۔

۵۔ تقابلی مطالعے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ادبی نمونوں، ادبی تحریروں اور فنکاروں کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا جائے۔

۶۔ تقابلی ادب میں موضوع کا بھی تقابل کیا جاتا ہے اور مختلف ادیبوں نے اپنے فن میں جن موضوعات کا استعمال کیا ہے۔ وہ آپس میں کتنے ملتے جلتے ہیں اور اس سے قبل کتنے ادباء ان موضوعات کو اپنی تخلیقات میں برت چکے ہیں۔

۷۔ تقابلی مطالعہ صرف اشتراک و مماثلت کی وجہ سے ہی نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان فن پاروں پر بھی ہو سکتا ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہوں مگر اس بات کو مد نظر رکھا جائے کہ اگر دو مخالف ادبی فن پاروں یا زبانوں میں اختلافات زیادہ ہوں اور اشتراکات کم ہوں تو پھر تقابل کرنا بے معنی اور مہمل ہو گا۔

۸۔ تقابلی ادب اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ تقابل کرنے والا مختلف زبانوں اور تہذیبوں کا شعور اور ادراک رکھتا ہو۔ اگر زبان پر عبور نہ رکھتا ہو تو تراجم کی مدد سے کام لیا جا سکتا ہے۔

۹۔ تقابلی مطالعہ میں مختلف علوم جیسے سائنس، نفسیات، فلسفہ، فنون لطیفہ اور سماجیات سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

۱۰۔ تقابلی مطالئے میں بنیادی سروکار بین التہذیبی جائزہ ہے اس میں ادب میں موجود دو مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں میں موجود اشتراکات و افتراکات کی نشاندہی، کی جاتی ہے نیز عالمگیر اور آفاقی عناصر کو بھی قلم زد کیا جاتا ہے۔

۱۱۔ تقابلی ادب میں صرف وہ ہی موضوعات کا انتخاب کریں گے جن کا تعلق ہمارے ادب سے ہے۔ پروفیسر عبد الستار کہتے ہیں۔

> ”ہم اپنے تقابلی مطالعے کے لیے صرف انہیں موضوعات کا انتخاب کریں گے جن کا تعلق ہمارے ہندوستانی ادب سے ہے مثلاً اردو ادب کے دائرے میں ہم اس سلسلے میں مندرجہ ذیل موضوعات لے سکتے ہیں" جدید شعری ادب میں قومی بیداری کا عنصر" عہد وسطیٰ کی صوفیانہ شاعری میں غنائیت کا پہلو"۔۔۔۔۔اس قسم کا تقابلی مطالعہ ہندوستان کی حدود میں اردو، ہندی، پنجابی اور بنگلہ زبانوں کے درمیان کرسکتے ہیں۔“[۴۴]

تاہم بعض تقابل کے لیے ایسے موضوعات بھی منتخب کیے جا سکتے ہیں جس کے لیے ہم ہندی، پشتو اور میراٹھی زبانوں تک بھی پھیلایا جا سکتا ہے۔ تقابلی ادب میں ایک جیسے پہلوؤں کی تلاش ایک ضروری امر ہے علاوہ ازیں متضاد، منفرد اور غیر یکساں پہلوؤں کو بھی زیر نظر رکھنا چاہئیے تاہم تقابلی ادب میں دو الگ الگ ادب کے ایک دوسرے پر اثرات کو بھی موضوع قلم بنایا جا سکتا ہے اور یہ اثرات دو طرفہ یا ایک طرفہ بھی ہو سکتے ہیں اس طرح مغرب کے ادب کا اثر مشرق کے ادب پر ہوتا رہا ہے۔

۱۲۔ تقابلی ادب میں تقابل کا مرکز کوئی ادبی تحریک، ادبی صنف یا ادبی رجحان ہوتا ہے علاوہ ازیں فکشن کا موضوع، مصنفین یا شعراء کے خاص حلقے کا تقابل کیا جا سکتا ہے تاہم تقابل کے لیے صرف ایک بنیادی اصول کی ہی پیروی کرنی چاہئیے اگر تقابل کے بنیادی اصول پر عمل پیرا نہ ہوا جائے تو قاری اور محقق بکھرے ہوئے حقائق میں الجھ جائے گا اور اس کا نتیجہ کچھ اچھا سامنے نہیں آئے گا۔

۱۳۔ تقابلی ادب کا دائرہ کار بہت پھیلا ہوا نہیں ہونا چاہئیے تقابلی ادب میں دو یا دو سے زیادہ زبانوں کی مختلف اصناف کا تقابل بھی کیا جا سکتا ہے۔

۱۴۔ تقابلی ادب میں جو چیز نہایت اہم ہے کہ تقابلی ادب میں ادبی تحریکوں کا کتنا اثر ہوا ہے اور اس ضمن میں معاشرتی اور سیاسی تحریکات نہایت اہم ہیں اور آزادی سے قبل کی تحریکوں نے اس پر کس طرح اثر ڈالا علاوہ ازیں تکنیک، اسلوب اور ہئیت پر تحریکوں کا کیا اثر ہے۔

۱۵۔ تاہم تقابلی ادب بہت ذمہ داری اور لگن کا کام ہے اور یہ انتہائی نازک کام ہے تقابلی ادب کے لیے روایتی طریقہ کار کا ہی انتخاب کیا جاتا ہے اور تقابلی ادب کے مطالعہ ہم سائنسی انداز میں کرتے ہیں۔ تقابلی ادب میں دو یا دو سے زیادہ مصنفین، زبانوں یا دبستانوں پر مجموعی تنقیدی تقابل کیا جاتا ہے اور اس ضمن میں اس کی ادبی حیثیت دیکھی جاتی ہے اور اس میں اس کی خوبیوں اور خامیوں کا تعین کیا جاتا ہے۔

۱۶۔ تقابل مندرجہ ذیل اعتبار سے ہی ہو سکتا ہے پہلا موضوعاتی تقابل، دوسرا اسلوبیاتی یا فنی تقابل، تیسرا فکری تقابل اور چوتھا عصری تقابل۔

ن۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیہ نگار اور ان کے انشائیوں کا مختصر تعارف

ا۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگار اور ان کے انشائیوں کا مختصر تعارف

ا۔ڈاکٹر وزیر آغا:

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے جذبوں کو جب اپنی شخصیت کا لمس فراہم کیا اور اپنے نازک خیالات اور تجربات کو حرکت دی تو اس عمل کے دوران آپ نے اپنی نظر وسیع و عریض کائنات پر رکھی اور اس میں فطرت کے رنگ بھرے اور اس میں اپنے مشاہدے کی سچائیوں کو شامل کر کے انشائیہ تخلیق کیا ان کے انشائیوں میں تہذیب مختلف زاویوں سے نمایاں ہوئی ہے۔ انشائیہ کو منفرد اور مقبول عام کرنے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایک ناقد کی حیثیت سے آپ نے انشائیہ کی مقتضیات اور شعریات مقرر کیں اور مختلف رسائل جیسے ''ادب لطیف'' اور ''اوراق'' میں انشائیہ کے بارے میں مضامین لکھ کر ہمیں انشائیہ کی اہمیت سے اجاگر کیا۔ آپ نے انشائیہ کے فنی محاسن ،حدود، تعریف اور اوصاف کی پہچان کروائی آپ نے انشائیہ میں خود طبع آزمائی کی۔ ان کے چار مجموعے منظر عام پر آئے جن میں پہلا ''خیال پارے'' ۱۹۶۰ء، دوسرا ''چوری سے یاری تک'' ۱۹۶۶ء، تیسرا ''دوسرا کنارہ'' ۱۹۸۰ء اور چوتھا ''اگر سمندر میرے اندر گرے'' ۱۹۸۹ء شامل ہیں۔ ان کے انشائیوں میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے نیز ان کے انشائیوں میں تقابلی انداز بکثرت پایا جاتا ہے جس کی بہترین مثال ان کا انشائیہ حقہ پینا ہے جس میں جدید تہذیب کا قدیم تہذیب سے تقابل ہے تاہم وہ زندگی کے گہرے حقائق کو فلسفیانہ اور نئے مفکرانہ انداز سے بیان کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ تازگی ان کے انشائیوں کا اہم جزو ہے۔ وزیر آغا کے انشائیوں میں اختصار اور معنی آفرینی کی صفت بھی موجود ہے اس کے لیے وہ اشعار کو بھی برتتے ہیں اور اس کے لیے وہ بڑی عقلمندی سے علامت، تشبیہ اور استعارہ کو بھی برتتے ہیں وہ کہیں کہیں اپنے انشائیوں کو پر معنی بنانے کے لیے تمثیلی انداز بھی اپناتے ہیں۔ وہ فطرت اور دیہات سے گہرا لگاؤ بھی رکھتے ہیں جس کا منہ بولتا ثبوت ان کے انشائیوں میں بھی موجود ہے وہ معمولی سی چیز کو نئے اور انوکھے انداز سے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری ان کی تحریر میں کھو جاتا ہے۔ ان کے انشائیوں میں زیر لب تبسم ،انکشاف ذات، شگفتگی، تازگی، عدم تکمیل، اختصار اور نکتہ آفرینی جیسی خوبیاں موجود ہیں تاہم یہ ایک عمدہ اور بہتر انشائیہ نگار کی خصوصیات ہیں۔

۲۔ غلام جیلانی اصغر:

غلام جیلانی اصغر دبستان وزیر آغا کی نمائندگی کرتے ہیں آپ نے انشائیہ کی مبادیات کے لیے "انشائیہ کیا ہے" کہ نام سے انشائیہ کی تنقید پر مضامین بھی لکھے ان کا پہلا انشائیہ رسالہ "اوراق" میں "لیٹنا" کے نام سے طبع ہوا تاہم ان کا پہلا انشائیوں کا مجموعہ "نرم دم گفتگو" ۱۹۹۶ء میں طبع ہوا۔ اس میں بیس انشائیے ہیں۔ آپ نے متنوع اور غیر معمولی موضوعات پر انشائیے لکھے ان کا انداز غیر روایتی اور منفرد ہے۔ آپ کا اسلوب سادہ اور رواں ہے۔ غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کی ایک بنیادی صفت یہ ہے کہ اسے اگر ہر بار پڑھا جائے تو قاری ہر بار ایک نئے موضوع اور نئے پہلو سے آشنا ہوتا ہے۔ انکشاف ذات کی خوبی بھی ان کے انشائیوں میں جھلکتی ہے۔ وہ عام خیز، معنی خیز اور پیاری بات کرتے ہیں۔ وہ بات سے بات نکالتے ہوئے دور تک چلے جاتے ہیں۔ مگر پھر اسی نکتے پر واپس پہنچ جاتے ہیں وہ تجربے کار ذہن سے انشائیہ پر قلم اٹھاتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں فلسفہ اور سنجیدگی کی بجائے ہلکے پھلکے موضوعات کو احاطہ تحریر میں لایا گیا ہے۔ ان کے مشہور انشائیوں میں "بستر پر لیٹنا"، "بچہ پالنا"، "چہرے"، "مکان بنانا"، "جھوٹ کی حمایت میں"، "غیر ذمہ داری" اور "گالی دینا" وغیرہ شامل ہیں۔ عدم تکمیلیت، انکشاف ذات، شگفتگی، تازگی، اختصار اور غیر رسمی طریق ان کے انشائیوں کے اوصاف ہیں۔ وہ فطرت سے بھی گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ آپ موضوع کا انتخاب اور الفاظ کا چناؤ بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں تاہم دبستان سرگودھا میں ڈاکٹر وزیر آغا کے بعد غلام جیلانی اصغر ہی اعلیٰ منصب پر فائز نظر آتے ہیں۔

۳۔ مشتاق قمر:

مشتاق قمر کا پہلا انشائیہ رسالہ "اوراق" میں "چھڑی" کے نام سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا اور ۱۹۷۰ء میں ان کا پہلا انشائیوں کا مجموعہ "ہم ہیں مشتاق" کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں چودہ انشائیے ہیں اور ان کے مشہور انشائیوں میں "چھڑی"، "دھوپ کھانا"، "کچھ نیند کی مذمت میں"، "آئس کریم کھانا"، "دھوپ میں بیٹھنا" اور "ہم ہیں مشتاق" شامل ہیں۔ ان کا اسلوب فکری اور فلسفیانہ ہے ان کے انشائیوں میں سوچ کا پہلو پایا جاتا ہے۔ فطرت سے گہری محبت ان کے انشائیوں کا خاصہ ہے۔ وہ پوری زندگی کا احاطہ کرنے کی بجائے زندگی کے ایک پہلو کو موضوع بناتے ہیں۔ ان کے انشائیے مشاہدات اور تجربات کا نچوڑ ہیں۔ انکشاف ذات، غیر رسمی انداز، عدم تکمیل، تازگی اور شگفتگی سے ان کا انشائیہ وجود میں آتا ہے تاہم ان کا اسلوب دلکش اور منفرد ہے۔

۴۔ جمیل آزر:

جمیل آزر نے اپنا پہلا انشائیہ ۱۹۵۹ء۲۹ مارچ میں رسالہ "لیل و نہار" میں "برساتی" کے نام سے شائع کروایا۔ جمیل آزر کے انشائیوں کے تین مجموعے "شاخ زیتون" ۱۹۸۱ء، "رت کے مہمان" ۱۹۹۴ء اور "وقت اے وقت" ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئے۔ اختصار، کہانی پن، سلاست روانی، موسیقیت، انکشاف ذات، شگفتگی، شعری لوازمات اور فطرت سے گہرا لگاؤ ان کے انشائیوں کی نمایاں صفات ہیں۔ ان کا انداز مثبت اور رجائیت سے بھرپور ہے۔ ان کے ان شائیوں میں فکر کی زیریں لہر پائی جاتی ہے جو ان کے انشائیوں میں مزاحیہ اور خوش طبع رنگ دینے کی بجائے سنجیدگی کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔

۵۔ اکبر حمیدی:

اکبر حمیدی دبستان سرگودھا کی تحریک میں اچانک سے شامل ہوئے اور بطور انشائیہ نگار اپنا ایک مقام بنانے میں کامیاب ہوئے آپ کے انشائیوں کے پانچ مجموعے شائع ہوئے۔ پہلا انشائیوں کا مجموعہ میں "جزیرے کا سفر" ۱۹۸۵ء، دوسرا "تتلی کے تعاقب میں" ۱۹۹۰ء میں، تیسرا "جھاڑیاں اور جگنو" ۱۹۹۸ء میں، چوتھا "پہاڑ مجھے بلاتا ہے" ۲۰۰۳ء میں اور پانچواں "اشتہاروں بھری دیواریں" ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئے۔ وہ انشائیہ کے خالق ہونے کے ساتھ ساتھ انشائیہ فہم بھی تھے وہ انشائیہ کی شعریات اس کے فن اور تکنیک سے پوری طرح آگاہ تھے ان کی نثر سادہ آسان اور رواں ہے کسی بھی تصنع اور تکلف سے پاک ہے آپ کے مشہور انشائیوں میں "تتلی کے تعاقب میں"، "رنگ دار شیشے"، "ریشم کا ٹکڑا"، "نئے موسموں کے پرندے"، "جھاڑیاں اور جگنو"، "اکھاڑے"، "پہاڑ مجھے بلاتا ہے"، "کامیابی کی دیوی"، "خالی گیراج" اور "زیرو پوائنٹ" شامل ہیں۔ ان کے انشائیوں کی نمایاں صفات فلسفیانہ انداز، انکشاف ذات، اختصار، زیرلب تبسم اور تہذیبی پہلو ہیں۔

۶۔ حنیف باوا:

حنیف باوا نے ۲۰۰۷ء میں انشائیوں کا مجموعہ "دائراوں سے باہر" شائع کیا اس مجموعے میں بیس انشائیے شامل ہیں۔ ان کا پہلا انشائیہ "چاک" رسالہ "اوراق" میں چھپا ڈاکٹر وزیر آغا نے اس انشائیے میں بہت سی تبدیلیاں کروائیں اور ان تبدیلیوں کے بعد یہ انشائیہ چھپا تاہم آپ نے انجم نیازی کے مشورے سے انشائیہ لکھنا شروع کیا۔ ان کے انشائیوں میں اسلوب کی سادگی، نکتہ آفرینی اور موضوعات کے نہاں اور چھپے ہوئے گوشوں کو صفحہ قرطاس پر بکھیرنا ہے اور انشائیوں میں نئی سے نئی بات بیان کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ میلوں ٹھیلوں، بازاروں، پارکوں، ہوٹلوں، ریستورانوں، کھیتوں گویا کہ ہر چیز پر غور کرتا ہے اور ہر چیز کے

حسن کو دیکھتا ہے اس وجہ سے ثقافت کی جھلک بھی ان کے انشائیوں میں موجود ہے گویا وہ اپنے انشائیوں میں معاشی ،معاشرتی اور نفسیاتی مسائل کو بھی پیش کرتے ہیں نیز ان کا تجزیہ بھی کرتے ہیں تاہم ان کے انشائیوں میں انفرادیت بھی موجود ہے۔

۷۔ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش:

سلیم آغا قزلباش کو انشائیہ کا فن ان کو اپنی وراثت سے حاصل ہوا ہے۔جب ان کا انشائیہ نے لفظوں کا روپ دھارا تو بہت اعلیٰ پایے کا انشائیہ تخلیق ہوا۔ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش ڈاکٹر وزیر آغا کے بیٹے ہیں۔ان کے انشائیوں کے مجموعے تین ہیں ان کا پہلا مجموعہ "سرگوشیاں" کے نام سے ۱۹۸۰ء میں چھپا ان کا دوسرا مجموعہ "آمنا سامنا" جبکہ تیسرا "نام میں کیا رکھا ہے" شامل ہے۔ان کا مشاہدہ وسیع ہے اور تجربات ہونے کے باعث ان کے انشائیے حیرت و انبساط کی خوبی رکھتے ہیں تازگی فکر ان کے انشائیوں کی پہچان ہے۔وہ ارد گرد پھیلی ہوئی معمولی اشیاء کو موضوع بناتے ہیں۔ان کے بعض انشائیوں میں استہفامیہ انداز پایا جاتا ہے۔سادگی،خیال آفرینی،بے ساختگی،روانی اور زندگی کی تلخ حقیقتیں ان کے انشائیوں کی صفات ہیں۔

۸۔ شفیع ہمدم:

شفیع ہمدم نے انشائیوں کا مجموعہ "رعنائی خیال" ۲۰۰۵ء میں شائع کیا اس میں کل ۲۹ انشائیے شامل ہیں۔ شفیع ہمدم ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی مشاورت سے انشائیے کی کی طرف راغب ہوئے اور انہوں نے بھی ڈاکٹر وزیر آغا کی طرز پر انشائیے لکھے تاہم موضوع سے ان کی گہری دلچسپی ہوتی ہے ،وہ پہلے اس موضوع کے بارے میں عام لوگوں کے خیالات بھی پیش کرتا ہے پھر دلائل و براہین سے اپنے خیالات لکھتا ہے اور یہ انشائیے میں وسعت کا بھی سبب ہوتا ہے تاہم ان کا انداز نہایت سادہ اور ہلکا پھلکا ہے وہ ناصح کے طور پر سامنے نہیں آتے آپ آفاقی سچائیوں کو بھی بیان کرتے ہیں ان کے انشائیوں میں زیر لب تبسم کی خوبی بھی موجود ہے وہ معاشرے کے عام موضوعات پر بھی لکھتے ہیں ان کے بعض انشائیے احساسات اور کیفیات پر بھی لکھے ہوئے ہیں۔ آپ دور بینی نگاہ اور تخلیقی سوچ کے مالک ہیں ان کے انشائیوں میں ذاتی خیالات پائے جاتے ہیں ،انکشاف ذات ان کے انشائیوں کا ایک خاص پہلو ہے ان کا انشائیوں میں بے تکلف انداز گفتگو انشائیوں کو پر اثر بناتا ہے وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو عمدہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں طوالت موجود نہیں بلکہ اختصار کی خوبی پائی جاتی ہے۔ نکتہ آفرینی،عدم تکمیل اور تشنگی کا عنصر بھی ان کے انشائیوں میں پایا جاتا ہے ۔گہری سوچ اور فکر کی تازگی بھی ان کے انشائیوں کا حصہ ہے۔ مظاہر فطرت اور فطرت سے لگاؤ بھی ان کے انشائیوں کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

۹۔ منور عثمانی:

منور عثمانی نے پہلا انشائیوں کا مجموعہ "فرنٹ سیٹ" ۲۰۱۰ء میں شائع کیا اور اس میں بیس انشائیے ہیں، ان کے انشائیوں میں اسلوب کا انوکھا پن اور تازگی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے انشائیوں میں سنجیدہ علمی رویہ اختیار کیا اور دبستان سرگودھا کی شعریات کو اپنایا ان کے ہاں موضوعات کی نکتہ آفرینی اور موضوعات کی رنگارنگی پائی جاتی ہے اور ان ہی سے ان کی تخلیقی جہت اور انفرادیت کی رونمائی ہوتی ہے۔ مناظر کی عکاسی بہت عمدہ انداز سے کرتے ہیں۔ انکشاف ذات، تجربات اور عمیق مشاہدات کو ہی اپنے انشائیوں میں بیان کرتے ہیں ان کا اسلوب سادگی کا حامل ہے اور بیان میں انہیں پوری قدرت حاصل ہے۔ وہ چھوٹے جملے میں بڑی بات کہہ جاتے ہیں اور انشائیہ اختتام کے پہنچنے تک قاری پر اتنا اثر چھوڑتا ہے کہ قاری اس کے سحر میں گرفتار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

۱۰۔ خالد اقبال:

خالد اقبال نے ۲۰۰۸ء میں اپنے انشائیوں کا مجموعہ "شگفتہ خاطر" کے نام سے شائع کروایا اور انشائیہ لکھنے والوں میں آپ کا نام نمایاں ہے۔ آپ کے انشائی مجموعے میں اکیس انشائیے شامل ہیں خالد اقبال جدید انشائیہ کے لوازمات کو اپناتے ہیں۔ وہ زندگی کے معمولی واقعات اور روزمرہ میں پیدا ہونے والی احساساتی کیفیات کو انشائیہ کے روپ میں لکھتے ہیں ان کے ہاں پائی جانے والی مزاح نگاری تبسم خیز ہی رہتی ہے اسے مزاح نہیں بننے دیتی وہ انسان کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں اور مشاہدے پر عبور رکھتے ہیں تاہم انہوں نے اپنے انشائیوں میں انسانی نفسیات کو بہت عمدہ انداز سے بیان کیا ہے۔ ان کے ہاں معنی تہہ در تہہ پائے جاتے ہیں، خالد اقبال ذاتی مشاہدے اور تجربے کو بہت عمدہ انداز میں بیان کرتے ہیں خالد اقبال پرانی اور اساطیری کہانیوں سے بھی معانی کشید کرتے ہیں اور تاریخی واقعات کو بھی جابجا بیان کرتے ہیں ان کا اسلوب سادگی کا حامل ہے ان کے انشائیوں میں اختصار کی خوبی بھی پائی جاتی ہے تاہم بات سے بات پیدا کرنے میں آپ کمزور نظر آتے ہیں ان کے اس طرز کے انشائیوں میں ایک خلا سا نظر آتا ہے تاہم آپ نے خیال یا کیفیت کو مختلف زاویوں سے پیش کیا وہ چھوٹے چھوٹے موضوعات ہمارے معاشرے سے ہی اخذ کر کے انہیں جاندار بناتے ہیں۔ وہ کہیں استعاراتی، کہیں افسانوی اور کہیں واقعاتی اسلوب سے مستفید ہوتے نظر آتے ہیں۔

۱۱۔ حیدر قریشی:

حیدر قریشی نے اپنے انشائیوں کا آغاز رسالہ "اوراق" سے کیا وہ وزیر آغا کی شعریات کی پابندی کرتے ہیں اور آپ نے ایک انشائیوں کا مجموعہ "فاصلے قربتیں" کے نام سے لکھا اس میں دس انشائیے موجود ہیں ان کے انشائیے

تازگی، شگفتگی، نکتہ آفرینی، انکشاف ذات، اختصار، غیر رسمی طریقہ کار اور تجربات و مشاہدات جیسی خوبیوں کے حامل ہیں۔ ان کے انشائیوں میں اولیت شگفتگی اور تازگی کو حاصل ہے کیونکہ وہ انشائیوں کو حظ پہنچانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں ۔ان کے انشائیوں میں بات بڑھ کر ایک نکتے پر ختم ہو جاتی ہے۔ انکشاف ذات بھی ان کی ایک عمدہ خوبی ہے اور ان کے انشائیوں میں ان کی ذات جھلکتی نظر آتی ہے۔ ان کے انشائیوں میں شاعرانہ تخیل بھی جھلکتا ہے کیونکہ حیدر قریشی ایک شاعر ہیں اس لیے حسن، رومانیت اور فطرت سے ان کا گہرا ربط ہے ان کے انشائیے متنوع موضوعات سے عاری نظر آتے ہیں مگر ان کے انشائیوں میں روانی اور تسلسل دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے انشائیوں میں برجستگی اور شگفتگی بہت مزہ دیتی ہے۔

۱۲۔ ناصر عباس نیر:

ناصر عباس نیر نے اپنا پہلا انشائیوں کا مجموعہ "چراغ آفریدم" ۲۰۰۰ء میں شائع کیا جس میں بیس انشائیے شامل ہیں تاہم آپ خود انشائیہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ انشائیہ کے نقاد بھی ہیں ان کے اسلوب میں شگفتگی اور سنجیدگی کا عنصر بھی موجود ہے ان کے ہاں نہ بہت زیادہ سنجیدگی ہے اور نہ ہی بہت زیادہ مزاح پایا جاتا ہے ان کے انشائیوں میں مدلل انداز کے ساتھ ساتھ دماغ کی ضوریزی پائی جاتی ہے مگر اس سے بھی انشائیہ بوجھل پن کا شکار نہیں ہوتا ان کے انشائیوں میں حکمت و دانائی پائی جاتی ہے۔ تاہم ناصر عباس نیر آرٹسٹ ہونے کی وجہ سے یکسانی کیفیت سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں شخصی اظہار اور خود پسندی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے بعض موضوعات پر مدلل انداز بھی غالب آتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ بات سے بات نکالتے ہیں اور نتیجہ بھی اخذ کرتے ہیں ان کے ہاں ایجاز و اختصار بھی موجود ہے۔

۱۳۔ بشیر سیفی:

بشیر سیفی انشائیہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ انشائیہ کے نقاد بھی تھے۔ انہوں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی انشائیہ نگاری پر لکھا ان کے موضوع کا نام "اردو میں انشائی ادب کا ارتقاء" تھا۔ اس مقالے کو انہوں نے ارتقائی شکل بھی دی آپ نے انشائیہ لکھنے کا آغاز رسالہ اوراق سے کیا انہوں نے "یکسانیت"، "کتابیں"، "نکٹائی" اور "پھول" جیسے انشائیے لکھے۔ انشائیہ کتابیں میں ضرب الامثال اور مصروں کو برتتے ہیں۔ نکٹائی میں گہری سنجیدگی کا تاثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ انشائیہ کی شعریات کو ملحوظ رکھتے ہیں تاہم ان کا انشائیہ "پھول" ان کے اسلوب کا نمائندہ انشائیہ ہے۔

۱۴۔جان کاشمیری:

جان کاشمیری کی پہلی تخلیق ہی ان کا شہرت کا سبب بنی آپ انشائیہ لکھنے والوں میں دیر سے آئے اور آتے ہی شہرت آپ کا مقدر بن گئی۔ان کے انشائیوں میں "تیسری آنکھ"، "پردہ"، "مسکراہٹ"، "لاگ شیٹ"، "ایش ٹرے" اور "شادی" وغیرہ شامل ہیں۔ان کے انشائیوں میں مکالماتی انداز بھی پایا جاتا ہے چونکہ آپ شاعر ہیں اس وجہ سے نادر تشبیہات و استعارات کا استعمال کرتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں شگفتگی اور شوخی کا عنصر بیک وقت پایا جاتا ہے۔ان کے انشائیوں میں تاریخ معاشرت، فطرت، سیاست، نفسیات اور ثقافت پائی جاتی ہے۔ان کے انشائیوں میں تصوف کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔

۱۵۔حامد برگی:

حامد برگی مشہور انشائیہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہیں ان کی تحریر میں تہہ در تہہ معنی چھپے ہوتے ہیں ان کی تحریر میں الفاظ چست ہیں وزیر آغا کے انشائیوں کی شعریات ان کے انشائیوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں ان کا مشہور انشائیہ "لڑائی جھگڑا" ہے۔

۱۶۔امجد طفیل:

امجد طفیل نے رسالہ "اوراق" سے انشائیہ لکھنے کا آغاز کیا ان کے انشائیوں میں آوارگی، موسم، اضطراب اور فرار قابل ذکر ہیں۔انشائیہ "موسم" میں عمر کے موسموں کی صورتحال بیان کی جاتی ہے بعد ازاں عمر کے موسموں کا حال احوال دریافت کیا جاتا ہے پھر موسم سے فطرت کا تعلق دریافت کیا جاتا ہے وہ بات سے بات آگے بڑھاتے ہیں مگر نکتہ آفرینی کا دامن نہیں چھوڑتے۔انشائیہ "فرار" میں محبوبہ کے ساتھ مل کر سماج کے رواجوں سے فرار پر بحث کی گئی ہے۔انشائیہ " اضطراب" میں بیان کیا گیا ہے کہ اضطراب جسم کے ساتھ ساتھ روح کے ساز مضراب سے بھی چھیڑ چھاڑ کرتا ہے اور مثبت اضطراب دنیا کو جنت کے متماثل بنا دیتا ہے۔انشائیہ "آوارگی" میں اشیاء کی بجائے کیفیات اور احساسات و جذبات کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے۔انشائیہ "دیوار" میں دیوار کو تہذیب کا نشانہ سمجھا گیا ہے۔اس انشایئے میں فکر اور سنجیدگی کی لہر دوڑتی نظر آتی ہے۔امجد طفیل بیانیہ انداز سے انشائیہ کا آغاز کر کے واقعاتی تسلسل کے ذریعے انجام تک انشائیہ پہنچ جاتا ہے۔

۱۷۔انور سدید:

انور سدید نے وزیر آغا کے انشائیوں کی تحریک کو بہت فروغ دیاانور سدید نے بہت منفرد انداز کے انشائیے لکھے انہوں نے انشائیہ کے فن اور اس کی خصوصیات متعارف کروانے کے ساتھ ساتھ انشائیہ کے مسائل سے ہمیں روشناس کروایاانہوں نے انشائیہ پر ایک کتاب "انشائیہ اردو ادب میں "لکھی ان کے دو انشائیوں کے مجموعے "ذکر اس پری وش کا"۱۹۸۱ءاور" آسمان میں پتنگیں" ۱۹۹۲ءمیں طبع کروائیں۔ان کے مشہور انشائیوں میں "ثور"، "مچھر کی مدافعت "وغیرہ شامل ہیں۔تازگی، شگفتگی،اختصار،انکشاف ذات،برجستگی،خیال آفرینی اور نکتہ آفرینی ان کے انشائیوں کی خوبیاں ہیں۔وہ زندگی کی عکاسی نئے مفاہیم کے ساتھ بہت خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔

۱۸۔ڈاکٹر محمد اسد اللہ:

ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے انشائیہ کی مرتی ہوئی روایت کو دوبارہ سے زندہ کیا آپ نئے انشائیہ لکھنے والوں میں سے ہیں۔انہوں نے دو انشائیوں کے مجموعے "بوڑھے کے رول میں "۱۹۹۱ءمیں اور "ڈبل رول "۲۰۱۵ءمیں شائع کیے علاوہ ازیں ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے انشائیہ کی صنف میں "انشائیہ کی روایت، مشرق و مغرب کے تناظر میں "۲۰۱۵ءمیں شائع کی انشائیوں میں ان کی سوچ،ذاتی تجربات،سادگی، شگفتگی،خیال آفرینی پائی جاتی ہے۔ان کے بہترین انشائیوں میں "ڈاڑھیاں"،اور "دوسرا ٹکٹ"وغیرہ شامل ہیں۔

۱۹۔اے غفار پاشا:

اے غفار پاشا نے انشائیوں کے چھ مجموعے لکھے ان میں "گوشہ عافیت"،"تجدید کا پل" ،"تار عنکبوت"،"مسافر خانہ"،"آنکھ مچولی"اور "سٹے آرڈر"شامل ہیں۔اے غفار پاشا کے پہلے مجموعے میں پختگی کا عنصر نہایت قلیل ہے اور سوچ کا دائرہ ذیادہ وسیع نہیں ہے تاہم ان کے دوسرے انشائیے کے مجموعے "تجدید کا پل"میں فنی جمالیات کا عنصر پایا جاتا ہے۔ان کے تیسرے مجموعے میں سنجیدگی کی بجائے شگفتگی کا پہلو نمایاں ہے تاہم اے غفار پاشا انشائیہ نگاروں کی فہرست میں معیار اور مقدار کے لحاظ سے سر فہرست ہیں ان کے انشائیے سو سے متجاوز کر گئے ہیں ان کے انشائیوں میں انشائیے کی تمام شعریات نکتہ آفرینی،اختصار،سادگی، شگفتگی، تازگی، تجربات و

مشاہدات، نئے نئے خیالات، خیال آفرینی، موضوع سے وابستگی اور کفایت لفظی وغیرہ موجود ہیں تاہم بہت جلد آپ نے بڑے انشائیہ نگاروں میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔

۲۰۔ اندر جیت لال:

اندر جیت انشائیہ کی صنف سے اتنے متاثر تھے کہ خود بھی انشائیہ تخلیق کرنا شروع کر دیا ان کا پہلا انشائیہ "مسکراہٹ ہی مسکراہٹ" ہے انہوں نے مضامین کی دو کتب لکھیں جن میں "مسکراہٹ ہی مسکراہٹ" اور "جانور سے انسان تک" شامل ہیں۔ ان کا اسلوب، مزاحیہ، سادہ اور شگفتہ ہے۔ ان کے انشائیے ادب اور تاریخ کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ وہ خشک اور روکھے مضامین اور خیالات کو بہت عمدگی اور نفاست سے پیش کرتے ہیں۔

۲۱۔ جاوید وششٹ:

جاوید وششٹ انشائیہ کا موجد ملا وجہی کو کہتے ہیں اور ان کی کتاب ملا وجہی کے انشائیے جاوید وششٹ نے "انشائیہ پچیسی" ۱۹۸۵ء میں شائع کی۔ ان کے انشائیوں میں شاعرانہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ان کے انشائیوں میں شگفتگی، لطف اندازی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ ان کے مشہور انشائیوں میں "جیم ہے یے زے"، "دھنک"، "روزن در"، "سینگ" اور "کھلونا" وغیرہ شامل ہیں۔

۲۲۔ جوگندر پال:

جوگندر پال ۱۹۴۷ء کے بعد انشائیہ کی طرف راغب ہوئے وہ اپنے خیالات کو سادہ اور آسان لفظوں میں انشائیہ میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا مشہور انشائیہ "نئے لوگ" ہے۔ ان کا انداز انوکھا، دلکش انداز بیان، شائستہ رو، مزاحیہ اور طنزیہ ہے۔ وہ اپنی تحریروں سے معاشرے پر طنز بھی کرتے ہیں اور جدید زمانے پر بڑی شائستگی اور سنجیدگی سے طنز کرتے ہیں۔

۲۳۔ اظہر ادیب:

اظہر ادیب نے رسالہ اوراق میں مسلسل انشائیے لکھے مگر ان کا کوئی انشائی مجموعہ نہیں ہے۔ ان کا پہلا انشائیہ ۱۹۸۴ء میں "خوشامد" کے نام سے شائع ہوا۔ ان کا دوسرا انشائیہ "سوچنا" ان کی فکر انگیزی کا مظہر ہے۔ سوچنا انشائیہ میں تمام ایجادات کی وجہ فکر اور سوچ کو قرار دیتے ہیں اور یہ سب ایجادات انسان کی گہری سوچ کا ہی نتیجہ ہیں تاہم اظہر ادیب انشائیے میں اپنے موضوع سے ہی جڑے رہتے ہیں وہ کہیں کہیں طنز و مزاح سے بھی کام لیتے ہیں

اس طرح وہ قارئین کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں ان کے تجربات ومشاہدات صاف دکھائی دیتے ہیں۔وہ مناسب جملوں میں اپنی بات بیان کرتے ہیں اور طوالت سے پرہیز کرتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں تاریخی لوک حوالے بھی پائے جاتے ہیں جس سے تحریر مزید موثر بن جاتی ہے،بے فکر اور تکلف کی بامعنی لہر کے ساتھ بے تکلف طرز بیان تحریر میں جان ڈال دیتا ہے اور حقیقت نگاری ان کے انشائیوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

۲۴۔شاہد شیدائی:

شاہد شیدائی کے انشایئے اوراق میں شائع ہوئے ان کے مشہور انشائیوں میں "پوسٹ کارڈ"، "پہیہ" اور "اشارے" شامل ہیں۔ان کے موضوعات عام اور معمولی ہیں۔وہ بات سے بات پیدا کرتے ہیں مگر نکتہ آفرینی کو مد نظر بھی رکھتے ہیں وہ روایات، پرانی اور تاریخی چیزوں کو اس کے پس منظر کو مد نظر رکھ کر بیان کرتے ہیں۔

۲۵۔محمد یونس بٹ:

محمد یونس بٹ نے انشائیہ کا آغاز انشائیہ کے اصولوں کو مد نظر رکھ کر کیا تاہم انہیں کافی شہرت ملی ان کے موضوعات سماجی افکار کی ہی نمائندگی کرتے ہیں ان کے انشائیوں میں بے ساختگی پائی جاتی ہے وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنے انشائیوں میں بیان کرتے ہیں تاہم ان کے ہاں ایک بات سے کئی مفاہیم کی تہیں نکلتی نظر آتی ہیں تاہم ان کی ہر بات موضوع سے جڑی ہوتی ہے۔ان کے بعض انشائیوں میں طنز ومزاح کی لہر دوڑتی نظر آتی ہے وہ اکثر جملے کے الٹ پھیر سے مزاح تخلیق کرتے ہیں ان کے اس طرح کے انشائیوں میں "بے کار رہنا" شامل ہے۔تاہم آپ زیادہ تر لفظوں سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ان کے ہاں قہقہہ آمیز کیفیت پائی جاتی ہے۔ان کے اسلوب پر مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خان اور شفیق الرحمن کے اسلوب کی یکساں جھلک دکھائی دیتی ہے ان کے انشائیوں میں انشائیہ کی شعریات بدرجہ اتم موجود ہیں جن میں عدم تکمیل، اختصار، نکتہ آفرینی، شگفتگی اور انکشاف ذات وغیرہ شامل ہیں۔ان کے مشہور انشائیوں میں "ٹیلی ویژن دیکھنا"، "سستی"، "سینما دیکھنا"، "کاغذ اور "یاد" وغیرہ شامل ہیں۔

۲۶۔پروین طارق:

پروین طارق نے انشائیہ کا آغاز رسالہ اوراق سے جمیل آزر کے مشورے سے کیا انہوں نے دو انشائی مجموعے "بولتے سناٹے "۲۰۰۶ء میں "جنگل رُت" ۲۰۰۹ء میں لکھے آپ پہلی صاحب خاتون انشائیہ نگار ہیں۔آپ نے وزیر آغا کے مقرر کردہ مقتضیات کے مطابق انشایئے لکھے وہ اپنی قوت مشاہدہ کو کام میں لاتے ہوئے انشائیہ لکھتی ہیں وہ عام سی چیز سے نئے معنی کشید کرتیں ہیں اور ارد گرد پر نگاہ مرکوز رکھتی ہیں۔وہ انکشاف ذات اور گہرے

مشاہدے کا بھرپور استعمال کرتی ہیں۔ مظاہر فطرت اور متصوفانہ خیالات سے ان کی گہری وابستگی نظر آتی ہے۔ ان کا اسلوب سادہ اور ثقالت سے عاری ہے۔ شگفتگی اور دلکشی ان کے اسلوب کا حصہ ہے۔ ان کے انشائیوں میں گہرا مشاہدہ، ذاتی تجربات اور گہری فکر نظر آتی ہے۔

۲۷۔ خیر الدین انصاری:

خیر الدین انصاری دبستان سرگودھا سے تعلق رکھتے ہیں ان کے انشائیوں کا مجموعہ "آڑھی ترچھی لکیریں" ۱۹۹۸ء میں چھپا اس میں کل بارہ انشائیے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں انکشاف ذات اور نکتہ آفرینی بخوبی موجود ہے آپ فطرت سے قربت رکھتے ہیں۔ معمولی سی چیز سے کیسے کیسے مفاہیم نکال لیتے ہیں اور معنی خیز بنا دیتے ہیں وہ معاشرتی پہلوؤں اور معاشرے کے ناسوروں کو بڑی چابکدستی سے اپنے انشائیے "بیماری" میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں طنز و مزاح کے دھارے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں ان کے ہاں تکبر اور انانیت کی بجائے منکر المزاجی اور انکساری پائی جاتی ہے ان کے ہاں مختلف خیالات موجود ہونے کے باوجود نکتہ آفرینی پائی جاتی ہے۔ وہ مختصر الفاظ میں تحریر کا نچوڑ بھی بیان کرتے ہیں۔ عدم تکمیل کی خوبی ان کے ہاں دیکھنے کو نہیں ملتی تاہم وہ لفظوں کی طوطا مینا اڑانے کی بجائے رنگارنگی پر یقین رکھتے ہیں۔

۲۸۔ انجم انصار:

انجم انصار نے انشائیے بہت بعد میں لکھنا شروع کیا تاہم وہ سینئر انشائیہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہیں۔ انہوں نے "منگنی کی انگوٹھی" جیسا بلند پایہ انشائیہ لکھا انجم انصار نسوانی احساسات و کیفیات پر پوری گرفت رکھتے ہیں ان کے انشائیوں میں خواتین کے ذاتی مسائل قلمبند کیے گئے ہیں نیز ان کے انشائیوں میں شادی و بیاہ کے موقعے پر نسوانی نفسیات اور جذبات و احساسات کی کیفیات کو لفظوں کی صورت میں ڈھالا گیا ہے۔ ان کے ہاں خیالات کا تسلسل، داخلی کیفیات کو بیان کرنے کا ہنر موجود ہے۔ ان کا اسلوب رواں دواں ہے۔ جملوں میں ربط اور گہری معنویت پائی جاتی ہے مگر انہوں نے تھوڑے عرصے کے لیے انشائیے کے میدان میں قدم جمائے اگر وہ زیادہ عرصہ کے لیے انشائیہ لکھتیں تو مرد انشائیہ نگاروں کے برابر آجاتیں۔ ان کا کام کم ضرور ہے مگر معیار بہت اعلیٰ ہے انجم انصار نئی دنیا کی متلاشی ہیں ان کے انشائیے قاری کی سوچ کو جھکڑ کر مصنف کے ہم رکاب بنا دیتے ہیں۔

۲۹۔ تقی حسین خسرو:

تقی حسین خسرو اوراق کے علاوہ دیگر رسائل میں بھی انشائیے لکھتے رہے ہیں ان کا اسلوب سیدھا سادا ہے آپ موضوع کسی عام اور سامنے موجود چیز کو بناتے ہیں ان کے انشائیوں میں ایجاز و اختصار اور نکتہ آفرینی کی صفت

موجود ہے۔ تقی حسین خسرو نے اوراق میں دو انشایئے ”اینٹی میٹر“ اور ”دروازہ“ لکھے۔ تقی حسین خسرو تہذیب، تاریخ،نفسیات اور شعور کو ملا کر انشائیہ لکھتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ اپنے تجربات و مشاہدات سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔

۳۰۔ارشد میر:

ارشد میر نے اوراق میں اپنا پہلا انشائیہ ”کڑھنا“ ۱۹۸۳ء میں لکھا آغاز میں آپ طنز و مزاح کی طرف مائل تھے مگر بعد میں شگفتگی و تازگی آپ کے انشائیوں میں نظر آنے لگی انہوں نے خیالات میں سے اپنے موضوع کو منتخب کیااور اس میں اپنے احساسات و جذبات کو شامل کر کے اس کا تعلق خارجی ادراک سے جوڑ دیا جو کہ ان کی ایک قسم کی فنی خوبی ہے۔ان کا مطالعہ وسیع، قوت مشاہدہ باریک بین اور کامل تجربہ ہے۔اسی وجہ سے ان کا اسلوب جاندار اور رواں دواں ہے۔ آپ بات سے بات نکالتے ہیں اور نکتہ آفرینی سے اشیاء میں جان ڈال دیتے ہیں۔ارشد میر کے زیادہ انشایئے تر معاشرے سے اخذ کیے ہوئے ہیں۔وہ چھوٹی سے چھوٹی چیز پر بھی قلم اٹھاتے ہیں۔وہ احساسات وکیفیات کو اپنے موضوع کا حصہ بناتے ہیں۔

۳۱۔جاوید حیدر جوئیہ:

جاوید حیدر جوئیہ چھوٹے چھوٹے واقعات سناتے ہوئے انشائیہ اخذ کر لیتے ہیں اور انشائیہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔وہ قاری کو دوست تسلیم کرتے ہوئے ساری باتیں بتاتے ہیں اور مشورہ بھی فراہم کرتے ہیں ان کا مشہور انشائیہ ”جبر واختیار“ ہے۔

۳۲۔راحت بھٹی:

راحت بھٹی نے اسی کی دہائی میں تین انشایئے لکھے جن میں ”سفید بال“،”آنسو“ اور ”سر کھجانا“ شامل ہیں۔ان کے ہاں انشائیوں کے لفظوں میں خیال انگیز نکتے منظر عام پر آتے ہیں ان کے ہاں آزادہ روی پائی جاتی ہے۔ان کے انشائیوں میں نکتہ آفرینی، شگفتگی،اختصار اور کشادگی پائی جاتی ہے۔

۳۳۔محمد اقبال انجم:

محمد اقبال انجم نے اپنے انشائیوں کا مجموعہ ۱۹۸۸ء میں ”خوشبو کے قافلے“ کے نام سے شائع کیا اور ان کے انشایئے اوراق میں شائع ہوتے رہے مگر اب ان کا مجموعہ آسانی سے دستیاب نہیں ہے۔ان کا نمائندہ انشائیہ ”خانہ بدوش“ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ انسان جھونپڑی میں بھی گزر بسر کر سکتا ہے مگر جب وقت کے ساتھ ساتھ انسان

کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہوتی ہے تو وہ محل بنانے اور گاڑیاں لینے کی ترغیب کرتا ہے۔ انشائیہ میں انگڑائی سے لے کر جنگ آزادی کے آخری انگڑائی تک بات کرتے نظر آتے ہیں۔

۳۴۔ قمر اقبال:

قمر اقبال نہ بہت سینئیر انشائیہ نگار ہیں اور نہ ہی اتنے جونئیر بلکہ ان کا تعلق درمیانے درجے کے انشائیہ نگاروں میں سے ہے ان کے انشائیے زیادہ تر خارجی مظاہر اور کیفیات سے متعلق ہیں ان کے انشائیوں میں ”رونا“، ”پنڈی“ اور ”خوف کھانا“ وغیرہ شامل ہیں۔ انشائیہ رونا کا آغاز انسان کے دنیا میں آنے سے لے کر انسان کے دنیا سے جانے تک ہے گویا رونا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ تاہم وہ رونے کی بات کو مزاح کی مٹھاس میں ڈال کر جاندار بنا دیتے ہیں۔ قمر اقبال انشائیہ پنڈی میں بیان کرتے ہیں کہ مچھلی جیسے پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اسطرح مصنف بھی پنڈی کے بغیر نہیں رہ سکتے اور وہ اداس ہیں۔ انشائیہ خوف کھانا میں خوف جیسی کیفییت کو زیر بحث لایا گیا ہے کہ خوف کھانا بظاہر نظر آنے سے قاصر ہے مگر خوف اور انسان کی دوستی آغاز ہی سے ہے مصنف کہتا ہے کہ مجھے خوف کی عادت ہے مگر یہ عادت میری ہر معاملے میں راہنمائی کرتی ہے تاہم ان کے انشائیے مجموعی طور پر سنجیدگی سے بوجھل نظر آتے ہیں۔ نکتہ آفرینی اور بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر ان کے ہاں موجود ہے۔

۳۵۔ عامر عبد اللہ:

عامر عبد اللہ کے انشائیے زیادہ تر اوراق، کاغذی پیرہن، صریر اور نقاط جیسے شماروں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ وہ ہر سال انشائیوں کا سالانہ جائزہ لیتے رہے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ”تنور“، ”تیز رفتاری“، ”کی رنگ“، ”بچپن“، ”بدن کی حمایت میں“، ”سورج“ اور ”سوال“ وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے زیادہ تر انشائیوں کے موضوعات ارد گرد معاشرے سے اخذ کیے ہوئے ہیں۔ ان کا پہلا انشائیہ تنور میں ذاتی تجربات و مشاہدات کو بیان کیا گیا ہے۔ انشائیے سورج اور سوال میں ان کی سوچ، فکر اور اسلوب کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے انشائیوں میں نکتہ آفرینی، شگفتگی، انکشاف ذات اور غیر رسمی انداز شامل ہے مگر فکر کا پہلو ان پر غالب آتا ہوا نظر آتا ہے۔

۳۶۔ رعنا تقی:

رعنا تقی ایسی انشائیہ نگار ہیں جنہوں نے بہت کم انشائیے لکھے ان کے انشائیے تعداد میں بہت کم ہیں ان کے نمائندہ انشائیوں میں ”ڈولی“ اور ”ماسک“ شامل ہیں، ان کے انشائیے معاشرے سے اخذ کیے ہوئے ہیں۔ وہ معاشرتی مجبوریوں کو بیان کرتے ہوئے سچی اور کھری بات کرتی ہیں۔ ان کے ہاں سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ ان کے انشائیوں میں سنجیدگی کی لہر، انکشاف ذات اور اختصار کی خوبی پائی جاتی ہے۔

۳۷۔ سعشہ خان:

سعشہ خان اوراق سے ابھرنے والی انشائیہ نگار ہیں ان کے نمائندہ انشائیے "لہریں"، "زینہ" اور "سوال" وغیرہ ہیں۔ ان کے انشائیوں میں تہہ داری، بات سے بات پیدا کرنا، مشاہدات و تجربات، گہری سوچ، سنجیدگی و متانت، مزاح، ایجاز و اختصار، معاشرتی و نفسیاتی پہلو اور اسلوب کی جاذبیت موجود ہے۔

۳۸۔ عطیہ خان:

عطیہ خان اپنے انشائیوں میں وسعت نظر رکھتی ہیں وہ خواتین کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہیں اور اس امر کے لیے گہرا ولولہ بھی رکھتی ہیں ان کا مشہور انشائیہ "عمر دراز" ہے۔

۳۹۔ انجم نیازی:

انجم نیازی مشہور انشائیہ نگار ہیں ان کے انشائیوں میں گہری اور معانی خیز باتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ وہ انشائیہ دلکش انداز میں لکھتے ہیں کہ قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالیتے ہیں ان کا نمائندہ انشائیہ "صفر" ہے۔

۴۰۔ ایس ایم معین قریشی:

ایس ایم معین قریشی کراچی سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے انشائیوں کی صفات تازگی ، اختصار، شگفتگی، مناسب اور چست الفاظ کا انتخاب وغیرہ شامل ہے طنز و مزاح ان کے انشائیوں میں پایا جاتا ہے۔ ان کا مشہور انشائیہ "کتے دو ہی اچھے" ہے۔

۴۱۔ مشتاق احمد:

مشتاق احمد کے انشائیے اپنے اندر بھرپور کشش رکھتے ہیں اور قاری کو تخیل کی دنیا کی سیر بھی کرواتے ہیں ان کا نمائندہ انشائیہ "حسرت دید" ہے۔

۴۲۔ منیزہ جمال:

منیزہ جمال خوش تحریر انشائیہ نگاروں کی کھیپ میں شامل ہیں اور اکثر ان کے انشائیے مختلف رسائل اور انٹر نیٹ پر پڑھنے کو ملتے ہیں ان کا مشہور انشائیہ "پان کا پتہ" ہے۔

۴۳۔ خادم حسین مجاہد:

خادم حسین مجاہد پاکستان کے انشائیہ نگاروں میں شامل ہیں اور ان کے انشائیے اکثر مختلف رسالوں کی زینت بنے ہوتے ہیں۔

۴۴۔اظہر حسن صدیقی:

اظہر حسن صدیقی کے انشایئے انور سدید کے انشائیوں کا ہی روپ دکھائی دیتے ہیں اور وہ معاشرے کی برائیوں پر طنز بھی کرتے ہیں۔ شگفتگی اور تازگی ان کے انشائیوں کی نمایاں صفات ہیں۔

۴۵۔قاضی اعجاز محور:

قاضی اعجاز محور اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنے انشائیوں میں پیش کرتے ہیں۔وہ معمولی موضوع کا انتخاب کر کے قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالیتے ہیں۔انسانی نفسیات اور داخلی کیفیات پر پورا عبور رکھتے ہیں ان کا مشہور انشائیہ "تبدیلی" ہے۔

۴۶۔افتخار قیصر:

افتخار قیصر کی شہرت ان کے انشائیہ "لحاف" کی وجہ سے ہوئی۔افتخار قیصر لحاف کو نادر انداز میں پیش کرتے ہیں اس انشایئے میں مصنف ندرت خیال کے ساتھ ساتھ رومانوی انداز سے احاطہ تحریر کرتے ہیں۔

۴۷۔طارق جامی:

طارق جامی کے انشایئے رسالہ اوراق اور امروز میں باقاعدہ شائع ہوئی مگر انہوں نے انشائیوں کی کوئی کتاب نہیں لکھی ان کا انداز شگفتہ ہے جو کہ تلازمات کی صورت میں ایک مزاح کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔وہ معاشرتی رویوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں مشاہدات اور تجربات کی آمیزش دیکھنے کو ملتی ہے وہ بات سے بات پیدا کرتے ہیں اور علم و عرفان کی روشنی سے ہماری توجہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی طرف مبذول کرواتے ہیں۔ان کے ہاں افسانوی طرز کے ساتھ ساتھ شعریت کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے۔ان کے مشہور انشائیوں میں "پڑ چھتی"، "خانہ آبادی" اور "لکھنا" شامل ہیں۔

۴۸۔خالد پرویز صدیقی:

خالد پرویز صدیقی کا نمائندہ انشائیہ "دائرہ" ہے۔یہ انشائیہ دفتر کی رجسٹر حاضری سے نمایاں ہوتا ہے اور پھر ہر زاویے سے ایک نیا خیال ابھرتا چلا جاتا ہے گویا خالد پرویز اس حقیقت سے قاری کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہر چیز حتٰی کہ زمین و آسمان اور انسان دائرہ کے حصار میں قیود ہے اور یہ قید منفی کی بجائے مثبت ہے اور اس سے زندگی کے ارتقاء کا سوتا پھوٹتا ہے مصنف کا ایک اور انشائیہ "بریف کیس" مشہور ہے اور اس انشایئے میں مصنف بریف کیس کو انسانی زندگی سے مشروط کرتے ہیں۔

۴۹۔کے۔ایم اشرف:

کے۔ایم اشرف کے نمائندہ انشائیوں میں "مسکراہٹ" اور "تتلی تعاقب میں" شامل ہیں وہ اپنے انشائیوں میں اپنی زندگی کے تجربے کو بیان کرتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں گہری معنویت، شگفتگی اور انکشاف ذات کی خوبیاں نمایاں ہیں۔

۵۰۔عاصی کرنالی:

عاصی کرنالی نے زندگی سے ہلکے پھلکے موضوعات کو منتخب کیا ہے ان کے نمائندہ انشائیوں میں "اقبال کی برکتیں"، "ہم کہ ٹھہرے پابند وقت"، "برج اسد بمقابلہ برج جدی"، "ہم بے چارے مہمان"، "بارے آلو کا کچھ بیان ہو جائے" اور "لائبریری سے کتاب اڑانا" وغیرہ شامل ہیں۔وہ موضوع کے باطن میں اتر کر آزادہ روی سے مسرتوں کے سوتے کو جگاتے ہیں۔

۵۱۔جاوید انور:

جاوید انور کا نمائندہ انشائیہ "سائن بورڈ" ہے ان کا انداز منفرد ہے ان کی شخصیت منکسر المزاج ہے اور وہ دنیا پر حیرت کی نگاہ ڈالتے ہیں۔جس سے عرفان و آگہی کی ایک دنیا منکشف ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

۵۲۔زہرہ جبیں:

زہرہ جبیں کے نمائندہ انشائیوں میں "لکھنا عرضی کا" اور "پامسٹری" شامل ہیں۔ان کے دو ہی انشائیے ہیں۔ان کے انشائیوں میں انشائی خوبیاں نمایاں نظر آتی ہیں۔زہرہ جبیں انشائیے لکھنے میں کامیاب نہ ہوئیں اس وجہ سے انہوں نے ان انشائیوں کے بعد انشائیہ لکھنے کی کاوش نہ کی۔

۵۳۔راجہ ریاض الدین:

راجہ ریاض الدین کا نمایاں انشائیہ "پانچواں موسم" ہے۔ان کے ہاں انشائیہ فہمی کا رحجان نمایاں ہے اور راجہ ریاض الدین ایک گمنام انشائیہ نگار ہیں اور ان کا ذکر اکبر حمیدی کے ہاں ملتا ہے۔

۵۴۔رب نواز مائل:

رب نواز مائل کا پہلا انشائیہ رسالہ "اوراق" میں ۱۹۷۲ء میں "ٹانگیں" کے نام سے چھپا۔رب نواز مائل موضوع کی نئی جہتوں اور پوشیدہ اسرار کو نہایت عمدہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔

۵۵۔ محمود شام:

محمود شام دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کی پیروی کرنے والوں میں سے ہیں۔ ان کا پہلا انشائیہ رسالہ ''ادبی دنیا'' میں ''بے ہمتی'' کے نام سے چھپا آپ بے ہمتی کو ہمت کے مقابلے میں زیادہ پسند کرتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں ہندی الفاظ کا بے دریغ استعمال بھی کرتے ہیں وہ اپنے انشائیوں میں انسان کی فطرت اور نفسیات اپنے تجربات کی روشنی میں بیان کرتے ہیں۔

۵۶۔ کامل قادری:

کامل قادری کے مشہور انشائیوں میں فٹ نوٹ، سریش کا درخت، ہارڈ بیڈ آور الگنی وغیرہ شامل ہیں۔ کامل قادری کے موضوعات میں تاریخ اور پرانی تہذیب شامل ہیں۔ وہ ہر پہلو کو گھما کر تہذیب و تاریخ کے موضوع پر بات کرتے ہیں ان کا انداز شگفتہ اور بے ساختہ ہے۔ ان کے انشائیوں میں انشائی خوبیاں بخوبی موجود ہیں نیز اختصار ان کی نمایاں خوبی ہے۔

۵۷۔ مختار پارس:

مختار پارس نے اپنا پہلا انشائی مجموعہ ''مختار نامہ'' کے نام سے ۲۰۰۰ء میں شائع کیا ان کے موضوعات بہت منفرد ہیں۔ ان کے نمایاں انشائیوں میں ''دروازہ''، ''سقراط کی عدالت میں''، ''شوق شکست''، ''مرتا ہوں خامشی پر''، ''شباب کی باتیں''، ''انسانیاں اور حیوانیاں''، ''وچ بغل کتاباں چائی ہو'' اور ''نہیں'' وغیرہ شامل ہیں۔ وہ اپنے بعض گھسے پٹے موضوع کو منتخب کر کے نئے اور منفرد انداز سے بیان کرتے ہیں۔

۵۸۔ میاں مقبول احمد:

میاں مقبول احمد کا پہلا انشائیوں کا مجموعہ ''باتوں باتوں میں ''۱۹۸۹ء میں منظر عام پر آیا ان کے نمائندہ انشائیوں میں ''انٹرویو''، ''کیسے چلتی ہے''، ''پیسا''، ''ضرورت''، ''کرسی''، ''مختصرات'' اور ''باتوں باتوں میں'' وغیرہ شامل ہیں۔ انہوں نے اپنے انشائیوں میں جسم کے اعضاء کو موضوع بنایا ہے آپ موضوع کی مختلف جہات پر بات کرتے ہیں آپ نہایت سادہ اور سلیس انداز میں انشائیہ لکھتے ہیں۔

و۔ دبستان لاہور کے انشائیہ نگار اور ان کے انشائیوں کا مختصر تعارف:

ا۔ مشکور حسین یاد:

مشکور حسین یاد کے انشائیوں کے تین مجموعے ہیں جن میں ''جوہر اندیشہ''، ''بات کی اونچی ذات'' اور ''وقت کا استعارہ'' شامل ہیں۔ ان کے انشائیوں میں طنز و مزاح کے ساتھ کلبیت و قنوطیت کے زاویے بھی دیکھے جا

سکتے ہیں وہ معاشرے کے تلخ حقائق سے خوفزدہ ہیں مگر وہ اشیاء سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو بھی انشائیوں کا حصہ بناتے ہیں وہ بے معنی کیفیات کو بہت عمدہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔ ان کے ہاں انکشاف ذات سے زیادہ خارج کے پہلو کو عمدہ انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کے انشائیوں میں دو انداز ملے جلے دکھائی دیتے ہیں پہلا انداز فلسفیانہ اور دوسرا مفکرانہ ہے جس پر طنز و مزاح کا رجحان غالب آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ انشائیہ لکھنے کے ساتھ ساتھ انشائیہ پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں مغربی ایسے کی مکمل خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ تازگی، شگفتگی، بے ساختگی اور روانی ان کی نمایاں صفات ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ذاتی زندگی کی جھلک بھی کہیں کہیں دیکھنے کو ملتی ہے اور بعض جگہوں پر آپ ناصح کے روپ میں بھی نظر آتے ہیں۔ وقت کی اہمیت بھی ان کے انشائیوں میں موجود ہے تاہم ان کے انشائیوں سے ہمیں مذہبی، روحانی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی معلومات بھی ملتی ہیں۔

۲۔ نظیر صدیقی:

نظیر صدیقی نے ۱۹۶۱ء میں اپنے انشائیوں کا مجموعہ "شہرت کی خاطر" شائع کیا ان کے انشائیوں میں طنز کے ساتھ مزاح بھی دکھائی دیتا ہے اور انشائیوں کی خوبیاں بھی بخوبی موجود ہیں وہ اپنے مزاح سے زہر سے بھرے طنز کے نشتر کو کم کرنے کا کام لیتے ہیں۔ وہ کڑوی سے کڑوی بات کو مزاح کے میٹھے سے لہجے سے بیان کرتے ہیں۔ وہ معاشرے کی اچھائیوں اور برائیوں پر نظر رکھتے ہیں اور لوگوں اور معاشرے کے ذاتی، معاشرتی، اجتماعی اور خارجی مسائل کو اپنے انشائیوں کا حصہ بناتے ہیں۔ انشائیہ "جہاں میں رہتا ہوں" میں مصنف ملک کے معاشی و اقتصادی حالات کو طنز و مزاح کے انداز میں بیان کرتے ہیں وہ معاشرے میں پنپنے والی برائیوں جیسے بددیانتی، بے روزگاری، سرکاری ملازمین کی بے راہ روی اور معاشرے میں بڑھتے ہوئے جرائم کو طنز و مزاح کے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے بعض انشائیے افسانوی انداز لیے ہوئے ہیں۔ ایسے انشائیوں میں "آزادی اور شرافت" شامل ہے ان کے انشائیوں میں کلبیت اور قنوطیت بھی موجود ہے جو کہ خوبی سے زیادہ خامی گردانی جاتی ہے۔

۳۔ جسٹس رستم کیانی:

جسٹس رستم کیانی نے "افکار پریشان" بیکن کے ایسز سے متاثر ہو کر لکھی۔ ان کی تقریروں میں خیال کی رو آزادی سے سفر کرتی نظر آتی ہے اور یہ خیال کسی ایک سمت سفر کرنے کی بجائے، ہر گام ہنسی کی پھلجڑیاں بکھیرتے چلے جاتے ہیں جسٹس کیانی کی تحریریں اس وقت منظر عام پر آئیں جب مارشل لاء کی سنجیدگی اور عمل کی سنگلاخیت

معاشرے میں ہر طرف پھیل گئیں انسان جو معاشرے سے مایوس اور اپنی ذات سے بے دخل ہو چکا تھا وہ ان کی تحریروں کو پڑھ کر کھل کھلا کر ہنسنے لگا تاہم انہوں نے زندگی کی ناہمواریوں کو اپنی تحریروں میں نمایاں کیا ہے۔انہوں نے اپنی تحریروں میں شوخ نگاری کو بے ادبی اور ادب میں بے ادبی کو گستاخیاں قرار دیا ہے۔آپ نے صیغہ واحد متکلم کا بھرپور استعمال کیا ہے اور اس سے گہرا تاثر جھلکتا ہے۔تاہم آپ نے مظاہر اور اشیاء پر بالکل بھی قلم نہیں اٹھایا اس وجہ سے ان کی تحریروں میں حقیقت کا مقامی رنگ ابھرتا ہے گویا آپ ایک بالا بین کی صورت میں سامنے آتے ہیں اور یہ انشائیہ نگاروں کے لیے قابل قبول بات نہیں ہے۔

۴۔احمد جمال پاشا:

احمد جمال پاشا کی تحریروں میں طنز ومزاح بخوبی موجود ہے ان کے انشائیوں کی نمایاں صفات لطافت، شگفتگی، تازگی اور روانی ہیں۔ان کے نمائندہ انشائیوں میں "ہجرت"، "شور"، "بے ترتیبی"، "ناپسندیدہ لوگ"، "نیاپیسہ" وغیرہ شامل ہیں۔انہوں نے اپنے انشائیوں میں مزاح کی شوخ کرن کو نمایاں کیا ہے لیکن اس سے موضوع کی داخلی کیفیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ یہ ان کی تحریروں میں تازہ کاری کو ابھارتی ہے وہ اپنے انشائیوں میں ظاہر اور باطن دونوں پر غور وفکر کرتے ہیں۔ان کے انشائیے "بلیوں کے سلسلے"، "شور"، "ہجرت" اور "بے ترتیبی" میں فن پر گرفت نظر آتی ہے بلکہ آپ حقیقت کا نیا مدار بھی تخلیق کرتے ہیں ان کے انشائیوں میں مزاح کی شوخ کرن زیر سطح پر رہتی ہے۔ان کے انشائیوں میں تازگی، شگفتگی اور موضوع کی ندرت جیسی خوبیاں موجود ہیں۔وہ موضوع کے مرکزی نکتے کے ساتھ ساتھ ارد گرد آوارہ گردی بھی کرتے نظر آتے ہیں۔تاہم آپ طنز ومزاح سے انشائیہ کی طرف براجمان ہوئے اور تھوڑے وقت میں قابل فخر شہرت حاصل کی۔

۵۔رام لعل نابھوی:

رام لعل نابھوی اپنے دوستوں کو تنہائی اور خلوت میں داخل ہونے کا موقع دیتے ہیں تو قہقہوں کے ساتھ ساتھ تبادلہ خیال بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ان کے نمائندہ انشائیوں میں "پوسٹ کارڈ"، "انتظار"، "مسکرانا" اور "حیرت" وغیرہ شامل ہیں۔وہ حقیقت کا معروضی پہلو بھی سامنے لاتے ہیں اور تازہ کاری کی خوبی سے انشائیہ میں موضوعی پہلو کو بھی ابھارتے ہیں، ان کے انشائیوں میں خیال کا غنائیہ پایا جاتا ہے اور یہ غنائیہ چھوٹے چھوٹے جملوں سے ترتیب دیا گیا ہے۔انہوں نے اپنے انشائیوں میں مخفی گوشوں تک رسائی کی ہے تاہم ان کا ہر قدم انشائیہ کی سر بلندی کی طرف گامزن ہے۔

۶۔صلاح الدین حیدر:

صلاح الدین حیدر کا تعلق ملتان سے ہے۔صلاح الدین حیدر ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیہ نگاری سے اختلاف رکھنے کی وجہ سے ”اوراق “میں اپنے انشائیے چھپوانے سے گریز کرتے تھے اور اپنے انشائیے ماہنامہ ” فنون لاہور“،ماہنامہ ”افکار کراچی “وغیرہ میں چھپواتے۔اوراق کے انشائیہ نگار انہیں انشائیہ نگار ماننے سے انکار کرتے ہیں اور ان کی تحریروں کو طنز و مزاح کی حامل تحریریں گردانتے ہیں۔ان کے دو انشائیوں کے مجموعے”حماقتیں میرے مقدر کی “اور”ڈر اور ڈراما“ہیں۔اگر ان کے انشائیوں کا جائزہ لیا جائے تو ان کے انشائیوں میں طنز کی کاٹ اور مزح نگاری وافر مقدار میں پائی جاتی ہے۔وہ اپنے انشائیوں میں فقرہ بازی سے کام لیتے ہیں۔صلاح الدین حیدر اپنی بات کو بیان کرنے کے لیے زیادہ تر ادیبوں کی زندگی،ان کی عادات،باتیں اور ان کی تحریروں کی مثال دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔اگر چہ صلاح الدین حیدر کی ابتدائی تحریریں کڑواہٹ اور تلخی سے بھرپور ہیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں میں توازن اور انکشاف ذات کی صفات نمایاں ہونے لگیں۔ان کی پختہ عمری کی تحریروں میں شگفتگی اور بے ساختہ پن ابھر کر سامنے آتا ہے۔وہ سنجیدگی میں مزاح اور مزاح میں سنجیدہ صورتحال پیدا کرتے نظر آتے ہیں تاہم صلاح الدین حیدر بات سے بات نکالنے میں ماہر ہیں۔ان کے ہاں معانی کی دلچسپ سطحیں نمایاں ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ان کے اکثر انشائیے رشید احمد صدیقی کی پیروی کرتے ہیں ان کے انشائیوں میں روایت سے جڑے رہنے کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔

صلاح الدین حیدر کے انشائیوں کا اگر دبستان سرگودھا کے انشائیوں کے ساتھ تقابل کیا جائے تو ان کے انشائیوں میں انکشاف ذات کی صفت پائی جاتی ہے اس کے علاوہ شگفتگی اور مزاح ان کی تحریروں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔وہ کسی ایک نقطے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کی پرکار ایک دائرے سے مختلف دائرے کھینچتی نظر آتی ہے۔ایجاز و اختصار ان کے انشائیوں کی نمایاں صفت ہے اور ان کے انشائیے تجربے اور مشاہدے کے علم سے مالا مال دکھائی دیتے ہیں۔

۷۔ڈاکٹر شہزاد قیصر:

ڈاکٹر شہزاد قیصر اپنے طنزیہ انداز سے معاشرے کی منافقت،ہٹ دھرمی،کھوکھلے پن اور دوہرے معیار کو نشانہ بناتے ہیں۔وہ اپنے انشائیوں سے معاشرے اور لوگوں کو ان کے اصل چہرے سے آگاہ کرتے ہیں اور ان کا انشائیہ بعض جگہوں پر طنز و مزاح میں اپنی حدود سے آگے بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے وہاں وہ مبلغ اور خطیب کا روپ

دھارتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ ان کے انشائیوں کے تین مجموعے ہیں ”کلیرنس سیل“، ”صاف چھپتے بھی نہیں“، اور ”آئینہ بنے ہے پیر ہن“ اور ان تینوں انشائیوں کا ایک مجموعہ بھی ”لطف آگہی“ کے نام سے شائع ہوا جس میں چار نئے انشائیے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ان کے انشائیوں کے متنوع پہلو ہیں جس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انشائیہ کا اصل مقصد کیا ہے وہ اپنے انشائیوں کے ذریعے معاشرے کی برائیوں کو مٹانا چاہتے ہیں معاشرے کے فاسد مواد کا قلع قمع کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں وہ معاشرے اور خود پر تنقید کرتے ہوئے ہنستے ہیں وہاں ان کے انشائیوں میں مزاح کی چاشنی دیکھنے کو ملتی ہے۔ بعض جگہوں پر مزاح لطیفہ گوئی کی حد کو چھوتا نظر آتا ہے ان کے انشائیوں میں نکتہ آفرینی کی صفت بھی موجود ہے ان کے انشائیوں میں جہاں لطیف پیرایہ پایا جاتا ہے وہاں انشائیہ سرگودھا دبستان کی شعریات کے معیار پر اترتا دکھائی دیتا ہے۔

۸۔ مجتبیٰ حسین:

مجتبیٰ حسین طنز و مزاح سے انشائیہ نگاری کی طرف آئے ان کا نمائندہ انشائیہ ”چینی ایش ٹرے کی یاد میں“ ہے اور ااس انشائیے میں مصنف ہموار سطح کو قابل غور رکھتا ہے۔ انہوں نے موضوع میں سے مخفی مفاہیم کو اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے موضوع کو بے جان رکھنے کی بجائے کئی نادر اور مخفی گوشے نمایاں کئے ہیں تاہم آپ انشائیہ کی طرف اتفاق سے ہی آئے ہیں تاہم آپ کے انشائیوں میں طنز و مزاح کی لہر بھرپور انداز میں موجود ہے۔

۹۔ ڈاکٹر محمد سلیم ملک:

ڈاکٹر محمد سلیم ملک نے اپنے انشائیوں کا مجموعہ ”باتیں ہماری یاد ہیں“ ۲۰۰۳ء میں لکھا اور اس میں بائیس انشائیے ہیں۔ انہوں نے اپنے معاصرین سے الگ راستہ بنانے کی کاوش کی ہے۔ انہوں نے اپنے لیے الگ اسلوب وضع کیا انہوں نے عربی و فارسی ادبیات کا بھی مطالعہ کیا ہے اس وجہ سے وہ مفرس و معرب زبان سے بھی خوب استفادہ کرتے ہیں وہ تشبیہات و استعارات کو بھی بخوبی برتتے ہیں۔ مقفیٰ و مسجع فقروں کا استعمال کرتے ہیں شاعری سے اپنا اسلوب آراستہ کرتے ہیں۔ وہ انسانی رویوں، احساسات اور ذہنی کیفیات کو زیر بحث لاتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں طنز و مزاح، لطیفہ گوئی اور فکر و فلسفہ موجود نہیں ہے بلکہ مہذب طرز کی خیال انگیزی ان کے ہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے انشائیوں میں خیال کی آزاد ترنگ، شگفتگی اور دلچسپی موجود ہے۔

۱۰۔ سلیمان بٹ:

سلیمان بٹ کے انشائیوں کا غالب رجحان مزاح نگاری ہے۔ انہوں نے انشائیوں کے لیے منفرد اسلوب مقرر کیا جو کہ ان کے انشائیوں ”ایش ٹرے“ اور ”جمعہ“ میں موجود ہے لیکن ان کی بے وقت موت نے ان سے یہ

اسلوب چھین لیا وہ اپنے انشائیوں میں انشائی دائرے میں رکھنے کے ساتھ ساتھ شوخی اور رنگینی سے بھی چار چاند لگاتے ہیں۔ آپ نے جمعہ جیسا انشائیہ لکھا ان کے انشائیوں میں حظ انگیزی اور نقطہ آفرینی پائی جاتی ہے۔ ان کا نام اردو کے چند اہم انشائیہ نگاروں میں شامل ہے۔ انشائیہ "جمعہ" میں وہ جمعہ کے دن ہونے والی چھٹی کی اہمیت بیان کرتے ہیں اور انسان کی نفسیاتی و ذہنی کیفیت کو بیان کرتے ہیں کہ کس طرح جمعہ کی چھٹی کا انتظار کیا جاتا ہے اور انسان آرام و سکون کے لیے کتنا پیاسا ہوتا ہے۔

۱۱۔ حسرت کاسنگجوی:

حسرت کاسنگجوی کے انشائیوں کا مجموعہ "شگوفہ" کے نام سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ وہ زندگی سے حاصل کردہ تجربات و مشاہدات، جذبات و احساسات اور ذہنی کیفیات سے مستفید ہو کر انشائیہ لکھتے ہیں۔ ان کے شگوفے کے مجموعے میں بعض تحریریں طنز و تشنیع اور اصلاحی مقصد سے لبریز نظر آتی ہیں اور ان کے ہاں لطیفہ گوئی کا عنصر بھی موجود ہے جو کہ قہقہہ اور خوشی کا سبب بنتا ہے۔

۱۲۔ شکیلہ رفیق:

شکیلہ رفیق رسالہ "فنون" میں اپنے انشائیے شائع کرواتیں رہیں وہ دبستان سرگودھا سے متفق نہ ہونے کے باوجود زیریں سطح پر "اوراق" سکول کی کچھ شعریات کو اپناتی ہیں ان کا نمائندہ انشائیہ "تیرے وعدے پر جیئے" ہم شامل ہے۔ اس انشائیہ کا موضوع ایسے لوگ ہیں جو غلط انگریزی میں گفتگو کرتے ہیں اور اپنے آپ کو سمجھتے ہیں کہ انگریزی بول کر انہوں نے اپنا معیار بلند کر لیا ہے بلکہ انسان کا بلند معیار انگریزی بولنے سے نہیں بلکہ انسان کی سوچ میں تبدیلی سے ہوتا ہے۔ ان کے انشائیوں میں طنز و مزاح بھرپور پایا جاتا ہے۔ ان کے ہاں بات سے بات نکالنے کا فن پورے عروج پر ہے۔ ان کے ہاں موضوع اور اسلوب کی انفرادیت پائی جاتی ہے۔ ان کے انشائیوں میں طوالت نہیں پائی جاتی ان کے انشائیوں میں کچھ چیزوں کی کمی بھی نظر آتی ہے جیسے علامت، تشبیہ و استعارے کا استعمال سے گریز، سطحیت کی کمی، سپاٹ پن، مکالماتی انداز وغیرہ شامل ہیں تاہم مجموعی طور پر شکیلہ ایک کامیاب انشائیہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہیں۔

۱۳۔ محمد بصیر رضا:

محمد بصیر رضا سنجیدگی اور شگفتگی کے امتزاج کی وجہ سے مشہور ہیں وہ قاری تک اپنے جذبات تحریروں تک پہنچاتے ہیں۔ ان کا مشہور انشائیہ "تعاقب" ہے۔

۱۴۔یوسف ناظم:

یوسف ناظم دبستان لاہور سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے انشائیوں میں مزاح بھرپور پایا جاتا ہے۔ان کے انشائیوں میں تازگی، شگفتگی، فکر کی گہرائی، برجستگی اور بے ساختگی جیسی صفات پائی جاتی ہیں۔مزاح اور طنز کے نشتر سے وہ کافی دیر تک قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

۱۵۔ معین اعجاز:

معین اعجاز نے انشائیہ کی صنف کے مستقبل کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ان کے اہم انشائیوں میں، ”اردو تنقید میں غیر ملکی سرمایہ کاری“، ”دیوتاؤں کی کشمکش“، ”مذمت بطور پیشہ “اور ”ہماری عینک کی پہلی سالگرہ “وغیرہ شامل ہیں۔ان کے انشائیوں کا لہجہ طنزیہ ہے وہ اپنے خیال کو عمدہ طریقے سے پیش کرتے ہیں۔وہ عہد حاضر کی برائیوں کو سیدھے اور سادہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔

۱۶۔ محمد حسن:

محمد حسن نے اپنے انشائیوں میں ذاتی تجربات، داخلی کیفیات اور انسانی نفسیات بہت سادہ اور منفرد انداز میں پیش کیے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں مزاح کی نسبت طنز زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے انشائیے فلسفیانہ اور شگفتگی سے بھرپور ہیں۔ان کا مشہور انشائیہ ”شراب“ ہے۔

۱۷۔رشید احمد گوریچہ:

رشید احمد گوریچہ کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ ”سوچ زاویے“ ۱۹۸۶ءمیں منظر عام پر آیا ان کے مشہور انشائیوں میں ”سرگوشی“، ”تمباکو نوشی“، ”دریچہ“، ”آئینہ دیکھنا“، ”خوب پردہ ہے“، ”نیند“، ”سوچنا“اور ”وقت گزارنا“ وغیرہ شامل ہیں ان کے موضوعات میں بہت تنوع پایا جاتا ہے۔ان کے کچھ انشائیوں میں سنجیدگی کی لہر دوڑتی ہے جس سے بوجھل پن پیدا ہوتا ہے۔خیال آفرینی اور فلسفیانہ سوچ ان کے انشائیوں کی صفات ہیں۔

۱۸۔اقبال ساغر صدیقی:

اقبال ساغر صدیقی کا پہلا انشائیوں کا مجموعہ ”شوخی تحریر“ ۱۹۸۰ءمیں طبع ہوا جبکہ دوسرا مجموعہ ”گل افشانی گفتار“ ۱۹۸۷میں منظر عام پر آیا ان کے انشائیوں میں مقصدیت اور طنز و مزاح بخوبی موجود ہے۔ان کے مشہور انشائیوں میں ”دیوان غالب کی رونمائی“ اور ”لاوڈ اسپیکر“ کا عذاب شامل ہیں ان کے انشائیوں میں معاشرتی مسائل اور روزمرہ زندگی کے معاملات پر بات کی گئی ہے وہ اپنے انشائیوں میں ضرب الامثال اور اشعار کا بھی استعمال کرتے ہیں ان کے انشائیوں میں طنز لطیف صورت میں نظر آتا ہے۔وہ کاٹ دار جملوں کے ساتھ چٹکلوں سے بھی طنز و مزاح کی صورت بھی پیدا کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔میں تذکیر القران، ترجمہ، مولاناوحید الدین خان، ص ۱۵۱۵

۲۔وحید قریشی،ڈاکٹر، اردو کا بہترین انشائی ادب، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص:۱۳۔۱۲

۳۔آدم شیخ،ڈاکٹر، انشائیہ بمبئی، ۱۹۶۵ء، ص ۷

۴۔Encyclopedia Britannica,Vol.8,P.No.713

۵۔کلیم الدین احمد، پیش لفظ، نشاط خاطر، از حسین عظیم آبادی، پٹنہ، ۱۹۸۰، ص ۷

۶۔آدم شیخ،ڈاکٹر، انشائیہ بمبئی، ۱۹۶۵، ص ۲۷

۷۔نظیر صدیقی، شہرت کی خاطر، ڈھاکہ، ۱۹۶۱، ص ۱۰

۸۔سلیم اختر،ڈاکٹر، انشائیہ کی بنیاد، لاہور، ۱۹۸۶، ص ۲۱۰

۹۔مشکور حسین یاد، ممکنات انشائیہ، لاہور، ص ۴۳

۱۰۔غلام جیلانی اصغر، انشائیہ کیا ہے؟ اوراق، انشائیہ وافسانہ نمبر مارچ۔اپریل ۱۹۷۲، ص ۲۳۰

۱۱۔وزیر آغا،ڈاکٹر، دوسرا کنارہ، سرگودھا، ۱۹۸۲، ص ۸

۱۲۔انشائیہ کے خدوخال، ص ۳۸

۱۳۔ظہیر الدین مدنی، اردو ایسیز، دہلی، ۱۹۸۱، ص ۲۸

۱۴۔وحید قریشی،ڈاکٹر، اردو کا بہترین انشائی ادب، لاہور، ۱۹۶۴، ص ۴۵

۱۵۔اختر اورینوی، بحوالہ اردو انشائیہ، انور سدید، لاہور، ۱۹۸۵، ص ۴۷

۱۶۔انشائیہ کی بنیاد،ڈاکٹر سلیم اختر، لاہور، ۱۹۸۶، ص ۳۷۳

۱۷۔ظہیر الدین برنی، اردو ایسیز، ص ۲۵

۱۸۔صنف انشائیہ اور انشائیے،ڈاکٹر سید محمد حسین، لکھنؤ، ۱۹۷۳، ص ۱۵

۱۹۔ارسطو، بوطیقا، ترجمہ عزیز احمد، انجمن ترقی اردو، کراچی، اشاعت ششم، ۲۰۱۱

۲۰۔وزیر آغا،ڈاکٹر، دوسرا کنارہ، سرگودھا، ۱۹۸۲، ص ۱۵

۲۱۔سید محمد حسنین، انشائیہ اور انشائیے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علیگڑھ، ۲۰۰۳، ص ۱۱

۲۲۔سید محمد حسنین، انشائیہ اور انشائیے، ص ۳۶

۲۳۔ایضاً، ص ۳۹

۲۴۔ایضاً، ص ۴۴

۲۵۔ سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ (جلد اول)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶

۲۶۔ فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغات، اردو جامع (نیا ایڈیشن) فیروز سنز لمیٹڈ لاہور

۲۷۔ وارث سرہندی، علمی اردو لغت (جامع)، علمی کتاب خانہ، لاہور طبع، ۲۰۰۳

۲۸۔ عابد علی عابد، سید، اسلوب، مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول دسمبر ۱۹۷۱ء، ص ۴۱۔

۲۹۔ رشید امجد ڈاکٹر، رویے اور شناختیں، مقبول اکیڈمی، راولپنڈی، ۱۹۸۸ء ص ۴۷

۳۰۔ منظر عباس نقوی، پروفیسر، اسلوب اور اس کی تشکیل، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۹ء، ص ۱۵

۳۱۔ ممتاز شیریں، معیار، نیا ادارہ، لاہور، طبع اول، ۱۹۶۳ء، ص ۳۶

۳۲۔ عابد علی عابد، سید، اسلوب، ایضا، ص ۴۸

۳۳۔ بحوالہ، اسلوب، عابد علی عابد، سید، ایضا، ص ۴۸

۳۴۔ مشکور حسین یاد، ممکنات انشائیہ، پولیمر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۲۴

۳۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، حرف آغاز، مشمولہ، انشائیہ کے خدوخال، مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۹۰ء، ص ۷

۳۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ کی بنیاد، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵۶

۳۷۔ رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳، ص ۱۵۶

۳۸۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، نذیر سنز پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۲۶

۳۹۔ سوزن بیسنیٹ، ترجمہ توحید احمد، تقابلی ادب: ایک تنقیدی جائزہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵، ص ۵

۴۰۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ص ۹۶

۴۱۔ www.wikipedia.or>wiki>com

۴۲۔ محمد حسن، مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۲۰۳

۴۳۔ Steven tostoy:Comparative Literature theory,method,Application p15
Amesterdam Atlanta,Ga 1998

۴۴۔ عبد الستار دلوی، ادبی و لسانی تحقیق اور تقابلی ادب (اصول اور طریق کار)، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی، ۲۰۱۶، ص ۱۴۷

باب دوم:

دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا فکری تقابل

الف۔ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کا فکری جائزہ:

انشائیہ ڈاکٹر وزیر آغا کی پیدائش ۱۹۲۲ء میں سرگودھا کے ایک گاؤں وزیر کوٹ میں ہوئی۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد کی نگرانی میں سرگودھا اور ضلع جھنگ سے حاصل کی آپ نے گونمنٹ کالج لاہور سے معاشیات میں ایم اے کیا آپ کے والد آغا وسعت علی کاشت کاری کا کاروبار کرتے تھے آپ نے ۱۹۵۸ء میں اردو ادب میں پی ایچ ڈی کی اور آپ کے تحقیقی مقالے کا عنوان اردو ادب میں طنز و مزاح تھا۔ آپ نے مولانا صلاح الدین کے ساتھ رسالہ ادبی دنیا کے مدیر کی حیثیت سے بھی کام کیا اور ڈاکٹر وزیر آغا نے مولانا صلاح الدین کی وفات کے بعد اپنا رسالہ ''اوراق'' کا بھی اجراء کیا جس کا شمار اردو ادب کے اہم رسائل میں ہوتا ہے۔ تاہم ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت اپنے آپ میں بہت سی تخلیقی پرتیں رکھتی ہے اور ہر پرت دوسرے سے مختلف ہے۔ ان کی تخلیقی شخصیت کبھی، بطور شاعر، انشائیہ نگار، ناقد اور کبھی مدیر کے طور پر سامنے آتی ہے۔ وزیر آغا نے ستمبر ۱۹۵۹ء میں پہلی بار اپنے انشائیہ ''چھکڑا'' کے لیے انشائیہ کو بطور لفظ استعمال کیا۔

وزیر آغا انشائیہ سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ وزیر آغا باقاعدہ طور پر پہلے انشائیہ لکھنے والوں میں سے ہیں۔ انہوں نے باقاعدہ تصور اور خیال کے تحت انشائیہ کی سمت نمائی کی اور اسے فروغ دیا۔ انہوں نے انشائیہ کی حدود، مقتضیات اور خدوخال مقرر کیے اور اسے طنز و مزاح اور سنجیدہ مضامین سے الگ تصور کیا۔ وزیر آغا سے قبل سرسید سے لے کر وزیر آغا تک انشائیہ ایک الگ اور مختلف شکل میں لکھا جاتا تھا مگر وزیر آغا کے اجتہادی اقدامات نے ایک منفرد صورت میں پیش کیا۔ ان کی پہلی کتاب ''خیال پارے'' ۱۹۶۱ء، دوسرا ''چوری سے یاری تک ۱۹۶۶ء تیسرا انشائی مجموعہ ''دوسرا کنارا'' ۱۹۸۲ء اور چوتھا انشائی مجموعہ ''سمندر میرے اندر گرے'' ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ ان کے یہ چاروں انشائی مجموعے کلیات کی صورت ۱۹۹۵ء میں ''پگڈنڈی سے روڈ رولر تک'' نام سے شائع ہوئے بعد ازاں تھوڑے سے انشائیوں کے اضافے کے ساتھ ۲۰۱۰ء میں ''پگڈنڈی'' کے نام سے اس کلیات کو دوبارہ شائع کیا گیا۔

"خیال پارے" میں چوبیں انشائیے شامل ہیں۔ان کے عنوانات درج ذیل ہیں۔ پگڈنڈی، بہادری، خاموشی، چھکڑا، آندھی، ریلوے ٹائم ٹیبل۔بے ترتیبی، کچھ علالت کی حمایت میں، قطب مینار، ڈبویا مجھ کو ہونے نے، گرمی، ٹریول لائٹ، آگ تاپنا، کچھ خوبصورتی کے بارے میں، سست روی، موڑ، ریل کا سفر، تنہائی، دُھند، وہ، آسیب، لحاف، اجنبی دیار میں شامل ہیں۔اس کتاب کا مقدمہ صلاح الدین حیدر نے لکھا ہے بعض ناقدین نے ان کے انشائیوں کو داد و تحسین سے نوازا اور بعض نے کافی مخالفت بھی کی۔

ان کے دوسرے انشائی مجموعے "چوری سے یاری تک" میں ۱۵انشائیے شامل ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں۔ چوری سے یاری تک، سیاح، چیخنا، جہاں کوئی نہ ہو، دیوار، طوطا پالنا، میری چالیسویں سالگرہ، واپسی، کچھ ضرب المثل کی مخالفت میں، یہ معصوم لوگ، کچھ رشتہ داروں کی شان میں، درمیانہ درجہ، بس اتنی سی بات ہے!، فُٹ پاتھ، کچھ قلم کے بارے میں۔اس انشائی مجموعے کا پیش لفظ مشتاق یوسفی نے لکھا ہے۔اس انشائی مجموعے کے موضوعات ادنیٰ، اعلیٰ، ادبی اور غیر ادبی سبھی شامل ہیں۔ان کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ان کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے اس مجموعے میں احساسات کی چاشنی پائی جاتی ہے کسی بھی چیز کو موضوع کے لیے منتخب کیا جاسکتا ہے۔

ان کے تیسرے انشائی مجموعے "دوسرا کنارہ" میں کُل ۱۷انشائیے شامل ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں۔بارہواں کھلاڑی، حقہ پینا، معافی مانگنا، لاہور، کھڑکی، بسنت، ٹھنڈا برف ہاتھ، کچھ مسکراہٹ کے بارے میں، کتابوں کی معیت میں، اکلاپا اور تنہائی، میرا البم، چلنا، ہجرت، میرے بچپن کا دوست، سائیسی علم دریاؤ!، ہینڈ بیگ۔اس انشائی مجموعے میں زندگی کے ہر پہلو سے موضوعات منتخب کر کے مجموعے میں شامل کیے گئے ہیں۔زیر نظر مجموعے میں دنیا کی ہر چھوٹی بڑی چیز تخلیقی صورت میں ڈھلتی نظر آتی ہے۔

ان کے چوتھے مجموعے "سمندر میرے اندر گرے" میں ۱۵انشائیے شامل ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں۔چرواہا، غُلامی، غزل، دستر خوان، کھلونے، پُل، قوس، نروان، آنکھیں، آزادی، عُریانی، کچھ اپنوں کے بارے میں، بارھواں کھلاڑی، سیاح، پگڈنڈی۔زیر نظر انشائیے کا پیش لفظ ڈاکٹر وزیر آغا نے خود لکھا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا پہلے مجموعے سے چوتھے مجموعے تک ہمیں ارتقاء دیکھنے کو ملتا ہے اور اس دوران ہمیں ان کے خیالات اور اسلوب میں بھی ارتقائی صورت ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔تاہم انشائیہ میں تکنیکی باریکیوں اور فلسفیانہ بحثوں سے گریز کیا جاتا ہے تاہم وزیر آغا کے مطابق انشائیہ میں فکر کی گہرائی اور سوچوں کی لہریں اور خیالات کا تسلسل موجود ہونا ضروری ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں میں مقصدیت اور فلسفہ بہت کم تھا تاہم تازگی اور لطافت ان کے انشائیوں میں بھرپور انداز میں موجود تھی۔ آپ نے انشائیے کو جدید اور منفرد اسلوب سے نوازا۔ خیال پارے کے انشائیے گہرے معنی اور مفاہیم کا سمندر رکھتے ہیں۔ وہ زندگی کی حقیقتوں کو زندگی کی کڑواہٹ اور تلخیوں سے الگ کر کے پیش کرتے ہیں انشائیے میں شخصی تاثر کے علاوہ اپنے مشاہدات کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ انشائیہ نگار انشائیہ لکھتے ہوئے اس دور کے سیاسی، سماجی و معاشی حالات و کیفیات کو بیان کر دیتا ہے تاہم مصنف ذاتی و شخصی تجربے کے ساتھ ساتھ اجتماعی مشاہدات و تجربات کو بھی اس میں شامل کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ آپ نے انشائیے کو ثقافتی روپ میں ڈھالا اور اسے پاکستانیت سے سجایا کہ بہت جلد مقبول عام ہو گیا۔ انشائیے میں انسان اور انسان سے وابستہ چیزوں سے بحث کی جاتی ہے۔ وہ خارج کے ذریعے داخل اور داخل کے ذریعے خارج پر بحث اور غور و فکر کرتے ہیں تاہم وہ جز کے واسطے سے کُل کو جانچتے ہیں۔ تاہم ہر انسان ایک دوسرے سے مختلف ہے انشائیہ نگار انسان کے اندر کی جانچ پرکھ کر کے قاری سے اس کا تعارف کرواتے ہیں۔

اگرچہ وزیر آغا علمی و ادبی موضوعات پر بڑی چابکدستی سے قلم اٹھاتے ہیں وہ پوری زندگی مطالعہ کرتے رہے وہ اپنے خیالات و تصورات کی ترویج بہت عمدہ انداز سے کرتے ہیں علم و ادب سے وابستگی کی بناء پر وہ مختلف علوم اور اصناف پر عبور رکھتے تھے۔ جن میں بنیادی شاعری ہے۔ انشائیہ کا وجود بھی شاعری ہی سے ہے انشائیہ بھی ان کے داخل سے تعلق رکھتا تھا جسے انہوں نے داخل کے ساتھ ساتھ معروضی رنگ و روغن سے بھی سجایا ہوا تھا اس طرح داخل اور خارج سے ایک اچھوتی اور انمول صورت ہمارے سامنے آئی۔ تاہم ہر انسان ایک دوسرے مختلف ہے انشائیہ نگار انسان کے اندر کی جانچ پرکھ کر کے قاری سے اس کا تعارف کرواتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا ”آگ تاپنا“ جیسے معمولی موضوع کو بھی زیر بحث لاتے ہیں آگ تاپنا ایک کیفیت اور ایک فن ہے اور اس فن کی بھی کچھ مقتضیات ہیں تاہم سرما کے موسم میں آگ کو تاپا جاتا ہے مصنف انشائیے میں لکڑیوں کو زندگی جلنے سے مشابہت دیتے ہیں جیسے رفتہ رفتہ زندگی گزرتی ہے ایسے ہی لکڑیاں جلتی ہیں اور اس کے لیے مصنف کمرہ بند کر کے تنہائی کو پسند کرتا ہے۔

انشائیہ ”خوبصورتی کے بارے میں“ کا موضوع خوبصورت کے احساس کے گرد گھومتا ہے اور انشائیہ ایمرسن کے قول کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے ”کہ ہم چاروں طرف خوبصورتی میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن اسے دیکھنے کے لیے ہمارے پاس آنکھیں نہیں۔ مصنف خوبصورتی کے شیدائی ہیں انشائیے کے آغاز میں خوبصورتی کے احساس

کو سمجھنے اور دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں مگر مصنف جب غور کرتے ہیں تو ان پر حقیقت آشکار ہوتی ہے تاہم خوبصورتی ہر ایک کے زاویہ نگاہ میں ہوتی ہے جس سے وہ چیزوں کو جانچتا اور پرکھتا ہے۔

انشائیہ "موڑ" ایک منفرد انشائیہ ہے جس میں زندگی میں موڑ کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے کہ جب بھی کوئی سفر کر رہا ہو تو موڑ کے آتے ہی رفتار مدھم ہو جاتی ہے مگر یک لخت ہی موڑ کے بعد رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ تاہم زندگی میں ہر آنے والی رکاوٹ ہماری رفتار کو تیز کرتی ہے۔

انشائیہ "بارش کے بعد میں" بارش کے بعد کے مناظر کو پیش کیا گیا ہے اسکی خوبصورتی کو عمدہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ بارش کے بعد ہر چیز دھلی اور نکھری نظر آتی ہے۔ بارش آنے سے کچھ دن پہلے تک تو ہر چیز گرد آلود اور مٹی سے لپٹی دکھائی دیتی ہے لیکن بارش کے بعد ہر چیز میں نکھار اور تابندگی دیکھنے کو ملتی ہے اور ہر چیز چکا چوند دکھائی دیتی ہے آسمان کی نیلاہٹ میں روشنی ہی روشنی تھی پہاڑ، زمین، پودے اور پھول اجلے اجلے نظر آتے ہیں، گھٹن کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ آسودگی اور آزادی کی فضا ہر طرف نظر آتی ہے اور ہر چیز اپنی طرف کھینچتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور گرد سے حاصل ہونے والی اکتاہٹ ختم ہوتی ہے اور اس کی جگہ انوکھی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا بچپن دیہات میں گزرا اور وہاں سے ہی آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی اس کے بعد وہ سرگودھا اور پھر وہ لاہور تشریف لے گئے مگر تاحیات وہ دیہات سے جڑے رہے وہ دیہات سے فطرت کے اسرار تک پہنچے تاہم ان کے انشائیوں کا بنیادی موضوع فطرت اور فطرت تک رسائی حاصل کرنا ہے وہ دیہات کی ہر چیز پر فریفتہ ہیں جن میں فصلیں، درخت، کنوئیں، پھل اور پھول وغیرہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ "ریل کا سفر" میں ریل گاڑی پر سفر کرنے کا تجربہ عمدہ پیرائے میں بیان کرتے ہیں انشائیے میں ان کا تجربہ اور مشاہدہ جوبن پر دکھائی دیتا ہے عام طور پر ریل کے سفر کو لوگ بہت پُر آسائش سمجھتے ہیں مگر مصنف کے خیال میں ایسا نہیں ہے مگر ریل گاڑی میں مسافر ایک دوسرے کی سیٹ ہتھیانے کا ہی سوچ رہے ہوتے ہیں۔ ریل میں سفر کرنے والا معاشرے، گھر، محلہ یا گاؤں وغیرہ سے سفر کے دوران زندان سے آزاد ہوتا ہے اور ریل کی الگ دنیا میں کھو جاتا ہے۔ ریل کے سفر کے دوران تنہائی اور لوگوں کے رش کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

انشائیہ "دھند" بھی فطرت پر لکھا گیا انشائیہ ہے مصنف ہر صبح اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر سورج کی شعاعوں کو چیڑ کے درخت کو درخشندگی بخشتے دیکھتے اور سارا ماحول سورج کی شعاعوں سے چمک اُٹھتا۔ مصنف مزید لکھتے ہیں۔

"میں سوچنے لگا ہوں دھند اور بادل میں بہ ظاہر کوئی فرق نہیں۔ دونوں پانی کے بخارات ہی تو ہیں لیکن یہی بخارات بلندی پر پہنچ جائیں تو بادل کہلاتے ہیں اور زمین پر اُتر آئیں تو دھند بن جاتے ہیں۔ جب تک یہ بلندیوں پر رہتے ہیں۔ ان کے طریق کار میں سنگ دلی، شقاوت، بے نیازی اور غرور سب کچھ ہوتا ہے۔ یہ چمکتے ہیں، گرجتے ہیں اور موت کے فرشتے بن کر زمین کے باسیوں کو خاکستر کر دیتے ہیں۔"[1]

انشائیہ "آندھی" میں بھی فطرت کی عکاسی کی گئی ہے زیر نظر انشائیہ میں آندھی کے فوائد بیان کئے گئے ہیں عام طور پر شرفا آندھی کو ایک لعنت گردانتے ہیں اور آندھی کے بارے میں نازیبا الفاظ میں اپنی رائے دیتے ہیں تاہم آندھی زندگی کو جھنجھوڑتی ہے اور تباہی و بربادی کے مناظر زمین پر چھوڑ کر آگے ہی آگے بڑھتی جاتی ہے آندھی کا فائدہ یہ ہے کہ جب آندھی اپنے وحشی جھونکوں کے سبب ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے تو ہر شخص کا ایک دوسرے سے رابطہ منقطع ہو جاتا ہے تب اندر احساس و شعور کی شمع روشن ہوتی ہے اور صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔

انشائیہ "گرمی" میں گرمی کے موسم کو موضوع بنایا گیا ہے اور گرمی کے فوائد پر بحث کی گئی ہے اگرچہ گرمی میں بلغمی مزاج نہیں پایا جاتا گرمی میں نسوانیت کی مانند دریا کی پختگی پائی جاتی ہے اس میں میٹھی سی حرارت پائی جاتی ہے۔ جو مطلع کو صاف رکھتی ہے گویا گرمی اور عشق، گرمی اور محبت کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ گرمی آپ کو چھاؤں میں بیٹھنے اور تاریک ترین گوشوں میں پناہ لینے کی ترغیب دیتی ہے اور گرمی سے فرزانگی حرکت میں آتی ہے۔ گرمی ہمیں اپنے اندر سوچنے کی طرف راغب کرتی ہے اور مصنف کے خیال میں انسان کی زندگی حرارت اور گرمی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا فطرت کے ساتھ ساتھ دھیرے دھیرے چہل قدمی کرتے ہیں۔ وہ فطرت کا گھونگٹ یکدم نہیں اٹھاتے بلکہ آہستہ آہستہ دلدوز انداز میں چاک کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا فطرت کے ساتھ گویا من اور تو کا سا تعلق رکھتے ہیں وہ اپنی آنکھوں سے فطرت کو دیکھتے ہیں اور اپنے مشاہدے کو جراءت رندانہ سے پیش کرتے ہیں۔ وہ فطرت سے روحانی تعلق رکھتے ہیں وہ ان مناظر سے صرف لطف اندوز ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کے ساتھ اپنا تعلق جوڑ کر پیغامات بھی حاصل کرتے ہیں اور اپنے باطن میں اُتارتے چلے جاتے ہیں اور اس سے معنی کا ایک نیا جہاں سامنے آتا ہے وہ خود کو فطرت کا ایک جزو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ فطرت کے حسن اور خوبصورتی کو بے باک انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے ہاں احساس آزادی سے لبریز مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ وہ فطرت کی طرف راغب

ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ فطرت کی طرف راغب ہونے سے زندگی اور کائنات کے نئے نئے وا روشن ہوتے ہیں اس سے فطرت کے نئے نئے مناظر کی منظر کشی کی جا سکتی ہے۔ انشائیہ "وہ" میں "میں" اور "تو" کے ساتھ وہ کی اہمیت واضح کی گئی ہے انسانی زندگی میں وہ کی بہت اہمیت ہے گویا وہ کے بغیر زدگی ادھوری اور نامکمل نظر آتی ہے۔ وہ کے بغیر کوئی بھی کہانی، فلم یا ڈرامہ ادھورا ہی رہتا ہے میں اور تو میں وہ مخالف یعنی ویلن ہوتا ہے۔ گویا زندگی میں وہ نہ ہو تو زندگی سپاٹ اور بے رونق ہو جائے۔

انشائیہ "ٹریول لائٹ" میں وزیر آغا ٹریول لائٹ کو زندگی کی اہم ضرورت گردانتے ہیں اور زندگی کے فلسفے کو علامتی پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ ریلوے پلیٹ فارم پر عام طور پر ایک اشتہار لگا ہوتا ہے جہاں بیضوی شکم کا موٹا تازہ آدمی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا جا رہا ہے اور اس کے پیچھے ایک مریل سا قلی صندوقوں بستروں پر اہرام اٹھائے جا رہا ہے اور سب سے اوپر ایک طوطے کا پنجرہ پڑا ہے اور وہ لوگوں کے جم غفیر کو طنزیہ انداز سے دیکھتا ہے۔ تاہم صندوق میں اس کی مادی مادی چیزیں دولت، زمین وغیرہ ہے اس سے اوپر جو بیگ ہے وہ بیوی، بچے، عزیز و اقارب سے اٹا ہوا ہے۔ سماجی ذمہ داریوں، مذہبی رجحانات، قوانین، اخلاق اور ذمہ داریوں کے بستر پڑے ہوئے ہیں اور اس پنجرہ میں قید طوطا ایک ایسی روح ہے جو زندگی کے گزرتے ہوئے جم غفیر کا بغور جائزہ لے رہا ہے ٹریول لائٹ کی عمدہ مثال گوتم بدھ ہے اور بیسویں صدی میں اسی فلسفے کی پیروی کرنے والے دو بڑے علمبردار گاندھی اور بھاوے ہیں۔ انشائیہ "قطب مینار" میں قطب مینار کی عظمت و بڑائی کو بیان کیا گیا ہے بزرگ کہتے ہیں کہ اگر دلی جاؤ تو قطب مینار ضرور دیکھو۔ تاہم قطب مینار کی بہت سی منازل ہیں جو کہ زندگی اور کائنات کی تصویر کو آنکھوں کے سامنے لاتی ہیں۔ قطب مینار پر میر و غالب کی فاتحانہ دلی پورے جوبن پر نظر آتی ہے۔

انشائیہ "آسیب" میں اباؤاجداد کی پُراسرار، غیر مادی اور تاریک دنیا کا تصور پیش کرتے ہیں۔ مصنف مری کی سیر کے لیے گئے اور وہاں انہوں نے اداسی اور مردہ دلی کو محسوس کیا اور ان کو مری کا ماحول بجھا بجھا سا دکھائی دیا ان کے دوست نے ان کی اداسی دور کرنے کے لیے "گھوسٹ سٹوریز" کی کتاب پڑھنے کے لیے دی۔ اس کے بعد غیر ارضی مخلوق کی پرچھائیاں انہیں ہر طرف نظر آنے لگیں اور خوفناک تصور ذہن پر چھانے لگے اور اس طرح انہیں مری میں ہر جگہ بھوت ہی نظر آنے لگے گویا انشائیہ انسان کی نفسیاتی کیفیت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ آپ جتنا بھی چیز میں ڈوب کر دیکھتے ہیں اس کے بارے میں سوچتے ہیں اور کسی کتاب کو توجہ و غور سے پڑھتے ہیں اس کے آثار آپ کی شخصیت پر یا آپ کے ارد گرد ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ انشائیہ "لحاف" میں ڈاکٹر وزیر آغا لحاف کو پرانے وقتوں کے غار سے مماثلت دیتے ہیں اور اس لحاف کو سوچ کی پہلی رو کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

انشائیہ ”اجنبی دیار میں“ سر سنگیت اور راگ کی اہمیت کے بارے میں ہے۔ آغاز میں مصنف سر سنگیت اور موسیقی سے نفرت کرتے تھے مگر اپنے ہمسائے دوستوں کی محفل میں شرکت نے انہیں بہت متاثر کیا اس طرح آہستہ آہستہ موسیقی سے رغبت کرنے لگے اور موسیقی جذبات کی برہنہ صورت ہوتی ہیں جو مجسم صورت میں ہمیں نظر آتی ہیں۔ انشائیہ ”بہادری“ بزدلی اور بہادری کے درمیان تفاوت کے موضوع پر ہے مصنف کی رائے میں جو شخص جتنا جراءت مند ہوتا ہے اتنا نادان بھی ہوتا ہے مصنف کی رائے میں بہادری سطحیت پر مبنی ایک ناتراشیدہ جذبہ ہے اس وجہ سے بزدلی جو کہ فراست اور تدبر پر مبنی ہے اسے روزمرہ زندگی میں رائج کرنا چاہئیے۔ انشائیہ ”علالت کی حمایت میں“ ایک منفرد انشائیہ ہے مصنف علالت کی حمایت میں رطب اللسان ہے اور بیماری کو ایک نعمت سمجھتا ہے اور مصنف جب بستر علالت پر دراز ہوتے ہیں تو اسے بستر ایک جزیرے کی مانند لگتا ہے جس جزیرے میں مصنف نے بپھرے ہوئے طوفان کو دیکھ لیا ہے مصنف بستر پر پڑے ارد گرد کا معائنہ کرتا ہے جہاں اسے شب و روز کا تماشہ نظر آتا ہے اور سب کچھ اسے بازیچہ اطفال کی مانند لگتا ہے۔

انشائیہ ”سست روی“ گاؤں کی سست روی پر لکھا گیا ہے گاؤں کی زندگی بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ گزرتی ہے شور شرابے کی کمی کی وجہ سے انسان فطرت کے زیادہ قریب ہوتا ہے جبکہ شہر کی زندگی زیادہ تیز رفتار ہوتی ہے گویا لوگ شہر میں ہنگامے کی وجہ وقت کی تیز رفتاری کو دیتے ہیں کو کہ یہ ایک واہمہ ہے گاؤں میں وقت کی رفتار گویا فطرت کی ہی اپنی رفتار ہے۔

”ڈبویا مجھ کو ہونے نے“ غالب اور اقبال کے نظریہ انفرادیت اور شخصیت کے فرق پر مبنی انشائیہ ہے ۔غالب انفرادیت کا قائل ہے جبکہ اقبال انسان کو عظیم مقصد کی طرف رواں دواں کرتے ہیں اور شخصیت کی تعمیر کی دعوت دیتے ہیں تاہم اقبال کچھ کرنے کچھ ہونے کی خواہش کرتے ہیں جبکہ غالب کچھ کرنے اور کچھ ہونے کی آرزو پر شرمندہ ہیں دونوں میں بہت تفاوت پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق انسان سفر کی مشکلات میں پڑے بغیر چارپائی پر دراز ہو کر بھی پوری دنیا کی سیر کر سکتا ہے اس طرح قاری پر حقیقی سفر کی صعوبتیں اور خواب کی دنیا کی لطافت واہو جاتی ہیں، وزیر آغا حقیقی دنیا کی رزم گاہ میں کھو جانے کے عمل کو پسند کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خواہشات کو کائنات میں اہم حیثیت حاصل ہے اور اسی کی وجہ سے انسان زندگی کے تسلسل سے آگاہ ہوتا ہے۔ ان کا انشائیہ ”نروان“ بھی کائنات میں خواہشات کے ادراک پر منحصر ہے ۔ڈاکٹر وزیر آغا کے دل میں نروان کا خیال تب آیا جب وہ بچپن میں اپنے والد کے ساتھ

درویشوں اور صوفیوں کے پاس جاتے اور وہاں خواہش سے دستبردار ہونے کے بارے میں گفتگو سنتے ان کے خیال میں خواہش ختم کرنا ہی اصل نروان ہے وہ انشائیہ نروان میں یوں بیان کرتے ہیں۔

> "تب مجھے محسوس ہوا کہ زندگی میں مجھے رتی بھر دلچسپی نہیں رہی۔ مجھے ہر شے بے کار، بے معنی اور لا حاصل نظر آتی۔ چاروں طرف ایک تھکا دینے والی تکرار کا احساس ہوتا۔ جذبے سرد پڑے تو تو ان کے ہدف بھی غیر اہم ہو گئے۔ آہستہ آہستہ میں ذی روح کی بجائے شے میں تبدیل ہو تا گیا سو وہ رشتہ جو ایک جاندار کا دوسرے جاندار سے ہوتا ہے پس منظر میں چلا گیا اور وہ رشتہ یا عدم رشتہ جو ایک شے کا دوسری شے سے قائم ہے، سطح پر آگیا۔ تب ایک جھٹکے کے ساتھ مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میں تو نروان کے نام پر دراصل موت کو اپنی طرف بلا رہا ہوں۔"[۲]

تاہم وزیر آغا کو ہم گیانی کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں اور فکر کی گہرائی بھی اسی گیان کی وجہ سے ہے۔ وہ اپنے تجربے اور مشاہدے سے فلسفے کی گہرائی کو عیاں کرتے ہیں۔ تاہم ان کا تصوف آج کل کے مرشد و صوفیاء کی طرح نہیں ہے بلکہ جس میں پیر و مرشد اور مریدی ہوتی ہے فکر و سوچ کو وہ محسوس کرتے ہیں۔ وہ اپنی سوچ کو دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہیں اس مقام پر معنی اس طرح کھُلتے ہیں اور معنی کا سیلاب الفاظ کی پوشیدہ تہوں میں دوڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔۔ رفیق سندیلوی یہاں اپنی رائے دیتے ہیں۔

> "وزیر آغا نے ہمیشہ صوفی و ویدانتی پر تخلیق کار کو ترجیح دی ہے۔ ان کا موقف رہا ہے کہ صوفی و ویدانتی یا تو کائنات کو کسی ماورائے مقصد معرفت کے حصول کا محض ایک زینہ قرار دیتا ہے۔"[۳]

انشائیہ "بارہواں کھلاڑی" بہت معمولی موضوع ہے جو دل کو بھانے والا موضوع ہے اور اس کی مہک تکلیف دہ ہے جس میں پورے انشائیے کی فضا دل کو اداس کر دینے والی ہے مگر اس میں تنہا مرد کا اداس رہنا نہیں ہے بلکہ مجموعی افراد کا غم ہے۔ بارہواں کھلاڑی میں مصنف اشیاء میں معنی و مفہوم ڈھونڈنے کے عادی ہیں اور انہیں ہارنے کی عادت نہیں ہے انشائیہ بارہواں کھلاڑی میں ان کی مہارت عروج پر دکھائی دیتی ہے۔

انشائیہ "تنہائی" میں وزیر آغا مکمل تنہائی حاصل کرنے کے طریقے کو موضوع بناتے ہیں۔ انسان کے برعکس حیوان زیادہ عرصے تک خاموشی اختیار کر سکتا ہے انسان کے لیے تنہائی کے لمحات حبس دوام دکھائی دیتے ہیں جبکہ حیوان بہت آرام و سکون سے یہ خاموشی کا وقت گزار لیتے ہیں۔

انشائیہ "خاموشی" میں وزیر آغا خاموشی کو زیر بحث لاتے ہیں اور اپنے دس روزہ قوت گویائی سے محروم ہونے کے تجربے کو انشائیے کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ دس روز کی چپ گویا ایسی تھی جیسے ابدی چُپ ہو اور یہ تھوڑا سا وقت صدیوں پر محیط ہو جائے اگر چند لمحوں کے لیے بھی رک جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دوسرے کی رفتار گویا بہت تیز ہو گئی ہو اور اگر اس کی جگہ قوت سماعت لے لے تو محسوس ہوتا ہے کہ ہر طرف آوازوں کا محشر بپا ہے گویا آوازوں کا سیل رواں ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ مصنف نے اپنے اس دس روزہ تجربے کو نظم کی صورت میں بھی ڈھالا۔

ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ "چھکڑا" میں چھکڑا کو ہمارا علامتی مظہر کہتے ہیں۔ جیسے انگریز کی علامتی مظہر جان بُل ہے اور امریکہ کا علامتی مظہر چچا سام ہے ہندوؤں کی علامتی مظہر گائے ہے مگر اقبال پاکستان کی علامتی مظہر اونٹ کو قرار دیتے ہیں مگر وزیر آغا اونٹ کو بطور علامتی مظہر تسلیم کرنے سے انکاری ہیں کیونکہ اونٹ میں صبر، قناعت، ہمت اور اولوالعزمی جیسی صفات موجود ہوتی ہیں مگر ہمارا ان سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں وزیر آغا کے مطابق چھکڑا ہمارا علامتی مظہر ہے۔ وزیر آغا زندگی میں "بے ترتیبی" کی اہمیت کو موضوع بناتے ہیں کائنات میں ہر چیز بے ترتیب ہے مصنف بھی بے ترتیبی کو ہی پسند کرتے ہیں حتٰی کہ کمرے میں موجود ہر چیز ترتیب سے پڑی ان کی الجھن کا باعث بنتی ہے گویا ترتیب، سلجھاؤ اور توازن ان کے نزدیک موت کا پتہ دیتی ہے گویا بے ترتیبی میں لچک، محبت، دوستی، پیار اور خلوص موجود ہوتا ہے۔

انشائیہ "طوطا پالنا" ایک علامتی انشائیہ ہے اس انشائیے میں انسان کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے دور کو کبوتر پالنے کا دور کہا گیا ہے اور یہ دور عہد طفلی کا دور کہلاتا ہے جس دور میں کبوتر اڑا کر بچے خوشی کا اظہار کرتے ہیں اس دور کو مصنف نے اڑانے کا دور کہا ہے۔ دوسرا دور وہ ہے جس میں آپ مرغ پالتے ہیں اور یہ دور جوانی کا دور ہے اور اس دور کو لڑنے لڑانے کا دور کہا جاتا ہے تیسرے دور کو طوطا پالنے کا دور کہا جاتا ہے۔ یعنی اس دور میں آپ طوطا پالتے ہیں اور بڑبڑاتے ہیں اور خود سے خود کلام ہوتے ہیں اور یہ دور بڑھاپے کا دور ہے جس میں انسان اکثر خود سے ہمکلام ہوتا ہے اور اس دور میں انسان کے اعضاء مضمحل ہو جاتے ہیں۔

انشائیہ "جہاں کوئی نہ ہو" میں گوتم بدھ کو علامتی انداز میں برتا گیا ہے کہ شادی شدہ آدمی ہمیشہ گوتم بدھ یعنی تنہائی کا متلاشی ہوتا ہے مصنف تنہائی حاصل کرنے کا طریقہ یہ سوچتا ہے کہ اسے گاؤں کی بجائے شہر کا رُخ کرنا چاہیئے اور وہ شہر کے کسی ہوٹل کی عمارت ساتویں منزل کا دو سو بیس والے کمرے کا انتخاب کر لیتا ہے ساتھ والے کمرے کے لوگ اتنے اجنبی اور معروف زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں کہ کوئی کسی سے آشنا نہیں ہوتا اور شہر کے اس

بارونق اور امنڈھتے ہوئے جم غفیر میں کوئی کسی سے موافقت نہیں رکھتا حتیٰ کہ بیمار کے لیے تیماردار نہیں ہوتا اور مرنے والوں کے لیے نوحہ خواں تک موجود نہیں ہوتا۔

"بس اتنی سی بات" ایک علامتی انشائیہ ہے انشائیے میں انسان کا فلسفہ بتایا گیا ہے کہ جوانی میں انسان جذبات کی آغوش میں سو رہا ہوتا ہے وہ کسی خاص شخصیت یا انفرادیت میں ڈھلا نہیں ہوتا مگر وقت گزرنے کے ساتھ جب انسان کے جذبات ٹھنڈے ہو جاتے ہیں تو وہ محنت کر کے اپنے آپ کو کسی خاص سانچے میں ڈھال لیتا ہے اور جوانی بھی بڑھاپے میں بدل جاتی ہے۔ انشائیہ "درمیانہ درجہ" ایک علامتی انشائیہ ہے۔ مصنف نے ریل گاڑی کے تین درجوں کو علامت کے طور پر برتا ہے اونچا درجہ، درمیانہ درجہ اور نچلا درجہ ہے۔ اونچے درجے کے مسافر ٹھنڈی، میٹھی، پُرسکون اور طمانیت سے بھرپور لمبی تان کے سوتے ہیں۔ انہیں کسی قسم کا خوف اور ڈر نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ زمانے کی مختلف الجھنوں کا شکار ہوتا ہے اور نہ ہی وہ کسی قسم کے خواب کا شکار ہوتے ہیں نچلے درجے کے لوگ بھی ڈر، خوف اور معاشرے کی الجھنوں سے بے نیاز ہوتے ہیں اور انہیں نیند کم ہی میسر ہوتی ہے اور نہ ہی وہ کسی قسم کا خواب دیکھتے ہیں جبکہ درمیانے درجہ کے لوگ اکثر خواب جیسی کیفیت میں ہی مبتلا رہتے ہیں۔ وہ کبھی میٹھے، کبھی ڈراؤنے اور کبھی بھیانک خواب دیکھتے ہیں۔ اس درجہ کے مسافروں کی حالت قابل رحم ہوتی ہے درمیانے درجے کے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ نچلے درجے کے لوگوں سے بہتر ہیں مگر یہ ان کی غلطی ہوتی ہے درمیانے درجے کے لوگوں کے لیے مصنف نے الٰہ دین چراغ رگڑ کر عالی شان مکان بنانے کا خواب دیکھتا ہے گویا اونچے درجے کے لوگ جنت میں اور نیچے درجے کے لوگ جہنم میں رہتے ہیں۔

> "لیکن درمیانے درجے کے مسافر نہ جنت کا باسی ہے اور نہ جہنم کا! اس کا مسکن تو ایک عالم برزخ ہے۔ اس مسافر کو اونچے درجے کا امرت بھی حاصل ہے اور اونچے درجے کا زہر بھی! لیکن دونوں کی مقدار بس اتنی ہوتی ہے کہ وہ ایک کی حلاوت اور شیرینی سے ابھی متمتع نہیں ہو چکتا کہ دوسرے کی تلخی اور کڑواہٹ بسے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔"[۲۸]

ڈاکٹر وزیر آغا "چوری سے یاری تک" میں چوری کو ہمارا پیشہ کے علاوہ مشغلہ بھی گردانتے ہیں اور چوری کے پیشے کی تاریخ بھی گردانتے ہیں کہ آریا قوم نے جب ہم پر حملہ کر کے ہمارے قلعوں کو برباد کیا تو انتقام کے طور پر رات کے وقت ہمارے لوگوں نے ان کے مویشی چوری کرنے شروع کر دیے اور نتیجے کے طور پر وہ ہمیں بد دعائیں دینے لگے مگر وقت کے ساتھ ہم نے اس پیشے کو اپنی پوری زندگی پر محیط کر لیا ہے۔ آریا قوم بھی ہماری قوم کے ناچ گانے اور شراب کو بھی دھیرے دھیرے اپنانے لگے اور نتیجے کے طور پر خوابوں میں مست رہنے لگے تاہم ہماری

تہذیب کی ہر پرت پر چوری کی صفت ملتی ہے۔ بایں ہمہ ہماری پریم کہانیوں، رادھاشیام اور رام سیتا کے ہاں چوری ملنے ملانے کا عنصر بخوبی پایا جاتا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا زندگی کی کڑوی اور تلخ حقیقتوں کے مرقعے خوش باش طریقے سے کھینچتے ہیں اوہ اپنی سوچ، فکر اور نظریات کا انخلاء کرتے ہیں کہ بعض ناگوار اور ناپسندیدہ چیزوں کو اس طرز سے بیان کرتے ہیں کہ وہ دل کو بھا جاتی ہیں۔

وزیر آغا کے انشائیوں میں تنوع اور رنگارنگی موجود ہے جس سے آشنا ہو کر قاری خود فراموشی کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ تاہم ان کے انشائیوں میں مسرت، دانائی و آگہی اور حیرت کے مناظر بھرپور منظر کشی کرتے ہیں۔ وزیر آغا کے انشائیوں میں تقابل کرنے کی خوبی کثرت سے ملتی ہے اور اس کی مثال انشائیہ ''حقہ پینا'' ہے اس میں جدید اور قدیم ثقافت اور تہذیب اور اس کے طرز عمل کا تقابل کیا گیا ہے اور قدیم ثقافتی و تہذیبی رنگ کو جدید پر ترجیح دی گئی ہے۔ وزیر آغا قدیم داستانوی ادب اور قدیم اردو ادب سے متاثر ہو کر بھی اپنے انشائیوں کے عنوانات کو منتخب کرتے ہیں جیسے سیاح اور طوطا پالنا وغیرہ۔ تاہم وزیر آغا جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں ہر زاویے سے اس موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے موضوعات کے تمام پہلوؤں کا بڑی چابکدستی سے احاطہ کرتے ہیں وہ اپنے انشائیوں میں شخصی تجربے کو شامل کر کے اسے منفرد اور دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ وزیر آغا کے انشائیے ان کی ذات کا پرتو اور عکس ہیں وہ انشائیہ کی تکمیل خارجی دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی ذات سے بھی مدد لیتے ہیں مگر داخلی مواد ان کے انشائیوں میں زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ جمیل آزر اپنی رائے دیتے ہیں۔

> ''انشائیے میں انکشاف ذات کا عمل اس طور پر ہوتا ہے کہ نہ تو اس میں فنکار کی خودستائی ظاہر ہوتی ہے اور نہ خودنمائی البتہ اس کی ذات کے دلکش اور لطیف گوشے منکشف ہوتے ہیں جن سے قاری بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔''[۵]

تاہم تخلیق کار کے تجربات ومشاہدات لاشعوری طور پر اس کی تخلیق میں شامل ہو جاتے ہیں۔ وزیر آغا کے انشائیے مثبت انداز میں لکھے گئے ہیں اور زندگی کے روشن پہلوؤں کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں وہ زندگی کے غمگین، دکھ اور سنجیدہ پہلوؤں میں امید کی کرن سے ہمیں روشناس کرواتے ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا نے کل ستر انشائیے لکھے ہیں اور یہ آپ نے پینتالیس سال کے عرصے کے دوران لکھے۔ انشائی مجموعہ ''چوری سے یاری تک'' ایک ٹھہرے ہوئے مقام کی مانند ہے۔ جہاں تھوڑی دیر ٹھہر کر ہم پر سفر کی نعمتوں کی ایک تصویر نمایاں ہوتی ہے اس کو دیکھ کر سنجیدگی اور صبر و بردباری کی خوبیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ تاہم ''خیال پارے'' میں سیمابی صفت موجود ہے اور چوری سے یاری تک میں ٹھہراؤ کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انشائی مجموعہ ''دوسرا کنارہ'' فلسفہ کی گہرائی اور گیان کی

خوشی کو عیاں کرتا ہے اور اشیاء ظاہر و باطن کی طرز سے اپنی پہچان بنا رہی ہیں جہاں ہر چیز کو داخل کے حوالے سے سمجھنے اور جاننے کی قوت پیدا ہو گئی ہے اس طرح چیزوں میں نہ بڑائی پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی حیرت جنم لیتی ہے۔اس سے ایک قسم کی اندرونی خوشی پیدا ہوتی ہے کہ چیزوں کی اصل حقیقت معلوم ہو گئی ہے۔

وزیر آغا اپنے انشائیوں کے چوتھے مجموعے ''سمندر میرے اندر گرے'' میں فلسفیانہ سوچ کو بیان کیا گیا ہے جس سے قاری سرشار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور جو مسرت کا باعث بنتا ہے۔ان کے انشائیوں میں پوری زندگی کا تجربہ دیکھنے کو ملتا ہے ان میں گہرا فکری تناظر پایا جاتا ہے تاہم انشائی مجموعے کے عنوان سے یہ بات عیاں ہو رہی ہے کہ قطرہ سمندر میں فنا ہونے کی بجائے سمندر اپنے اندر موجزن ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔تاہم اس مجموعے کا پہلا انشائیہ ''چرواہا'' میں تہذیبی اور تاریخی شعور کے اثرات پائے جاتے ہیں۔اس انشائیے میں ہمیں پوری انسانی تہذیب پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔انشائیے میں چرواہا ہمیں عصا تھامے ہوئے دکھائی دیتا ہے اور کئی سو سالوں کے سفر کے باوجود اس پر تھکاوٹ کے کوئی اثرات نمایاں نہیں ہوتے وہ سفر کی تمام صعوبتوں کے باوجود سفر پر رواں دواں نظر آتا ہے۔وقت گزرنے کے باعث سب کچھ بدل رہا ہے مگر چرواہے کا کردار ابھی تک ویسے کا ویسے ہے۔منور عثمانی ان چاروں مجموعوں کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں۔

> ''پہلے انشائی مجموعے میں انشائیہ نگار اپنے اندر کی مسرتوں اور باہر کی حیرتوں میں اُترا ہوا تھا،دوسرے مجموعے میں وہ اپنے مسائل اور مجبوریوں میں الجھ کر اپنی فکری قوت سے آزاد فضا کی طرف لپکنے میں مبتلا تھا۔تیسرے مجموعے میں عمر کے ساٹھ سال کا پُل عبور کر کے ایک دھیمے سے تحرک اور گنگناتے ہوئے ٹھہراؤ میں اطمینان اور عرفان کا حظ اٹھا رہا تھا اور اب چوتھے مجموعے میں وہ اپنے اندر اور باہر کے مترنم ٹھہراؤ سے باہر نکل رہا ہے۔اپنے مدھم لہجے اور ایسی نکتہ آفرینی سے اپنے خارج کی داخلی نشات الثانیہ کا منظر بُن رہا ہے۔''[۱]

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں میں بہت تنوع اور رنگا رنگی پائی جاتی ہے انہوں نے ہر طرح کے موضوعات پر قلم اٹھایا ان کے انشائیوں میں انفرادیت پائی جاتی ہے ان کے کچھ موضوعات کیفیات کو ظاہر کرتے ہیں جیسے بہادری،خاموشی،سست روی وغیرہ،کچھ عنوانات خاص و عام چیزوں کے ہیں جیسے قطب مینار،چرواہا،بارہواں کھلاڑی اور لاہور وغیرہ۔کچھ فعل مصدر کی صورت میں ہیں جیسے حقہ پینا اور آگ تاپنا وغیرہ۔کچھ عنوانات مظاہر فطرت کی عکاسی کرتے ہیں جیسے بسنت،آندھی اور آسیب وغیرہ۔کچھ انشائیوں کے عنوانات افسانوی طرز کے ہیں۔جیسے بارش کے بعد،جہاں کوئی نہ ہو اور ڈوبیا مجھ کو ہونے نے وغیرہ۔

وزیر آغا کے انشائیوں میں قدیم داستانوں کے اثرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں ان کے کچھ انشائیوں کے عنوانات قدیم داستانوں سے متاثر ہیں جیسے طوطا پالنا اور آسیب وغیرہ۔ تاہم ڈاکٹر وزیر آغا معاشرتی و تہذیبی مسائل پر بھی قلم اٹھاتے ہیں وہ ایک مخلص اور ہمدرد انسان کی مانند معاشرے کی اصلاح کا جذبہ بھی رکھتے ہیں ان کے انشائیوں میں فطرت اور زندگی کے نئے پہلو بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا اردو انشائیہ کے بڑے تخلیق کار ہیں ان کے مخالفین اور ناقدین نے ان کے قد و قامت کو کم کرنے کی فضول کوشش تو کی ہے مگر وزیر آغا نے انشائیہ نگاری کو ادبی حیثیت سے اہم مقام سے نوازا اور مخالفین کو مسکت جواب دیا۔

ب۔غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کا فکری جائزہ:

غلام جیلانی اصغر انشائیہ نگار، بہترین مقرر، مزاح نگار، خاکہ نگار اور بطور ناقد کے طور پر سامنے آئے۔ انہوں نے اردو اور انگریزی میں بہت سے مضامین لکھے۔انہوں نے مضامین کے ساتھ ادبی کتب پر لاتعداد تبصرے بھی کیے۔ آپ نے انشائیوں کی تنقید پر ایک کتاب ”انشائیہ کیا ہے؟“شائع کی۔اس میں انشائیوں پر مختلف مضامین لکھے گئے ہیں۔غلام جیلانی اصغر کی تاریخ پیدائش 1 جنوری ۱۹۱۸ء کو تلہ گنگ چکوال کی ہے آپ نے ابتدائی تعلیم کو تلہ گنگ سے جبکہ ایف کا امتحان کیمبل پور ۱۹۳۷ء میں پاس کیا۔بی اے کا امتحان اسلامیہ کالج لاہور سے ۱۹۳۹ء میں پاس کیا اسی دور میں آپ نے اپنی پہلی نثری تحریر رسالہ عارف سے شائع کروائی۔اس کے بعد ایم اے انگریزی کا امتحان اسلامیہ کالج پشاور سے اول پوزیشن سے پاس کیا۔

۱۹۴۱ء میں ہی زمیندار کالج گجرات میں بطور لیکچرار اپنی نوکری کا آغاز کیا۔جہاں سرگودھا میں آپ کی ملاقات وزیر آغا سے ہوئی۔ آپ نے انجمن ترقی اردو میں بطور ناظم اعلیٰ کے بھی کام کیا۔ان کا پہلا انشائیہ رسالہ اوراق میں ”بستر میں لیٹنا“ کے نام سے چھپا۔ان کے انشائیوں کا مجموعہ ”نرم دم گفتگو“ کے نام سے ۱۹۹۶ء میں چھپا۔اس میں بیس انشائیے ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں۔ تسخیر کائنات، مکان بنانا، بچہ پالنا، کچھ جھوٹ کی حمایت میں، چہرے، بلڈ گروپ، غیر ذمہ داری، پس آئینہ، سردی، سوال اُٹھانا، بچہ اور باپ، پوتا، سفر جاری ہے، کچھ ریٹائرمنٹ کے بارے میں، بستر میں لیٹنا، اٹھنا اور بیٹھنا، عادت، وراثت، گالی دینا، ملاقات۔ زیر نظر انشائی مجموعے کا پیش لفظ ڈاکٹر انور سدید نے لکھا اور غلام جیلانی اصغر کا اپنا ایک مضمون گفتگو کے نام سے کتاب کے آغاز میں شامل کیا گیا ہے۔

ان کے انشائیے ایک آدمی کی سوچ اور فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔ تسخیر کائنات مصنف کا بہت عمدہ اور اعلیٰ انشائیہ ہے غلام جیلانی اصغر انشائیہ میں انکشاف ذات کو بھی نمایاں کرتے ہیں جس میں وہ اپنی ذات کو کائنات سے تشبیہ دیتے ہیں ان کی کائنات بہت وسیع ہے جو ماضی میں بھی وسیع تھی، حال میں بھی وسیع ہے اور مستقبل میں بھی وسیع رہے گی وہ زیر نظر انشائیے میں انسان کی نفسیات کے چھپے ہوئے گوشوں کے کشفی پہلوؤں کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے من میں ڈوب کر زندگی کی تلاش کرنے کے اس پورے عمل کو تسخیر کائنات کے نام سے نوازتے ہیں۔

غلام جیلانی اصغر انشائیہ "مکان بنانا" میں اپنا مکان بنانے کے عمل کے دوران جو کچھ محسوس کیا اسے انشائیہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ مصنف نے جب اپنے مکان کی نیو کھدی ہوئی دیکھی تو انہیں پہلی بار زمین کی گہرائیوں کا عرفان ہوا۔ کہ زمین کے اندر بھی جہان نو موجود ہے اس کی اپنی فضائے بسیط ہے جو کئی تہوں پر پھیلی ہوئی ہے۔

> "اس کا اندر تو اس سمندر کی طرح ہے جس کی تہہ ناپید ہے۔ اس کا باہر اس ایماندار آدمی کی طرح ہے جس کی ساری ایمانداری اس کے چہرے پر لکھی ہوتی ہے۔ جب آدمی زمین کے بطن میں اُترتا ہے تو وہ اپنے بطن کی پُراسرار معنویت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے زمین کے باہر تو ایک ایسی سطحیت ہے جس پر چلنے سے انسان اپنے اصلی وجود سے کٹ کر زمانی تناظر میں ایک حقیر تنکا بن جاتا ہے جو انبوہ کے سیلاب میں بے یار و مددگار بہتا چلا جا رہا ہو۔"

لیکن زمین کے باہر اونچے اونچے مکان، عمارتیں، دھواں چھوڑتی گاڑیاں اور بد وضع سڑکیں وغیرہ موجود ہیں۔ تاہم جب مکان تعمیر کے مراحل طے کر کے تیار ہو جاتا ہے تو مصنف کافی دکھی ہو جاتا ہے کہ مکان بننے سے پہلے میں آزاد پرندے کی مانند تھا اور پرندوں کی طرح شام کو اپنے گھونسلے میں آرام کے لیے چلا جاتا تھا لیکن اب مصنف اپنے آپ کو غیر مرئی رسی کے ساتھ خود کو اپنے مکان میں بندھا ہوا پاتا ہے۔ انشائیہ "جھوٹ کی حمایت میں" اپنے آپ میں ایک اچھوتا انشائیہ ہے۔ غلام جیلانی اصغر انشائیہ جھوٹ کی حمایت میں اپنی رائے قائم کرتے ہیں کہ انسان غیر دانستہ طور پر کبھی بھی جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتا جھوٹ بولنے کے لیے انسان کا ذہن بھی بہت پیچیدہ، باریک بین اور دوررس ہونا چاہیے اسی وجہ سے احمق آدمی جھوٹ نہیں بولتے اس طرح جس ادب میں ہر طرف سچائی لکھی نظر آئے ایسا ادب گھٹیا اور مصنوعی ہی نظر آتا ہے۔ اس طرح دوسروں کو خوش کرنے کے لیے دانستہ طور پر جھوٹ بولنے سے احتراز نہیں کرنا چاہیے۔

غلام جیلانی اصغر "بچہ پالنا" جیسے منفرد موضوع کا انتخاب کرتے ہیں اور بچہ پالنا کے بارے میں کہتے ہیں کہ بچہ پالنا کچھ مشکل امر تو نہیں مگر بچے میں خود بھی پلنے کی پوری صلاحیت ہونی چاہئیے بچہ عام طور پر اپنی ذات کو نمائشی طور پر بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے اور وہ آمریت کے طور پر رو رو کر محلے والوں کو اکٹھا کر لیتا ہے بچوں کی عام طور پر دو اقسام ہوتی ہیں پہلا دیدہ زیب اور دوسرا دیدہ فریب۔ بچے کو پالنے کے لیے دوسرے کی گہری وابستگی ہونی چاہئیے اگر دوری یا فاصلے سے بچہ کو پالنے کی جدوجہد کی جائے تو ناکامی آپ کا مقدر رہے گی۔ اگر انسان کی شخصیت میں یک رخا پن کی خامی ہو تو آپ کو بچہ نہیں پالنا چاہئیے۔

غلام جیلانی اصغر نے انشائیہ "غیر ذمہ داری" جیسے انوکھے موضوع پر لکھا ہے غیر ذمہ داری بڑی محنت اور بہت ذمہ داری والا کام ہے اس لیے ہمارے معاشرے میں ذمہ دار افراد کی تعداد بہت تھوڑی ہے در حقیقت بے غرض انسان غیر ذمہ دار ہی ہوتا ہے ذمہ دار انسان ہر کام سوچ سمجھ کر کرتا ہے اور اس کی ایک منزل ہوتی ہے اور ہر کام کسی سازش یا چال کے تحت کرتا ہے۔ غیر ذمہ دار انسان کوئی کام منصوبے کے تحت نہیں کرتا۔ ذمہ دار لوگ اپنی موت کی ذمہ داری خود پر ہی ڈالتے ہیں ان کی موت کبھی حادثاتی یا فطری طور پر نہیں ہوتی۔ غیر ذمہ دار افراد کرسی پر بیٹھنے والے کام کو قبول نہیں کرتے یہ غیر ذمہ داری کی عادت ان کی طبعیت کے بالکل منافی نہیں غیر ذمہ دار شخص سارے فیصلے چائے کی میز پر ہی کرتا ہے مصنف کے خیال میں آرٹ، فن یا انشائیہ کے لکھاری بھی غیر ذمہ دار افراد کی فہرست میں ہی آتے ہیں۔

غلام جیلانی اصغر انشائیہ "سردی" میں سردی کے موسم میں پیدا ہونے والے احساسات اور اس کے اثرات کو احاطہ تحریر میں لاتے ہیں۔ سردی صوری طور پر تانیثیت کے طور پر برتی جاتی ہے مصنف اس کا تعلق طبقہ نسواں سے جوڑتے ہیں اسی وجہ سے اس کا پورا نظام بھی مادر سری ہی ہے اسی وجہ سے اس میں ماں جیسی شفقت، ملائمت اور خود سپردگی پائی جاتی ہے اگرچہ سردی کا موسم کوئی فن پارہ تخلیق کرنے کے عین مزاج ہے۔

غلام جیلانی اصغر "بلڈ گروپ" جیسے منفرد موضوع کو احاطہ تحریر میں لاتے ہیں۔ غلام جیلانی بیان کرتے ہیں:

> "انگلستان کا شاہی خاندان طترت کے اس سربستہ راز سے آشنا ہے، چنانچہ وہ ہر دو سو سال کے بعد باہر سے نیا بلڈ گروپ لے آتا ہے۔ کبھی جرمن، کبھی بویریا سے کبھی سکاٹ لینڈ سے۔ اس طرح مین پائپ تو وہی رہتا ہے، لیکن ادھر ادھر سے اس میں چھوٹے پائپ آکر مل جاتے ہیں، اور پانی گدلا ہونے کے باوجود حیاتیاتی قوت نمو سے مالامال ہو جاتا ہے۔"[۸]

تاہم بعض گروپ زمانہ شناس ہوتے ہیں وہ باہر سے مختلف طبقات کے لوگوں کو برآمد کر کے گروپ کو قوت فراہم کرتے ہیں۔ غلام جیلانی اصغر ”گالی دینا“ جیسے انوکھے موضوع کا انتخاب کرتے ہیں اور گالی دینے کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہیں گالی دینے کو اکثر معیوب فعل سمجھا جاتا ہے شریف النفس لوگ اس سے اجتناب کرتے ہیں ادب میں گالی صرف آرٹسٹک ذوق کے لیے دی جاتی ہے تا کہ اسٹائل میں وزن پیدا ہو جائے تاہم گالی کی ابتداء جنگلات کی بجائے کھلے میدانوں میں ہوئی گالی عام طور پر عالمگیر سطح تک بھی نکالی جاتی ہے یورپ کی گالی آرام دہ ہوتی ہے جبکہ پنجاب کی گالی تیسری عالمگیر جنگ لگانے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ گالی دینے کے بعد انسان اپنے آپ کو ہلکا پھلکا بھی محسوس کرتا ہے۔ عام طور پر وہی لوگ گالی دیتے ہیں جو نرگسیت اور داخلیت کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں تاہم گالی دینا جمہوریت کے فروغ کا باعث ہوتی ہے اور آمریت کے دور میں تو گالی دینے پر پابندی عائد کی جاتی ہے۔

غلام جیلانی اصغر انشائیہ ”پوتا“ میں ہمارے مشرقی معاشرے میں دادا کے لیے پوتے کی اہمیت کو بخوبی بیان کرتے ہیں مشرق میں پوتا دادا کا نام زندہ رکھنے کا سب سے سہل طریقہ ہے دراصل پوتا روایات کا نمائندہ اور پاسدار ہوتا ہے۔ غلام جیلانی اصغر ریٹائرمنٹ اور ”ریٹائرمنٹ کے بعد“ کے حالات و مشکلات کو شگفتہ انداز سے احاطہ تحریر میں لاتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کو آرام اور آسودگی میسر کرنے کا سبب سمجھا جاتا ہے مگر ریٹائرمنٹ کے بعد گھریلو ناآسودگی ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مصنف کے خیال میں ریٹائرمنٹ ایک بیماری کی طرح ہے جیسے بیماری کا سن کر رشتے دار اور لوگ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں ویسے ہی ریٹائرمنٹ کے بعد رشتے دار ،عزیز اور دوستوں کا رد عمل ہوتا ہے۔ ریٹائرمنٹ آدمی کو اہل خانہ کے لیے بوجھ ہی سمجھا جاتا ہے۔

> ”ریٹائرمنٹ دراصل ایک طویل قید کے بعد آسیب زدہ جیل سے رہا ہونے کی ایک علامت ہے۔ یہ آزادی اور خود مختاری کا ایک واضح سمبل ہے۔ یہ ازمنہ وسطیٰ کے غلامانہ جبر سے نکل کر جاگیرانہ فراغت اور شرافت کا ایک نشان ہے۔ یہ ایک آزاد روح کو کرسی کی آہنی گرفت سے آزاد کرانے کا منصوبہ ہے یہ مر کر زندہ ہونے کا علامیہ ہے۔“[۹]

گویا ریٹائرمنٹ کے بعد آدمی کو وہ عزت نہیں ملتی جو حاضر نوکری کے وقت ملتی تھی تاہم ریٹائرمنٹ کے بعد بہت سے مسئلوں کے ساتھ پنشن وصول کرنے کا بھی مسئلہ درپیش آتا ہے۔ غلام جیلانی اصغر انشائیہ ”بستر میں لیٹنا“ میں بستر میں لیٹنے کے بے شمار فوائد بتاتے ہیں۔ دنیا کے بہت سے مسائل بستر میں لیٹ کر حل کیے جاسکتے ہیں یونانی حکماء بھی لیٹ کر ہی سوچتے، ارسطو اور افلاطون بھی لیٹ کر ہی فلسفے پر بحث و مباحثہ کرتے دنیا کا بہت سا ادب

بھی لیٹ کر ہی بچوں کو سفر کی داستانیں اور کہانیاں سنا کر تخلیق ہوا ہے۔ روم کے اکثر لوگ بانسری بجاتے، کہانی شعر سنتے اور جنگیں بھی لڑتے اور نتیجے کے طور پر روم دنیا کا مرکز بننے میں کامیاب ہو گیا لہٰذا بے کاری سے لیٹنا اور بستر میں لیٹنا میں بہت فرق ہے۔ مصنف کے خیال میں لیٹنے سے پہلے آپ کو اپنی نیت کا بھرپور جائزہ لینا ہو گا کیونکہ بستر میں ہی آپ ہر کام خیر عافیت سے سرانجام دے سکتے ہیں۔

غلام جیلانی اصغر انشائیہ ”ملاقات“ میں ملاقات کے طور طریقوں کو موضوع بحث بناتے ہیں اور ملاقات کے آداب پر بھی بات کرتے ہیں۔ ملاقات کرنے سے قبل جگہ، گفتگو کا موضوع اور دوسرے کے موڈ کو جانچ لینا چاہیئے ملاقات دو اشخاص کا نہیں بلکہ دو انفاس کا ملنا ہوتی ہے اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اجنبیت ہی قائم رہتی ہے۔ اس طرح عام آدمی سے ملاقات ہو تو صرف رسمی تعارف ہی ہوتا ہے اگر ملاقات کرتے وقت اپنے تعارف کے ساتھ دوسرے کی خوشامد بھی کریں تو ملاقات کا دروازہ آپ کو کھلا ہی ملے گا اور اگر ملاقاتی سے آپ کی ذہنی وابستگی نہ ہو تو آپ صرف ملنے کو ہی کافی سمجھیں گے۔

غلام جیلانی اصغر انشائیہ ”عادت“ میں انسانی عادت کو دائرہ تحریر میں لاتے ہیں کہ انسان کو زندگی میں مختلف عادات کی عادت ہوتی ہے گویا انسانی زندگی خود ایک عادت ہے عادت چاہے اچھی ہو یا بُری یہ انسان کی زندگی کو سہل اور آسان بنا دیتی ہے بعض لوگ جو یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ انہیں کوئی عادت نہیں ہے تو وہ خود کو دھوکہ دے رہے ہوتے ہیں مصنف عادت سے چھٹکارا پانے کا ایک موثر طریقہ بھی بتاتے ہیں کہ ہم اپنی عادات وقت کے ساتھ بدلتے رہیں تاکہ بے رنگی ختم ہو اور دلکشی پیدا ہو اور بوریت کا بھی قلع قمع ہو اور عادات ختم کرنا اسی طرح ممکن ہے کہ آپ ایک عادت ختم کر کے اس کے متبادل کسی دوسری عادت کو اپنا لیں تاہم انسان ساری زندگی عادتوں سے آزادی حاصل نہیں کر سکتا اگر ایسا ہو تو انسان کا جینا انتہائی مشکل ہو جائے۔ اگرچہ غلام جیلانی اصغر کے انشائیہ کے موضوعات غیر معمولی ہیں انہوں نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا جن پر پہلے انشائیہ نہیں لکھا گیا۔ ان کے انشائیوں کے موضوعات غیر روایتی ہیں اور ان کی اپنی ایک انفرادیت ہے غلام جیلانی اصغر اپنی رائے دیتے ہیں۔

> ”انشائیہ کسی موضوع کا پابند نہیں ہے۔ مسئلہ تو موضوع کے پُر اسرار پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے، جس طرح ایک اچھا فوٹو گرافر کسی شے یا Object کا ایک غیر معمولی زاویہ تلاش کرتا ہے جہاں سے تصویر ایک نیا رُخ اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح انشائیہ نگار موضوع کے ان پہلوؤں کی نشاندہی کرتا ہے جو قاری کی نگاہ سے پوشیدہ ہوں۔“[۱۰]

ان کے انشائیے پڑھنے سے قاری ہر بار موضوع کے کسی نئے گوشے اور پہلو سے واقف ہوتے ہیں۔اس سے فکر کا کوئی نیا پہلو اُجاگر ہوتا ہے۔اس طرح ان کے انشائیوں میں سوچ و فکر کی گہرائی بخوبی موجود ہے۔وہ اپنے انشائیوں میں قاری کے لیے نئے راستے اور نئی راہیں وا کرتے ہیں۔وہ چھوٹے اور مختصر موضوع کو نہایت قرینے سے پیش کرتے ہیں کہ بڑے سے بڑا اہل قلم ان کی اس خوبی کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کرنل محمد خان ان کے انشائیوں کے مجموعی اسلوب کو یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ خوبصورت، معنی خیز اور عام فہم بات کرتے ہیں۔وہ اپنے چھوٹے سے چھوٹے موضوع کو بیان کے ہنر سے ہیر ابنانے میں ماہر ہیں۔

ان کے انشائیے ان کی زندگی کے عملی تجربات و مشاہدات سے اخذ ہوئے ہیں۔غلام جیلانی اصغر زندگی کو قنوطیت کی بجائے خوش فکری کی نظر سے دیکھتے ہیں۔غلام جیلانی اصغر زندگی میں پابندیوں کو قبول نہیں کرتے بلکہ آزاد پنچھی کی طرح کھلی فضا میں سانس لینے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ زندگی کو ہشاش بشاش دکھاتے ہیں۔غلام جیلانی اصغر نے ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ انشائیہ کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

سجاد نقوی ان کی تقریروں کو زبانی انشائیہ کا بھی نام دیتے ہیں۔تاہم ان کے انشائیوں میں زندگی کے مختلف رنگ پوری آب و تاب سے موجود ہیں۔وہ اپنی تحریروں میں خارج سے داخل اور خارجیت سے داخلیت کے ساتھ تعلق جوڑ کر خیالات، عمیق مشاہدے، علمی بصیرت اور گہرے تجربات کا استعمال کر کے اپنے انشائیوں کو خوشنما اور قاری کے لیے قابل مسحور بنا دیتے ہیں۔وہ زندگی کے اُتار چڑھاؤ اور تضادات و مشترکات سے مواد اخذ کرتے ہیں اور نتیجہ خیزی سے قاری کو آگاہ بھی کرواتے ہیں۔ان کے ہاں فطرت سے گہرا لگاؤ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

اگرچہ ان کی تخلیق میں بہت وسعت پائی جاتی ہے آپ نے پختہ عمر میں انشائیے لکھنے شروع کیے آپ نے انگریزی ادب کا بھی گہرا مطالعہ کر رکھا تھا جب آپ انشائیہ لکھنے کی طرف راغب ہوئے تو ان کے خیالات پختہ ہو چکے تھے۔وہ انشائیہ لکھتے وقت دور سوچ کے بھنور میں پہنچ کر واپس اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹ آتے ہیں۔وہ ہمیشہ منفرد اور نیا موضوع تلاش کر کے اس پر طبع آزمائی کرتے۔وہ اپنے انشائیوں میں "مدار" سے الگ ہو کر ایک مختلف "مدار" سامنے لاتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں انکشاف ذات اور شگفتی بھی پائی جاتی ہے۔وہ روایتی انداز سے سوچنے کی بجائے زندگی کو بے فکر انسان کی طرح غور کرتے اور سمجھتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں سوچنے کا انداز ایک ہلکی سی لکیر کی مانند ہے۔ان کے ہاں زندگی کا گہرا فلسفہ موجود نہیں ہے۔وہ اپنے انشائیوں میں دلائل دینے کی بجائے سادہ انداز سے اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہیں۔انہیں وزیر آغا کے بعد دوسرا بڑا انشائیہ نگار کہا جاتا ہے۔

ج۔ مشتاق قمر کے انشائیوں کا فکری جائزہ:

مشتاق قمر تواتر کے ساتھ انشائیہ لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کا پہلا انشائیوں کا مجموعہ ۱۹۷۰ء میں ”ہم ہیں مشتاق“ کے نام سے شائع ہوا مشتاق قمر انگریزی کے استاد تھے اس لیے وہ انگریزی انشائیہ سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ ان کو جدید دور کے انشائیہ کے بانیوں میں شامل کرنے تک ڈاکٹر وزیر آغا کا ہاتھ ہے، ڈاکٹر وزیر آغا نے ”انشائیہ کے خدوخال“ کو مشتاق قمر کے نام سے منسوب کیا۔ وہ آغاز سے طنزیہ مضامین لکھتے آرہے تھے اس وجہ سے ایک مدار سے نکل کر دوسرے مدار میں آنا بے حد مشکل تھا۔ انہوں نے ہمت نہ ہاری اور چار برس تک مسلسل کوشش کر کے انشائیہ لکھنے میں کامیاب ہوگئے۔ وزیر آغا نے انشائیہ ”چھتری“ کو بارش کا پہلا قطرہ قرار دیا جو ۱۹۶۶ء میں رسالہ اوراق میں شائع ہوا۔ ۱۹۶۹ء تک اوراق کے ہر شمارے میں ان کا انشائیہ چھپتا رہا اور فروری ۱۹۷۰ء تک ”ہم ہیں مشتاق“ کے نام سے انشائی مجموعہ پیش کیا اس مجموعے کا دیباچہ پہلا پتھر انور سدید نے لکھا۔ ”ہم ہیں مشتاق“ میں چودہ انشائیے شامل ہیں جن کے عنوانات یہ ہیں۔ بال کٹوانا، چھتری، بیٹھنا، آئس کریم کھانا، دھوپ کھانا، تبدیلی نام، کوہ پیمائی، لونا ٹہم، بھول جانا، بڑھاپا، اپالو ٹریجڈی، کچھ نیند کی مذمت میں، شہرت کی مخالفت میں اور مرزا غالب زندگی کی ساتویں جہت ہیں۔

مشتاق قمر نے اپنے انشائی مجموعے کا عنوان ”ہم ہیں مشتاق“ غالب کے ایک شعر ٹکڑے سے لیا ہے اور یہ اپنے طور پر اچھوتا نظر آتا ہے اس میں وہ حقیقت پوشیدہ تھی جو ہر حساس انسان میں موجود ہوتی ہے۔ مشتاق قمر نے عام زندگی اور معاشرے سے موضوعات کا انتخاب کیا ہے آپ کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ تاہم جس دور میں مشتاق قمر نے انشائیہ لکھنا شروع کیا وہ انشائیہ کا زریں دور تھا۔ ان کے انشائیوں پر کافی تنقید بھی ہوئی مگر انہوں نے آغاز میں ہی بیشتر کمزوریوں پر قابو پالیا اور اس کی راہ میں ہر آنے والی مشکلیں خود دم توڑ گئیں۔ ان کے انشائیوں کی اپنی انفرادیت ہے ان کے انشائیوں میں سوچ کی ہلکی سی لہر پائی جاتی ہے اور اس لہر کو ان کے فلیپ نگار عارف عبدالمتین نے ایک خاص نوعیت کے فلسفیانہ اسلوب تدبیر کا نام دیا ہے۔

مشتاق قمر نے تہذیب کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ انسان اور مظاہر کی فطرت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ انشائیہ ”بال کٹوانا“ میں قدیم اور جدید تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے اور تہذیب کو انہوں نے نہایت شگفتہ انداز سے بیان کیا ہے۔ مشتاق قمر بال کٹوانا کو تہذیبی عمل گردانتے ہیں۔ مردوں کے بڑے بال پرانی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں اور جوں جوں تہذیب ترقی کرتی موجودہ دور میں پہنچی ہے تو آدمیوں نے مہذب

طریقے سے چھوٹے چھوٹے بال کٹوانا شروع کر دیے ہیں اور مصنف ان لوگوں پر طنز کرتے ہیں جنہیں کتب بینی کا شوق ہوتا ہے اور اس شوق میں ان کے بال یعنی تہذیب کی آخری نشانی سرے سے غائب ہی ہو جاتی ہے۔ مردوں کے مقابلے میں عورتیں پرانی تہذیب سے چمٹی نظر آتی ہیں اور بعض عورتیں جدید تہذیب کے طور طریقوں کو اپناتے ہوئے مردوں کی ہم سری کرتے ہوئے بال کٹوا دیتی ہیں۔ عام طور پر قہوہ خانوں، ریستورانوں، کالجوں اور کلبوں وغیرہ کو جدید تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔

انشائیہ "چھڑی" میں انسان کی زندگی میں آنے والے مدارج کو شگفتہ انداز سے واضح کیا گیا ہے اور چھڑی کو بطور علامت برتا گیا ہے۔ مشتاق قمر چھڑی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں کہ چھڑی کے بہت سے فوائد ہیں چھڑی بڑھاپے کا سہارا ہوتی ہے چھڑی ظاہری شکل اور صورت سے خوبصورت ہوتی ہے بلکہ یہ زندگی میں توازن بھی قائم رکھتی ہے اس طرح لوگ چھڑی اور لاٹھی کو لوگ ایک دوسرے میں غلط ملط کر دیتے ہیں مشتاق قمر ان کے بنیادی فرق کو واضح کرتے ہیں کہ چھڑی تحمل و بربادی اور غور و فکر کی عکاسی کرتی ہے جبکہ لاٹھی جوش، جذبہ، طاقت اور ولولے کو ظاہر کرتی ہے اور جب کوئی شخص ہاتھ میں لاٹھی لے کر مٹر گشت کرتا ہے تو فطرت اس پر عیاں ہوتی ہے گویا چھڑی جمالیاتی تسکین کا ذریعہ ہے تاہم چھڑی مردانہ وجاہت کے ساتھ ساتھ فہم و فراست جیسی صفات کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ چھڑی داخل کے ساتھ ساتھ خارج کی صلاحیتیوں کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ تاہم چھڑی ہمیں اپنے ماضی کی بھی یاد دلاتی ہے جب انسان کا واحد سہارا چھڑی ہی تھا اور انسان گھنے جنگلوں اور بیابانوں میں رہتا تھا اور یہ چھڑی اس دور کی طرف مراجعت کرنے پر انسان کو اکساتی ہے گویا مشتاق قمر نے چھوٹی سی چیز پر قلم اٹھا کر ناقدین کو حیرت میں ڈال دیا۔

انشائیہ "بیٹھنا" میں مصنف منفرد انداز کی نکتہ آفرینیاں منظر عام پر لاتے ہیں اور یہ اپنے انداز میں نیا اور انوکھا انشائیہ ہے۔ اس میں بیٹھنے کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے کہ لیٹنا جمود کی علامت ہے اور کھڑے رہنا ایک مشکل کام ہے کہ اس پر انسان ثابت قدم نہیں رہ سکتا اور ثابت رہنے کے لیے انسان کو ایکسی لیٹر کا سہارا لینا پڑتا ہے جبکہ بیٹھنا نہایت پر لطف اور خواب آور کیفیت ہے مشتاق قمر بیٹھنے کی اہمیت بتاتے ہیں:

> "بیٹھنے کا عمل حرکت اور سکوت کا ایک دلکش سنجوگ ہے، یہ وہ مقدس مقام ہے جس کے ایک طرف زندگی اپنے تمام تر شور و شغف کے ساتھ پڑاؤ ڈالے پڑی ہے اور دوسری طرف موت کی یخ بستگی شرابی کی طرح رقص کناں ہیں۔"[11]

انسان کا چہرہ بیٹھنے سے کھل جاتا ہے بعض لوگ بیٹھنے کو سستی اور کاہلی کا عمل گردانتے ہیں جبکہ بیٹھنے کے لیے انسان کا پختہ ارادہ اور کوشش درکار ہوتی ہے تاہم بیٹھنے کے ساتھ ہی انسان خوش آئندہ خواب دیکھتا ہے کہ دونوں ماں باپ بیٹھے ہیں اور کب ان کا بچہ کمائی کرے گا اور انہیں بیٹھا کر کھلائے گا گویا مصنف کی نظر میں زندگی کا لطف اور مزہ بیٹھنے میں ہی ہے تاہم بیٹھنا سکون اور آرام کی علامت ہے۔ مشتاق قمر کے انشائیوں میں عمیق مشاہدہ اور تجربہ جھلکتا ہے۔ انشائیہ ''آئس کریم کھانا'' بھی ان کے تجربے اور مشاہدے کی عمدہ مثال ہے اس انشایئے میں مشتاق قمر آئس کریم کھانے کو ایک ناخوشگوار عمل کہتے ہیں کہ یہ انسانی خلیوں کو جامد بنا دیتی ہے اور یہ کھا کر انسانی خلیے حرکت کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ آئس کریم کے مقابلے میں چائے انسان کو ہر وقت چست و چابندر کھتی ہے اور اس کے پاس ہر مسئلے کا حل ہر وقت موجود رہتا ہے۔ مشتاق قمر آئس کریم کھانے کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں آئس کریم مشروب ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا شمار ماکولات میں ہوتا ہے جبکہ چائے پینے سے زندگی اور جسم میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔

مشتاق قمر فطرت سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں اور انشائیہ ''دھوپ کھانا'' اس کی عمدہ مثال ہے۔ فطرت کی عکاسی ان کے انشائیوں میں پایا جانے والا غالب موضوع ہے اس انشایئے میں فطرت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے کہ انسان کا کام صرف دریاؤں کا رخ موڑنا یا تبدیل کرنا نہیں بلکہ دریا کے کنارے بیٹھ کر دھوپ سے لطف اندوز ہونا بھی ہے مصنف مزید مشورہ بھی دیتے ہیں کہ جب سورج بلندی پر ہوتا ہے تو کسی مناسب جگہ پر لیٹ کر سورج کی ان کرنوں سے لطف اندوز ہونا چاہئیے اور معاشرے کے مسائل پر غور و فکر کر کے ان کے حل تلاش کرنے چاہئیں اگر اس طرح مسائل کو جانچا اور پرکھا جائے تو ان مسائل کو حل ہو جانے کا قوی امکان ہے گویا دھوپ کا موسم سرما میں آتا ہے۔ جس میں کلیاں چٹکتی ہیں ، پھول کھلتے ہیں، درخت سر سبز ہوتے ہیں اور اس سے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ بعض لوگ سن باتھ اور دھوپ کھانا کو ایک ہی سمجھتے ہیں جبکہ سن باتھ میں جنس مخالف کے ساتھ کسی کی موجودگی ہونا بھی ضروری ہے اور دھوپ کھانے میں تنہائی درکار ہے۔ مشتاق قمر کہتے ہیں:

> ''زندگی کی اصل مسرتوں کا راز ان ہی چھوٹی چھوٹی چیزوں۔۔۔۔۔۔۔۔ دھوپ، گنے درخت کی رس بھری ٹہنی۔۔۔۔۔۔۔۔ میں مضمر ہے اور جتنی دیر آپ ان سے ناآشنا رہیں گے اتنی دیر آپ زندگی کا پورا لطف اٹھانے سے قاصر رہیں گے۔''[۱۴]

مشتاق قمر سائنسدانوں پر بھی طنز کرتے ہیں جو سورج کی شعاعوں کو قید کر کے سولر پینل آلات ایجاد کرتے ہیں اور سورج کی شعاعوں کو قید کرنے پر معمور ہیں مگر ان کے مطابق سورج کی شعاعوں کو ان تک آنے تک روکا

نہیں جا سکتا۔ مشتاق قمر محض تفنن طبع کے لیے انشائیہ نہیں لکھتے بلکہ زندگی کے کسی ایک پہلو کو توجہ مرکز بناتے ہیں۔ آپ گہرے مشاہدے کی کسوٹی پر نئے مفاہیم سامنے لاتے ہیں ان کے ہاں سستا جذباتی رد عمل نہیں ملتا تاہم ان کے انشائیے گہری اور مثبت سوچ بچار کے بعد انشائیے کا روپ دھار لیتے ہیں۔ "تبدیلی نام" مشتاق قمر کا ایک ایسا ہی انشائیہ ہے جس میں کسی بھی شے، چیز، انسان یا جگہ کا نام نہ رکھنے کو بہترین مانا گیا ہے گویا یہ اپنی طرز کا انوکھا انشائیہ اور موضوع ہے مصنف نے دو بھائیوں دلاور خان اور اکبر خان کو دیکھ کر یہ انشائیہ اخذ کیا ہے۔ دلاور خان اپنی زندگی کا زیادہ عرصہ دلاور خان بن کر ہی گزارتا ہے مگر ایک دن اچانک دلبر خان بن کر سامنے آتا ہے مگر جب مصنف دلبر خان کو جانچتے اور دیکھتے ہیں تو دلاور خان وہی پرانے والا دلاور خان ہوتا ہے اس میں دلبر خان والی خوبیاں نظر نہیں آتیں اور نہ ہی اس کی شخصیت میں کوئی نمایاں خوبی نظر آتی ہے۔ زیر نظر انشائیے میں مصنف اخذ کرتے ہیں کہ در حقیقت چیزوں کا اپنا کوئی نام نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے کسی نام سے پکارنا چاہیئے چیزوں کی اصل خوبصورتی بے نام رہنے میں ہی ہے اور گمنام چیزوں میں ہی اصل خوبصورتی جھلکتی نظر آتی ہے۔

انشائیہ "کوہ پیمائی" میں انسان کی فطرت کی عکاسی کی گئی ہے کہ انسان ہمیشہ بلندی پانے کی خواہش رکھتا ہے اور اس کے لیے مصمم ارادہ بھی کر لیتا ہے اور تگ و دو بھی کرتا نظر آتا ہے۔ در حقیقت کوہ پیمائی بھی اس شوق کا مظہر ہے کہ انسان کوہ پیمائی کا جناتی لباس زیب تن کر کے اور آکسیجن کے کئی پونڈ وزنی تھیلے اٹھائے ہانپتا کانپتا چوٹی سر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

> "انسان کے ذہن میں نا معلوم وجوہ کی بنا پر ازل سے ہی بلندی کا ایک تصور موجود ہے۔۔۔۔۔اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں اس بلندی تک رسائی حاصل کرنے کی زبردست خواہش پائی جاتی ہے جسے وہ تگ و تاحیات میں مختلف کروٹیں دیتا رہتا ہے۔ ہماری زندگی کے ہر پلان کا گراف بلندی کی طرف اٹھتا دکھائی دیتا ہے۔۔۔۔۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہم نے بھولے سے بھی زندگی کے نقطہ آغاز کی بلندی سے نشیب کی طرف لڑھکنے کا پروگرام مرتب کیا ہو۔۔۔۔۔۔ بلکہ اس امر کا پورا پورا اہتمام برتا جاتا ہے کہ ہمارا ہر قدم اوپر ہی کی طرف اٹھنے پائے۔"[۳۴]

بعض دفعہ کوہ پیما راستے کی دشواریوں اور مشکلات کی وجہ سے اوب جاتے ہیں لیکن بعض کوہ پیما جوش و جذبے سے لبریز ہو کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر ہی دم لیتے ہیں۔ لیکن جب کوہ پیما کے داخلی جذبات سرد پڑ جاتے ہیں تو کوہ پیما کے قدم پستی اور نشیب کی طرف ہی آتے ہیں۔ مشتاق قمر زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنا موضوع بناتے ہیں وہ

زندگی کی پوری کہانی کو بیان نہیں کرتے بلکہ زندگی کے ایک پہلو کو اپنا موضوع بناتے ہیں اور اس پہلو کے چھپے ہوئے گوشوں کو اپنا موضوع بناتے ہیں وہ اپنی قوت متخیلہ سے برابر کام لیتے ہیں اور موضوع کو محسوس کرتے ہیں اور پھر اس موضوع کے مخفی مفہوم کو سطح عام پر لانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

انشائیہ "بھول جانا" میں مصنف انسان کی کمزوری بھولنے کو موضوع بناتے ہیں چونکہ بھول جانا ایک فطری عمل ہے جس کی وجہ انسان کا کمزور حافظہ ہے لیکن مصنف بھول جانے کی کمزوری کی بجائے اسے ایک خوبی گردانتے ہیں کیونکہ بھول جانا عفو درگزر کو جنم دیتا ہے اور بھول جانے میں ہی صبر، آرام و سکون اور عافیت ہے اور دل میں کدورت رکھنے کی بجائے بھول جانے سے ہی دائمی مسرت کا حصول ممکن ہے۔

> "ذرا ذرا بات یاد رکھنے والے انسان کہاوتی بھڑیئے کی طرح انتہائی خطرناک ہوتے ہیں وہ کسی وقت بھی کوئی گڑھا مردہ اکھیڑ کر خلل عامہ کا باعث بن سکتے ہیں۔ لیکن بھول جانے کی صلاحیت رکھنے والے بزرگ سوسائٹی یا فرد کے لیے بھیڑ کے بچے سے بھی زیادہ بے ضرر ہوتے ہیں۔"[۱۴]

بھول جانے والے شخص کو لوگ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں یاد رکھنا جسمانی تقاضا ہوتا ہے جبکہ بھول جانا روحانی عمل گردانا جاتا ہے تاہم یاد کرنا دنیا کے آسان ترین کاموں میں سے ایک ہے لیکن بھولنے کے لیے نئے سرے سے ذہن کی تخلیق ہوتی ہے۔ اسطرح انشائیہ "بڑھاپا" میں مشتاق قمر بڑھاپے کو دو قسموں میں تقسیم کرتا ہے پہلی قسم کا تعلق انسان کی داخلیت سے ہوتا ہے اس میں انسان اپنی اصل عمر سے خود کو تجاوز محسوس کرتا ہے اور اس کا ذہن بہت جلد ترقی کر رہا ہوتا ہے جو انسان کے لیے مایوسی کا سبب بنتا ہے اس طرح کا بڑھاپا آپ کا جانی دشمن ہوتا ہے اور دوسری قسم کے بڑھاپے کا تعلق انسان کے خارج سے ہے جو کہ فطرتی ہے۔ انسان خارج سے بوڑھا نظر آتا ہے مگر داخل کے بارے میں کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا تاہم بڑھاپا انسان کی تمام منفی قوتوں کو سلب کر دیتا ہے۔ مشتاق قمر مزید بڑھاپے کے بارے میں کہتے ہیں کہ کوئی انسان بڑھاپے کی سرنگ سے گزرے بغیر مکمل انسان نہیں کہلوا سکتا گویا بڑھاپے میں انسان کے اعضاء کمزور ہو جاتے ہیں مگر بڑھاپے میں انسان اس قدر دانا ہو جاتا ہے کہ اس سے کسی قسم کی کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی اور یہی وہ مقام ہے جہاں زندگی اپنے اصل روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے اور اس کے لیے خارج اور باطن دونوں پر بڑھاپے کو مسلط کرنا ضروری ہے۔

مشتاق قمر عام معاشرے سے اپنے موضوعات کو منتخب کرتے ہیں مگر آپ نے معمولی موضوعات سے نئے معنی دریافت کر کے معمولی موضوعات کو بھی خاص کر دیا ہے اس طرح آپ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اپنا قلم ریز

کرتے ہیں ”اپالوٹریجڈی“ میں مصنف توہمات اور توہم پرستی کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں اور سائنسی ایجادات کو رد کرتے ہوئے توہم پرستی کا ساتھ دیتے ہیں مشتاق قمر انشائیے میں اپنے علاقے کے بارے میں بتاتے ہیں کہ وہاں لوگ شادی بیاہ گویا ہر موقعے پر لوگ دیا جلانا نہ بھولتے۔ عام طور پر دیہاتی علاقوں میں توہم پرستی کا رحجان زیادہ ہوتا ہے قبرستان کی سب سے پرانی قبر پر دیا جلانا، کالی بلی کا راستہ کاٹنا، کوے کے بولنے پر مہمان کی آمد اور زیتوں کی شاخ امن کا باعث وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کوئی کام شروع کرنے سے پہلے ستاروں کے بارے میں معلومات، گٹھ جوڑ اور بزرگ لوگوں سے آشیر باد بھی لیا جاتا ہے۔ مصنف مزید اپنی رائے دیتے ہیں کہ بعض دفعہ توہمات سچی ثابت نہیں ہوتیں اور اگر یہ سچی ثابت نہ ہوں تو اس کے پیچھے حادثات کا ہاتھ ہوتا ہے اور حادثات تو سائنسی ایجادات میں بھی حائل ہو سکتے ہیں اور اس دلائل کو ثابت کرنے کے لیے مصنف اپالوٹریجڈی کی مثال دیتے ہیں کہ یہ حادثہ بھی کالی بلی کے راستہ کاٹنے سے ہی رونما ہوا تھا اپالو ون وہ خلائی راکٹ تھا جس میں تین خلاباز، دو امریکی اور ایک کورین موجود تھا اور اس راکٹ کا تکنیکی خرابی کی وجہ سے زمین سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا اور یہ تینوں خلاباز جان بحق ہو گئے اور مصنف کے خیال میں اس حادثے کی اصل وجہ کالی بلی کا راستہ کاٹنا تھا۔ مشتاق قمر توہم پرستی کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

> ”دراصل توہم پرستی (جسے بدقسمتی سے اچھے الفاظ میں یاد نہیں کیا جاتا) علامتوں کی زبان ہے اور اس سے پوری طرح استفادہ کرنے کے لیے ان علامتوں کی گتھیاں سلجھانا اور ان کی زبان سمجھنا بے حد ضروری ہے۔“[۱۵]

انشائیہ ”نیند کی مذمت میں“ ایک منفرد طرز کا انشائیہ ہے جس میں مصنف نیند کی مذمت کرتے ہیں اور جاگنے کو بہترین فعل گردانتے ہیں۔ ان کے خیال میں چھ گھنٹے کی نیند کو ایک مجرب کام سمجھا گیا ہے مگر مصنف کے خیال میں رات کے سناٹے میں بستر پر تکیہ لگا کر کائنات کی لامحدود خوبصورتی میں خود کو ضم کر دینا چاہئیے اور اس لمحے آپ کو سکون اور آشتی جیسی نعمت میسر ہو گی اور مصنف مزید نیند کی تاریخ پر بات کرتے ہیں کہ نیند قرون وسطیٰ کی تخلیق کردہ ہے مگر قرون وسطیٰ تو فطرت کے شیدائی تھے تو پھر اتنی لمبی تان کر نہ سوتے ہوں گے تاہم قرون اولیٰ کے لوگ زندگی کی نمائندگی کرتے تھے اس لیے وہ نیند کی بجائے جاگنے کو زیادہ پسند کرتے تھے تاہم نیند قرون وسطیٰ میں ایجاد ہوئی تاہم مشتاق قمر کے خیال میں نیند ایک فطری عمل نہیں ہے اگر یہ فطری ہوتا تو سونے کے اوقات کار مقرر ہوتے ان کے خیال میں نیند یکسانیت اور بوریت سے بچنے کا ایک بہانہ ہے۔

"شہرت کی مخالفت میں" انوکھا مگر دلچسپ انشائیہ ہے اس انشایئے میں مصنف شہرت سے زیادہ گمنامی کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں انسان اپنی پوری زندگی شہرت حاصل کرنے اور داد وصول کرنے میں صرف کر دیتا ہے۔ انسان جب شہرت یافتہ ہو جاتا ہے تو اس کی شخصیت کے مبہم اور چھپے پہلوؤں کی بھی تحقیق کی جاتی ہے اور اس کی زندگی کے پوشیدہ پہلو بھی سب کے سامنے عیاں ہو جاتے ہیں جو وہ سب سے چھپا کر رکھتا ہے۔

> "شہرت ایک ایسی چڑیا ہے جو آپ کے ہاتھ سے پھدک پھدک جاتی ہے لیکن گمنامی وہ پالتو بلی ہے جو آپ کے پہلو میں لمبی تان کر لیٹ جاتی ہے۔ شہرت کا طالب تیر کمان سے لیس جال اٹھائے در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ اس سے چڑیا کو پھانسنے کے لیے جابجا جال پھیلانے پڑتے ہیں۔۔۔۔۔ اور جب کبھی وہ (بد قسمتی) سے اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کی یاس دیدنی ہوتی ہے۔"[۲۴]

تاہم شہرت کا دور دور حقیقت سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے اور یہ صرف سراب اور واہمہ ہے گمنام شخص کی شش جہات ہوتی ہیں وہ جب چاہے جہاں چاہے مکمل آزادی کے ساتھ ادھر اُدھر جا سکتا ہے اور اپنا پہلو بدل سکتا ہے۔ مشتاق قمر نے علامت کو بھی اپنے انشائیوں میں برتا ہے "مرزا غالب۔۔۔۔۔ زندگی کی ساتویں جہت" ایک علامتی انشائیہ ہے۔ مشتاق قمر مرزا غالب کی زندگی اور ان کے کارناموں کو علامت کے طور پر برتتے ہیں۔ مرزا غالب اپنے وقت کی شاعری، اسلوب، انداز اور طور طریقوں سے انحراف کرتے ہیں اور ایک نئے انداز، نئے طریقے اور نئے اصولوں کو رائج کرتے ہیں اور یہ مرزا غالب کا اہم کارنامہ ہے۔ زندگی کی شش جہات ہیں اور ساتویں جہت مرزا غالب کی وجہ سے ہمارے سامنے نمایاں ہوتی ہے۔

مشتاق قمر زندگی کے زاویے کو اپنے رخ سے دیکھتے ہیں اور وہ اپنے انشائیوں میں تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ پیش کرتے ہیں۔ مشتاق قمر کی زیرک آنکھ اپنے عمیق مشاہدات، تجربات کے نچوڑ، فطرت اور اشیاء کے مظاہر سے ایک جال تیار کر کے لاشعور کے سمندر میں ڈال دیتی ہے اور گزرتے وقت کے ساتھ یہ چمکدار موتی انشائیہ کی شکل میں ڈھل جاتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں گہری سوچ اور فکر کی گہرائی پائی جاتی ہے ان میں سستا پن نہیں جھلکتا وہ اپنے انشائیوں میں دوستانہ انداز سے اپنی زندگی کے تجربات کو بیان کرتے ہیں اور اس بات کا اندازہ ان کے شگفتہ انداز سے ہوتا ہے۔ مشتاق قمر کے انشائیوں میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے اور ان کے انشائیوں میں ان کی شخصیت جھلکتی نظر آتی ہے عارف عبد المتین ان کے انشائیوں کے بارے میں اپنا اظہار خیال یوں کرتے ہیں:

"مشتاق قمر کے انشایئے ایک ایسے صیقل شدہ آئینے کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں ان کی مہذب شخصیت کے بیشتر دلآویز رنگ جلوہ ریز ہیں اور کیونکہ یہ شخصیت انسانی علائق سے بے نیاز ہو کر خلا میں پروان نہیں چڑھتی لہذا ہم اس آئینہ میں اپنی اور دیگر ان گنت شخصیتوں کے گوناگوں روپ بھی اجمالا منعکس ہوتے دیکھتے ہیں۔"[۱۷]

مشتاق قمر اپنے منتخب شدہ الفاظ سے ایک ایسا جال بنتے ہیں جس میں موضوع کو آگے بڑھنے میں مدد ملتی ہے اور قاری پر سحر طاری ہو جاتا ہے اور یہ نئے مفاہیم کی ترسیل کا کام بھی کرتا ہے مشتاق قمر آسان سے آسان ترین الفاظ کا چناؤ کر کے اپنے موضوع کو پیش کرتے ہیں وہ اپنے موضوعات کی تہ میں جا کر نئے معنی دریافت کر کے قارئین کو پیش کرتے ہیں اس طرح وہ عام ہونے کے باوجود بہت اہم ہو جاتے ہیں وہ عام زندگی اور ہمارے معاشرے سے موضوعات کو چنتے ہیں۔ڈاکٹر بشیر سیفی ان کے انشائیوں میں پائی جانے والی نکتہ آفرینی اور نہاں گوشوں کو عیاں کرنے کی وجہ سے ایک بہترین انشائیہ نگار گردانتے ہیں وہ اپنی رائے کچھ یوں دیتے ہیں:"مشتاق قمر موضوع کے چھپے ہوئے گوشوں کو جس طرح دریافت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اس کے پیش نظر مشتاق قمر کو کامیاب انشائیہ نگار کہا جا سکتا ہے۔"[۱۸]

تاہم مشتاق قمر کے انشایئے ان کی شخصیت سے مختلف نہیں ہیں بلکہ ان کی ذات ہی ان کے انشائیوں میں جھلکتی ہے۔انہوں نے جتنا بھی لکھا معیاری لکھا اور انہوں نے کسی بھی دلیل کے بغیر سیدھے سادھے انداز میں اپنی نقطہ کو پیش کیا۔

د۔ جمیل آزر کے انشائیوں کا فکری جائزہ:

جمیل آزر انبالہ میں ۳۰ جون ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے۔آپ چار سال کی عمر میں اپنے والد محترم کے ساتھ تحصیل سمندری میں آبسے اس کے بعد آپ لاہور آ گئے لاہور میں تھوڑا عرصہ گزارنے کے بعد آپ دوبارہ انبالہ تشریف لے گئے اور وہاں مسلم فیڈریشن کے ممبر بن گئے اور تحریک پاکستان میں بھی حصہ لیا بعد ازاں آپ ہجرت کر کے لاہور آ گئے اور مسلم ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔۱۹۴۸ء میں آپ راولپنڈی تشریف لے گئے اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ملازمت بھی کرتے رہے آپ نے ۱۹۶۶ء میں ایم اے انگریزی کیا۔آپ کا پہلا انشائیہ "برساتی "کے نام سے رسالہ لیل و نہار میں ۲۹ مارچ ۱۹۵۹ء میں چھپا۔جمیل آزر کے تین مجموعے منظر عام پر آئے ہیں۔"شاخ زیتون" ۱۹۸۱ء،"رت کے مہمان "اپریل ۱۹۹۴ء اور "وقت اے وقت" ۲۰۰۷ء میں شائع

ہوئے۔ جمیل آزر نے ۵۶ انشائیے لکھے جن میں سے ۵۵ ان کے انشائی مجموعوں میں جبکہ ایک انشائیہ تحفے ماہنامہ الحمراء میں ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔

شاخ زیتون میں سترہ انشائیے شامل ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں واشنگ مشین، مچھلی کا شکار، شاخ زیتون، منی پلانٹ، مارکو پولو، نیم پلیٹ، نام کے بغیر، بھولے بسرے نغمے، جنگ کرنا، پکنک، بھوک ہڑتال، اخبار پڑھنا، تمباکو نوشی، کچھ فیشن پر، سنہری شاخ، مانگے کی سگریٹ، کچھ لکھنے کے بارے میں۔ تاہم شاخ زیتون کا انتساب آصف الدین وردگ کے نام کیا گیا ہے۔

جمیل آزر زندگی کی حقیقتوں کو بے باکی سے آر پار دیکھتے ہیں اور زندگی کی تفسیر عمدہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔ مصنف انشائیہ "واشنگ مشین" میں روحوں پر جمی میل اور دلوں میں کینہ، بغض اور منافقت کو دھونے اور صاف کرنے کے لیے واشنگ مشین کی ایجاد جیسا انقلاب لانے جیسے اچھوتے موضوع کو احاطہ تحریر میں لاتے ہیں۔ مصنف واشنگ مشین کو یہاں علامت کے طور پر برتتے ہیں۔ معاشرے میں بھی بہت میل کچیل اور کثافت بھیانک روپ میں پاؤں پسارے نظر آرہی ہے اور مصنف اپنی چھڑی کی معیت میں معاشرے کی میل کچیل دور کرنے کے لیے نکلتے ہیں۔

انشائیہ "مچھلی کا شکار" بھی ایک علامتی انشائیہ ہے جس میں روحانیت کی طرف سفر اور موجود سے عالم ناموجود کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مصنف بہت سے عالم بیزار لوگوں کو دریا کے کنارے تنہائی میں مچھلی پکڑتے دیکھتے ہیں۔ مصنف کے دوست مچھلی کے شکاریوں کے بارے میں اپنی رائے اس طرح رکھتے ہیں کہ یہ لوگ قسمت یا کسی چانس پر یقین رکھتے ہیں اور مچھلی کے شکاری کو کسی جواری سے تشبیہ دیتے ہیں جیسے جواری کسی چانس سے جیت جاتے ہیں اس طرح مچھلی کا شکاری بھی چانس ہی لیتا ہے مگر مصنف کے خیال میں مچھلی کے شکار کو جواری سے تشبیہ دینا صریح گناہ کے زمرے میں آتا ہے گویا مچھلی کے شکار سے قبل تیاری کرنی پڑتی ہے کانٹا، ڈور، پانی، مچھلی کی خوراک اس طرح روحانیت کے سفر پر جانے کے لیے بھی تیاری کی جاتی ہے جس طرح ڈور کا ایک سرا پانی میں ڈبویا جاتا ہے اسی طرح روحانیت میں کسی عالم ناموجود کے ساتھ خود کو جوڑا جاتا ہے اور خود ذہنی، جسمانی اور روحانی طور پر خالق حقیقی کی طرف توجہ مرکوز کر دیا جاتا ہے اور خود کو فراموش کر کے ہی روحانی سکون ملتا ہے اور جب مچھلی کانٹے میں پھنس جاتی ہے تو دل عالم ناموجود سے موجود میں آکر فرط مسرت سے جھوم جاتا ہے۔

انشائیہ "شاخ زیتون" فطرت کے حسن پر لکھا ایک خوبصورت انشائیہ ہے جس میں مصنف نے زیتون کے درخت کی کشش کو دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے مصنف نسیم سحری کے وقت شہر سے باہر ایک زراعتی فارم میں پہنچ

جاتے ہیں وہاں دور پھیلے کھیتوں کے ایک کونے میں زیتون کے قطار اندر قطار لگے درختوں جھنڈ ان کی توجہ کھینچنے کا سبب بنتے ہیں اور وہ اس زیتون کی سبز دنیا میں کھو جاتے ہیں۔ وہ زیتون کے درخت کے بارے میں کہتے ہیں۔

> "اس کی بھری بھری شاخیں تنے کی تھوڑی سی بلندی کے ساتھ ہی اپنی مضبوط منفرد حیثیت سے کسی رقاصہ کی طرح بل کھاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس کی شاخوں کا پھیلاؤ افقی بھی ہے اور عمودی بھی۔ اس کی چینی دوشیزاؤں کی آنکھوں جیسے ننھے منے پتوں کا رنگ ایسا ہے جیسے کسی نے سبزے پر نقرئی افشاں چھڑک دی ہے جو ذرا سی روشنی میں جھلملا اٹھتے ہیں۔"[۱۹]

انشائیہ "منی پلانٹ" میں توہم پرستی اور رسومات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مصنف کی بیوی روز اس وجہ سے منی پلانٹ کو پانی دیتی کہ یہ پودا پھیل کر پورے گھر کو اپنی سرسبز آغوش میں لے لے گا اور اس سے گھر میں خوشحالی آئے گی مگر مصنف صرف اپنی بیوی کو منی پلانٹ کے پودے کو پانی دینے کے اس پاکیزہ عمل سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ انشائیہ "مارکوپولو" ایک منفرد انشائیہ ہے مصنف خود میں مارکوپولو کی روح کو وارد پاتے ہیں اور اس طرح مصنف اپنے دوستوں کے ہمراہ شمالی کوہستان کے علاقے کو ایکسپلور کرنے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ مصنف فطرت کے ان خوبصورت مناظر کو دیکھ کر اکثر کیٹس، ورڈزورتھ اور کالرج وغیرہ کی نظمیں یاد کرتے ہیں اور اکثر شعراء فطرت کے ان حسین مناظر کو دیکھ کر ہی نظمیں لکھتے ہیں گویا یہ سب مارکوپولو کا ہی کمال ہے جو اپنی معیت میں تحقیق شناس کی طرح فطرت کا جائزہ لیتا ہے اور سیر کرواتا ہے۔

انشائیہ "نیم پلیٹ" میں پلیٹ کو اصل کی نقل کہتے ہیں اور یہ افلاطون کے نظریہ نقل کی ہی عکاسی کرتی ہے اور لوح محفوظ کی ہی نقل ہے۔ انشائیہ "نام کے بغیر" شیکسپئیر کے قول کے گرد گھومتا ہے کہ نام میں کیا ہے گویا یہ ایک منفرد سوچ اور خیال ہے کہ کسی بھی چیز کی تخلیق یا ایجاد ہوتے وقت اسے نام سے محروم رکھا جائے اور جوں جوں کسی چیز کا استعمال ہو اس چیز کی خوبی کے مطابق اس چیز کو نام دیا جائے۔ انشائیہ "بھولے بسرے نغمے" میں مصنف ماضی اور بھولے بسرے نغموں کی اہمیت بیان کرتے ہیں۔ مصنف جب بھی ریڈیو پر بھولے بسرے نغمے سنتے ہیں تو ماضی میں کھو جاتے ہیں اور وقت کی اہمیت کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہیں۔

> "آخر انسانی زندگی کا ارتقاء نت نئی چیزوں کے وجود میں آنے سے ہی تو ہوتا ہے لیکن بات صرف اتنی ہے کہ ان کے ساتھ جذباتی وابستگی کے لیے وقت کی مہر درکار ہوتی ہے جونہی یہ نئی چیزیں ماضی کا لباس پہن کر میرے نگار خانہ فکر میں آتی ہیں ان کے حسن و دلکشی میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہوتا ہے۔"[۲۰]

تاہم وقت گزرنے کے ساتھ چیزوں کی قیمت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ جیسے نئے دوستوں کی بجائے پرانے دوستوں سے مل کر زیادہ خوشی ہوتی ہے پرانی چیزوں سے جذباتی وابستگی زیادہ ہوتی ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے چیزیں کندن بننا شروع ہو جاتی ہیں۔ انشائیہ "جنگ کرنا" میں زندگی کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے کہ زندگی مسلسل جنگ کا نام ہے اور جنگ ضروری فعل ہے۔ جنگ کا اصل مقصد یہ ہے کہ آپ اپنے خلاف کھڑے ہونے والی مخالف قوت سے مقابلہ کریں جو کہ آپ کی آزادی، خواہش، ارتقاء اور مقاصد کی تکمیل کی راہ میں روڑے اٹکائے۔ بڑے لیڈر اور سیاست دان بھی مسلسل جنگ کرنے کی ہی وجہ سے کامیاب ہوئے ہیں اور یہ مفکرین، سیاست دانوں اور روحانیت کے علمبرداروں کا شغل خاص بھی رہا ہے اور جنگ کرنے میں ہی عزت و حرمت اور انسانیت قائم ہے۔

انشائیہ "پکنک" میں پکنک کی اصل اور اس کی تاریخ کو احاطہ تحریر میں لایا گیا ہے ہر شے اپنی جبلت کی طرف لوٹ رہی ہے اور مصنف کی رائے میں پکنک میں جانا اسی قول کی وجہ سے ہے جیسے انسان ابتداء میں نیم برہنہ حالت میں جنگل میں خانہ بدوش اور خورد ونوش سے بے پرواہ اور زمانے سے ناآشنا تھا وہ دریاؤں میں تیرتا، درختوں پر چڑھتا اور کھلے آسمان تلے سو جاتا تھا شاید پکنک مراجعت کی ہی ایک شکل ہے۔ جب موسم سہانا ہوتا ہے تو ہر کوئی فطرت سے لطف اندوز ہونے کے لیے پکنک پر روانہ ہوتا ہے پکنک پر جانے سے تہذیب کا لبادہ اتر جاتا ہے اور انسان آزاد فضا میں سانس لینے لگتا ہے۔

انشائیہ "بھوک ہڑتال" میں بھوک ہڑتال کرنے کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے مصنف کی رائے میں بھوک ہڑتال ایک جائز اور مثبت فعل ہے اور جو قوم اور لوگ بھوک ہڑتال سے محروم ہیں وہ دراصل جذبہ صادق سے خالی ہیں عام طور پر ہڑتال آرزوؤں اور خواہشات کی ناتمامی پر مخالف قوتوں کے خلاف احتجاج ہے فی الاصل بھوک ہڑتال ایک قوی عمل ہے جس میں محکوم حاکم سے، بچہ اپنے والد سے اور چھوٹا بڑے سے اپنے مطالبات منوانے کی کوشش کرتا ہے اس میں جائز وناجائز دونوں مطالبات پورے ہوتے ہیں گویا یہ ایک احسن طریقہ، بہتر نسخہ اور موثر ہتھیار بھی ہے مگر ایسی ہڑتالیں جس میں گھیراؤ اور جلاؤ جیسے حربے استعمال کیے جاتے ہیں وہ سراسر بے ذوق اور ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔ انشائیہ "اخبار پڑھنا" میں اخبار پڑھنے کی اہمیت بیان کی گئی ہے جمیل آزر اخبار پڑھنا میں بیان کرتے ہیں۔

> "اخبار ہماری بے خبری کی تاریکی کی لو سے روشن کرتا ہے یہ ہمیں ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے۔ یہ ہمیں ایک ایسا مشترکہ پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے جہاں سے ہم بلا روک ٹوک آپس میں ہم کلامی و ہم زبانی کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ اخبار کا مطالعہ حقیقت میں ایک طرح کی سماجی و ثقافتی غواصی ہے۔"[۲۱]

انشائیہ ”تمباکو نوشی“ میں مصنف تمباکو اور حقے کو ثقافت کی علامت کہتے ہیں اور اس کے حق میں مختلف دلائل بھی دیتے ہیں۔پائپ نوشی جدید ثقافت کی اور حقہ نوشی قدیم ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں اور سگرٹ درمیانہ راستہ ہے۔سگرٹ قدیم اور جدید کا ہم آہنگ ہے اور جمہوریت کی نشانی ہے تاہم حقہ مساوات کی عکاسی کرتا ہے اور پائپ امیر اور اونچے لوگوں کی عکاسی کرتا ہے پائپ آمریت کو ظاہر کرتا ہے۔انشائیہ ”کچھ فیشن پر“ میں مصنف فیشن پر اپنی رائے دیتے ہیں کہ فیشن ہمیشہ تغیر پذیر ہی ہوتا ہے اس لیے اسے برا بھلا نہیں کہنا چاہئیے موسموں اور وقت کے ساتھ فیشن ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اور یہ ایک جمالیاتی فن اور ذوق ہے اور زندہ دل لوگ ہی اسے اپناتے ہیں دنیا کے تمام فیشن انسان کو زندہ اور متحرک رکھتے ہیں فیشن میں بہت کشش پائی جاتی ہے۔فیشن کے بغیر زندگی بے رونق اور بے نور ہے۔

انشائیہ ”سنہری شاخ“ میں مصنف نے حکمران بننے کی خواہش اور حکمران بننے کی ہوس کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔انشائیہ مانگے کی سگرٹ میں مصنف مانگے کی سگرٹ کا تجربہ بیان کرتے ہیں مصنف کو مانگے کی سگریٹ کی عادت ہے اور سگرٹ کے دھوئیں سے الرجک ہیں کیونکہ مصنف کے خیال میں اس سے انسان کا وژن ماند پڑ جاتا ہے۔دنیا کے بہت سے دانشور اور معروف سیاست دان سگرٹ پیتے ہیں اور دھوئیں کے رومان پرور ماحول میں بہت سے مسائل ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں بعض معروف شخصیات کے منہ سے سگرٹ یا سگار چھین لیا جائے تو ان کی شخصیت ہی باقی نہیں رہتی۔

انشائیہ ”کچھ لکھنے کے بارے میں“ مصنف نے تحریر کرنے اور کچھ لکھنے کے بارے میں اپنی رائے دی ہے کہ لکھنا کیوں ضروری ہے اور کس حالت میں لکھا جاتا ہے۔مصنف منٹو کی حالت کو بھی تحریر کرتے ہیں کہ منٹو اپنی تخلیق کے بارے میں کہتا ہے کہ افسانے میرے ارد گرد پڑے ہوتے ہیں اور جب میں نے افسانہ بیان کرنا ہوتا ہے تو میری حالت کٹکٹاتی مرغی کی مانند ہوتی ہے جو انڈہ دینے والی ہوتی ہے اور جب تک انڈہ نہیں دے لیتی اس وقت تک بے چین رہتی ہے۔مصنف لفظوں کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں جب بھی کوئی صفحات پر عبارت پڑھی جاتی ہے تو لفظ انگڑائی لینے لگتے ہیں اور بہت سے نہاں گوشے عیاں ہوتے ہیں لفظ انسان کو کرب اور تکلیف سے آزادی دلانے میں مدد کرتے ہیں۔

جمیل آزر کے دوسرے انشائی مجموعے میں اٹھارہ انشائیے شامل ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں۔بالک ہٹ، غیر معروف شہری، آرٹس سٹوڈنٹس، رت کے مہمان، نشہ، ذکر اک ملاقات کا، ہائیڈ پارک، جن، ڈرائنگ روم میں گھوڑا، موڈ، مسٹر رائٹ مین، شمولیت، نیکی ،دریا اور سمندر، عظیم نشر گاہ، ریلوے پلیٹ فارم، میری ساٹھویں

سالگرہ، میرا گھر، ایک ضروری اعلان۔ جمیل آزر انشائیہ "غیر معروف شہری "میں شہر کے آکٹوپس کو موضوع بناتے ہیں۔ شہر کا آکٹوپس ہمیشہ آپ کو یاد دلاتا ہے کہ آپ تنہا، غیر اہم، غیر ضروری اور بے مایہ چیز کی مانند ہیں مصنف اپنی رائے دیتے ہیں۔

"زرپرست شہری معاشرہ ہمیں ہر لمحہ انسانی رفعت سے گرا کر سکوں میں، کھاتہ نمبروں میں، افرادی قوت میں اور زر مبادلہ میں تبدیل کر رہا ہے سر بفلک عمارتیں، تیز رفتار کاریں، عظیم صنعتی نظام، ائیر کنڈیشنڈ انٹر نیشنل ہوٹل، سپر سانک ہوائی جہاز انسان سے ان کی شناخت چھین رہے ہیں اور اسے اپنی پہچان بر قرار رکھنے کے لیے شناختی کارڈ جیسی بے جان چیز کا سہارا لینا پڑتا ہے شہری معاشرے کے برعکس انسان دوست دیہی معاشرہ آپ کو ذات کے حوالہ سے پہچانتا ہے۔ دیہات میں لوگ آپ کی شخصیت کو آپ کی شرافت و نجابت اور دیانت و خلوص کی خوشبو سے پہچانتے ہیں۔"[۲۲]

انشائیہ آرٹس سٹوڈنٹس میں آرٹس کے طالب علموں پر انشائیہ لکھتے ہیں۔ لوگ آرٹس سٹوڈنٹس کو تھرڈ کلاس سمجھتے ہیں لیکن کالج کی رونقیں انہی آرٹس سٹوڈنٹس کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ زیادہ تر آرٹس سٹوڈنٹسسیاست دان، مصور، شاعر، کھلاڑی۔ فلم نگار، سول سروس کے آفیسرز، پولیس اور فوج وغیرہ کے رُوپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ جمیل آزر انشائیہ "رُت کے مہمان" میں بہار کے موسم میں گھروں میں گھونسلہ بنانے والے پرندوں اور پرندوں کی انسان کی زندگی میں اہمیت کو موضوع بناتے ہیں۔ مصنف کے ڈرائنگ روم میں ہر سال بہار کے موسم میں پرندے روشندان میں ڈیرہ ڈالتے، چہچہاتے، نغمے الاپتے اور تانیں اُڑاتے بڑے دھڑلے کے ساتھ ڈیرہ ڈال لیتے ہیں جو کہ مصنف کی بے پناہ مسرت کا باعث ہے۔

جمیل آزر انشائیہ "نشہ "میں اقتدار کے نشے کو موضوع بناتے ہیں ہر شخص اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہے اور رعایا کا فرمانروا بننے کے خواب دیکھتا ہے جیسے شوہر اپنے بیوی اور بچوں کا فرمانروا ہوتا ہے تاہم دنیا میں بہت سے نشے ہوتے ہین جن میں جنس، دولت و امارت اور شراب وغیرہ کا نشہ شامل ہے نشے میں انسان اپنی اصلی شخصیت کا اظہار ضرور کرتا ہے۔

"بے اقتدار زندگی تو نری پھیکی اور بدمزہ ہو کر رہ جاتی ہے جب کہ اقتدار سے بھرپور زندگی آدمی کو جواں ہر دم رواں، پیہم دواں رکھتی ہے اقتدار ایک ایسا نشہ ہے جو آپ کو کبھی بوڑھا نہیں ہونے دیتا، اور ریٹائرمنٹ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"[۲۳]

انشائیہ ''ذکر اک ملاقات کا'' میں مصنف اپنے ایک بچپن کے دوست سے کافی عرصے کے بعد ملاقات کا ذکر کرتے ہیں جنہیں وہ مری کی سڑک پر ملے مگر دونوں ایک دوسرے کو پہچاننے سے قاصر تھے وقت کی دبیز تہہ نے انہیں دو مختلف شخصیتوں میں بدل دیا تھا اب ان دونوں میں نہ تو ذہنی وابستگی تھی نہ روحانی اور نہ ثقافتی ہم آہنگی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے اجنبی تھے مصنف کے خیال میں دوستی کو مضبوط کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً ملاقاتیں کرتی رہنی چاہئیں۔ اس سے دوستی زندہ اور تازہ دم رہتی ہے۔ انشائیہ ''ہائیڈ پارک'' ایک ادبی انشائیہ ہے اس میں تنقید کو موضوع بحث بنایا گیا ہے کہ تنقید ہمیشہ کسی بھی فن پارے، تخلیق یا تحریر کو عقب سے جانچتی ہے انشائیے میں ہائیڈ پارک ایک ایسی جگہ ہے جہاں ناقدین اکھٹے ہو کر تنقید کی پھلجڑیاں بکھیرتے اور اپنی تحریر کو دربار میں پیش کرنے سے پہلے بار بار پڑھتے تاکہ اس میں کوئی ناپختگی نہ رہے اور مصنف موافق اور مخالف آراء کو خاموشی سے سنتے رہتے۔

انشائیہ ''جن'' میں جوانی کے زور و شور اور جوانی کے پُر زور جذبات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ در حقیقت انسان جب جوان ہوتا ہے تو ایک خوفناک جن اس میں وارد ہو جاتا ہے اور جب یہ جن انسان پر قبضہ کر لیتا ہے تو اس سے جس طرح چاہے اس طرح کے کام کروا سکتا ہے اور وہ اپنے آپ کو دنیا کا ذہین ترین، خوبصورت ترین اور طاقتور ترین انسان سمجھنا شروع کر دیتا ہے اور دوسروں کو چیونٹی سمجھ کر مسل دینا چاہتا ہے اس طرح کی مثال ہٹلر اور سکندر اعظم وغیرہ کی دی جا سکتی ہے۔ بعض ہوشیار سیاستدان نوجوانوں کو اپنی پارٹی میں شامل کر لیتے ہیں اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام نکلواتے ہیں اور ان کے دماغ کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔

انشائیہ ''ڈرائنگ روم میں گھوڑا'' میں گھوڑے کی خصوصیات پر بحث کی گئی ہے مصنف کے ڈرائینگ روم میں سفید چار سوتی کپڑے پر سرخ، سفید اور سیاہ رنگ کے دھاگوں سے گھوڑے کی شبیہ بنی ہوئی ہے اور گھوڑا برق رفتاری سے بھاگ رہا ہے۔ مصنف اس گھوڑے کی تصویر دیکھ کر اس کے خیالات میں کھو جاتا ہے کہ گھوڑا ابتدائے آفرینش سے ہی انسان کی زندگی میں داخل ہو گیا تھا تاہم گھوڑا وفادار جانور ہے۔

انشائیہ ''مُوڈ'' میں انسانی موڈ کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے کہ ہر چیز انسان کے مُوڈ پر منحصر ہے اگر انسان کا دھیان انسان کے مُوڈ کے مطابق ہو تو ہر کام اچھا ہوتا ہے اور زندگی کے معاملات میں مُوڈ بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انشائیہ ''مسٹر رائٹ مین'' ایک کرداری انشائیہ ہے اور یہ ایک ایسا کردار ہے جب یہ کردار کسی قوم میں رچ بس جاتا ہے تو نسلی تفاخر اور قوم کی برتری کا تاج سر پر پہن کر انسان کو متاثر کرتا ہے۔ مسٹر رائٹ مین لوگوں کو کفایت شعاری کے مشورے دیتا ہے اور قناعت اپنانے کی ترغیب دیتا ہے مسٹر رائٹ مین موقع کی مناسبت سے بات کرتا

ہے وہ اپنی بات کو درست تسلیم کرتا ہے اور بات کو منوانے میں بہت ضدی اور ہٹ دھرم واقع ہوا ہے۔ جنگ عظیم دوم میں اٹلی اور جرمنی نے مسٹر رائٹ مین کا کردار ادا کیا تھا۔ اس وقت دنیا میں دو طاقتیں مسٹر رائٹ مین کا کردار ادا کر رہی ہیں پہلی سرمایہ درانہ استعماریت اور دوسری اشتراکی استعماریت۔

انشائیہ "شمولیت" میں شمولیت کے مختلف اور دلفریب رنگوں کو صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ کسی بھی چیز سے بھرپور لطف اندوز ہونے کے لیے اس میں شمولیت بہت ضروری ہے کسی بھی کھیل میں اگر عدم دلچسپی ہو مگر آپ اس میں شمولیت اختیار کرلیں اس سے کھیل میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور اس سے خوشی کا عنصر بھی پیدا ہوتا ہے۔ انشائیہ "نیکی، دریا اور سمندر" اخلاقیات پر مبنی انشائیہ ہے۔ ہر انسان دوسروں کے احسانات کے بوجھ تلے دبا ہوتا ہے۔ مصنف فرانس کے مشہور ادیب کامیو کے ناول میں ایک فقرہ پڑھتے ہیں جس کسی پر بھی میں نے احسان کیا وہ ہی میرا بڑا دشمن بن گیا۔ مصنف کی رائے میں اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم نیکی کرنے سے گریز کریں بلکہ اس فقرے پر عمل پیرا ہونا چاہئیے کہ نیکی کر دریا میں ڈال مطلب یہ کہ نیکی کر کہ انفرادی لاشعور کے حوالے کر دینی چاہئیے۔

> "دراصل جب آپ کسی شخص پر احسان کرتے ہیں تو اس سے اس کی خود پسندی اور نخوت کو صدمہ پہنچتا ہے جسے برداشت کرنے کا وہ ہرگز متحمل نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کا آپ سے عداوت رکھنا ایک فطری عمل ہوتا ہے۔ آپ کا وجود ہر لمحہ اسے آپ کے سامنے چھوٹا کر دیتا ہے جسے برداشت کرنے کا اس میں حوصلہ نہیں ہوتا۔"[۲۴]

جمیل آزر انشائیہ "عظیم نشرگاہ" میں ریڈیو کو بطور عظیم نشرگاہ موضوع بناتے ہیں۔ ریڈیو ہماری زندگی میں ایسی سہولت ہے جس سے ہم کسی بھی جگہ سوئچ آن کر کے اس کے پروگراموں سے تفریح حاصل کرسکتے ہیں۔ اس سے ہم ملکی، غیر ملکی خبریں، معلومات، گیت، کلاسیکی گیت، ٹھمریاں، مزاح گویا ہر طرح کی نشریات سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ انشائیہ "ریلوے پلیٹ فارم" میں مصنف سیر کے لیے بہترین جگہ ریلوے پلیٹ فارم کو ہی قرار دیتے ہیں جہاں آپ زندگی کے رنگا رنگ جمال سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ تاہم ہماری زمین بھی ایک پلیٹ فارم ہے اور کائنات بھی سیاروں، ستاروں، چاند اور سورج کا پلیٹ فارم ہے دماغ کے لیے خیالات پلیٹ فارم کا درجہ رکھتا ہے اور ایسے ہی جسم کے لیے روح ایک پلیٹ فارم ہے۔ اس طرح انشائیہ "میری ساٹھویں سالگرہ" ان کی ریٹائرمنٹ اور ان کی سالگرہ کے دن کو بہت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ گویا مصنف اس دن خود کو پہاڑ کی چوٹی پر محسوس کرتے ہیں مگر

ان کے خیال میں ان کا سفر ختم نہیں ہوا بلکہ ابھی سفر کا پہلا دن ہے اور یہ سفر پہاڑ کے اس طرف کا سفر ہے اور جس کو عبور کرنے کے لیے نئے ولولے اور پختہ ارادے کی ضرورت ہے۔

انشائیہ "میرا گھر" میں مصنف اپنی سرزمین، دھرتی، اپنے ملک کو اپنا گھر کہتے ہیں ان کے خیال کے مطابق مشرق، مغرب اور شمال و جنوب تک پھیلی ہوئی سرزمین یہ سب ان کا اپنا گھر ہے۔

انشائیہ "ایک ضروری اعلان "موت جیسی تلخ حقیقت پر لکھا گیا ہے موت اٹل شے ہے کوئی ذی روح اس سے مفر نہیں۔ موت ہماری زندگی میں ہیبت و جلال اور ڈرامائی انداز میں آتی ہے انسان اپنے روزمرہ کاموں میں اتنا مصروف ہوتا ہے کہ فرشتہ اجل روح قابض کرلیتا ہے موت ہمیشہ تکلیف دہ اور دردناک ہوتی ہے۔

موت بھی عجیب شے ہے جوں ہی بندہ وجود میں آتا ہے وہ اپنی پوری شخصیت کے ساتھ سائے کی طرح اس کے پیچھے لگ جاتی ہے۔

> "پیدائش کے فوراً بعد بچے کی چیخ شاید اس کا ڈراؤنا روپ دیکھنے ہی کی وجہ سے نکلتی ہے۔ اپنی بقا کے لیے ساری عمر بندہ اس سے بچنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ کبھی دوسروں کو مارتا ہے اور کبھی اپنوں کو لیکن بالآخر موت اسے دبوچ ہی لیتی ہے اور اس کا تمام کاروبار حیات اس کا اقتدار، اسکا مرتبہ، اس کے مربعے، اس کی کوٹھیاں اور بینک بیلنس دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور دیکھنے والے خود تصویر حیرت بن جاتے ہیں۔"[۲۵]

جمیل آزر کا تیسرا انشائی مجموعہ "وقت اے وقت" ہے جس میں بیس انشائیے شامل ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں۔ لکشمن ریکھا، ہوم سویٹ ہوم، وقت اے وقت، چائے کی معیت میں، تانگہ کلچر، کچے پکے آم، فکری نہ کرو، آپ کا کیا خیال ہے، سفر، شاید میں بروائیڈ ہوں، مکالمہ، برساتی، گورڈن کالج سدا رہے آباد، دعوت ولیمہ، اشتہار زدہ دیواریں، بدل جاتے ہیں لوگ۔ شادی کے بعد، آکسفورڈ شوز، کتابوں کو دوستوں سے بچاؤ، مہربان کیسے کیسے۔ بھیک مانگنے والے اور تیرے جانثاروں کو سلام۔ انشائیہ "لکشمن ریکھا" میں ان دیکھی قوت اور فطرت کی کار فرمائی کو احاطہ تحریر میں لایا گیا ہے مصنف لکشمن ریکھا کو انشائیہ کا عنوان رام کے بن باس کے وقت سیتا دیوی کے ارد گرد تحفظ کی لکشمن ریکھا سے لیتا ہے۔ جب سیتا اس لکشمن ریکھا کو پار کر لیتی ہے، راون جو اس کی تاک میں تھا اسے لے اڑتا ہے اور پھر رام اور راون کے درمیان سیتا کو حاصل کرنے کے لیے جنگ چھڑ گئی۔ تاہم اگر انسان ابلیس کے بہکاوے میں آکر لکشمن ریکھا کو پار کر کے اپنی تہذیب چھوڑ کر دوسری تہذیب میں مداخلت کرتا ہے تو وہ اپنے روحانی حصار کو توڑ دیتا ہے اور مشکلات کا شکار ہو جاتا ہے۔

انشائیہ "وقت اے وقت" میں وقت کا فلسفہ اور وقت کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ مصنف کے خیال میں وقت ایک چھلاوے کی مانند ہے جو انسان کو ہمیشہ دھوکا دیتا ہے۔

> "آہ وقت کتنا بے رحم قاطع ہے جو ہمیں لحہ لحہ قطع کر رہا ہے اور لیر لیر اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمیں ہوا میں بکھیر رہا ہے۔ یہ کہیں حسن کو برباد کر رہا ہے کہیں رشتوں اور ناطوں کو منقطع کر رہا ہے۔ ہمارے وہ بھائی بہن جو ہمارے دامن شفقت سے چمٹے رہتے تھے اب لا تعلقی کے حصار میں جکڑے ہوئے ہیں۔"[۲۶]

وقت گزرنے کے ساتھ حیرت انگیز واقعات بھی رونما ہوتے ہیں۔ جو شخص کل تاج پہنے ہوتا ہے آج وہ ہی شخص پھانسی کے تخت پر ہوتا ہے وقت بہت ہی سفاک اور تباہ کار ہوتا ہے۔ انشائیہ "چائے کی معیت میں "مصنف کا چائے سے عشق اور وابستگی کو ظاہر کرتا ہے مصنف کی رائے میں چائے سے جو مہمانوں کی خاطر مدارت ہوتی ہے وہ مشروبات میں نہیں ہے چائے پیش کرنے میں میزبان کی محبت، محنت، چاہت و خلوص اور اس کی شخصیت شامل ہوتی ہے۔ کافی اور شراب تفاخر اور بے معنویت کے شکار لوگوں کی نشانی ہیں۔ تاہم مصنف چائے کی اہمیت ظاہر کرتے ہیں کہ چائے پینا معتدل اور متوازن مزاج کے حامل لوگوں کو ظاہر کرتی ہے۔ چینی قوم تو اس کو مقدس مشروب تسلیم کرتے ہیں۔

انشائیہ "تانگہ کلچر" مصنف کا ثقافت سے لگاؤ اور تانگہ کلچر کو زندہ رکھنے کی کاوش ہے۔ مصنف ایک رات کاروں، بسوں اور رکشاؤں کے بے ہنگم شور میں تانگے پر سفر کر رہے تھے مگر تانگہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا دونوں طرف کی روشنیوں سے محروم تھا جس پر مصنف اپنی آبرو بچاتے ہوئے تانگہ بان کو پانچ کا نوٹ تھما کر تانگے سے اُتر گئے کیونکہ رکشہ، اسکوٹر اور ٹیکسی گاڑیوں کی روشنیوں کو دیکھ کر مصنف کو بہت افسوس ہوا۔ انشائیہ "کچے پکے آم" جدیدیت کی حمایت میں لکھا گیا انشائیہ ہے۔ مصنف کو اپنی پوتی کی جدت پسندی بہت پسند ہے کیونکہ وہ ہر چیز میں جدت چاہتی ہے۔ مصنف کی رائے میں فطرت بھی جدیدیت کی حامی ہے۔ ہر روز نئے دن کی طرح نکلتا ہے اور پھر نئے دن کا آغاز ہوتا ہے۔ بہار، خزاں، سرما، گرما میں ہم متنوع لباس پہن کر نئے رنگوں نئے موسموں اور نئے پھلوں اور نئے ذائقوں سے آشنا ہوتے ہیں۔ مصنف کہتے ہیں۔

> "میں جب جدیدیت کے رجحان کے سوتے تلاش کرنے کی سعی کرتا ہوں تو مجھے سب سے پہلے جدیدیت پسند مفکر یا فلاسفر سقراط نظر آتا ہے، جس کے فکری ذہن سے افلاطون پیدا ہوا اور جس کے فکری خزانے سے نئے نئے علوم کے چشمے جاری ہو گئے۔ جدیدیت کے دھارے انہی دو عظیم ہستیوں کے مرہون منت ہیں۔"[۲۷]

انشائیہ "فکری نہ کرو" میں مصنف زندگی میں فکر کی اہمیت کی نشاندہی کرتے ہیں زندگی میں فکر کرنا بہت ضروری ہے یہ اپنے اندر قوت محرکہ رکھتی ہے جس سے انسان ترقی کرتا اور آگے بڑھتا ہے۔ انشائیہ "آپ کا کیا خیال ہے" میں مصنف تیسری دنیا کے لوگوں کی خامی کو نمایاں کرتے ہیں کہ تیسری دنیا کے لوگ فرد کو آزادی کے حق سے محروم رکھتے ہیں اور لوگوں کی خود مختار حیثیت کو بھی تسلیم نہیں کرتے اور فرد کی رائے کو اہمیت نہیں دیتے اگر یہ لوگ فرد کی رائے، اس کی آزادی اور انسان کی خود مختار حیثیت کو تسلیم کرلیں تو یہ لوگ ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑے ہو جائیں۔

انشائیہ "سفر" میں سحری سے افطاری تک کے سفر کو موضوع بنایا گیا ہے۔ انشائیہ "شاید میں برومائیڈ ہوں" میں مصنف انکشاف ذات اور اظہار ذات کی ایک غیر معمولی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے مصنف خود کو مسرت کے عمل سے گزار کر دوسروں کو بھی اپنی مسرت میں شامل کرتا ہے۔ مصنف نے سنجیدہ مسئلے کو لطافت سے صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے ہمارے معاشرہ میں قدرتی ماحول آہستہ آہستہ انحطاط پذیر ہو رہا ہے جو کہ انسان کے لیے خطرے کا باعث ہے انشائیہ نگار اسے اپنے انداز سے دیکھتے ہیں۔ وہ صبح سیر کے دوران دائیں طرف کے فٹ پاتھ جو کہ باغ کی طرف جاتا ہے اسے چھوڑ کر بائیں طرف زرعی فارم کے راستے پگڈنڈی کی طرف چلے جاتے ہیں گویا اس میں علامت کا استعمال کیا گیا ہے کہ حال کو چھوڑ کر ماضی کی قدامت کی طرف چلے جاتے ہیں۔ گویا اس میں علامت کا استعمال کیا گیا ہے کہ حال کو چھوڑ کر ماضی کی قدامت کی طرف داخل ہونے کا عمل ہے۔ دائیں طرف زندگی کا جدید رخ ہے جس میں سہولتیں اور آسائشیں ہیں اور بائیں طرف دیہات، فطرت، لہلہاتے کھیت، ہرے بھرے درخت، پرندے، جانور اور ہریالی ہے۔ تاہم دائیں بائیں کے یہ مناظر انسان کے رویوں کی عکاسی کرتے ہیں کہ چیزوں کو قریب سے دیکھنا اور جدید کو چھوڑ کر قدیم سے وابستگی ان کے پختہ ذہن اور ان کے فطری رویے کی غماز ہے۔

انشائیہ "مکالمہ" میں مصنف نے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں اپنا فلسفہ اور سوچ ہم پر عیاں کی ہے۔

> "ہماری ماضی کی تمثیلیں جتنی زیادہ حرکی ہوں گی ہمارا حال اور مستقبل اتنا ہی تابناک ہو گا۔ ماضی ہمیں اعتماد بخشتا ہے تو حال ہمیں اعتماد بخشتا ہے تو حال ہمیں جہد مسلسل کی طرف ابھارتا ہے اور مستقبل کامیابی کی نوید دیتا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کے اس پُر اسرار تسلسل کو ہم علیحدہ علیحدہ کر ہی نہیں سکتے۔ یہ تو بیک وقت ساتھ چلتے ہیں۔ ماضی ہمارے حال اور حال ہمارے مستقبل پر پیہم اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ ہمارا ہر فعل چند لمحوں بعد ماضی اور مستقبل میں تبدیل ہو کر نئی تہذیب کا حصہ بن جاتا ہے اور متنوع تمثالوں میں ڈھل جاتا ہے۔"[۲۸]

انشائیہ ”برساتی“میں مصنف اپنے عمیق مشاہدے اور تجربے کو بیان کرتے ہیں۔تاہم انشائیہ ایک کشفی عمل ہے مصنف اپنے تجربے کو منفرد انشائی انداز میں لکھتے ہیں کہ اکثر لوگ ظاہر پرست ہوتے ہیں ظاہری حسن اور چمک دمک پر فریفتہ ہو جاتے ہیں مگر ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی اور ضروری نہیں کہ ہر خوبصورت اور پیاری چیز پائیدار بھی ہو اور جو جیسا نظر آتا ہے ضروری نہیں اس کا باطن بھی اتنا اچھا ہو۔اس طرح ”دعوت ولیمہ“میں مصنف اپنے تجربات بتاتے ہیں اور ولیمے پر ہونے والے رسم و رواج کی اہمیت بتاتے ہیں۔انشائیہ ” اشتہار زدہ دیواریں “مصنف کے مشاہدے پر مبنی انشائیہ ہے ہم اگر بس اسٹیشنوں،ریل گاڑیوں،بس اسٹینڈوں،چھوٹے بڑے شہروں میں داخل ہوں تو وہاں ہر طرف اشتہاروں کی بھرمار نظر آتی ہے جن میں حکیموں کی ادویات،زنانہ و مردانہ بیماریوں،سروں اور دانتوں کے منجن،اسکولوں اور کالجوں کے اشتہارات،کریموں اور فلموں کے اشتہارات وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔یہ اشتہار اسکول،کالج،سڑک کے کنارے واقع گھروں کی دیواروں پر بھی پینٹروں نے رنگ برنگے پینٹ اور برش کے ساتھ آویزاں کیے ہوتے ہیں۔

انشائیہ ”آکسفورڈ شوز“ایک کہانی کی صورت میں لکھا گیا جس میں جان عالم اپنے پُر خلوص دوست پر اپنے آکسفورڈ شوز چوری ہونے پر شک کرتا ہے اگرچہ جان عالم سنار ہے اور آکسفورڈ شوز خریدتا ہے اور اس کے دوست اس کے شوز دیکھ کر رشک کرتے ہیں تاہم مصنف انشائیہ کا نچوڑ کچھ یوں نکالتے ہیں کہ جب کسی کے خلاف شک و شبہ گھر کر جائے تو اتنی آسانی سے دل سے نہیں نکلتا اور اگر کسی پر الزام یا شک بھی ہو تو اس بات کو سچ کرنے کے لیے کوئی ثبوت بھی پاس ہونا چاہیئے۔

”کتابوں کو دوستوں سے بچاؤ“ایک منفرد انشائیہ ہے مصنف اپنے تجربات کو انشائیہ کی صورت میں ڈھالتا ہے کہ ادھار دی ہوئی کتاب بہت مشکل سے واپس ملتی ہے اگر مل بھی جائے تو اس کے کچھ صفحات غائب ہوتے ہیں کچھ مُڑے ہوتے ہیں اور لکھنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا اور جابجا لکیریں اور نشانات بھی لگے ہوتے ہیں مصنف اس بحث کو اپنی کتابیں نہ ملنے کو موضوع بناتے ہیں۔انشائیہ ”مہربان کیسے کیسے“بھیک مانگنے والے میں کاسہ گداؤں اور بھیک مانگنے والوں کو موضوع بنایا گیا ہے مصنف بھیک مانگنے والوں پر طنز و تنقید کرتے ہیں کہ گداگر گھروں میں گھنٹی بجا بجا کر بھیک مانگتے ہیں جیسے کسی سے کوئی ادھار لیا ہو اور بعض تو صبح صبح بھیک مانگتے ہیں جو ڈیوٹی سے لیٹ ہونے کا سبب بھی بنتا ہے۔

"صبح سے لے کر شام تک بلکہ رات گئے تک بھیک مانگنے والے اپنے دھندے میں مصروف رہتے ہیں وہ کون سی جگہ ہے جہاں یہ لوگ نہیں ہوتے۔ مسجدوں سے لے کر سینما گھروں تک، اور بسوں سے لے کر ریل گاڑیوں تک کے تمام علاقے ان کی زد میں ہوتے ہیں۔ ادھر آپ بس میں سوار ہوئے۔ ادھر آپ نے نہایت دلدوز صدا سنی۔"[۲۹]

انشائیہ "تیرے جانثاروں کو سلام" میں کشمیر جنت نظیر کو موضوع بنایا گیا ہے جمیل آزر انشائیہ کا آغاز شہنشاہ نور الدین جہانگیر کے شاہی جلوس کے ذکر سے کرتے ہیں جب بادشاہ وادی کشمیر کے جانفزا منظر کو دیکھ کر یکایک بولے کہ "گر فردوس برروئے زمین است ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است" مگر اب وادی کشمیر کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ گر دوزخ برروئے زمین است ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است۔ گویا راکھشوں نے جنت جیسی زمین کو جہنم بنا دیا ہے اور ہر طرف قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ جوانوں اور بچوں کو سر عام قتل کیا جا رہا ہے عورتوں کی عصمتیں لوٹی جا رہی ہیں گویا وادی آہ و فغاں کی دہائیاں دے رہی ہے۔ مگر حقوق انسانی کے علمبردار ادارے خاموش و ساکت ہیں مگر اس وادی کے غیور سپوت اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر انہیں آزادی سے ہم کنار کریں گے کیونکہ فتح حق کی ہی ہوتی ہے۔ جمیل آزر نے زندگی کے عام موضوعات پر قلم اٹھایا ان کے ہاں موضوعات کی رنگارنگی ہے انہوں نے معاشرے کے چھوٹے چھوٹے موضوعات پر لکھا اور اس سے ان کے انشائیوں میں حیرت انگیز مسرت در آئی۔

ر۔ اکبر حمیدی کے انشائیوں کا فکری جائزہ:

اکبر حمیدی یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے ان کا آبائی گاؤں فیروزوالہ ہے ابتدائی تعلیم گوجرانوالہ سے حاصل کی اور گوجرانوالہ میں ہی بطور کلرک کام کرتے رہے آپ گوجرانوالہ کے بعد اسلام آباد میں پروفیسر کی حیثیت سے پڑھاتے رہے آپ نے اپنی پوری زندگی درس و تدریس میں وقف کر دی آپ نے آغاز میں شاعری میں نام پیدا کیا پھر پانچ سال تک افسانے بھی لکھتے رہے آپ انشائیہ کی طرف جب راغب ہوئے تو ایک کامیاب انشائیہ نگار کے طور پر اُبھرے۔ اکبر حمیدی نے اپنا پہلا انشائیہ "پہلی منزل" کے عنوان سے ۱۹۸۲ء میں رسالہ اوراق میں شائع کیا۔ ان کے انشائیوں کے پانچ مجموعے ہیں جن میں سو سے زیادہ انشائیے ہیں۔ ان کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ "جزیرے کا سفر" ۱۹۸۵ء، دوسرا مجموعہ "تتلی کے تعاقب میں" ۱۹۹۰ء، تیسرا مجموعہ "جھاڑیاں اور جگنو" ۱۹۹۸ء، چوتھا مجموعہ "پہاڑ مجھے بلاتا ہے" ۲۰۰۳ء میں اور پانچواں مجموعہ "اشتہاروں بھری دیواریں" ۲۰۰۷ء شائع ہوئے۔

اکبر حمیدی اپنے انشائیوں میں مختلف جزیروں کی سیر کروا کر انسان کے مختلف رویوں سے ہمیں آشنا کرواتے ہیں وہ کائنات کے مظاہر اور کائنات میں موجود ساری اشیاء کو جزیرے کا نام دیتے ہیں۔اکبر حمیدی کے موضوعات رنگارنگ ہونے کے ساتھ ساتھ وحدت تاثر کا اثر لیے ہوئے ہیں۔وہ افسانوی انداز میں معمولی اور غیر معمولی چیزوں کو موضوع بنا کر سادہ اور شگفتہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ قاری جیسے جیسے انشائیہ پڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے وہ زمان و مکان پر غور و فکر کرتا جاتا ہے۔ان کے انشائیوں میں ایک قسم کی مشترک پائی جانے والی چیز انسان ہے اور وہ ہر طرح سے ان کے انشائیوں میں موجود ہے کہیں انہیں جزیرے کہا گیا ہے، کہیں منفی مثبت صورت میں پیش کیا گیا ہے کہ انسان تسخیر کائنات کرتا ہے اور کہیں فاختہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور کہیں عقاب پر جھپٹتا ہے اور کہیں درویش کی صورت میں نظر آتا ہے اور کبھی بڑے آدمی کی صورت اور کبھی چھوٹے آدمی کا روپ اختیار کرلیتا ہے لہٰذا اکبر حمیدی مختلف موضوعات کے موضوع انسان کو ہی بناتے ہیں کہ اس کائنات کا مرکزی نکتہ بنی نوع انسان کو ہی بنایا گیا ہے۔اکبر حمیدی سمندر کے جزیروں سے بات کرتے ہوئے مظاہر قدرت کو بھی موضوع بناتے ہیں اور قاری اس سے روحانی مسرت حاصل کرتا ہے۔ان کے انشائیوں کے پہلے مجموعے ”جزیرے کے سفر“ میں اکیس انشائیے شامل ہیں اس مجموعے میں جزیرے کا سفر ،انتظار گاہ، گولڈن چانس، دُور اندیشی، نیگٹیو پازیٹو، درمیانی منزل، پتنگ، خزاں، گالی دینے والے کی حمایت میں، پرانے کپڑے، موسم، آزادی، چھوٹا آدمی، ذمہ داری، جنگل، میں سوچتا ہوں، گھنٹہ گھر، غلطی کی گنجائش، چڑیا گھر، کامیابی اور اُترن شامل ہیں۔

اکبر حمیدی نے اپنے انشائیوں میں علامت کو بھی برتا ہے ”انشائیہ جزیرے کا سفر“ بھی ایک علامتی انشائیہ ہے دنیا میں بہت سے جزیرے موجود ہیں کہیں سمندری جزیرے ہیں اور کہیں خشک جزیرے ہیں مصنف نے یہاں جزیرے کو انسان کی ذات اور اس کے باطن کے لیے برتا ہے اور سمندر کو بھی اس کے باطن کے لیے برتا ہے۔انسان کو ایک ہی نظر میں دیکھنا ممکن نہیں ہوتا اس پر بار بار نگاہ ڈالنی پڑتی ہے گویا ہر انسان اپنی ذات کے جزیرے میں مقید ہے۔جزیروں میں یعنی باطن میں رہنے والے لوگ باہر کی دنیا یعنی سمندر سے بے تعلق نہیں ہوتے جب باہر کی زندگی کا دائرہ وسیع ہوتا ہے یعنی باہر میل جول اور تعلقات جتنے زیادہ ہوں گے،انسان کے تجربات اور مشاہدات جتنے زیادہ ہوں گے،اس کا باطن اتنا ہی وسیع ہو گا اس طرح یہ دنیا پوری کائنات میں جزیرے کی مانند ہے گویا جزیرے کئی طرز کے ہو سکتے ہیں اور کوئی جزیرہ سمندر سے علیحدٰہ ہو کر بے تعلق نہیں ہو سکتا یہاں بھی مصنف نے علامت برتی ہے کہ انسان دنیا میں الگ رہ کر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔انشائیہ ”انتظار گاہ“میں بھی مصنف نے علامت برتی ہے اس انشائیے میں دنیا کو ریلوے اسٹیشن اور گھر کو انتظار گاہ کہا گیا ہے اور انسان دنیا میں مسافر ہے

اور اسے اس عارضی دنیا سے اپنے مستقبل کے ٹھکانے آخرت میں کوچ کر جانا ہے۔اکبر حمیدی مزید کہتے ہیں۔

"پلیٹ فارم ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہم ہنس ہنس کر ملتے ہیں اور رو رو کر جدا ہوتے ہیں۔ آنے والوں کے لیے پھولوں کے ہار ہیں اور جانے والوں کے لیے آنسوؤں کی مالا!!"[30]

انسان جب دنیا میں آتا ہے تو لوگ خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور جب جدا ہوتا ہے تو رو رو کر جُدا ہوتا ہے اس پر پھول پھینکے جاتے ہیں گویا دنیا ایک عارضی جگہ ہے تاہم ایک کامیاب سفر اس بات پر منحصر ہے کہ دنیا میں یعنی انتظار گاہ میں اپنا سفر کیسے گزارا اور اسے اپنی پہلی منزل سمجھا اور آخرت کے لیے تیاری کی۔ انشائیہ "گولڈن چانس" میں مصنف زندگی کو ایک چانس کہتے ہیں جو منتخب خوش قسمت لوگوں کو ملتا ہے۔ مصنف اسے کھلا پانی سے بھی تشبیہ دیتے ہیں زندگی ہر لحہ بدلتی رہتی ہے اور یہ بہت وسعتوں تک پھیلی ہوئی کائنات کی مانند ہے انسان پوری کائنات کو تسخیر کرنا چاہتا ہے۔ زندگی ایک سنہری موقع اور گولڈن چانس ہے۔ جن لوگوں کو زندگی ملی وہ اپنی ہمت اور شوق کے مطابق گھومتے پھرتے، مقصد کو پورا کرتے اور اسے عمل کی جگہ بناتے ہیں مصنف یہاں زندگی کا فلسفہ بھی پیش کرتے ہیں کہ وہ جو کائنات کے خوبصورت رنگوں کو اپنی آنکھوں میں سمو لیتے ہیں اور پھول کی خوشبو کے ساتھ کانٹے کی چبھن سے بھی فیض یاب ہوتے ہیں۔

انشائیہ "دور اندیشی" میں مصنف دور اندیشی کے فوائد اور قباحتیں اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں بیان کرتے ہیں۔ مصنف دور اندیشی پر طنز کرتا ہے کہ دور اندیشی اس شاعر کی مانند ہے جو اپنی غزل کا آغاز مقطع سے کرے فی الحقیقت دور اندیشی کا مفہوم ہے کہ بہت دور کے اندیشوں اور ڈر و خوف کو اپنے دولت و خانہ میں در لینا۔ دور اندیشی تب شروع ہوتی ہے جب انسان خود کو غیر محفوظ سمجھتا ہے اور اس کی بنیاد کسی خطرے پر قائم ہوتی ہے اور اس کا تعلق حال کی بجائے مستقبل سے ہوتا ہے۔ دور اندیش آدمی عام طور پر بزدل ہوتا ہے جو چھوٹے چھوٹے بچوں کو سردی میں باہر جانے سے ٹوکتا رہتا ہے۔ دور اندیش شخص ہمیشہ اضطراب کا شکار رہتا ہے اور دور کی سوچ سوچ کر فکر مند رہتا ہے اور اکثر خیالات میں کھویا رہتا ہے۔

انشائیہ "نیگٹو پازٹیو" ایک علامتی انشائیہ ہے نیگٹیو سے مراد اصلیت یعنی باطن کی اچھائیاں ہیں اور پازٹیو سے مراد سطحی ہے یعنی سامنے سے نظر آنے والا۔ مصنف کی رائے میں نیگٹیو اور پازٹیو دونوں انسانی شخصیت کے اہم پہلو ہیں اور دونوں پہلو آپس میں خلط ملط ہو گئے ہیں کونسا پہلو کہاں تک پازٹیو ہے اور کہاں تک نیگٹیو ہے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہو چکا ہے اس طرح فطرت بھی ہزاروں لاکھوں سالوں سے نیگٹو پازٹیو کا تماشا دکھا رہی ہے رات کا اندھیرا پھیل جاتا ہے اور رات کے اندھیرے کے بعد دن ضرور آتا ہے اور دن کی روشنی چارون طرف پھیل جاتی

ہے پھر رات اور دن کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے گویا انسانی زندگی کا آغاز بھی نیگٹیو سے ہوا تھا مصنف انشائیے میں اپنے دوستوں کے بارے میں آگاہ کرتے ہیں کہ ان کے دوست جتنے زیادہ قریبی ہیں اتنے ہی نیگٹو ان کے پاس ہیں اور ان کے پازٹیو تیار کر کے دیتے ہیں مصنف کے دوست اپنا باطن، اپنی اصلیت اور اچھائیاں برائیاں مصنف کو بتاتے ہیں اور وہ ان کی اصلیت کو چھپاتے ہیں اور بعض اوقات تو جان جوکھوں میں ڈال کر ان کے کردار کی سیاہیاں اور برائیوں کو مٹانے یا چھپانے کی کوشش کرتے ہیں مصنف انشائیے کے اختتام میں نصیحت بھی کرتے ہیں جو دوسروں کے کردار کو داغدار کرتے ہیں تو ان کا اپنا کردار بھی داغدار ہونے سے محفوظ نہیں رہتا۔

انشائیہ "درمیانی منزل" میں مصنف درمیانی منزل، درمیانے طبقے کی حمایت کرتے ہیں مصنف کہتے ہیں کہ نچلے طبقے کے لوگ ہمیشہ پستے رہتے ہیں جبکہ اونچے طبقے کے لوگ آسمان سے باتیں کرتے ہیں تاہم درمیانی منزل کے لوگ شعور نفس کے ذریعے تزکیہ نفس کرتے ہیں درمیانے درجے کے لوگ نہ زمین سے ٹکراتے ہیں اور نہ آسمان سے باتیں کرتے ہیں اوپر والے اور نیچے طبقے والے لوگ کسی نا کسی کشمکش کا شکار ہوتے ہیں ایک غذا کی کمی کا شکار ہوتے ہیں اور دوسرے خوراک کی زیادتی پیش آتی ہے جبکہ درمیانے طبقے کے لوگ ہر قسم کی کشمکش اور دباؤ سے آزاد ہوتے ہیں ان کی خوراک میں توازن ہوتا ہے۔

> "نچلی منزل والوں کا سارا زور اوپر کی منزل چھیننے اور اوپر کی منزل والوں کا سارا زور اپنی منزل کے تحفظ کے لیے صرف ہوتا ہے۔ انہی مقاصد کے حصول کے انہوں نے سیاست گری کا جال بچھا رکھا ہے۔ بیشتر لوگ ان دو جماعتوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ جب کوئی جھگڑا کھڑا ہوتا ہے لوگ اپنے اپنے فریق کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔"[۳۱]

اس طرح دونوں فریق خود کو سچا تسلیم کرتے ہیں اور دوسروں کو جھوٹا سمجھتے ہیں تاہم انسان کو اچھے و بُرے، جاہل و عالم، اونچا نیچا، مخالف و موافق، دوست و دشمن وغیرہ میں بانٹا گیا ہے مگر مصنف کی رائے میں بہترین درجہ درمیانہ درجہ ہے۔ انشائیہ "پتنگ" ایک علامتی انشائیہ ہے انشائیہ میں مصنف پتنگ کو اپنی زندگی قرار دیتے ہیں مصنف کا اس کاغذی پیرہن سے تعلق نجانے کب سے اور کتنے عرصے سے ہے۔ پتنگ مختلف رنگوں اور شکلوں کی ہوتی ہے اور پتنگ باز کی پتنگ دیکھ کر ہی حیثیت، مزاج اور لہجہ وغیرہ کا پتا چلتا ہے تیز ہوا میں پتنگ کسی اور سمت اڑنا شروع کر دیتی ہے اگر پتنگ کی ہوا مناسب ہو، موزوں ہو تو پھر ہی پتنگ اچھے طریقے سے رقص کرتی ہے۔ پتنگ انسان کے ذہنی ارتقاء کی مانند ہوا میں اڑتی ہے۔

"انسان کے ذہنی ارتقاء کو اگر پتنگ بازی سے تشبیہ دی جائے تو میرا خیال ہے، یہ تشبیہ بہت موزوں ہو گی۔ آخر انسان نے کیا کیا ہے؟ یہی تو کیا ہے کہ اپنے ذہن کی پرواز کو وسعت دیتا چلا گیا ہے جس طرح پتنگ باز کو ڈور دیتا چلا جاتا ہے اور وہ آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ انسان کے ارتقائے ذہن کو پتنگ بازی سے بڑی مماثلت ہے۔"[۳۲]

اگرچہ ارتقائے ذہن کے لیے موافق موسم ہونا ضروری ہے جیسے پتنگ کے لیے مناسب موسم بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آج انسانی ذہن بہت ترقی کے مراحل طے کر لیتا اگر بہت سے لٹیرے گاٹی مارنے سے گریز کرتے۔ چنگیز خان، تیمور لنگ اور ہلاکو خان نے گاٹی مار کر ہی پتنگ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ بعض دفعہ دماغ پتنگ کی طرح بلندیوں میں اُڑ رہا ہوتا ہے اور ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتا ہے اس طرح کے دماغ کو بلندی سے نارمل سطح پر لانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ انشائیہ "گالی دینے والے کی حمایت میں" مصنف گالی دینے کی وجہ اور گالی دینے والے کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔ مصنف کی رائے میں جو شخص گالیاں دیتا ہے وہ صاف دل کا مالک ہوتا ہے اس کا باطن پاک ہوتا ہے، وہ صاف گو ہوتا ہے مصنف اپنی رائے دیتے ہیں کہ مجھے زیادہ تر ان لوگوں سے ڈر لگتا ہے جو گالیاں نہیں دیتے، خاموش رہتے ہیں اور موقع دیکھ کر پیچھے سے وار کرتے ہیں۔ مصنف انسانی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہیں وہ گالی دینے والے کی نفسیات بتاتے ہیں کہ وہ اپنے غصے کا فوری اظہار گالی نکال کر تا ہے اور اس کا دل کسی بھی قسم کے بغض اور غصے سے پاک ہوتا ہے وہ اپنا تزکیہ نفس کر لیتا ہے۔ گالی دینے والے سے لوگ نفرت کا اظہار کرتے ہیں جسکی وجہ سے لوگ گالی دینے سے پرہیز کرتے ہیں۔

انشائیہ "پرانے کپڑے" ایک علامتی انشائیہ ہے اور پرانے کپڑے سے مراد گزرتے لمحے، پرانی یادیں اور پرانے رشتے مراد ہیں۔ ہمارے گھروں میں عام طور پر جابجا پرانے کپڑے بکھرے ہوتے ہیں اور یہ کپڑے پرانے ہو کر ہمارے استعمال کے قابل نہیں رہتے۔ کچھ کپڑے اپنی چمک ختم کر دیتے ہیں، کچھ کپڑے پھٹ جاتے ہیں کچھ ہمارے دل سے آہستہ آہستہ اُتر جاتے ہیں اور کچھ گمنامی میں چلے جاتے ہیں۔ مصنف کہتے ہیں کہ ایسے ہی کپڑوں کے بے شمار ٹکڑے میرے ارد گرد پھیلے ہوئے ہیں۔ مصنف کے ارد گرد ان کی یادیں بکھری ہوئی ہیں اور ماضی میں ہونے والے واقعات آنکھوں کے ارد گرد گھومتے ہیں۔

"درخت مسلسل زرد، خشک، کمزور پتوں کو پرانے کپڑوں کی طرح اتارتے چلے جاتے ہیں ہوائیں ہمیشہ موسموں کا نیا لباس پہنتی ہیں پہاڑ، سمندر، دریا، زمین، آسمان نئی نئی ہیئتیں پہنتے چلے جاتے ہیں اور پرانے مناظر پرانے کپڑوں کی طرح تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ ایسی ہی تبدیلیاں ہماری زندگی کے ہر میدان میں ہوتی رہتی ہیں۔"[۳۳]

پرانے کپڑے گزرتے لمحے اور وقت کی مانند ہے جیسے پرانا کپڑا وقت کے ساتھ پرانا ہو کر اتر جاتا ہے اس طرح لمحہ بھی پرانا ہو جاتا ہے اور پرانے لمحے کی جگہ نیا لمحہ زیب تن ہو جاتا ہے تاہم مصنف گزرتے وقت کے ساتھ ہونے والی تبدیلیوں کو نمایاں کرتے ہیں اور وقت کے فلسفے کو بھی انشائیے میں سمو دیتے ہیں۔ انشائیہ "موسم" میں مصنف اندر اور باہر کے موسم کو احاطہ تحریر میں لاتے ہیں۔ موسم کے بارے میں مختلف قسم کی پشین گوئیاں کی جاتی ہیں۔ کبھی موسم خوشگوار، کبھی ابر آلود، کبھی تیز جھکڑ، کبھی ہلکی بارش، کبھی برفباری، کبھی گرج چمک کے ساتھ تیز بارش، کبھی سردی اور کبھی گرمی ہوتی ہے اور آسمان ہمیں موسم کی صورتحال فراہم کرنے کا ذریعہ ہے تاہم وقت اور موسم ایک دوسرے کے ساتھ پیوست اور جُڑے ہوئے ہیں۔

> "وقت کائنات کی ہر چیز کو تبدیل کر رہا ہے کروٹ پر کروٹ دیے جا رہا ہے۔ جیسے کوئی صف لپیٹ رہا ہو۔ اس عمل کو شاید ہم موسم کہتے ہیں جو تبدیلی کا استعارہ ہے۔ پوری کائنات اس کی زد میں ہے۔ لیکن کیا انسان بھی؟ کم سے کم جذبوں کی سطح پر تو نہیں!" [۳۴]

مصنف انسان کو فاختہ اور موسموں کو عقاب بھی کہتے ہیں کہ انسان صدیوں سے موسموں کی لپیٹ میں ہے اور اس سے نبرد آزما ہو رہا ہے کتنی دفعہ موسم کے زور میں آ کر موت اور حادثات سے دوچار ہوا مگر پھر بھی انسان نے شکست کو قبول نہیں کیا اور مسلسل موسم سے نبرد آزما ہو رہا ہے، انسان نے اپنی حفاظت کی خاطر بہت سے حصار بھی تعمیر کیے ہیں نیز انسان میں ان نفس انسانی کو قابو میں رکھنے کی پوری قوت، طاقت اور صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ مصنف مزید کہتے ہیں کہ انسان کے اندر ایسے رڈار بھی نصب ہیں جو اسے اندر کی آفات سے محفوظ رکھتے ہیں۔

انشائیہ "چھوٹا آدمی" میں مصنف چھوٹے اور بڑے آدمی کے فرق کو واضح کرتے ہیں اور چھوٹے آدمی کی حمایت میں انشائیہ لکھتے ہیں اور چھوٹے آدمی کی خصوصیات بیان کرتے ہیں بڑا آدمی ہمیں فتح کر کے ہمارا سر بارگاہ میں جھکا کر ہم سے داد اور خراج تحسین وصول کرتا ہے جبکہ چھوٹا آدمی مفتوح ہو کر اپنا سر نیاز مندی سے جھکا دیتا ہے۔ چھوٹا آدمی خاموشی سے ہماری خدمت پر معمور ہوتا ہے مصنف بڑے آدمی کے بارے میں کہتے ہیں کہ بہت سے معاشرتی و اخلاقی مسائل بڑا آدمی بننے کی چاہ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ انشائیہ "ذمہ داری" میں مصنف ذمہ داری کے حق میں دلائل دیتے ہیں کہ ہر انسان پر کوئی نہ کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے مگر بہت کم لوگ ذمہ داری کو پورا کرتے ہیں، زیادہ تر لوگ اختیارات سے ہی فائدہ اٹھاتے ہیں مگر اپنی ذمہ داری پر توجہ نہیں دیتے مصنف ایسے لوگوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔

"جنگل" ایک علامتی انشائیہ ہے جس میں جنگل کو بطور علامت برتا گیا ہے مصنف معاشرے میں پائے جانے والے مسائل کے لیے جنگل کی علامت استعمال کرتے ہیں مصنف معاشرے میں پائی جانے والی مہنگائی کو موضوع بناتے ہیں اور مہنگائی کی وجہ سے معاشرے میں بڑھنے والی پریشانی کو موضوع بناتے ہیں انہیں بازار میدان حشر کی مانند لگتا ہے جہاں لوگوں، ٹریفک اور انجنوں کا بہت شور شرابا ہوتا ہے۔

انشائیہ "میں سوچتا ہوں" میں مصنف انکشاف ذات اور انسان کی نفسیات کو بیان کرتے ہیں کہ سوچنا دوسرے اعمال کی طرح عمل ہے اور ہر کوئی اپنے ذاتی معیار کے مطابق سوچتا ہے۔ انسان کے معیار کا اندازہ اس کی سوچ سے لگایا جا سکتا ہے۔ سوچ ایک غیر شعوری عمل ہے بچپن میں انسان کی سوچ چھوٹی سوچ ہوتی ہے جوانی میں انسان کچھ پانے اور حسین اور آئیڈیلز لوگوں کو حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگتا ہے مصنف اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں انشایئے کی تکمیل کرتے ہیں۔ مصنف سوچ کے تلخ پہلو بھی بیان کرتے ہیں کہ سوچ ایک تلخ اور کڑواہٹ سے بھرپور کام ہے جب انسان اپنی زندگی کے کڑوے سچ یاد کرتا ہے تو اندر ہی اندر کڑتا ہے۔ تاہم سوچ سمندر کی ان لہروں کی مانند ہے جو صدا آب پر چلتی رہیں گی اور سوچوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو ہمیشہ جاری و ساری رہے گا۔

انشائیہ "گھنٹہ گھر" میں مصنف انسان کو کائنات کا گھنٹہ گھر کہتے ہیں اور گھنٹہ گھر کو علامت کے طور پر برتتے ہیں انسان کی ہر گزرتے وقت کے ساتھ اس کی سوچ، سمجھ اور صلاحیتوں میں تبدیلی آ رہی ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ انسان ترقی کے مراحل طے کر رہا ہے۔ انسان کے اندر اور باہر بہت سے ریسیورز لگے ہوئے ہیں جن سے یہ پیغام وصول کر رہا ہے اور جیسے جیسے انسان ریسیورز حاصل کر رہا ہے اتنا ہی انسان مہذب، تعلیم یافتہ اور باصلاحیت ہوتا جا رہا ہے۔ انشائیہ "چڑیا گھر" ایک علامتی انشائیہ ہے اور چڑیا گھر کو انسان کی خواہشات کے لیے علامتی طور پر برتا ہے کہ ہر انسان کی کچھ خواہشات ہوتی ہیں جنہیں وہ پورا کرنا چاہتا ہے اور اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتا ہے۔ مختلف لوگوں کی مختلف خواہشات، آرزوئیں اور امنگیں ہوتی ہیں جو اکثر ادھوری رہ جاتی ہیں اور بعض اوقات پوری بھی ہو جاتی ہیں۔

انشائیہ "کامیابی" میں مصنف ہمیں حقیقی کامیابی سے روشناس کرواتے ہیں دنیا میں ہر انسان خود کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہے انسان کامیابی کو حاصل کرنے کے لیے بہت دور تک نکل جاتا ہے مگر کامیابی ایک پھول کی مانند ہے جو ہمیشہ کانٹوں سے گھرا رہتا ہے جتنے دنیا میں کامیاب انسان ہوتے ہیں ان کے پیچھے بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں مصنف مزید کہتے ہیں کہ انسان اور ہمارا معاشرہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان تک داؤ پر لگا دیتے

ہیں۔انشائیہ ”اُترن“ مصنف کا منفرد انشائیہ ہے اس انشائیے میں مصنف لباس، نظریات و خیالات اور تہذیب و تمدن کی اُترن سے نجات چاہتا ہے اور ہر چیز منفرد اور جدید چاہتے ہیں مصنف تعمیر شخصیت کرنا چاہتے ہیں اور وہ اپنی تہذیب و تمدن اور خیالات و نظریات میں بھی تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔

اکبر حمیدی کا دوسرا انشائیوں کا مجموعہ ”تتلی کے تعاقب میں ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں رنگ دار شیشے، ریشم کا ٹکڑا، نئے موسموں کے پرندے، لوز ٹھنکنگ، شادی کی شرکت، سفر، تتلی کے تعاقب میں، نقاد کی حمایت میں، موڑ، مشورہ، دیواریں، ہیرو، غالب کے طرفدار، کرکٹ، ہر دلعزیز، پالش، کیل، باغی، ضمیر کی مخالفت میں، نظام سقہ، پہلی تالی اور کھانے کی میز شامل ہیں اس مجموعے کا دیباچہ پروفیسر نظیر صدیقی نے لکھا ہے۔اکبر حمیدی کے انشائیوں میں مزاح کی رنگا رنگی اور زندگی کی رونقیں دیکھی جاسکتی ہیں اور ان کے موضوعات کسی بھی قسم کے تعصب سے خارج ہیں۔وہ گہری عصری آگہی رکھتے ہیں اور یہ ہی ان کی انفرادی خوبی ہے۔انشائیہ ”پہلی تالی “میں مصنف سامعین میں پہلی تالی بجانے والے کی اہمیت اجاگر کرتے ہیں۔یہ پہلی تالی ہی سامعین کو گرماتی ہے معاشرے میں پنپنے والی تنظیموں کی روح رواں بنتی ہے اور پہلی تالی ہی راج کرتی ہے اور یہ قومی مسائل کو حل کروانے کا سبب بنتی ہے اور بین الاقوامی سطح پر بھی پہلی تالی کی آواز سنی جاسکتی ہے۔مصنف پہلی تالی بجانے والے کو خراج تحسین بھی پیش کرتے ہیں۔پہلی تالی بجانے والا نفسیات دان ہوتا ہے جو لوگوں کی نفسیات کو سمجھتا ہے مصنف پہلی تالی سے مراد پہلی آواز اور پہلا قائد لیتے ہیں جو سب سے پہلے حق کے لیے آواز اٹھاتا ہے وہ پہلے آواز اٹھانے کی ہمت اور حوصلہ رکھتا ہے مصنف ہنگری تحریک آزادی کے پہلے قائد پٹوفی کی مثال دیتے ہیں۔اس پہلے بارش کے قطرے نے جان پر کھیل کر کروڑوں لوگوں کی جان بخشی۔

انشائیہ ” باغی “میں مصنف باغی کی خوبیاں، صفات اور اہمیت بیان کرتے ہیں۔مصنف خود باغی کی خوبی رکھنے پر فخر کرتے ہیں۔باغی شخص غیر معمولی ذہانت، عقل، پیش رفت اور برداشت کا عنصر رکھتا ہے۔وہ وقت کا بھرپور استعمال کرتا ہے۔باغی شخص اطاعت کا جذبہ نہیں رکھتا۔زیادہ اطاعت کرنے والا شخص اپنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے اور اس کی عزت اور غیرت بھی ماند پڑ جاتی ہے جتنی پسماندہ قومیں ہیں وہ اتنی ہی فرمانبردار ہیں ترقی یافتہ قومیں بغاوت پسند کرتی ہیں دنیا میں جتنے بڑے عالم اور ہیروز ہیں وہ دراصل باغی ہی ہیں۔انہوں نے اپنے وقت کے دقیانوسی خیالات اور برائیوں کے خلاف آواز بلند کی ہماری فطرت بھی بغاوت پر عمل کرتی ہے جیسے کہ ہوا حبس کے خلاف کھلی بغاوت ہے اندھیرے میں چاند کی روشنی بھی کھلی بغاوت ہے گویا یہ دنیا بھی بغاوتوں کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔

"سو باغی ہونا ایک نہایت ہی باوقار، پر لطف اور بالکل نئے انداز کی زندگی بسر کرنا ہے جس کا تصور بھی وہ لوگ نہیں کر سکتے جو اس وصف عظیم سے محروم ہیں!!یہ ایک انوکھا تجربہ ہے!!باغی ہونا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔اس کے لیے عظیم حوصلے کی ضرورت ہے۔میں تو باغی انسان کو انسانوں میں سے بھی کچھ اور ہی طرح کی مخلوق سمجھتا ہوں۔وہ اور ہی طرح سے دیکھتے ہیں۔۔۔۔اور ہی طرح سے پیش آتے ہیں۔۔۔۔"[۳۵]

دنیا میں نئی نئی ایجادات بھی بغاوت کا نتیجہ ہیں انسان نے جنگلوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے نئے نئے راستے، سڑکیں بنائیں اور دنیا میں مختلف طریقے سے ترقی کی۔اس طرح انسان کی ترقی اور انسان کی زندگی کا سارا دارومدار بغاوت پر منحصر ہے۔انشائیہ "مشورہ" میں مصنف مشورہ دینے اور لینے کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہیں بہت سے لوگ دوسروں سے مشورہ لینے کے عادی ہوتے ہیں ایسے لوگ اکیلے سفر نہیں کر سکتے چونکہ مشورہ کرنا اچھی چیز ہے مگر اس میں قباحت زیادہ پائی جاتی ہے اگر کوئی شخص ہر وقت مشورہ کرتا رہے اسے مشورے کی اتنی عادت ہو جاتی ہے کہ کوئی کام وہ مشورے کے بغیر کر ہی نہیں سکتا زیادہ مشورہ لینے والا دوسروں کے اشارے پر ناچتا ہے بعض لوگ مفت مشورہ دیتے ہیں اور ایسے لوگ ہر موڑ پر موجود ہوتے ہیں بعض دست شناس ہوتے ہیں بعض طوطے سے فال نکلواتے ہیں بعض ماہر علوم رمل و نجوم سے مشورہ لیتے ہیں اور بعض قانون دانوں سے مشورہ طلب کرتے ہیں مصنف کے مطابق گاؤں یا دیہات کے لوگ زیادہ مشورہ دیتے ہیں اور عموماً مایوس کن اور منفی مشورے ہی دیے جاتے ہیں اور جو لوگ زیادہ مشورے لیتے ہیں ان کی قوت فیصلہ ختم ہو جاتی ہے۔

انشائیہ "غالب کا طرفدار" میں مصنف زندگی کا فلسفہ بیان کرتے ہیں۔مصنف زندگی کو جنگل کا ایک مشکل سفر کہتے ہیں اور اس سفر میں مصنف اپنا بخوبی ساتھ بھی دیتے ہیں کبھی زندگی میں بہت نازک حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔مصنف خود کو ہی زندگی کا دوست اور ہمزاد قرار دیتے ہیں۔ہمیں خود پر تنقید کا نشانہ بھی نہیں بنانا چاہئیے اپنی غلطیوں پر خود الزام تراشی نہیں کرنی چاہئیے بلکہ سمجھنا چاہئیے کہ میرے فیصلے پُر اعتمادی کے ساتھ کیے گئے تھے اگر کوئی نقصان کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے مصنف زندگی کے بارے میں اپنی رائے بھی دیتے ہیں۔

"زندگی بہت عجیب چیز ہے۔۔۔۔مگر انسانی سوچیں تو بہت عجیب ہیں۔۔۔۔۔۔میں نے اکثر سوچا ہے۔انسان کس قدر ہمدردی، محبت، نرمی اور صرف نظر کا متمنی ہے کہ زندگی جیسا مشکل اور پیچیدہ کھیل اسے بغیر کسی مشق اور تجربے کے کھیلنے کو کہا گیا ہے۔"[۳۶]

انشائیہ ”پالش“میں مصنف زندگی میں پالش کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ مصنف کے مطابق انسان کی خوبصورتی اس پالش کی ہی وجہ سے ہے اس طرح نئے کپڑوں اور نوجوانوں کے چہرے اس وجہ سے زیادہ دلکش اور دیدہ زیب لگتے ہیں کہ ان پر قدرتی پالش موجود ہوتی ہے۔ مسکراہٹ بھی تو چہرے کی پالش ہوتی ہے۔ بعض انسانوں میں تہذیب، سلیقہ، آداب و گفتار اور کردار اتنا اعلیٰ ہوتا ہے کہ وہ سب کا پسندیدہ ہوتا ہے دراصل حسن بھی ایک طرح سے پالش ہی ہے گلاب کا پھول بھی پالش کی وجہ سے خوبصورت ہوتا ہے فطرت بھی پالش کی وجہ سے دلکش اور خوبصورت ہے۔ اصل انسان کی خوبصورتی اس میں ہے کہ وہ اپنی اخلاقیات، تہذیب، وفاداری، رواداری اور اچھی خوبیوں کو بحال رکھے اسی طرح وہ اپنے آپ پر پالش قائم رکھ سکتا ہے۔

انشائیہ ”کرکٹ“میں مصنف کرکٹ کے کھیل کو زندگی کے مماثل قرار دیتے ہیں مصنف کرکٹ کی فیلڈنگ کو شطرنج کی بساط قرار دیتے ہیں اور اسے یہ زندگی کی ہی تصویر کہتے ہیں۔ جس میں منصوبہ بندی، تکنیک، جارحیت، محبت، نفرت، ہنسنا اور رونا وغیرہ شامل ہے اور یہ زندگی گزارنا سکھاتا ہے اور فیلڈنگ کو دیکھ کر میدان جنگ میں کوئی اُتری ہوئی کوئی فوج کی یاد آتی ہے۔ جس میں ہر کھلاڑی اپنی جگہ پر مرد شجاعت بن کر کھڑا اور لڑتا نظر آتا ہے۔ کیپٹن حالات پر کڑی نگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ کھلاڑیوں کو مختلف احتیاطیں اور ہدایات دیتا ہے۔ فیلڈنگ کو دیکھ کر زندگی کے بہت سے نازک حالات یاد آتے ہیں۔ وکٹ کیپر حملہ آور بھی اور دفاع بھی کرتا ہے اس کی ذمہ داری سے کام لینا ٹیم کو فتح سے دوچار بھی کرواتا ہے اور غیر ذمہ داری شکست کا سامنا کرواتی ہے۔

اکبر حمیدی کا تیسرا مجموعہ ”جھاڑیاں اور جگنو“ ۱۹۹۸ءمیں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں درج ذیل انشائیے شامل ہیں۔ نئی پرانی گاڑیاں، اونچی ناک اور قومی ترقی، سپنوں کا گاؤں، میک اپ، پیچھے رہا ہوا آدمی، جامن کا پیڑ، روشنی کا غبارہ، بگڑا ہوا بچہ، مٹی کا سورج، اکھاڑے، باورچی خانہ، ترجیح، کافر عشقم، ریلوے پھاٹک، سیر ہی سہی، جھاڑیاں اور جگنو، ٹھینگا باجے، اتفاق سے، چہرہ بہ چہرہ، آرام طلبی، کھانے کی میز، نظام سقہ اور کیل۔ اکبر حمیدی خارج سے اپنے موضوعات اکھٹا کرتے ہیں۔ اکبر حمیدی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور معاشرے کے دیگر موضوعات پر بھی بات کرتے ہیں اور بعض جگہ پر زندگی کے تلخ حقائق کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔ ان کے انشائیوں میں آغاز سے اختتام تک دلچسپی کا عنصر پایا جاتا ہے جو قاری کے لیے کشش کا باعث بنتی ہے۔ وہ گہری فکر اور سوچ کے ساتھ فکر کے نئے دریچے وا کرتے ہیں جو کہ قاری کے لیے مسرت کا باعث ہے۔

انشائیہ ”نئی پرانی گاڑیاں“میں مصنف انسانی جسم کے لیے گاڑی کو بطور علامت برتتے ہیں اور روح کے لیے ڈرائیور کو بطور علامت استعمال کیا ہے۔ مصنف کی رائے میں انسانی جسم ایک گاڑی ہے۔ جس میں بیٹھ کر ہم

ڈرائیونگ کرتے ہیں جس قدر گاڑی نئی اور بہتر ہو گیا تنی ہی گاڑی اچھا سفر کرے گی۔ اس طرح جسم اور روح کا بھی گہرا تعلق ہے جو کچھ جسم پر گزرتا ہے اسے انسان اندر تک محسوس کرتا ہے۔ تاہم خاندان، معاشرہ، قوم اور ملک بھی ایک قسم کی گاڑیاں ہیں جو آہستہ آہستہ حال دل ہی سنا رہی ہیں۔

انشائیہ "اونچی ناک اور قومی ترقی" میں مصنف ناک کی اہمیت کو بیان کرتے ہیں اور ناک کو علامت کے طور پر برتتے ہیں۔ انسان کے چہرے پر اصل خوبصورتی ناک کی ہی وجہ سے ہے اگر ناک اونچی ہو گی تو چہرہ خوبصورت لگے گا اور اگر ناک چپٹی ہوئی ہو گی تو چہرہ بدنما لگے گا چہرے پر ناک کی مرکزی اور نمایاں حیثیت ہے مصنف کی رائے میں قومی ترقی اسی صورت ممکن ہے جب ہم ناک کی سیدھ یعنی سیدھے راستے پر چلیں اور نیکی کے راستے کو اہمیت دیں اور اچھائی کا رویہ اختیار کریں اور یہ اسی صورت ممکن ہے جب انسان ضمیر کی آواز سنے اور اس کا ضمیر اجاگر ہو گویا تب ہی ہم اونچی ناک کے وجود کو سمجھ سکیں۔ انشائیہ "سپنوں کا گاؤں" میں مصنف اپنے گاؤں فیروزوالہ سے لگاؤ اور محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ مصنف کے سپنوں کا گاؤں ان کا گاؤں فیروزوالہ ہی ہے جہاں ٹھنڈے میٹھے پانی کی ندی بہتی ہے اور دوسری طرف ایک اونچا ٹیلا ہے جہاں چرواہے بیٹھ کر بانسری سے دھنیں بجاتے ہیں جہاں ارد گرد باغات پھیلے ہوئے ہیں مصنف اسلام آباد منتقل ہو گئے ہیں مگر ان کے دل میں ابھی بھی فیروزوالہ گاؤں سے محبت قائم ہے وہ لوگوں کی بجائے وہاں کی گلیوں کو یاد کرتے ہیں۔

> "تب مجھے محسوس ہوا کہ میں گاؤں کے کسی شخص کی جدائی کو اس قدر محسوس نہیں کر رہا ہوں جس قدر گاؤں کی گلیوں اور در و دیوار کی جدائی کو۔ جن درخت کے نیچے میں بیٹھتا تھا، جن جگھوں پر میں کھیلتا تھا اب وہ کس قدر دلکش ہو گئے تھے، وہاں کے پانی سے لبالب ڈھاب کو ـــــ وہاں کے مناظر کو جانوروں۔ کھیتوں۔ فصلوں۔ فضاؤں کو۔۔۔ وہاں رہتے ہوئے جن چیزوں کو میں نہایت غیر اہم سمجھتا تھا اب وہ سب کی سب اچانک مجھے نہایت اہم محسوس ہونے لگیں تھیں۔۔۔۔۔ ان سب نے مجھے اداس کر دیا تھا۔"[۳۴]

مصنف اپنے تجربے اور مشاہدے سے گاؤں کی خوبیاں بیان کرتے ہیں کہ گاؤں میں صفات سے زیادہ ذات کی قدر ہے انہیں وہاں گزرا ہوا وقت اور گاؤں بہت یاد آتا ہے اور مصنف اس گاؤں کا باشندہ ہونا فخر کی بات سمجھتے ہیں اور یہ ہی ان کے سپنوں کا گاؤں ہے۔ انشائیہ "میک اپ" میں مصنف میک اپ پر بات کرتے ہیں کہ میک اپ کسی چیز کو چھپانے کے لیے، دکھانے کے لیے یا کچھ ظاہر کرنے کے لیے کیا جاتا ہے مصنف اپنے نکتہ نظر کو بھی واضح کرتے ہیں کہ جو میک اپ دکھاوے کے لیے ہوتا ہے یہ ہمارے ذوق نظر کو بڑھاتا ہے جو میک اپ ہمارے چہرے کو

چھپانے کی خاطر کیا جاتا ہے وہ ذوق نظر کو ختم کرنے کے لیے یا اسے مہمیز لگانے کے لیے کیا جاتا ہے پہلے پہل لوگ میک اپ کو فیشن سمجھتے تھے لیکن اب اسے ضرورت مانتے ہیں۔ یہ ایک جمالیاتی ضرورت ہے میک اپ فرد سے لے کر اجتماعی زندگی، قومی اور بین الاقوامی سطح تک بھی کیا جاتا ہے۔ اقتصادیات اور سیاسیات کے شعبوں میں بھی میک اپ بہت عمدہ طریقوں سے کیا جاتا ہے۔

انشائیہ ''پیچھے رہا ہوا آدمی'' میں مصنف انکشاف ذات کرتے ہیں اور ذہنی کیفیت کو بیان کرتے ہیں کہ بعض دفعہ صورتحال یا حالات ایسے آتے ہیں جب انسان خود کو پیچھے رہا ہوا آدمی محسوس کرتا ہے مصنف اپنے کشفی پہلو کو بتاتے ہیں کہ بعض دفعہ مجھے ایسی صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب مجھے بات بہت دیر سے سمجھ میں آتی ہے ۔مصنف مزید کہتے ہیں کہ میں ذہین آدمی ہوں مگر مجھ میں خودکار قسم کی تیزی نہیں ہے جو ہر وقت بر سر عمل کرنے کے لیے موجود ہوتی ہے مصنف مزید کہتے ہیں کہ بہت سے مواقع پر میں محبت کی زبان سمجھنے سے قاصر رہا ہوں مصنف اپنوں کی جدائی کو بھی پیچھے رہا ہوا آدمی کی طرح محسوس کرتے ہیں۔ انشائیہ ''جامن کا پیڑ'' میں مصنف جامن کے درخت سے حاصل کیے ہوئے تجربات اور مشاہدات کے زیر اثر لکھتے ہیں اور یہ انشائیہ فطرت کے مشاہدے پر لکھا گیا ہے مصنف کے گھر کے آنگن میں جامن کے پیڑ ہے مصنف کی خاتون خانہ اب اس پیڑ کو کاٹنا چاہتی ہیں کیونکہ اب وہ پھل دینے کے قابل نہیں رہا اور پتے زمین پر زیادہ گرنے سے زمین گندی ہو جاتی ہے مگر مصنف پیڑ کے فوائد بتاتے ہیں اور پیڑ کے کاٹنے کے ارادے کو ترک کر دیتے ہیں یہ درخت مصنف کی کھڑکی پر ایستادہ ہے اور جون کے گرم مہینے میں سورج کی گرمی سے محفوظ رکھتا ہے اور کمرے کی چھت کو تپش سے محفوظ رکھتا ہے بارشوں کے موسم میں بارش کو کمرے میں آنے سے روکتا ہے یہ پرندوں، چڑیوں وغیرہ کا مسکن بھی ہے اس کا گھنا سایہ ہوتا ہے بچے اس کے سائے تلے کھیلتے ہیں۔ بارش کے موسم میں اس کی سوندھی خوشبو ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ مصنف مزید کہتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ درخت پھل ہی دیں بلکہ اس کا گھنا سایہ بھی تو اس کا پھل ہی ہے۔ اس کا حسن وزیبائش اور خوشبو بھی تو اس کا پھل ہی ہے۔

''روشنی کا غبارہ'' میں مصنف ایک منفرد سوچ اور خیال کو زیر بحث لاتے ہیں انسان کے ذہن میں عجیب خیالات کم ہی آتے ہیں اکثر سب توازن ذہن ہی رکھتے ہیں جن میں غیر معمولی یا عجیب خیالات مشکل ہی سے آتے ہیں۔ معمولات سے ہٹ کر زیادہ نہ سوچنا ایک نفسیاتی عارضہ ہے اکثر لوگ متوازن ذہن رکھتے ہیں تاہم آج لوگ جتنی ترقی کر رہے ہیں یہ غیر معمولی اور عجیب خیالات کی وجہ سے ہی ہے۔ مصنف بھی انشائیے میں عجیب خیال پیش

کرتے ہیں کہ مصنف روشنی کو چاروں اطراف پھیلانے کے لیے غبارہ چھوڑنا چاہتے ہیں۔ تاہم مصنف ایک منفرد سوچ پیش کرتے ہیں۔

انشائیہ ''بگڑا ہوا بچہ''میں مصنف معاشرے کے بنائے ہوئے اداروں کے معاشرے پر دباؤ کو اپنے انشائیے میں موضوع بحث بناتے ہیں۔ ہر انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کی منفرد سوچ اور اپنے منفرد خیالات و نظریات ہوتے ہیں ۔معاشرہ مختلف اداروں کو بناتا بھی ہے اور اس بگڑے ہوئے بچے کو سدھارنے کے لیے اپنی تعلیم، نظریات، تہذیب، تعلیم، اخلاقی اقدار کا دباؤ بچے پر ڈالتا ہے اور اس طرح معاشرے کی فرد واحد کی حیثیت معاشرے سے ختم ہو جاتی ہے اس سے خود غرض اور منافق کردار جنم لیتے ہیں اور معاشرہ ان کھوکھلے اور منافق کرداروں کے بیچ میں دب کر رہ جاتا ہے۔ مصنف بگڑے ہوئے بچے سے مراد فرد واحد کو کہتے ہیں جس کے اپنے خیالات، رائے اور جذبات ہیں لیکن معاشرہ اسے بگڑا ہوا بچہ کہتا ہے معاشرہ اپنے اداروں کے ذریعے اس کی سوچ، فکر، تہذیب، تربیت اور اخلاق کو بدل کر رکھ دیتا ہے تب وہ بگڑا ہوا بچہ معاشرے کے مطابق ڈھل جاتا ہے مگر مصنف خود کو بگڑا ہوا بچہ ہی رکھنا چاہتے ہیں اور خود کو ان اداروں کی اطاعت گزاری سے دور ہی رکھنا چاہتے ہیں۔

انشائیہ ''مٹی کا سورج''ایک علامتی انشائیہ ہے مصنف لکھاری کے لیے مٹی کا سورج لفظ علامت کے طور پر برتتے ہیں جو تاریکی میں روشنی کرتا ہے اور لکھاری خود آگ میں جل کر دوسروں میں علم اور روشنی بانٹتا ہے ایک لکھاری مختلف باتیں سوچتا ہے مصنف اپنے تجربے اور تخلیق کرنے کی صلاحیت کو اپنے انداز میں بیان کرتے ہیں مصنف انشائیے میں روحانیت کے موضوع پر بھی بات کرتے ہیں۔ اس طرح ایک لکھاری مختلف سوچوں میں گم ہو کر خود کو سورج کی آگ میں جلا کر کچھ تخلیق کرتا ہے تاکہ یہ روشنی دوسروں تک پہنچا سکے۔

انشائیہ ''اکھاڑے''میں مصنف اپنے چاروں طرف موجود اکھاڑے دیکھتے ہیں جو کہ انسان کے ایک دوسرے سے برتری حاصل کرنے کے نتیجے میں وجود میں آتے ہیں۔ مصنف دنیا میں اکھاڑے ہی اکھاڑے دیکھ کر انہیں طنز کا نشانہ بناتے ہیں گویا ازل سے ہی انسان کی کمزوری ہے کہ وہ فتح حاصل کرنا چاہتا ہے اور شکست کو برداشت کرنے کا حوصلہ ناپید ہے۔ دنیا میں مختلف کھیل جذبہ برتری کو تسکین فراہم کرنے کے لیے ہی کھیلے جاتے ہیں۔ اگرچہ مصنف دنیا میں موجود جنگ کے کھیل کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جو فتح و شکست کے کھیل میں انسانیت کو تباہ و برباد کر رہی ہے اور اس طرح کے گھٹیا کھیل سے کروڑوں انسانوں کا خون ہو چکا ہے مصنف انشائیہ کے اختتام میں نصیحت کرتے ہیں کہ انسان کو احساس برتری حاصل کرنے والے اس قسم کے کھیل سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

انشائیہ "باورچی خانہ" ایک علامتی انشائیہ ہے جس میں مصنف باورچی خانے میں موجود چیزوں نمک، مرچ، ہلدی، چٹنی، مربے، اچار، چٹنیاں، کشمش اور بادام، آگ، ہوا کو غم، خوشیوں، راحت، کامیابی اور ناکامی کے لیے علامت کے طور پر برتا ہے کیونکہ اکثر اوقات غم اور خوشی کو آپس میں ملا دیتے ہیں جس سے خوشی غم میں مدغم ہو جاتی ہے اور ہم خوشی سے صحیح سے لطف اندوز نہیں ہو پاتے۔

"میرا خیال ہے اگر ہم ان سب چیزوں کو الگ الگ رکھنے کی صلاحیت حاصل کر لیں تو سب سے لطف اندوز ہونے لگیں۔ لیکن ہم تو چینی میں مرچیں ملائے رکھتے ہیں اور یوں چینی کی مٹھاس کو محسوس کرنے کی بجائے مرچوں کی تلخی سے بے مزا ہوتے رہتے ہیں آخر ہم اتنی سی بات کو کیوں سمجھ نہیں پاتے کہ چینی کے برتن کو اور مرچوں کے برتن کو ایک دوسرے سے علیحٰدہ علیحٰدہ فاصلے پر رکھنے کی ضرورت ہے۔"[۳۸]

انشائیہ "ترجیح" میں مصنف کو اپنی زندگی میں ملنے والی ترجیح کو زیر بحث لاتے ہیں اور ترجیح کی نفسیات پر بات کرتے ہیں۔ مصنف ترجیح کے معاملے میں خود کو بہت حساس سمجھتے ہیں کیونکہ مصنف کو بچپن سے ترجیحی سلوک ملا ہے مگر اب ان کے دوست ان کو ترجیح نہیں دیتے۔ مصنف اپنے ماضی کو یاد کرتے ہیں کہ ان کے ماں باپ بہن بھائی بیوی بچے ہمیشہ ان کے ساتھ ترجیحی سلوک کرتے رہے ہیں اس وجہ سے مصنف کو ترجیح کی عادت ہو چکی ہے اور ترجیحی سلوک کا حصول انسان کی نفسیات میں شامل ہے ترجیح سے مصنف کا دل کبھی سیر نہیں ہوا بلکہ مصنف کے مطابق دل بھرنے میں انہیں صدیاں لگیں گی مصنف کی رائے میں ترجیحی محبت کسی چیز کا بھی نعم البدل نہیں ہے۔

انشائیہ "کافر عشقم" میں مصنف مذاہب کے مختلف گروہوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور ایک گروہ دوسرے گروہ کو کافر ہونے اور مسلمان نہ ہونے کا درجہ دے دیتا ہے اور مذاہب کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر کے ذات پات کی طرح کوئی چیز سمجھ لیا گیا ہے مصنف کشفی پہلو کو سامنے لاتے ہیں کہ وہ چالیس سال کے بعد اس حقیقت کو سمجھ پائے کہ وہ چھوٹے دائرے سے نکل کر خود کو دائرہ انسانیت میں لے آئے جہاں کالے گورے، عالم جاہل مسلمان، کافر سب سے انسانیت کی بنا پر محبت کی جاتی ہے۔ تاہم مصنف معاشرے میں مذاہب کی وجہ سے مختلف قوموں اور مختلف گروہوں کی لڑائی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جو لڑتے ہوئے انسانیت کو ہی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مصنف انشائیے کے اختتام پر خطیبانہ انداز اپناتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے گناہوں کی سزا کے لیے ایک دن مقرر کر رکھا ہے جب اللہ تعالیٰ انسان کو اس کے کیے کی سزا دیں گے۔

انشائیہ " ریلوے پھاٹک " میں مصنف اپنے بچپن کی یاد کو تازہ کرتے ہیں کہ جب وہ بچپن میں ریل گاڑی دیکھنے کے لیے گاؤں سے شہر ریلوے پھاٹک پر دھواں اڑاتی ریل گاڑیاں دیکھنے کے لیے پیدل چھ سات کلومیٹر سفر کرتے تھے اور پھاٹک کی دوسری طرف شہر تھا مگر مصنف اس میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ پھاٹک پر جب ٹریفک رکی ہوتی اور ریل گاڑی کی آواز آنی شروع ہو جاتی تو ریل کی دھمک محسوس ہوتی اور لڑکے چیخیں مارتے اور ریل کنکر، گرد و غبار اڑاتی گزر جاتی اور کنکر یا دھول کا کوئی ذرہ ان کی آنکھوں میں براجمان ہو جاتا مصنف اب گاؤں سے شہر منتقل ہو چکے ہیں اور ان کو وہ ماضی یاد آتا ہے جب ریلوے پھاٹک پر ریل گاڑی کی اڑتی گرد و غبار سے لطف اندوز ہوتے تھے مگر اب وہاں منظر بدل چکا ہے اور مصنف ماضی میں ریلوے پھاٹک کے منظر میں کھوئے ہوئے ہیں۔

انشائیہ " سیر ہی سہی می "ں مصنف بحیثیت پروفیسر اپنے تجربات و مشاہدات کو انشائیہ کی صورت میں لکھتے ہیں اور وہ غالب کی غزل کے مصرعے کو انشائیہ کا عنوان دیتے ہیں کہ دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی اور یہ مصرعہ ہی انشائیہ کا نچوڑ ہے۔ مصنف کو استاد ہونے کے ناطے امتحانی پرچے دیکھنا نہایت پریشان کرتا اور آپ بوریت کا شکار ہو جاتے اس بوریت سے نجات پانے کے لیے آپ نے کالج کے سرسبز گوشے کو منتخب کیا جہاں اونچے سرو کے درخت تھے اور اردگرد کیاریاں تھیں اور اردگرد ہری گھاس تھی وہاں میز پر بیٹھ کر آپ نے امتحانی پرچے دیکھنا شروع کیے اور یکایک آپ کی پریشانی آسانی میں بدل گئی اور آپ ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگے گویا مصنف اپنے تجربات کو عمدہ پیرائے سے انشائیے میں سمو دیتے ہیں۔

انشائیہ " جھاڑیاں اور جگنو " ایک علامتی انشائیہ ہے۔ مصنف جھاڑیوں کو ماضی، جگنو کو مستقبل اور خود کو حال کہتے ہیں مصنف بچپن میں ساون بھادوں کے موسم میں تالاب کے ساتھ ملحق جھاڑیوں سے جگنو پکڑا کرتے تھے کوئی جگنو تو ان کے ہاتھ آ جاتا تو اس طرح ان کی ہاتھ جگنوؤں سے بھر جاتے مگر بعض دفعہ جگنو ان کے ہاتھ سے نکل جاتا اور ہاتھ کی ہتھیلیوں میں اندھیرا ہی رہ جاتا۔ مصنف خواہشوں اور امیدوں کے لیے جگنوؤں کو علامتی طور پر برتتے ہیں۔ خواہشوں اور امیدوں سے ہمارے دل منور ہو جاتے ہیں اور اگر ناامیدی ہو تو دل میں اندھیرا ہی رہتا ہے جھاڑیوں کی طرح جس میں جگنو موجود نہیں ہوتے انسان کو امید رکھنی چاہئیے اس سے دل زندہ اور شاد باد رہتا ہے اور جگنوؤں کی روشنی سے ہم مستقبل کی دنیاؤں میں سیر و سیاحت کر سکتے ہیں۔

> " جذبوں سے لبریز دل۔ خوابوں سے معمور آنکھیں اور رنگوں سے شرابور چہرے اس لیے روشن ہیں کہ ان کے بطون میں ان گنت جگنو چمک رہے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے اندر وہ کونسی چیز ہے جس کے شعلے ہمارے رگ و پے میں لپکتے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔۔۔۔ وہ کوئی جگنو ہی ہو سکتا ہے ورنہ ہمارے تاریک جھاڑیوں کے سوا اور ہیں کیا!! "[۳۹]

مصنف سورج کو بھی ایک جگنو ہی کہتے ہیں جو دن رات کو روشن رکھتا ہے۔ گویا ہمارے اندر بھی جگنو موجود ہیں روشنی، تاریکی، غم اور خوشی بھی تو ہمارے اندر کے جگنو ہیں اور جب تک یہ جگنو ہمارے اندر روشنی فراہم کرتے رہیں گے تو تاریکی چھٹ جائے گی اس وجہ سے ہمارے اپنے اندر جگنوؤں کو ہمیشہ روشن رکھنا چاہئیے۔ انشائیہ ''ٹھینگا باجے'' میں مصنف مختلف پیشوں اور اس کی تقسیم کار پر بحث کرتے ہیں۔ انشائیہ جس کا کام اسی کو ساجھے اور کرے تو ٹھینگا باجے محاورے پر لکھا گیا ہے۔ ماہر اقتصادیات نے ہر کسی کو تقسیم کار کے اصول کے مطابق ان کی مہارتوں کے پیش نظر رکھتے ہوئے کام پر لگا دیا ہے اور دنیا کی ترقی کی اصل وجہ یہی تقسیم کار ہی ہے۔ انسان پہلے جنگل میں رہتا تھا اور تقسیم کار کے تحت ہی اس نے جنگل سے باہر نکل کر مختلف پیشے اپنائے، ابتداء میں کسی نے کپڑا بنایا ہو گا، کسی نے اناج کے لیے زمین کاشت کی ہو گی، کسی نے فنون لطیفہ کا پیشہ اپنایا ہو گا اس طرح یہ کام انہوں نے اپنی اولادوں کو سکھا دیا ہو گا اس طرح سب پیشے بنی نوع انسان میں تقسیم ہوئے اور علمی ، تہذیبی، معاشی، سیاسی اور سائنسی ضروریات کے لیے بھی شعبے وجود میں آئے تاکہ معاشرے کا سکون اور نظام قائم رکھا جا سکے۔

انشائیہ ''اتفاق سے'' میں مصنف زندگی میں اتفاق کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں مصنف نیوٹن کی مثال دیتے ہیں کہ انہوں نے اتفاق سے گرتے ہوئے سیب کو دیکھا اور کشش ثقل دریافت کی اسطرح اتفاق سے کولمبس نے امریکہ دریافت کیا اور مختلف ایجادات اتفاق سے ہی سامنے آئیں تاہم اگر تاریخ میں نظر دوڑائیں تو اتفاق کا اہم کردار نظر آئے گا اس طرح انسان کی زندگی میں اتفاق نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انشائیہ ''چہرہ بہ چہرہ'' ایک فکری انشائیہ ہے انسان کی زندگی میں سوچ ہی سوچ ہوتی ہے جو انسان کی زندگی کو بھوت کی طرح قابو میں رکھتی ہے اور اسے کسی جن کے ذریعے ہی انسان کے ذہن سے اُتارا جا سکتا ہے تاہم انسان کی سوچ جیسی ہو گی ویسا ہی اس کا چہرہ ہوتا ہے، کچھ سوچیں موجودہ ہوتی ہیں اور کچھ غیر موجودہ ہوتی ہیں مصنف اپنے تجربات کے نچوڑ بھی انشائیہ میں بیان کرتے ہیں کہ سوچوں کے کچھ چہروں سے انسان کا سامنا ہوتا ہے اور وہ چہرہ وقت کے ساتھ اپنا رنگ بدل لیتا ہے۔

> ''زندگی کے اتنے چہرے ہیں کہ ہم انہیں گن نہیں سکتے۔ یہ ہزار چہرہ محبوبہ ہے اور ہر چہرے میں کئی چہرے ہیں کہ ہم انہیں گن نہیں سکتے، میں سمجھتا ہوں ہر واقعہ۔ ہر خیال۔ ہر جذبہ۔ ہر کیفیت۔ ہر مقام ہر شخص بلکہ ہر چیز ایک چہرہ ہے اور ان میں سے ہر ایک بطون کی خبر دیتا ہے۔''[۴۰]

مصنف مزید کہتے ہیں کہ انہوں نے زندگی کے بہت سے چہرے دیکھنے کے ساتھ ساتھ سوچے بھی ہیں اس طرح ان کو سوچ کر بھی بہت لطف اٹھایا ہے۔ انشائیہ ''آرام طلبی'' میں مصنف زندگی میں آرام طلبی کی اہمیت کو بیان

کرتے ہیں افراد قوم اور اقوام عالم کو آرام طلبی کی زندگی گزارنی چاہئیے آرام طلب انسان ہی فطرت کو قریب سے دیکھتا ہے اس لیے زیادہ تر شعراء آرام طلب تھے مصنف غالب اور میر کی مثال بھی دیتے ہیں۔ آرام طلبی انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اور بے آرامی غیر فطری عمل ہے جتنی کوئی قوم آرام طلب ہو گی اتنی ہی تہذیب یافتہ ہو گی گویا انسان نے آج تک اتنی ترقی اور ایجادات آرام طلبی کی وجہ سے ہی کی ہیں۔

انشائیہ ''کھانے کی میز'' میں مصنف اپنی زندگی میں کھانے کی میز کی اہمیت بتاتے ہیں کہ ان کے ہاں کھانے کی میز کے لیے کوئی مناسب کمرہ موجود نہیں تھا اس وجہ سے بر آمدے میں باورچی خانے کی دیوار کے ساتھ رکھا گیا تھا اور یہ چیزیں رکھنے کے کام آتا تھا گھر کے لوگ کبھی بھی اس پر بیٹھ کر کھانا تناول نہ کرتے اور علیحٰدہ علیحٰدہ بیٹھ کر ہی کھانا کھاتے اپنی سہولت کے لیے گھر والوں نے اس پر ٹائم پیس، پھولوں کا گلدان، شیشہ، کنگھی، بستے، خطوط، اخبارات، میگزین، بجلی، ٹیلی فون اور گیس کے بل، شادی بیاہ کے کارڈ، سودہ سلف کی فہرستیں، دوائی کی شیشیاں اور قلم پنسل وغیرہ رکھے ہوئے تھے مصنف انسان پر طنز بھی کرتے ہیں کہ انسان سہل واقع ہوا ہے اور اپنی مشکل پسندی کو جلد ہی آسانی میں تبدیل کر لیتا ہے۔ مصنف اس کھانے کی میز سے چیزوں کو اکثر ہٹاتے بھی رہتے ہیں مصنف علامت کے طور پر برتتے ہیں کہ جس طرح ذہن میں زیادہ چیزیں اکھٹی ہو جائیں تو کچھ بھلانا پڑتی ہیں ایسے ہی میز پر چیزوں کے انبار سے بچنے کے لیے مصنف چیزوں کو ہٹاتے رہتے ہیں مصنف ہماری زمین کو کھانے کی میز کی مانند کہتے ہیں کہ پوری کائنات میں ہماری زمین کھانے کی میز کی طرح ہے اور جسے کائنات کے بر آمدے میں رکھا گیا ہے۔

انشائیہ ''نظام سقہ'' میں مصنف نظام سقہ کی ایک دن کی حاصل کی ہوئی بادشاہت کو موضوع بناتے ہیں کہ بادشاہ ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر تیراکی نہ جانتے ہوئے بھی دریا میں تیرنے کے لیے بھاگا اور نظام سقہ نے بادشاہ کو دریا میں چھلانگ لگا کر اس کی بادشاہت بچا لیا اور دوبارہ نظام سقہ کی وجہ سے تخت نشین ہو گیا اور بادشاہ نے نظام سقہ سے دریافت کیا کہ تم اس سب کے بدلے کیا مانگتے ہو تو نظام سقہ بولا کہ مجھے ایک دن کی بادشاہت چاہئیے اسطرح نظام سقہ نے ایک دن کی حکمرانی حاصل کی اور سیاست کا رُخ موڑا۔

''بظاہر وہ ایک دن کا حکمران تھا مگر اپنی فراست، دور اندیشی، انقلابی اقدامات اور جرات مندانہ سیاسی حکمت عملی کے باعث دنیا کے اس عظیم مدبر حکمران نے عالمی سیاست کو ایک نئے رُخ سے روشناس کر دیا اور ایک بالکل جدید طرز حکومت کی بنیاد رکھی۔''[۴۱]

اس طرح نظام سقہ نے تاریخ کا رخ بدل ڈالا اس نے اہل خاندان کو خطابات دیے اور جاگیروں کو تقسیم کیا اس نے نئی اخلاقیات سے متعارف کیا، کاغذی کرنسی کا آغاز بھی کروایا، چام کے دام چلوائے گویا وہ بہت بڑی شخصیت

رکھتا تھا کہ بادشاہ کے کہنے پر اس نے بادشاہت ہی مانگ لی اور پھر ایک دن کے بعد بغیر کسی جغرافیائی تبدیلی کے بادشاہت واپس بھی کر دی اس طرح تاریخ میں ہمیشہ کے لیے نظام سقہ کا نام زندہ رہے گا۔

انشائیہ "کیل" میں مصنف ہمارے معاشرے پر طنز کرتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ غیر ضروری چیزوں اور روایات کو مفید سمجھ کر نافذ کر دیتا ہے حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی انشائیہ میں کیل کو روایات، پابندیوں اور مجبوریوں کو علامت کے طور پر برتا گیا ہے اور معاشرے کے لیے موچی کو علامت کے طور پر برتا گیا ہے۔ مصنف انشائیہ میں طنز کرتے ہیں کہ بعض دفعہ مسائل کے خاتمے کے لیے حل تلاش کیے جاتے ہیں اور بعض دفعہ سب لوگ کسی چیز کی مخالفت کرتے ہیں اور اس مخالفت سے بچاؤ کا طریقہ بھی سوچا جاتا ہے مصنف اس طرز کے معاشرے پر طنز کرتے ہیں جو مشکلات اور رکاوٹ پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ اکبر حمیدی کے انشائیوں کا چوتھا مجموعہ "پہاڑ مجھے بلاتا ہے" ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا اس مجموعے میں اٹھارہ انشائیے شامل ہیں۔ جن کے عنوانات یہ ہیں۔ خالی گیراج، ہمایوں کا ایک دن، شوق فضول، دہشت گرد، پہاڑ مجھے بلاتا ہے، نام بدنام، ٹیلی فون کال، گوجرانوالہ، آگ، مچھلیوں بھرے تالاب، کامیابی کی دیوی، یہ تو ندیں، مہمان خصوصی، ایک فلسفی کی مخالفت میں، اپنی دنیا، وال کلاک کے پیچھے، میں کہاں ہوں زیرو پوائنٹ۔

انشائیہ "خالی گیراج" میں مصنف اپنے تجربات و مشاہدات قلمبند کرتے ہیں۔ مصنف نے اپنے گھر میں خالی گیراج بنایا ہوا ہے مگر ان کے پاس گاڑی نہیں ہے اس وجہ سے ان کے ہمسائے خالی گیراج دیکھ کر رات بھر کے لیے اپنی خالی گاڑی وہاں کھڑی کرنا چاہتے ہیں اور بہت سالوں سے ان کا گیراج ہمسائیوں کے حقوق کی ادائیگی کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ مصنف خالی گیراج کو علامتی اور تمثیلی انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قومی یا بین الاقوامی سطح پر فارغ لوگ یا چیز نظر آئے تو لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نہیں چوکتے۔

انشائیہ "ہمایوں کا ایک دن" میں مصنف تاریخ کو موضوع بناتے ہیں کہ تاریخ میں بادشاہ بادشاہت کے بہت عادی ہوتے تھے وہ بادشاہت لیے بغیر خود کو ادھورا تسلیم کرتے تھے کیونکہ اس وقت ایک بات مشہور تھی تخت یا تختہ یعنی یا تو بادشاہت حاصل کی جائے یا تو موت کو گلے لگا لیا جائے۔ مصنف بادشاہ ہمایوں کے بارے میں بات کرتے ہیں کہ جب بادشاہ ہمایوں دوسری بار فتح یاب ہو کر برصغیر پہنچا اور نظام سقہ کے ایک دن کی بادشاہت لینے کی خواہش پوری کی تو بادشاہ ہمایوں کا وہ ایک دن کس طرح گزرا ہو گا اس دن بادشاہ کو بادشاہت سے محروم کر دیا گیا اور بادشاہت نے نظام سقہ کے گھر کا رُخ کر لیا اس وقت بادشاہ کی ذہنی کیفیت کیسی ہو گی ملکہ عالیہ پر کیا بیتی ہو گی وہ بادشاہ ہمایوں کو بادشاہت دینے پر کوستی ہو گی انہیں ڈر لگا ہو گا کہ کہیں بادشاہت ان سے چھن نہ جائے کہیں ایک

دن کی بادشاہت طول نہ پکڑ لے تاہم مصنف ایک دن کی ہمایوں کی حکومت جانے اور ان کے اندیشوں کو بیان کرتے ہیں۔

انشائیہ ''شوق فضول'' مصنف کا منفرد انشائیہ ہے مصنف کو کچھ سال پہلے ماضی کی یاد کو تازہ کرنے کا شوق فضول پیدا ہوا اور آپ اس میں جذباتی سکون کی تلاش کرنے لگے مصنف نے ماضی کی یاد کو تازہ کرنے کی شروعات اپنے گاؤں سے کی جہاں انہوں نے اپنا بچپن اور جوانی گزاری تھی وہ سوچتے تھے کہ وہاں بڑے تالاب کیسے ہوں گے ان کا مچھانا اور راجباہ کیسا ہو گا بینک گھر اور پچا تُلے کا شہتوت کیسا ہو گا مگر جب مصنف وہاں گئے تو پورا منظر ہی بدل گیا تھا مصنف کو اپنی درسگاہ دیکھنے کا شوق فضول بھی چڑھ آیا جہاں وہ سکول کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد چار سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے مصنف کی رائے میں ماضی کی یاد میں طلسماتی قوت موجود ہے تاہم مصنف آئندہ اس ارادے سے باز رہے۔

> ''میں اس بات کو سمجھتا ہوں کہ تجربے سے سیکھنا ایک خطرناک کھیل ہے جس میں بعض اوقات ادائیگی حصول کی نسبت کہیں زیادہ کرنی پڑتی ہے ویسے بھی یہ دوسرے لوگوں کی سرشت ہے۔ صف اول کے لوگ تجربے سے سیکھنے کی بجائے دماغ سے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں بھی اکثر ایسا ہی کرتا ہوں مگر جب شوق فضول کا بھوت سر پر سوار ہو تو بعض اوقات آدمی اس بھوت کے اشاروں پر ناچنے لگتا ہے۔''[۴۲]

انشائیہ ''دہشت گرد'' میں مصنف قومی اور بین الاقوامی سطح پر موجود دہشت گردی کو زیر بحث لاتے ہیں ہمارے شہروں سے اکثر بموں، دھماکوں اور گولیوں کی آواز سنائی دیتی ہے اور بیرون ممالک میں بھی دہشت گردی کی خبریں اکثر سننے میں آتی ہیں اور ہمارا میڈیا بھی ان خبروں کو دہشت گردی کی ہی طرح پھیلا دیتا ہے مصنف ہمارے میڈیا اور ارد گرد موجود دہشت گردی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور یہ دہشت گردی کی اصل وجہ طاقت کا حصول ہے ہر کوئی اپنی طاقت کو تسلیم کروانا چاہتا ہے۔ دنیا میں اب کچھ شعبے دہشت گردی کی وجہ بنے ہوئے ہیں اور وہ اپنی اہمیت اور فضیلت کو بڑھانا چاہتے ہیں اور دولت کے حصول کے لیے مختلف ہتھکنڈے اپنا رہے ہیں سائنسدان بھی اب گزرتے وقت کے ساتھ مختلف پیش گوئیاں کرتے نظر آتے ہیں اس طرح والدین بھی بچے پر اپنی دہشت پھیلا کر ان سے اپنی مرضی کے شعبے کا انتخاب کروانا چاہتے ہیں گویا ہر درجے اور سطح پر مختلف طرح کی دہشت گردی ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہے۔

انشائیہ "پہاڑ مجھے بلاتا ہے" ایک علامتی انشائیہ ہے جس میں پہاڑ کو کامیابی، منزل مقصود اور خواہشات کی علامت کے طور پر برتا گیا ہے مصنف کہتے ہیں کہ بچپن سے لے کر اب تک مجھے پہاڑ بلا رہا ہے۔ مصنف کو اپنی زندگی بھی پہاڑ کا ایک سفر لگتی ہے مصنف جونہی پہاڑ کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں پہاڑ پیچھے ہٹتا جا رہا ہے۔ مصنف اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں مگر منزل ابھی دور ہی ہے۔ بچپن میں یہ پہاڑ دور ہی ہوتا تھا مگر جوانی میں یہ پہاڑ کی صورت میں بدل گیا مصنف کہتے ہیں کہ بچپن میں ان کی خواہشات، آرزوئیں اور تمنائیں منزل مقصود تھیں مگر جوانی میں پہاڑ کی طرح مقاصد بلند ہو گئے۔ مصنف اپنی منزل کو دیکھ کر تحریک حاصل کرتے ہیں اور پختہ ارادہ کر لیتے ہیں کہ ایک روز مجھے اس منزل تک پہنچنا ہے مصنف گاؤں میں کلرکی کی نوکری کرتے تھے مگر ان کی نظر تب بھی پہاڑ کی طرف ہی ہوتی تھی مصنف جب اسلام آباد پہنچے تب ان کی ملاقات سب سے پہلے مارگلہ کے پہاڑوں سے ہوئی تاہم مصنف کو راستے میں بہت سے ہمسفر ملے کچھ مہربان تھے کچھ مددگار تھے، کچھ حسین تھے، کچھ نے انہیں بہت حوصلہ دیا، کچھ اپنی ذات کے خول میں بند تھے، کچھ سے انہیں اپنی ذات کا عرفان حاصل کیا ان سب ہمسفروں کے ساتھ مصنف خود کو اپنا ہمسفر محسوس کرتے رہے۔ مصنف اسلام آباد میں بھی اس جگہ رہائش پذیر ہیں جہاں ان کے تینوں اطراف پہاڑ ہیں اور چوتھی طرف مصنف خود کھڑے ہیں۔

انشائیہ "نام بدنام" میں مصنف اپنے مشاہدات اور تجربات کا نچوڑ پیش کرتے ہیں۔ ابتداء میں چیزوں کی مناسبت دیکھ کر چیزوں کے نام رکھے گئے جتنی زیادہ چیزیں تھیں اُتنے ہی زیادہ نام رکھے گئے اس طرح ہر چیز کا کوئی نہ کوئی نام دیا گیا چالیس سال قبل بھی چیزوں کی شکل وشباہت اور صورت دیکھ کر نام رکھا جاتا تھا۔ اس طرح نام کا تعلق بھی مذہبی، جغرافیائی اور زمانی لحاظ سے بھی ہے۔ انشائیہ "ٹیلی فون کال" میں مصنف دو ہمسایہ ملکوں کی ٹیلی فون کال کے ذریعے لڑائی اور جھگڑے کو بیان کرتے ہیں۔ یہ لڑائی پاکستان اور بھارت کی ہے جو ایک مکالمے کے ذریعے بیان کی گئی ہے۔ جس میں گھن گرج اور آواز کے ایک دوسرے کو طعنے دیے گئے ہیں جس میں مار دھاڑ، ہاہاکار، اچھی ملکی انتظام، پلاٹوں پر قبضہ، مختلف بولیوں، پہلے میزائل بنانے، دیوار کے مسئلے، بھوک و مفلسی اور ترقی پذیر ہونے کے طعنے دیے گئے ہیں۔

انشائیہ "گوجرانوالہ" میں مصنف اپنی یاد کو تازہ کرتے ہیں۔ مصنف نے اپنی زندگی کے چوالیس سال گوجرانوالہ میں گزارے اور اس کے بعد اسلام آباد میں گزارے اور اس کے بعد اسلام آباد روانہ ہو گئے مصنف اپنے دوستوں اور ان کی محبت کو یاد کرتے ہیں مصنف کو اسلام آباد میں بھی محبت ملی مگر پہلی محبت کے مزے ہی کچھ

الگ ہیں مصنف گوجرانوالہ کی سڑکیں، مکان، کالج، دوکانیں، چوک، رونقیں سبھی کچھ یاد کرتے ہیں اور یہ سب کچھ ان کے بطون میں زندہ ہیں۔

انشائیہ "آگ" میں مصنف آگ کو متحرک رکھنے، زندہ رکھنے، قوت فراہم کرنے اور جلوہ ربی دکھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں جیسے حضرت موسیٰ کوہ طور پر گئے اور اپنے ساتھ آگ کا تحفہ لے آئے مصنف کہتے ہیں کہ عام طور پر لوگ بچوں کو سکول پڑھانے اور روزی کمانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں مگر مصنف اپنے ساتھ ادب کی آگ لے آئے اور اس آگ نے انہیں ایسا جلایا کہ وہ تخلیق ادب کرنے کے قابل ہو گئے اگرچہ جذباتی لوگوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا مگر جذباتی لوگ زندگی کی آگ سے بھرپور ہوتے ہیں اور یہ ہی تخلیق کی آگ سمجھی جاتی ہے۔ آگ کو زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

انشائیہ "مچھلیوں بھرے تالاب" میں مصنف انکشاف ذات کے ساتھ اپنی زندگی کے تجربات بتاتے ہیں کہ ہم سب انسان مچھلیاں پکڑنے کی دوڑ میں اپنے اپنے تالابوں میں ڈوریاں پکڑے بیٹھے ہیں اور یہ ہمارے دخل میں نہیں ہے کہ کانٹے کو بڑی مچھلی لگتی ہے یا چھوٹی مچھلی لگتی ہے مصنف کی رائے میں انسان کے اندر بھی ایک تالاب بستا ہے اور مصنف انشائیہ میں شہر، گاؤں اور ملکوں کو بھی تالاب کہتے ہیں۔ مصنف لڑکپن میں صبح سویرے مچھلیاں پکڑنے مچھانے جاتے وہاں دو ایکڑ کا پھیلا ہوا تالاب تھا جہاں وہ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ کنڈی لگا کر بیٹھ جاتے اور مچھلی لگنے کا انتظار کرتے اور بڑی مچھلیاں جال میں جلد پھنس جاتیں اور چھوٹی مچھلیاں جال سے بچ نکلتیں جیسے چھوٹے آدمی نہایت احتیاط اور دانائی سے اکثر بچ نکلتے ہیں بعض لوگوں کو طویل انتظار کے بعد بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا اور انسان مایوس ہو جاتا ہے جس طرح بڑی مچھلی اور کچھوے میں امتیاز کرنا ضروری ہے ایسے ہی دارالخلافہ میں مصنف کو بڑے آدمیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کے طریقہ واردات اور ان کی نفسیاتی کیفیت کو بھی سمجھنا پڑتا ہے۔

انشائیہ "کامیابی کی دیوی" میں مصنف کامیابی حاصل کرنے کا اصل گر بتاتے ہیں کہ انسان حقیقی کامیابی محنت کی عظمت، سچائی اور خودداری سے ہی حاصل کر سکتا ہے۔ انہیں خصوصیات سے ہی انسان عزت اور شہرت حاصل کرتا ہے۔ بعض لوگ محنت مشقت اور لہو پانی کو کیش کروا کے شہرت اور عزت حاصل کرتے ہیں جو کہ عارضی چیز ہے۔ مصنف انشائیہ میں یونانی متھالوجی سے کامیابی کا دیوی کا عنوان اخذ کرتے ہیں۔ انشائیہ "یہ توندیں" میں مصنف معاشرے کے توند نکلے ہوئے افراد پر تنقید کرتے ہیں کہ یہ معاشرے کی بدصورتی ہے توند نکلے افراد اپنے فرائض منصبی ادا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں توندوں کی وجہ سے قحط سالی، غربت اور مختلف برائیاں چوری ،ڈاکہ اور راہ زنی پھیلی ہوئی ہیں۔ جیسے بیوروکریسی میں بہت سی توندیں پائی جاتی ہیں جو اپنے حصے سے زیادہ کھاتی

ہیں۔ یہ توندیں مختلف طریقوں سے بڑھتی ہیں۔ کوئی قانون کے نام پر حق سے زیادہ لیتا ہے کوئی سماجیات اور کوئی روایات کے نام پر اپنی توند کو بڑھا لیتا ہے اور کوئی کسی نا کسی نام پر توند نکال لیتا ہے اور دوسروں کا حق بھی چھین لیتا ہے۔

> "ہر بڑی توند ایک طرح کی بیوروکریسی ہے۔ جس نے کسی نا کسی طرح اپنے حصے سے زیادہ لے رکھا ہے۔ بعضوں نے قوم اور ملک کے نام پر۔ بعض نے کسی بہت پاکیزہ اور پوتر کے نام پر۔ بعض نے قوانین۔ سماجیات۔ روایات اور کئی طرح کے ناموں سے توندیں بڑھالی ہیں اور انہیں کم کرنے پر رضامند نہیں۔ یہ توندیں ان کی قوتیں ہیں۔ جن کے بارے میں کچھ سوچنا بھی ہماری اخلاقیات کے منافی ہو چکا ہے۔"[۴۳]

انشائیہ "مہمان خصوصی" میں مصنف ہمارے ہاں اور بیرون ملک مہمان خصوصی کی اہمیت تفاوت کے ساتھ اُجاگر کرتے ہیں۔ مصنف یہاں اور بیرون ملک کے سیاسی نظام میں فرق کو واضح کرتے ہیں اس طرح جگہ اور وقت کے فاصلے ذہنی فاصلوں میں اضافہ کرتے ہیں اور فاصلے انسان کی سوچ اور فکر کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ انشائیہ " ایک فلسفی کی مخالفت میں "مصنف فلسفیانہ سوچ اور معاشرے کی حقیقت پسندی کا موازنہ کرتے نظر آتے ہیں وہ اپنے خیالات، تجربات و مشاہدات کا نچوڑ انشائیے میں سمو دیتے ہیں۔ مصنف اپنے اندر دو طرح کی سوچ کا جائزہ لیتے ہیں ایک وہ جو بڑے، اعلیٰ مقاصد اور عظیم آدرشوں کا سبق دیتا ہے جو بہت بلند اور باوقار ہے جو بلند اخلاق ہے اور ہر کسی کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے، مصنف اپنے اس فلسفی کو بہت محبت اور عقیدت کے ساتھ دیکھتے ہیں اور دوسری قسم کا وہ فلسفی ہے جسے مصنف جانور کا نام دیتے ہیں جس کا انسان کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اگرچہ فلسفی کا تعلق مقاصد اور آدرشوں سے ہے اس کا زندگی کے تلخ حقائق سے کوئی واسطہ نہیں لیکن پھر انسان کا دماغ بعض دفعہ فلسفی کی باتوں میں آ جاتا ہے جس کا انسان کو حقائق کو نظر انداز کرنے کی صورت میں نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ ترقی یافتہ معاشرے میں فلسفی کی باتوں پر عمل درآمد کیا جاسکتا ہے مگر ترقی پذیر ممالک میں زیادہ تر حقائق پر ہی عمل درآمد ہوتا ہے، ہمارے ممالک میں قوت، پیسہ، اختیارات اور مراتب وغیرہ کی زیادہ عزت و توقیر کی جاتی ہے۔ مصنف بھی فلسفی کے آدرشوں پر عمل نہیں کرتے بلکہ حقیقت کی دنیا میں رہتے ہیں۔

انشائیہ " اپنی دنیا" میں مصنف اپنی فکر اور سوچ سے ہمیں آشنا کرواتے ہیں کہ ہمارے حالات ہمارے اعمال کا ہی نتیجہ ہیں اور اس کی وجہ ہم خود ہی ہیں اس لیے یہ ہمارے بس میں نہیں ہیں کہ ہم اسے سدھار سکیں اس وجہ سے یہ باتیں سوچ کر اور حالات دیکھ کر ہمیں پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ انشائیہ " وال کلاک کے پیچھے" میں

مصنف بد صورتی کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں کہ بد صورتی کس طرح خوبصورتی پر حاوی ہوتی ہے اور اس کی خوبصورتی کو زائل کر دیتی ہے۔ کیونکہ ہماری نظر خوبصورتی کی بجائے اس چھوٹی سی بد صورتی پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے گویا انسان ہر طرف خوبصورت ہی خوبصورتی ہی چاہتا ہے حقیر سی بد صورتی انسان کو قابل قبول نہیں۔ بد صورتی سے نفرت فطرتی ہے اور انسان کی نفسیات میں شامل ہے اور جو لوگ بد صورتی کو پسند کرتے ہیں وہ فی الحقیقت غیر فطرتی چیز ہے۔

انشائیہ "میں کہاں ہوں" میں مصنف خود کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں مصنف زندگی میں جب بھی پریشان ہوتے ہیں تو خود کو آئینہ میں دیکھتے ہیں۔ مصنف خود کو تلاش کرتے ہیں کہ میں کہاں ہوں مصنف اکثر رات کو سوچنے سے احتراز برتتے ہیں۔ انہیں برٹینڈ رسل کی بات ہمیشہ یاد آتی ہے کہ رات کو سوچنا نہیں چاہئیے مصنف دل و دماغ جبلت ضمیر کو زندگی کا لازمی جز کہتے ہیں کہ ان کے بغیر زندگی گزارنا ناممکن ہے یہ سب چیزیں اپنا اپنا مزاج رکھتی ہیں مصنف مزید کہتے ہیں کہ میں اپنے جسم میں ہوں یا جسم سے باہر مگر کہیں تو ضرور موجود ہیں اس طرح مصنف خود کی تلاش میں سر گرداں ہی ہیں۔

انشائیہ "زیرو پوائنٹ" میں مصنف ایک نیا تصور، نئی سوچ اور نئی فکر دینا چاہتے ہیں۔ مصنف اپنے انشائیوں کے ذریعے تحقیق کے میدان میں نیا اضافہ کرتے ہیں۔ انسان کے جسم میں بہت سے ریسیورز ہیں مگر انسان اتنی ترقی نہیں کر سکا کہ سارے ریسیورز کھول سکے۔ مصنف انسانی ریسیورز کھول کر انسانیت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ مصنف انسان کے اندر ایک زیرو پوائنٹ دریافت کرتے ہیں اور اس سے انسان بہت سے مسائل سے بچ سکتا ہے۔ زیرو پوائنٹ سے مراد انسان کے جذبات کا نارمل سطح پر رہنا ہے اس سے انسان نفسیاتی اور جسمانی طور پر نارمل سطح پر رہیں گے اس مقام پر آنے سے آسان اور سہل راستے ملتے ہیں اور یہ ہمیں ہر بار نئے آغاز کا موقع دیتا ہے۔

اکبر حمیدی کا پانچواں مجموعہ "اشتہاروں بھری دیواریں" ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں اکیس انشائیے شامل ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں۔ رشتے ناطے، دنیا ایک کہانی، خوشیوں کی تلاش میں، یہ الماریاں، دوستی کی مخالفت میں، جب بجلی فیل ہو جائے، جادو نگری، کبھی ہم لا اُبالی تھے، ہوائی سڑکیں، کورا کاغذ، خوابوں کے بے نشان جزیرے، اک ذرا صبر، پیوند لگی زندگی، سامنے کی باتیں، قید خانہ کس کو عزیز نہیں، پھولوں میں گھرا کانٹا، مسافر نواز بہیترے، اندر کا آدمی، کھڑکیاں اور دروازے، اشتہاروں بھری دیواریں، غلطیہائے مضامین۔

انشائیہ ”رشتے ناطے“ میں مصنف انسانی زندگی بلکہ پوری کائنات میں موجود رشتے ناطوں کو موضوع بناتے ہیں۔ بعض رشتے تو ہم خود بناتے ہیں مگر کچھ دوسروں کی دراز ہستیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں جو زبردستی ہماری زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح انسان کے ہر عضو کا دوسرے عضو کے ساتھ گہرا تعلق ہے جس سے ہمارا پورا جسم کام کرتا ہے اور یہ انسان کے بدنی رشتے ناطے ہیں اس طرح حیوانات و نباتات کے بھی اپنے رشتے ناطے ہیں زمین و آسمان کا بھی رشتہ ہے جو دور اُفق پر جا کر ملتے ہیں۔ کچھ رشتے تو ہماری سمجھ سے باہر ہیں جیسے چاند کا سمندر سے رشتہ، زمین کا آسمان سے، بلبل کا پھول، آدم و حوا کا، ڈالی سے پھل اور پھول کا رشتہ وغیرہ۔ انشائیہ ”دنیا ایک کہانی“ میں مصنف دنیا کو رنگ برنگی خوبصورت کتاب کہتے ہیں۔ مصنف کو یہ دنیا انشائیہ شاعری اور ڈرامہ کے تار و پود سے بنی ہوئی کہانی کی طرح لگتی ہے گویا انسان کے ہر چہرے کے پیچھے ایک کہانی چھپی ہے اس کے اوپر، آگے پیچھے اور اس کے باطن بھی ایک کہانی ہی ہیں۔ ہوا کا شور، بادل کی گرج چمک، بجلی کی چمکار کی بھی ایک کہانی ہی ہے گویا پوری دنیا ایک کہانی ہی ہے۔

انشائیہ ”خوشیوں کی تلاش میں“ مصنف خوشیوں کے حصول کا ذریعہ اور خوشیاں حصول کرنے کا فلسفہ بتاتے ہیں مصنف کے مطابق خوشیاں عام طور پر خواہشات کے حصول کے ساتھ ہی منسلک کر دی جاتی ہیں دنیا میں جتنے انسان پائے جاتے ہیں اتنے ہی ان کی خوشیوں کے مختلف روپ اور شکلیں ہیں انسان کی عادت اور فطرت ایسی ہے کہ خوشیاں انسان نے کسی چیز کے حصول ہونے سے منسلک کی ہوئی ہیں۔

انشائیہ ”دوستی کی مخالفت میں“ مصنف دوستی کے بارے میں اپنا فلسفہ اور نقطہ نظر قاری پر واضح کرتے ہیں کہ مصنف اپنا خیال رائے ظاہر کرتے ہیں کہ میں دوستوں کی مخالفت نہیں کرتا بلکہ دوستیوں کے خلاف رہتا ہوں اور دوستیوں کے مضر اثرات سے بچتا ہوں اور دوستوں کے خیالات میں اپنے خیالات اکثر گھسیٹرتا ہوں۔ مصنف کی رائے میں دوستیاں انسان کو کمزور، بے سہارا اور دست کرم کا محتاج بنا دیتی ہیں ہم میں خود اعتمادی ختم ہو جاتی ہے اور دوستی کو ہم قدم قدم پر لے کر ساتھ چلنا چاہتے ہیں نفسیاتی اور عملی طور پر ہمیں سہاروں کی ضرورت رہتی ہے گویا دوستی جتنی مضبوط ہو گی اتنا ہی ہمیں اندر سے کمزور کر دیتی ہے۔

انشائیہ ”جب بجلی فیل ہو جائے“ میں مصنف بجلی کے فیل ہونے کو دماغ یا فوراً کسی کے سوال کا نہ جواب دینے کو علامت کے طور پر برتتے ہیں۔ انشائیہ ”جادو نگری“ میں مصنف زندگی میں آنے والے مختلف مراحل اور اس کی رنگا رنگی کو دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں کہ زندگی ایک سفر ہے جس میں مختلف رنگ رنگ کے مناظر دیکھنے پڑھتے ہیں۔ جس میں خوشی اور غم دونوں شامل ہیں گویا زندگی کا لطف ہی رنگ رنگ کے مناظر میسر آنے کی

وجہ سے ہے مگر مصنف انشائیہ کے آخر میں نہ ختم ہونے والے سفر کی خواہش کرتے ہیں جو لا فانی ہے اور جس میں رنگ رنگ کے مناظر ہوں مگر یہ قدرت کے ہاتھ میں ہے کہ وہ انسان کو کون کون سے مناظر دیکھاتی ہے مصنف زندگی کے اس رنگ رنگ کے مناظر دیکھنے کو جادو نگری کا نام دیتے ہیں۔ انشائیہ ''کبھی ہم لا اُبالی تھے'' میں مصنف لا اُبالی جذبے کو احاطہ تحریر میں لاتے ہیں اور بچپن کے جذبے کو بہت حسرت سے یاد کرتے ہیں۔ مصنف نے انشائیہ کا عنوان ایک نظم سے لیا ہے۔ مصنف لا اُبالی کے جذبے کو یوں بیان کرتے ہیں۔

> ''لا اُبالی رویہ مجھے ایک ایسی بے پناہ قوت محسوس ہوتا ہے جو کسی بھی قسم کے ناجائز اور جائز دباؤ کو قبول نہیں کرتا۔ وہ ایک ایسی طاقت ہے جو مشکل حالات میں جب انسان پریشانیوں میں گھر جانے کے خطرے کو محسوس کرنے لگتا ہے، یکدم پیش قدمی کرتا ہے اور انسان کے چاروں طرف امن وعافیت کا حصار کھینچ دیتی ہے۔''[۳۳]

انشائیہ '' ہوائی سڑکیں '' ایک علامتی انشائیہ ہے جس میں ہوائی سڑکوں کو علامت کے طور پر برتا گیا ہے۔ ہوائی سڑکوں سے مصنف کی مراد میڈیا کا بے ہنگم شور، اُڑنے والی خبریں اور خراب حالات وغیرہ مُراد ہیں۔ انشائیہ ''کورا کاغذ'' مصنف کے عمیق مشاہدات اور تجربات کا غماز ہے ہمارے معاشرے میں عام طور پر سیدھے اور معصوم لوگوں کو کورا کاغذ کہا جاتا ہے مگر مصنف کی رائے میں انہوں نے آج تک کورا کاغذ نہیں دیکھا جیسے کہ سفید کاغذ کو کورا سمجھا جاتا ہے مگر وہ بھی کورا نہیں ہوتا کیونکہ اس پر بھی لائنیں اور سفید رنگ ہوتا ہے۔

انشائیہ ''خوابوں کے بے نشان جزیرے'' میں مصنف انکشاف ذات کے ایک کشفی حصے کو انشائیے میں لکھتے ہیں۔ اکبر حمیدی خوابوں کی زندگی کی اہمیت بتاتے ہیں کہ خواب دیکھنا ذہنی طور پر صحت مند ہونے کی نشانی ہے اور خواب دیکھنا فطرتی ہے اس طرح عمر کے ہر حصے میں انسان کی کچھ خواہشات اور آرزوئیں ہوتی ہیں اور انسان اپنی عمر کے مطابق ہی خواب دیکھتا ہے۔ مصنف کی رائے میں خواب خواہشوں، سوچوں، ڈر اور خوف کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مصنف اپنی زندگی میں دو طرح کے خواب دیکھتے ہیں۔ ایک وہ جب وہ طالب علم تھے اور دوسرا جب اسلام کے ایک انگریزی زبان کے کالج میں لیکچرار کے فرائض سرانجام دے رہے تھے اور یہ خواب ان کے خیال میں اس وجہ سے آتے تھے کہ ان کی ذات کا کچھ حصہ ماضی میں رہ گیا ہے مگر یہ خواب ہی ہیں جو زندگی کو پُر لطف اور مسرت سے بازیاب کرتے ہیں۔

انشائیہ ''اک ذرا صبر'' میں صبر جیسی قوت اور طاقت کو زیر بحث لاتے ہیں۔ مصنف کے خیال میں وہ وقت قریب ہے جب طاقتور اور کمزور دونوں صبر کو ایک طاقت تسلیم کرلیں گے اور یہ دن انسانی عظمت کا دن ہو

گا۔انشائیہ "پیوند لگی زندگی میں" مصنف پیوند کو انسانی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں پیوند کے بغیر انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔انسانی زندگی میں جو مختلف قسم کے رنگ ڈھنگ، چال ڈھال، آوازیں، مزاج اور تراش خراش وغیرہ پیوند کاری کی ہی عمدہ مثالیں ہیں۔قدرت نے انسان کی تکمیل پیوند کاری سے ہی کی ہے گویا یہ پیوند کاری ہی زندگی کا حسن ہے۔

انشائیہ " قید خانہ کسی کو عزیز نہیں" میں مصنف زندگی میں قید خانہ کی اہمیت اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اجاگر کرتے ہیں اکثر لوگ زندگی بھر قید خانہ میں مقید رہنا چاہتے ہیں اور پوری عمر اس کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔مصنف اپنے آپ کو انسانیت اور ادب کے ذیلی شعبے میں خود کو گرفتار کیے ہوئے ہیں۔انشائیہ "مسافر نواز بہیترے" میں مصنف سفر کی اہمیت اور سفر کے دوران آہستہ روی کو بیان کرتے ہیں۔کہ سفر جتنا آہستہ اور آرام سے کیا جائے گا راستے کی چیزوں سے اتنا ہی لطف اندوز ہوں گے اس لیے زندگی کا تمام مزہ آہستہ روی میں ہی ہے ۔جب سفر آہستہ کیا جائے گا کہ انسانی ذہن بھی آہستہ روی کی طرف مائل ہو گا اس طرح زندگی سے بھرپور لطف اٹھایا جاسکے گا۔

انشائیہ " اشتہاروں بھری دیواریں" میں مصنف اپنے مشاہدات اور تجربات بیان کرتے ہیں۔دیواروں پر اکثر ہمیں اشتہار دیکھنے کو ملتے ہیں یہ اشتہار عورتوں مردوں کے مسائل، درویش بابا، نجومی، پامسٹ اور سکولوں کالجوں وغیرہ کے بارے میں ہوتے ہیں۔اس طرح خداتعالیٰ نے اپنی فنکاری کو دکھانے کے لیے رات میں چاند، ستارے اور دن میں پہاڑ، سورج وغیرہ بنائے ہیں تاہم انسان بھی ایک چلتا پھرتا اشتہار ہے اور ہر انسان اپنے عقیدوں ،نسلوں، قوموں، طبقوں اور مشغلوں سے پہچانا جاتا ہے گویا وہ انسان کے اشتہار ہی ہیں جیسے اشتہاروں سے دیواریں چھپ جاتی ہیں اس طرح انسان کی انسانیت بھی اس کے عقیدوں، نسلوں، مشغلوں اور طبقوں کے بوجھ تلے دب چکی ہے۔

اکبر حمیدی کے انشائیوں میں ایک قسم کی مشترک پائی جانے والی چیز انسان ہے اور وہ ہر طرح سے ان کے انشائیوں میں موجود ہے کہیں انہیں جزیرے کہا گیا ہے کہیں منفی، مثبت صورت میں موجود ہے، کہیں تسخیر کائنات کرتا ہے، کہیں فاختہ کی صورت میں نظر آتا ہے اور کہیں عقاب پر جھپٹتا ہے اور کہیں درویش کی صورت میں نظر آتا ہے، کبھی بڑے آدمی کی صورت میں دیکھا جاسکتا ہے اور کبھی چھوٹے آدمی کا روپ اختیار کر لیتا ہے لہٰذا اکبر حمیدی مختلف موضوعات کا موضوع انسان کو ہی بناتے ہیں کہ اس کائنات کا مرکزی نقطہ بنی نوع انسان کو ہی بنایا گیا ہے۔

منشایاد اظہار خیال کرتے ہیں۔

"اکبر حمیدی کے انشائیے دراصل اس کی اپنی باتیں ہیں جو اس پر گزریں،اس نے سنیں، سہیں، سوچیں یا اسے سوجھیں، یہ اس کی اپنی باتیں ہیں مگر ایسی کہ پڑھنے والوں کو بھی اپنی لگیں۔ میٹھی، رسیلی باتیں،بات سے بات نکلتی ہے مگر نکلتی ہی نہیں جاتی ہے۔ مضمون نگاری کے برعکس جس میں ہر پہلو اور مخفی گوشے کو کھنگالا اور اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کسی لطیف نکتے کی دریافت کے ساتھ ہی اپنا چھوٹا سا تخلیقی دائرہ مکمل کر لیتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے۔"[۴۵]

اکبر حمیدی اپنے انشائیوں میں ذاتی تجربات اور مشاہدات سے رنگ بھر دیتے ہیں۔وہ چھوٹی سی چھوٹی اور اعلیٰ سے اعلیٰ چیز کو بھی موضوع بناتے ہیں ایسی چیز جس پر انسان غور نہیں کرتا اور ان کے نادیدہ پہلوؤں سے ہمیں روشناس کرواتے ہیں،وہ قاری کی سوچ میں ایک نئی کروٹ پیدا کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں اور اس سے تازگی کی لہر اُجاگر ہوتی ہے جو فکری بہجت اور مسرت پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔اکبر حمیدہ کے انشائیے گہری فکر اور سوچ میں غوطہ زنی کرتے نظر آتے ہیں وہ سوچ کی بہت سی پرتیں کھولتے چلے جاتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں سوچ اور فکر کے مختلف رنگ جھلکتے نظر آتے ہیں ان کے انشائیوں کا انداز فلسفیانہ ہے نیز ان کے انشائیوں میں نشاطیہ اور حزنیہ کیفیات پائی جاتی ہیں آپ ہر پرت پر رواں تبصرہ کرتے ہیں ان کا تبصرہ جامع اور اختصار پر مبنی ہوتا ہے۔

اکبر حمیدی اپنی شخصیت میں کائنات کا عکس موجود پاتے ہیں۔ان کے انشائیوں کا اختتام کسی سوال،سوچ اور کسی فکر پر کیا ہے جس سے قاری کے لیے تشنگی کا سامان بھی پیدا ہوتا ہے اور قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔اکبر حمیدی نے انشائیہ کو عصری آگاہی سے منسلک کیا اور معاشرے کے مسائل کو موضوع بنایا اس طرح انہوں نے انشائیہ میں ایک نئے رُخ اور ایک نئے پہلو کو تلاش کیا ہے۔ان کے معاشرتی مسائل کو نمایاں کرنے والے انشائیوں میں کامیابی، چڑیا گھر، گھنٹہ گھر، جنگل، آزادی، ذمہ داری، گولڈن چانس،انتظار گاہ وغیرہ شامل ہیں۔وہ معاشرے کے مسائل پر کھل کر بات کرتے ہیں۔وہ بعض جگہوں پر ناصح اور خطیبانہ انداز بھی اپناتے ہیں اکبر حمیدی دلائل کے ساتھ اپنی بات کو پیش کرتے ہیں ان کے انشائیوں میں طنز کی کاٹ بھی پائی جاتی ہے جو کہ مضامین کی خاصیت سمجھی جاتی ہے ان کے انشائیوں میں ان کی سوچ مثبت اور پختہ نظر آتی ہے۔ان کے نئے نئے خیالات اور سوچ قاری کی قوت متخیلہ پر مہمیز لگاتی ہے۔وہ چیزوں کی اچھائی اور برائی دونوں کو سامنے لاتے ہیں کہ سکے کے دونوں رُخ کو دیکھا جا سکتا ہے۔

اکبر حمیدی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور معاشرے کے دیگر موضوعات پر بھی بات کرتے ہیں اور بعض جگہ پر زندگی کے تلخ حقائق کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں مثالیں اور دلائل دے کر بات کی وضاحت کرتے ہیں۔ وہ سوچ کی بہت سی پرتیں کھولتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے موضوعات خارجی اور داخلی کیفیات سے سرشار ہیں۔ اکبر حمیدی کے انشائیوں میں انکشاف ذات بھی بنیادی خوبی ہے وہ فنکارانہ مہارت سے اپنے تجربات کو قاری پر وا کرتے ہیں۔

اکبر حمیدی اپنے سادہ رواں اور شگفتہ انداز سے مظاہر فطرت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں وہ ہمیں خیال افروز حقیقتوں سے آشنا کرواتے ہیں اور ان کا یہ رویہ نیا، اچھوتا اور ترقی یافتہ ہے۔ اکبر حمیدی اپنے انشائیوں میں مزاج کا استعمال بہت توازن کے ساتھ کرتے ہیں۔ اکبر حمیدی معمولی اشیاء سے غیر معمولی پہلو اخذ کرتے ہیں اور بدصورت چیزوں سے خوبصورتی کی خصوصیات کو نمایاں کرتے ہیں اور یہ ان کی ہی انفرادیت ہے۔ اکبر حمیدی انشائیہ نگار کی حیثیت سے تیسری آنکھ بھی رکھتے ہیں جس سے وہ اشیاء کے باطن سے نئے معنی اخذ کرتے ہیں وہ کائنات کے اسرار و رموز اور زندگی کی کھلی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور اپنے مشاہدات کو بے دریغ بیان کرتے ہیں ان کے لیے کائنات کی کوئی چیز عبث اور فضول نہیں ہے۔ وہ انسانی نفسیات کو بے نقاب کرتے ہیں اور انسان کی بے حسی کو سامنے لاتے ہیں۔ اکبر حمیدی کسی بھی موضوع کو اپنے لیے مخصوص نہیں کر لیتے اور نہ ہی شجر ممنوعہ بناتے ہیں وہ ہر چیز سے نئے مفاہیم اخذ کرتے ہیں۔ وہ نہایت ذہانت و ذکاوت سے نئے پہلو کی طرف ہماری توجہ مبذول کرواتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں دلچسپی کا عنصر پایا جاتا ہے جو قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کے لیے کافی ہے تاہم اکبر حمیدی ایک اعلیٰ اور اہم تخلیق کار کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔

ہ۔ مشکور حسین یاد کے انشائیوں کا فکری جائزہ:

انشائیہ مشکور حسین یاد بھارت کے سادات خاندان سے تعلق رکھتے ہیں آپ ستمبر ۱۹۲۲ء میں یاد حصار کے ایک گاؤں ڈبوالی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حصار میں ہی ملازمت کرتے تھے جس کی وجہ سے حصار میں ہی آپ کی پرورش ہوئی آپ نے انٹرمیڈیٹ لدھیانہ سے پاس کیا جبکہ بی اے جالندھر سے کیا۔ آپ نے سب سے پہلے ایک ہفتہ وار اخبار پکار کے مدیر کے طور پر کام کیا بعد ازاں راشننگ کے محکمہ میں انکوائری افسر کے طور پر کام کیا۔ آپ کو شروع سے ہی تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا اس لیے آپ نے راشننگ کے محکمے کو ترک کر کے ڈبوالی میں بطور انگریزی کے استاد کی حیثیت سے تعلیم دینا شروع کر دی۔ اگست ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند میں انکی ماں، بیوی، بیٹی، بھائی

اور بہت سے رشتے داروں کی شہادت کے بعد آپ پاکستان ہجرت کر گئے۔ یہاں لاہور میں قیام کرنے کے بعد آپ ڈائریکٹر تعلیم کے آفس میں کلرک کے طور پر کام کرنے لگے اس کے بعد ضلع دار کی حیثیت سے محکمہ انہار میں بھی کام کیا آپ نے ۱۹۵۵ء میں ایم اے اردو اور ۱۹۶۰ء میں ایم اے فارسی کیا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں اردو کے پروفیسر کے طور پر پڑھانے لگ گئے۔ مشکور حسین یاد آغاز سے ہی انشائیے کی طرف راغب ہو گئے تھے۔ اس وقت انشائیے کے لیے نثر لطیف کا لفظ استعمال ہوتا تھا تاہم اوراق کے انشائیہ نگار اور نقاد انہیں انشائیہ نگار ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا اسلوب اوراق کے ناقدین سے بہت مختلف ہے تاہم اگر کوئی غیر جانبدار ناقد ان کی انشائیہ نگاری کے بارے میں کوئی رائے رقم کرتا ہے تو وہ مشکور حسین یاد کی خدمات کو فراموش نہیں کر پاتا۔ مشکور حسین یاد ڈاکٹر وزیر آغا کی مقرر مقتضیات سے جزوی اختلاف کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگار انہیں بطور انشائیہ نگار ماننے سے انکار کرتے ہیں مگر مشکور حسین یاد کے انشائیوں کی اپنی پہچان اور انفرادیت ہے۔

مشکور حسین یاد نے اپنے انشائیے ۱۹۷۰ء سے لے کر ۱۹۸۷ء کے وقت کے دوران لکھے جو کہ ان کی سترہ سالہ محنت کا ثمر ہیں۔ مشکور حسین یاد کے تین انشائی مجموعے ہیں جن میں پہلا "جوہر اندیشہ"، "دوسرا بات کی اونچی ذات" اور تیسرا "وقت کا استعارہ" ہیں اور ان تینوں انشائی مجموعوں کو اکٹھا کر کے "متاع دیدہ دل کے نام سے بھی شائع کیا گیا ہے۔

"جوہر اندیشہ" میں تیس انشائیے شامل ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں۔ کتاب، لے سانس بھی آہستہ، سطح، نادانی کا شعور، تجربہ اور نا تجربہ کاری، کسب زر، مبالغہ، رہا آباد عالم، تنہائی، عقل کا استعمال، جوہر کا المیہ، منافق، سر کے بل، ناک پکڑنے کا عمل، لمحے کا دوام، سیدھی راہ، ناجائز تعلقات، انسانی معاشرہ میں کردار، چھوئی موئی، غالب خستہ کے بغیر، ہر جائی، عمر طبعی، آزادی کے درد، ہوس، سنہری موقع، اطمینان، دشمن بنایئے، قدر و منزلت، گوش حقیقت نیوش، بکرے کی ماں۔ مشکور حسین یاد انشائیہ "کتاب" میں لکھنے والوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں اور کتاب کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ کتاب زندگی میں مہمل اور بے معنی قسم کی دشواریوں کو بیدار کرتی ہے اور الٹی سیدھی باتیں سکھاتی ہے اور اوٹ پٹانگ قصے کہانیاں سننے پر مجبور کرتی ہے۔ اگرچہ مشکور حسین یاد زندگی اور علم کے فلسفے پر بحث کرتے ہیں اور چھوٹے سے موضوع پر گفتگو کر کے اسے اعلیٰ فلسفیانہ بنا دیتے ہیں۔ انشائیہ "لے سانس بھی آہستہ" میں مشکور حسین یاد نے زندگی کے فلسفے کو عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے گویا ان کا انشائیہ میر تقی میر کے اس شعر کے فلسفے کو بیان کر رہا ہے۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

گویا نزاکت کے ساتھ ناتواں کے تصور کو جوڑا جاتا ہے لیکن نزاکت تسلسل حیات کی طرح ہے یہ ادق اور پیچیدہ ہے۔ تاہم نزاکت آزادی اور ارتقاء دونوں کی ضامن ہوتی ہے اور نزاکت میں احتیاط کا پہلو بہت اہمیت رکھتا ہے گویا مصنف یہاں پیغام حیات دینا چاہتے ہیں کہ زندگی بہت نازک اور ادق ہے اس میں ہمیں احتیاط اور پھونک پھونک کر قدم اٹھانا چاہیئے۔ مشکور حسین یاد نے ''سطح'' کی اہمیت و حقیقت بیان کرتے ہیں زیر نظر انشائیے میں گہری سنجیدگی اور گہری سوچ دیکھنے کو ملتی ہے۔ جو شخص سطح کو چھولے اس کی قسمت کھل جائے گی اور جس نے سطح کو نہ چھوا اسے ہمیشہ موت ہی ملی مشکور حسین یہاں ناصح کے طور پر نظر آتے ہیں۔ گویا مصنف نے اس انشائیے کو علمی و سنجیدہ انداز میں لکھا ہے۔

انشائیہ ''نادانی کا شعور'' میں مصنف سنجیدہ موضوع پر بحث چھیڑتے ہیں اور دانا لوگوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ دانا لوگ ہر جگہ میسر ہوتے ہیں اور نادانی کو کوئی کم ہی قبول کرتا ہے ہم اکثر بچوں کو نادان کہتے ہیں اور خود کو دانا کہتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم بچوں کو نادان بول کر اپنی نادانی عیاں کرتے ہیں۔

> ''چنانچہ انسان بہت کچھ جاننا چاہتا ہے لیکن جب اسے بہت کچھ کے بجائے صرف کچھ کا علم ہوتا ہے تو وہ اسی علم کو بہت سمجھتے ہوئے علمیت کے مستقل فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔نادانی کے شعور کی پہلی ضرب اسی فریب پر آکر پڑتی ہے یہ شعور انسان کو بتاتا ہے کہ اب تک جو کچھ اسے علم حاصل ہوا ہے اسکی حیثیت انتہائی معمولی ہے ابھی اسے بہت کچھ معلوم کرنا ہے جیسے جیسے علم بڑھتا ہے نادانی کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا چلا جاتا ہے۔''[۴۶]

بچوں انشائیہ ''عقل کا استعمال'' میں مشکور حسین یاد ناصحانہ و متوازن انداز میں عقل کے استعمال کا مشورہ دیتے ہیں۔ مشکور حسین یاد عمل اور تجربے کو عقل کا نام دیتے ہیں گویا انسان کی ہر حرکت عقل پر منحصر ہے انسان کے ہر عمل کے پیچھے انسان کی عقل ہوتی ہے مگر لوگ ہر الٹی سیدھی بات کو بھی عقل سمجھتے ہیں جیسے چوری، بدمعاشی، جھوٹ، عیاری وغیرہ۔ لیکن یہ عقل نہیں کہلاتے۔ جیسی نیت ہوگی ویسی عقل ہوگی۔ ''سر کے بل '' ایک علامتی انشائیہ ہے۔ سر کے بل کو علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن کا استعمال کرتا ہے اور عقل و دانش کے تحت ہی وہ زندگی کا سفر گزارتا ہے اس لیے سمجھدار آدمی ہمیشہ سر کے بل چلنا پسند کرتا ہے۔ مشکور حسین یاد انشائیہ ''گوش حقیقت نیوش'' میں سچی بات سننے کا گُر بتاتے ہیں اور سچائی بتانے اور سننے کی تلخی سے آگاہ کرتے ہیں۔ حق گوئی کی بجائے حق نیوشی زیادہ قابل تعریف ہے سچ بات بول کر دل کو بہت

سکون ملتا ہے۔ مشکور حسین یاد حق نیوشی کا گُر بتاتے ہیں کہ انسان اپنے آپ کو کامل تصور نہ کرے اور انسان جھوٹے وقار کی سوچ اور خیال ذہن میں نہ لائے۔

انشائیہ "دشمن بنایئے" میں مصنف دوستی اور دشمنی کے نظریے کو عمدہ پیرائے میں بیان کرتے ہیں انسان کی پوری زندگی دشمن بنانے اور اس سے مقابلہ کرنے میں صرف ہو جاتی ہے وہ اس ضمن میں بہت سی تکلیفیں اور دکھ برداشت کرتے ہیں لیکن شر پسند عناصر کے آگے کبھی سر تسلیم خم نہیں کرتے اور اسی میں انسانیت کی بقا ہے۔ انشائیہ "عمر طبعی" میں میں مصنف انسان کی طبعی عمر کا فلسفہ بتاتے ہیں کہ جب سے انسان دنیا میں ظہور پذیر ہوا ہے تب سے کوئی انسان اپنی عمر آپ نہیں مرا۔ وہ خودکُشی کا مرتکب ہوتا ہے یا اسے قتل کیا جاتا ہے اور دنیا میں تمام اموات معاشرے کی خرابیوں کی وجہ سے آتی ہے نیز انسان کو بڑھاپا بھی معاشرے کی خرابیوں کی وجہ سے آتا ہے ۔مشکور حسین یاد زندگی کی حقیقت یوں بیان کرتے ہیں۔"انسان شے اور لاشے کے درمیان کی ایک مضبوط کڑی ہے۔ جس کی فنا کو بقول میر ہم زیادہ سے زیادہ، زندگی کا ایک وقفہ قرار دے سکتے ہیں۔"[۴۷]

یوں انشائیہ "سنہری موقع" میں مصنف وقت کے فلسفے کو بارہا اپنے انشائیوں میں برتتے ہیں۔ مشکور حسین یاد نصیحت کرتے ہیں کہ زندگی بار بار مواقع فراہم نہیں کرتی اس لیے حال سے فائدہ اٹھانا چاہئیے۔ ماضی کی یادیں اور مستقبل کے خواب ہمیں فائدہ نہیں پہنچا سکتے اس لیے زمانہ حال کی ہر ساعت سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہئیے اور وقت کی قدر کرنی چاہئیے۔

> "میں سمجھتا ہوں زندگی کا ہر لمحہ ایک سنہری موقع ہے۔ انسان اپنی زندگی کو کامرانیوں سے مالا مال کرنے کے لیے جس وقت بھی چاہے عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ زندگی میں سنہری موقعے خود بخود پیدا نہیں ہوتے بلکہ انہیں پیدا کیا جاتا ہے۔"[۴۸]

انشائیہ "اطمینان" میں مشکور حسین یاد انسان کی ذہنی و دلی کیفیت اطمینان کی زندگی میں اہمیت و کردار کو احاطہ تحریر میں لاتے ہیں۔ وہ لوگوں اور معاشرے کے اطمینان کے بارے میں مفروضات کو رد کرتے ہیں جن نظریات سے معاشرہ مفلوج ہو جاتا ہے کہ جب انسان اطمینان حاصل کر لیتا ہے وہ زندگی میں ترقی کے منازل طے نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے دل میں کچھ کرنے کی لگن باقی نہیں رہتی اور کچھ پا لینے کی آرزو تمنا گل ہو جاتی ہے۔ انشائیہ "قدر و منزلت" میں مصنف انسان کی معاشرے میں قدر و منزلت حاصل کرنے کی خواہش اور کوشش کو موضوع بناتے ہیں۔ انشائیہ "ناجائز تعلقات" میں مشکور حسین یاد ازدواجی زندگی اور جنسی موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں۔ وہ طنزیہ انداز میں میاں بیوی کے تعلقات کو طنز کا نشانہ بھی بناتے ہیں کہ میاں بیوی کے تعلقات ہمیشہ

بگڑے ہی رہتے ہیں وہ میاں بیوی کے تعلقات کو اونٹ کی کل سے تشبیہ دیتے ہیں کہ یہ کل کبھی سیدھی نہیں ہوتی اس طرح میاں بیوی ایک دوسرے سے کبھی خوش نہیں ہوتے۔

انشائیہ ''سیدھی راہ'' میں مصنف سیدھی راہ اور ٹیڑھی راہ کے فرق کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے مفادات اور عیوب کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ مشکور حسین یاد کے مطابق سیدھی راہ پر چلنے سے منزل جلدی مل جاتی ہے اور ٹیڑھی راہ پر چلنے سے منزل جلدی نہیں مل سکتی مشکور حسین یاد سیدھی راہ کو استعاراتی طور پر استعمال کرتے ہیں۔ سیدھی راہ نیکی و خیر کی ہے جبکہ ٹیڑھی راہ بدی و شر کی ہے۔ تاہم مشکور حسین یاد انشائیہ کو اخلاقی مقاصد کے لیے لکھتے ہیں اور ناصح کے طور پر سیدھی راہ پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ انشائیہ ''غالب خستہ کے بغیر'' میں زندگی کے فلسفے پر غور و فکر کرتے ہیں اور اسے موضوع قلم بناتے ہیں گویا مشکور حسین یاد کا زیر نظر انشائیہ غالب کے اس شعر کی تشریح نظر آتا ہے۔

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

بنی نوع انسان نے انسان بننے کے لیے کچھ قدریں مقرر کی ہیں اور ان قدروں کی وجہ سے وہ دوسری اشیاء عالم سے اعلیٰ مقام پر فائز ہو جاتا ہے اور یہ قدریں انسان میں خود آگاہی کے ساتھ خستہ بھی بنا دیتی ہیں اگرچہ سب انسان زندگی میں اعلیٰ قدروں کو نہیں اپناتے اس وجہ سے معاشرہ تضاد کا شکار ہو جاتا ہے تاہم جینے کا لطف اسی تضاد کی کشمکش میں ہے اور کشمکش اسی غم کا دوسرا نام ہے اور غم کے بغیر زندگی کا کوئی جواز نہیں ہے تاہم مشکور حسین یاد نظریہ غم کو بخوبی بیان کرتے ہیں اور کہیں نہ کہیں مصنف کلبیت اور قنوطیت پسند بھی نظر آتا ہے۔

انشائیہ ''انسانی معاشرہ اور کردار'' میں مصنف انسانی معاشرے میں انسان کے کردار کو بیان کرتے ہیں گویا معاشرہ اور کردار لازم و ملزوم ہیں۔ کردار جذبے، عقل اور ارادے جیسی صفات کے مجموعے کا نام ہے جس سے ایک ذہن کی تشکیل ہوتی ہے۔ معاشرے کی ترقی کا تمام تر انحصار انسان کے ذہن و کردار پر ہے جسے سہل انگاری نے چھوا نہ ہو تاہم مشکور حسین یاد ہمیں مضبوط کردار کا درس دیتے ہیں کہ مضبوط کردار کی ہی بدولت انسان مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں اور اسی کے ذریعے ہی جلال و جمال کی جیسی سچائیاں بنی نوع انسان پر آشکار ہوتی ہیں۔

انشائیہ ''لمحے کا دوام'' میں مصنف وقت اور لمحوں کے فلسفے پر غور و فکر کرتے ہیں وہ سوچتے ہیں کہ وقت نے کائنات کو پیدا کیا ہے یا کائنات نے وقت کو پیدا کیا ہے۔ مشکور حسین یاد کے مطابق یہ انسانی خواہشات ہی ہیں جو تخلیق لمحات پر بڑی حد تک قدرت رکھتی ہیں لیکن لمحے کو تخلیق رکھنے کے بعد اسے زیادہ دیر تک زندہ نہیں رکھا جا

سکتا گویا لمحے پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں اصل مسئلہ جو درپیش ہے وہ یہ ہے کہ مثالی لمحے کو دوام بخشا جائے یہ لمحہ تھوڑی دیر کے لیے حواس پر چھا جاتا ہے اور جھپکتے ہی دھڑام سے نیچے گر جاتا ہے۔ مصنف وقت کے فلسفے پر غور کرتے ہیں اور لمحات کو دوام بخشتے ہیں۔

انشائیہ ”ناک پکڑنے کا عمل“ ایک علامتی انشائیہ ہے علاوہ ازیں مشکور حسین یاد انشائیہ ”تنہائی میں تنہائی کے فلسفے کو عمدہ انداز میں بیان کرتے ہیں اور مفکرانہ انداز اپناتے نظر آتے ہیں وہ تنہائی کے بارے میں بتاتے ہیں کہ آدمی عام طور پر تنہا رہنا پسند نہیں کرتا اس کا سیدھا مطلب یہ نکلتا ہے کہ آدمی اپنا بوجھ متحمل نہیں کر سکتا تنہا رہنے والا انسان مضبوط ہوتا ہے تنہائی میں انسان کچھ تخلیق کر سکتا ہے تنہائی میں انسان حقائق پر غور کرتا ہے تنہائی ایک دکھ ہے راحت ہے تاہم تنہائی دکھ اور سکھ کی دوئی کو ختم کر دیتی ہے۔

انشائیہ ”مبالغہ“ میں مشکور حسین یاد نے مبالغہ کی ادبی اور معاشرتی ضرورت و اہمیت کو موضوع بنایا ہے مبالغہ اس خوبی کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعے کسی شے، چیز یا شخص کی بعید از قیاس تعریف، برائی یا مذمت کی جائے۔ اگر مبالغہ درست اور عمدہ انداز میں کیا جائے تو اس چیز، شے یا انسان کا حسن نکھر جاتا ہے اور اسے چار چاند لگ جاتے ہیں اس طرح ادب اور فنون لطیفہ میں بھی مبالغہ کی بہت اہمیت ہے۔ تاہم مبالغہ انسانی ضرورت ہے اگر مبالغہ کو انسان منتخب نہ کرتے تو اس کی حالت اس مشین جیسی ہو جاتی جو دن رات ایک ہی طریقے سے چلتی رہتی ہے اور اس سے بوریت ہو جاتی ہے۔ انشائیہ ”کسب زر“ میں انسانی محنت اور انسانی محنت کے نتیجے میں وصول ہونے والی دولت اور زر کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مشکور حسین یاد کسب زر کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہیں۔

> ”انسانی محنت کی کوئی قیمت نہیں لگائی جا سکتی اور ہم انسانی محنت کی قیمت لگاتے ہیں ہماری اس غلطی سے معاشرے کی بیشتر برائیوں کا آغاز ہوتا ہے۔“[۹۹]

انشائیہ ”رہا آباد عالم“ میں مشکور حسین یاد دنیا میں پائے جانے والے لوگوں کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں پہلی قسم کے لوگ وہ ہیں جو ہمیشہ اپنی آنکھیں بند رکھتے ہیں اور ایسے لوگ ہمیشہ خواب دیکھتے رہتے ہیں اور زندگی سے فرار کے مرتکب ہوتے ہیں ایسے لوگ تساہل اور سستی میں رہتے ہیں اور خوابوں میں کھوئے رہتے ہیں جبکہ دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو ہمیشہ اپنی آنکھیں کھولے رکھتے ہیں ایسے لوگ زندگی کو ہمیشہ اپنے قابو میں رکھنا چاہتے ہیں مگر وہ ہمیشہ زندگی سے ڈرتے رہتے ہیں دنیا کی حقیقت کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتے ہیں اور یہی ڈر ان کی ناکامی کی اصل وجہ ہے۔ تیسری قسم کے لوگ کانے ہیں جو ایک آنکھ کھولتے ہیں اور دوسری بند کر لیتے ہیں کانا آدمی نشانہ اچھا لگاتا ہے اور اسے ہر چیز ٹھکانے پر رکھی نظر آتی ہے۔

انشائیہ "منافق" میں مصنف اخلاقیات کو موضوع بناتے ہیں مشکور حسین یاد اخلاقی مقاصد کے تحت ہی انشائیہ منافق لکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں منافقت بہت پھیل چکی ہے۔ اور ہر کوئی کسی کا لحاظ رکھنے کے لیے منافقت کا رویہ اختیار کر لیتا ہے مشکور حسین یاد معاشرے کے اس دوہرے پن پر قلم اٹھاتے ہیں اور معاشرے کی اس برائی پر طنز کرتے ہیں۔ انشائیہ "تجربہ اور ناتجربہ کاری" میں مشکور حسین یاد تجربہ اور ناتجربہ کاری کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر غور و فکر کرتے ہیں۔ تاہم تجربہ سے قبل انسان یگانگت کی فضا میں سانس لیتا نظر آتا ہے تاہم تجربہ انسان کو ڈرپوک، خود غرض، حریص اور تنگ دل بنا دیتا ہے عام طور پر تجربہ تکلیفیں پہنچاتا ہے اور زخم لگاتا ہے اور ناتجربہ کاری معصوم ہوتی ہے اور زخموں پر مرہم کا کام کرتی ہے تجربے کے پیچھے بھی ناتجربہ کاری کا نرم و نازک ہاتھ موجود ہوتا ہے۔

> "تجربہ کے ذریعے بات سمجھنا آسان ہے اس لیے نہیں کہ تجربہ خود آسان چیز ہے بلکہ اس لیے کہ تجربے کے ذریعے بات ہمیشہ ادھوری سمجھ آتی ہے انسان کو اچھے برے کی تمیز بھی اس ادھورے پن کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے، جتنا کچھ سمجھ میں آ گیا وہ اچھا، جو سمجھ میں نہیں آیا وہ بُرا۔"[50]

مشکور حسین یاد کے دوسرے انشائی مجموعے "بات کی اونچی ذات" میں بتیس انشائیے شامل ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں سوچ کی آگ سمجھ کر سونا، خوبصورت لوگ، اُداس آئینے، عالی ظرفی، انکسار کے آسمان، واحد متکلم، سچ کا ذائقہ، سادگی و پرکاری، اچھا زمانہ، فتح و شکست، تختِ سلطنت، بنی نوع آدم کا شرف، شہد کا چھتا، پارس کا پتھر، بات کی اونچی ذات، خُود غرضی، غنچہ نو شگفتہ، ایفائے عہد، خود اعتمادی کا بھرم، نشو و نما، مجالِ سخن، جائے پناہ، انا کی رانی، مجاز مرسل، خوف، بائیں ہاتھ کا کھیل، میاں مٹھو، ہوا کا جھونکا، فن ترجمہ نگاری، سر سید کی یاد میں، ناراضی، نئی بات۔ ان کے تیسرے انشائی مجموعے "وقت کا استعارہ" میں بتیس انشائیے شامل ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں خوشی کا بارِ عظیم، نزاکتوں کا مرقع، بننے سنورنے کا وقت، آدمی کی بڑائی، فراغت، ہبوطِ آدم، چھلنی بھی بولے، چھوٹا آدمی، آشوبِ آگہی، ذوقِ ساعت، دل پرخوں کی ایک گلابی سے، سرخاب کا پر، غیر ذات کی رعنائی، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، وصل محبوب کا موسم، خندہ پیشانی، نشاط کار عنفوانِ شباب، برہنگی کا ایک بلیغ استعارہ، عقیدہ۔ اسم کا جسم، یہ وقت ہے شگفتن گل ہائے ناز کا، جنم جنم کا خمار، قدموں کی دھول، یگانگت کی قوس قزح، پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے، تنہائی کا شور، انقلاب کی عمر، بہشت میں پہلا قدم، بڑھاپا سنبھالے نہیں سنبھلتا، اصل میں دونوں ایک ہیں، ہاتھ بھاگ پر، وقت کا استعارہ۔

مشکور حسین یاد انشائیہ ”ہبوط آدم“ میں اخلاقی اقدار کو دائرہ تحریر میں لاتے ہیں اور معاشرے میں پائی جانے والی برائیوں کا قلع قمع کرنا چاہتے ہیں اور برائی کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں مصنف کی رائے میں جو شخص کسی دوسرے کی برائی کرتا ہے اس کے اپنے ہوش و ہواس قائم نہیں ہوتے باوجود اس کے وہ یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ دوسرے کی برائی کر کے وہ دوسرے کے ہوش ٹھکانے لگا رہا ہے لیکن اس کے برعکس ہی ہوتا ہے اور برائی سے دو طرح ہی چھٹکارا پایا جاسکتا ہے۔ اول یہ کہ حسن و خوبی کا ماحول پیدا کیا جائے اور دوم اگر ایسا ماحول نہیں پیدا کیا جاسکتا تو اسے امید دلائی جائے کہ آج نہیں تو کل حسن و خوبی کا ماحول ضرور پیدا ہو جائے گا اور اس سے انسان کے ہوش و ہواس اپنی جگہ قائم رہیں گے گویا اگر ہم کسی کو بُرا کہہ رہے ہوتے ہیں تو خود کو ہی ملیامیٹ کر رہے ہوتے ہیں اور وہ اپنی ہی غور و فکر کی صلاحیتوں کو مفلوج کر رہا ہوتا ہے۔

> ”بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ اولاد آدم کا ایک دوسرے کو آپس میں بُرا کہنا حیات انسانی کے ساتھ برائی کے رشتے کو مضبوط کرتا ہے۔ برا کرنا برے کرنے سے اس لیے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے کہ کی ہوئی برائی کی پھر بھی کوئی حد ہوتی ہے، کہی ہوئی برائی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔“[۵۱]

مشکور حسین یاد انشائیہ ”نزاکتوں کا مرقع“ میں پتھر کو نزاکتوں کا مرقع کہتے ہیں اور پتھر کا ٹکڑا مشکور حسین یاد کو یاد دلاتا ہے کہ زندگی سادگی سے آراستہ ہے، زندگی بکھری ہوئی اور منتشر چیز نہیں ہے۔ گویا مشکور حسین یاد پتھر دیکھ کو ماضی میں کھو جاتے ہیں جب انسان پتھروں میں زندگی گزارتا تھا اور یہ پتھر اپنے اندر بے بہا خوبصورتیوں کو چھپائے ہوئے ہے اور پتھر کو دیکھ کر انسان کا حمد کہنے کو جی چاہتا ہے۔ مشکور حسین یاد اپنے عہد کے معاشی، معاشرتی، روحانی اور سیاسی حالات سے قاری کو واقف کرواتے ہیں ان کے اس طرز کے انشائیوں میں واحد متکلم، سنبھالے نہیں سنبھلتا، لے سانس بھی آہستہ، معاشرہ اور کردار، بڑھاپا اور لمحے کا دوام وغیرہ شامل ہیں۔

وہ انشائیہ کے موضوع کے لیے کسی قید کے پابند نہیں ہیں۔ ان کے انشائیوں کے موضوعات اخلاقی اقدار، جنسیات، احساس اور ذاتی زندگی کے تجربات ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ان کا عہد بولتا دکھائی دیتا ہے وہ زندگی کے گھمبیر مسائل بھی تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں وقت اور زمانے کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں ناصح کا روپ بھی دھارتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ان کے تجربات و مشاہدات دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں زندگی ہنستی کھیلتی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے انشائیے کسی شعر کی طرح رواں ہیں ان کے انشائیے جذبات سے بھرپور، گہری فکر سے لبریز اور گہرائی اور جستجو کی صفات رکھتے ہیں اس کے ساتھ

ساتھ شگفتگی اور بے ساختگی ان کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ان کے انشائیے کسی شعر کی طرح رواں ہیں ان کے انشائیے جذبات سے بھرپور، گہری فکر سے لبریز، گہرائی اور جستجو کی صفات رکھتے ہیں۔ان کے انشائیے مغربی زبان کے ایسے کے مطابق لکھے گئے ہیں مگر ان میں پاکستانیت کا رنگ نظر آتا ہے۔

تاہم ان کا مرکزی نکتہ ارد گرد معاشرہ اور عام آدمی کے زندگی کے تجربات ہیں اسی کے ارد گرد ان کی گفتگو کا دائرہ گھومتا ہے۔مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں دو انداز نظر آتے ہیں جس میں سنجیدگی،خشک فلسفہ اور دوسرا طنز و مزاح شامل ہیں۔مشکور حسین یاد سر سید احمد سے رشید احمد صدیقی کے مضامین اور مزاحیہ مضامین کو انشائیہ نگار تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں کیونکہ وہ انشائیہ کے لیے فکر و فلسفہ کو لازمی خیال کرتے ہیں۔آپ نے طنز و فکر اور فلسفیانہ مضامین کے ذریعے اخلاقی مقاصد کی ترویج بھی کی۔ان کے انشائیوں میں کلبیت اور قنوطیت بدرجہ اتم موجود ہے جو کہ نذیر صدیقی کے انشائیوں کا خاصہ ہے۔وہ معاشرے کے المناک حادثات اور برائیوں سے آگاہ ہیں اس لیے وہ سماج سے خوفزدہ دکھائی دیتے ہیں۔

وہ اشیاء اور ارد گرد کے حالات و مظاہر پر پیار و عقیدت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔وہ انشائیے کے موضوع کو بھی اپنی ذات کا حصہ نہیں بناتے اور منفرد اور انوکھے موضوعات کو بھی احاطہ تحریر میں نہیں لاتے بلکہ اپنے تجربات اور مشاہدات سے اپنا انشائیہ سجاتے ہیں۔جس سے ان کی پوری زندگی کا احاطہ ہو جاتا ہے۔وہ اپنی ذات کے اسرار و رموز کو بھی اپنے انشائیوں میں بیان کرتے ہیں یہی ان کے انشائیوں کی بڑی خوبی ہے۔ان کے انشائیوں میں تخلیقیت کا عنصر بھی موجود ہے اور یہ احساس کی حد تک جا پہنچتا ہے لیکن جہاں فکر کی سطح بہت حد تک مجرد محسوس ہونے لگتی ہے وہاں مقرون چیزوں سے ان کا واسطہ ٹوٹ کر خلائی شکل کی صورت اختیار کر لیتا ہے وہاں ان کا انشائیہ اپنا معیار کھونے لگتا ہے اور بعض جگہ ان کا انشائیہ بہت سنجیدہ اور فلسفیانہ فکر اختیار کر لیتا ہے۔مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں مقصدیت بخوبی موجود ہے اور یہ مثبت مقصدیت ان کے انشائیوں کو رونق بخشتی ہے۔ مصنف خیر و شر کے مسئلے کو بھی اپنے انشائیوں کا حصہ بناتے ہیں ان کے خیال میں انسان اپنے اعمال کے معاملے میں آزاد ہے اس لیے وہ اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اس کے لیے وہ معاشرے کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتا تاہم وہ اپنے آپ کو عام آدمی سمجھتے ہیں۔

مصنف اپنے انشائیوں میں تہذیبی سرگرمیوں کا بھی ذکر کیا ہے جیسے کی پاؤں دبانے کا عمل کئی صدیوں سے ہمارے معاشرے میں چلا آرہا ہے۔اور وہ اپنی تہذیبی سرگرمیوں کے دلدادہ ہیں۔مشکور حسین یاد اپنے انشائیوں

میں وقت کے فلسفہ پر بھی روشنی ڈالتے ہیں ان کی رائے میں وقت ماضی، حال اور مستقبل کی شکل میں تقسیم نہیں ہو سکتا اور یہ صرف انسان کا اپنا ذہن ہے جو اسے تقسیم کرتا ہے۔

ن۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں کا فکری جائزہ:

نظیر صدیقی کی پیدائش ۷ نومبر ۱۹۳۰ء کو بہار میں ہوئی۔ آپ تقسیم ہند کے بعد جون ۱۹۴۷ء میں ڈھاکہ تشریف لے گئے آپ نے ڈھاکہ یونیورسٹی ۱۹۵۳ء سے ایم اے اردو کا امتحان پاس کیا اور پھر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے انگریزی کیا بعد ازاں آپ نے بطور لیکچرار نوٹرے ڈیم کالج ڈھاکہ میں درس و تدریس کا کام کا آغاز کیا۔ نظیر صدیقی نے اٹھارہ سے زائد کتابیں لکھیں اور ان کی کتاب شہرت کی خاطر اپریل ۱۹۶۱ء میں کتاب گھر ڈھاکہ سے شائع ہوئی جسے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۱ء کے درمیان لکھا گیا۔ ”شہرت کی خاطر“ میں سولہ انشائیے شامل ہیں جن میں سے غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد اور آپ سے ملئے سفر نامے ہیں۔ انشائیوں کے عنوانات درج ذیل ہیں جہاں میں رہتا ہوں، دوست اور دوستی، بور، پدرم فقیر بود، یہ انسان، امتحان گاہ، بیٹھے بٹھائے، حمیدیہ اسکول آف اردو پوئیٹری، آزادی اور شرافت، مستقبل کا ادیب، اشتہار یا انکشاف، شادی، بیسویں صدی، شہرت کی خاطر۔

”جہاں میں رہتا ہوں“ انشائیہ میں نظیر صدیقی نے ہمارے معاشرے کے تلخ حقائق کو بے نقاب کیا ہے وہ معاشرے کے گھناؤنے چہرے سے پردہ ہٹاتے ہیں اور کہیں طنزیہ اور کہیں مزاحیہ انداز سے ان حقائق پر وار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں میں ہمارا عہد اور زندگی دکھائی دیتی ہے ان کے انشائیے فرضی انشائیے نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی دوربین نگاہوں سے اور اپنے تجربات سے حقیقت پر مبنی انشائیے لکھتے ہیں آپ نے طنز کا بھرپور استعمال کیا ہے اس طرح حقیقت کو بیان کرنے سے زندگی کے کئی چھپے ہوئے گوشے سامنے آتے ہیں۔ نظیر صدیقی ایسے انشائیہ نگار ہیں جنہیں سرے سے ہی اختلافات کا سامنا کرنا پڑا اور اس وجہ سے انہیں بعض انشائیہ نگار مضمون نگار یا مزاح نگار کہتے ہیں۔

نظیر صدیقی ایسے ادیب ہیں جو کہ کسی ادبی تحریک میں کبھی شامل نہ ہوئے اور نہ ہی کسی تحریک کے نظریات پر عمل پیرا ہوئے آغاز میں آپ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے مگر وہ اس کے حصار میں کبھی نہیں آئے بلکہ آپ جدیدیت اور ترقی پسندوں کے ناقد تھے۔ اگر نظیر صدیقی کے فلسفے پر غور کیا جائے تو ان کی ادباء کے بارے میں رائے تھی کہ اچھا ادیب غیر جانبدرانہ طور پر کائنات کا مبصر ہوتا ہے تاکہ وہ سارے مکاتب کا جائزہ لے سکے اس طرح ادیب عصبیت سے دور رہ سکتا ہے۔ نظیر صدیقی نے انشائیہ ”دوست اور دوستی“ میں دوستی کے ہر پہلو پر غور و

فکر کیا ہے۔ آپ نے دوستی کو ایک نعمت قرار دیا ہے۔ وہ دوستی کے بارے میں اپنے نظریات و عقائد کو مختلف رنگ و روغن کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ دوستی ایک نعمت ہے لیکن دوستی کی کوئی معیاد نہیں ہوتی بعض اوقات دوستی کسی عداوت اور دشمنی کے بغیر ختم ہو جاتی ہے وہ دوستی کے لیے ایک شرط بتاتے ہیں کہ آدمی کا دل گردہ ضرور ہونا چاہئیے تاکہ دوستوں کے مطالبے پورے کیے جا سکیں۔ نظیر صدیقی کی رائے میں دوستوں کو اپنے راز بھی نہیں بتانے چاہئیں اور دوست کو کبھی دشمن بھی نہیں بنانا چاہئیے۔ تاہم نظیر صدیقی اپنی زندگی کے تجربات بیان کرتے ہیں وہ ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔

نظیر صدیقی کا انشائیہ ''بور'' گہرے مشاہدے اور تجربے کا ثبوت ہے اور وہ اپنے مشاہدے کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں۔ نظیر صدیقی نے انشائیہ بور میں بور ہونے کی وجوہات بتائی ہیں اور عام طور پر لوگ بوریت سے کتراتے ہیں۔ نظیر صدیقی انسانی رویے کو موضوع بحث لاتے ہیں بوریت دور کرنے کے لیے لوگ طرح طرح کے انسانی رویے اپناتے ہیں اور بعض دفعہ تو بور انسان دوسروں کا قیمتی وقت ضائع کرنے سے گریز نہیں کرتے اور بعض سگریٹ پیتے ہیں اور بعض گپ شپ لگانے کے لیے کسی دوسرے انسان کا متلاشی ہوتا ہے۔ انشائیہ کا عنوان ''پدرم فقیر بود'' (میرا باپ فقیر تھا) فارسی کا فقرہ ہے مصنف انشائیے میں تفاخر کی خوبی کے مختلف زاویوں کو زیر بحث لاتے ہیں کہ فخر کرنا انسان کے جذبات میں سے ایک جذبہ ہے جس کی تسکین کی خاطر وہ کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ لاتا ہے ہر انسان کے فخر کرنے کا اپنا طریقہ اور صورت ہے بعض لوگ امیر ہونے پر فخر کرتے ہیں اور بعض غربت پر فخر کرتے ہیں بعض ممالک جمہوریت، بعض فاشئیت پر اور بعض اشتراکیت پر فخر کرتے ہیں۔

انشائیہ ''یہ انسان'' میں مصنف انسان کی نفسیات اور فطرت کو زیر بحث لاتے ہیں کی انسان آغاز سے ہی خود فریبی میں مبتلا رہا ہے انسان کی صفت اور کمزوری و کوتاہی یہ ہے کہ وہ خدا کے وجود اور عدم وجود کو ثابت نہیں کر سکا انسان کی آفاقی خوبی یہ بھی ہے کہ انسان بڑھاپے میں پرہیز گار ہو جاتا ہے اور جوانی میں اکثر عیاش پرست ہوتا ہے اگر انسان کی تاریخ کی طرف نظر دوڑائیں تو انسان حماقت اور جراءت کی طرف مائل رہا ہے انسان کو ایسی فطرت ودیعت کی گئی ہے کہ وہ حق و باطل کے جھگڑوں میں جھگڑا رہتا ہے انسان کی فطرت میں نیکی اور بدی شامل ہے۔ سیاست کے لحاظ سے انسان غلام اور آزاد واقع ہوا ہے انسان کے بہت سے طبقے ہیں جن میں سیاست، سائنس دان، فلسفی اور مصنفین وغیرہ شامل ہیں۔ ادیب اور شاعر کی ایک صفت یہ ہے کہ انہیں زندگی گزارنے کا طریقہ نہیں آتا مگر خوبصورت انداز میں بیان کرنا ہی آتا ہے۔

انشائیہ ”امتحان گاہ“ میں مصنف ہمارے ملک میں طلباء سے لیے جانے والے امتحان اور اس دوران آنے والی مشکلات کو زیر بحث لاتے ہیں دراصل امتحانات طلباء کی آزمائش کی خاطر منعقد کیے جاتے ہیں اور یہ اساتذہ کے لیے انتہائی صبر آزما عمل ہے کیونکہ استاد کو ٹہلتے ہوئے تین گھنٹے نگرانی کرنی پڑتی ہے۔ جو طلباء سارا سال پڑھنے سے گریز کرتے ہیں وہ امتحان کے دن مختلف حیلے بہانے بنا کر چوری کرنے سے باز نہیں آتے۔ مصنف اپنی رائے یوں دیتے ہیں۔

”امتحان گاہ میں چوری اور ملک میں چور بازاری کے پیش نظر میرا یہ خیال مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے کہ پاکستانیوں کی قوم چوروں کی قوم ہے یہاں طلباء سے لے کر وزراء تک سب کے سب چور ہیں۔“[۵۲]

نظیر صدیقی انشائیہ ”بیٹھے بٹھائے“ میں رقمطراز ہیں کہ بیٹھے بٹھائے انسان کو کوئی سوچ اور فکر آجاتی ہے یا بیٹھے بٹھائے کوئی آفت یا مصیبت برپا ہو جاتی ہے۔ مصنف انسان کی فطرت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

”دراصل یہ انسان کی فطرت ہے۔ جو کام انسان کے لیے جتنا ضروری قرار دیا جائے گا وہ اس سے اتنا ہی کترائے گا اسے جس سمت کے سفر سے جتنا زیادہ روکا جائے گا وہ اس سمت کے سفر پر اتنا ہی مصر ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو احتراز سے زیادہ ارتکاب میں، ثواب سے زیادہ گناہ میں، حلال سے زیادہ حرام میں اور منکوحہ سے زیادہ محبوبہ میں کشش محسوس ہوتی رہی ہے۔“[۵۳]

انشائیہ ”آزادی اور شرافت“ میں مصنف ایسے لوگوں کو طنز اور تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ جو محبت اور جنس میں اپنی آزادی چاہتے ہیں مصنف معاشرے کی اخلاقیات پر بھی گہرا طنز کرتے ہیں۔ انشائیہ ”مستقبل کا ادیب“ میں مصنف ادیبوں کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں بات کرتے ہیں مصنف کی رائے میں ادیب اس وقت ادیب کہلانے کے لائق ہوتا ہے جب وہ بہت سے نشیب و فراز کا تجربہ رکھتا ہو ادیب کو اپنی پہچان بنانے کے لیے بہت سے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ایڈیٹر بھی ادباء کے مضامین کسی بڑے ادیب کی وساطت سے رسائل میں شائع کرتے ہیں۔ ادباء کے مضامین اگر ایڈیٹر کو پسند آئے تو ہی شائع کرتے ہیں وگرنہ واپس کر دیے جاتے ہیں یا اس پر لیپا پوتی کرنی پڑتی ہے۔ ادباء زیادہ تر کلرک، لیکچرار یا معلم ہی ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انہیں کم آمدنی میں ہی گزارا کرنا پڑتا ہے۔ بعض لوگ شعر و ادب کی وجہ غربت کو ٹھہراتے ہیں ایسے لوگوں کے نزدیک عسرت اور مفلوک الحالی ہی ان کی تخلیقی سرچشموں اور صلاحیتوں کی وجہ ہے لیکن مصنف کی رائے میں یہ سراسر مغالطہ آمیز ہیں دراصل یہ

خوبیاں انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہوتی ہیں۔ان کی چھٹی حس،ذاتی تجربات ومشاہدات انہیں ادیب بنانے میں مددگار ہوتے ہیں۔

> "جو ادیب مستقبل میں پیدا ہوں گے اور جن ادیبوں کی ادبی حیثیت مستقبل کے ادیب ہیں لیکن ان کے علاوہ مستقبل کے ادیبوں کی ایک قسم وہ بھی ہے جو اپنے زمانے میں مشہور وممتاز ہونے کے باوجود اپنے زمانے میں اس احترام وافتخار کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔ایسے ادیبوں کو حالات وحوادث مستقبل کے حوالے کر دیتے ہیں یعنی ان کی قدر ومنزلت کا صحیح احساس اور ان کی اہمیت وعظمت کا مکمل اندازہ آئندہ نسلوں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔"[۵۴]

انشائیہ "اشتہار یا انکشاف" میں مصنف کتابوں کے اشتہار پڑھنے کی بجائے کتابیں پڑھنے پر ترجیح دیتے ہیں۔مصنف اخبار پر اشتہارات سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ کسی ادیب کی کتاب یا مضامین پڑھنے کی بجائے اس کتاب کے اشتہار پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے دوستوں کے درمیان انہیں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اگرچہ اشتہارات پڑھنے میں کم وقت درکار ہوتا ہے۔اس لیے بعض لوگ اشتہارات پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں مصنف ایسے لوگوں پر طنز بھی کرتے ہیں جو لوگ تقرریا منصبی کے لیے کتاب لکھتے ہیں تاکہ ان کا تقرر یا ترقی ہو سکے ایسے لوگ صرف کتاب کو اشتہار ہی سمجھتے ہیں۔

انشائیہ "شادی" میں مصنف شادی کے نقصانات اور فوائد کو زیر بحث لاتے ہیں۔مصنف کے خیال میں شادی ایک شامت ہے جس سے بچنا محال ہے اور شادی کے بعد شوہر کو بیوی کی ذمہ داریاں اٹھانا مہلک محسوس ہوتا ہے۔بعض لوگ شادی کرنے کے لیے اقتصادی حالت بہتر ہونے کے منتظر ہوتے ہیں۔شادی کے معاملے میں نوجوان محبت کی شادی کو پسند کرتے ہیں جبکہ بوڑھے افراد منکوحہ سے محبت کو پسند کرتے ہیں اور یہ تضاد آغاز سے ہی نوجوانوں اور بزرگوں میں پایا جاتا ہے۔ہمارے ہاں بزرگ بچوں کی مرضی کی بجائے زبردستی سے اپنی مرضی سے شادی کروانے کے قائل ہیں جس کے رد عمل میں بچے کھلی بغاوت پر اتر آتے ہیں بغاوت کا نتیجہ سول میرج کی صورت میں نکلتا ہے شادی سے بہت سے مسائل حل ہوتے ہیں مگر اس سے بہت سے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔

انشائیہ "بیسویں صدی" میں مصنف بیسویں صدی کے کرشمات کو زیر بحث لاتے ہیں مصنف نے یہ انشائیہ ۲۳مارچ۱۹۶۱ء میں لکھا اس دور میں انسان نے بہت سے حربے ایجاد کر کے اسے اپنے اوپر آزمایا یہ دور زیادہ

مصیبتوں اور تکلیفوں کا دور تھا جس میں دو عظیم جنگیں ہوئیں اور پھر تیسری جنگ سے بچنے کی کوشش بھی کی گئی اور اس کوشش کو کارگر ثابت کرنے کے لیے نوبل پرائز بھی مقرر کیا گیا۔ بڑی قوموں نے چھوٹی قوموں پر دباؤ بھی ڈالا تاکہ ان کی چھوٹی قوموں میں مقامی جنگ چھڑی رہے۔ جہاں اس دور میں بہت سی ایجادات ہوئیں وہاں اس دور نے مذہبی تعصب اور رنگ و نسل کی تفریق کو بھی جنم دیا۔ اس دور کے آغاز میں لوگوں پر مذہب کی اجارہ داری قائم تھی نیز اس دور میں سائنسی علوم کے علاوہ دوسرے علوم نے بھی کافی ترقی کی جیسے نفسیات وغیرہ۔

بیسویں صدی میں بہت تکلیف دہ حد تک آرام و آسائش کی سہولیات زیادہ ہوگئیں تھیں۔ اس دور میں علم و ادب بھی ترقی کی راہ پر گامزن تھا یورپ میں نت نئے تجربے کیے جاتے تھے جبکہ مشرق میں یورپ کی پیروی کی جاتی تھی تاہم جس قدر عریانی حقیقی زندگی میں پائی جاتی تھی اس قدر عریانی حقیقی زندگی میں پائی جاتی تھی گویا زندگی اور ادب میں مطابقت پائی جاتی تھی۔ انشائیہ ”شہرت کی خاطر“ میں مصنف ناقدین، مصنفین اور شعراء کی شہرت حاصل کرنے کی انتھک کوشش پر قلم اٹھاتے ہیں۔ مصنف شہرت کے حصول کے لیے سرقہ سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ شہرت کے لیے مشہور شعراء سے اپنی غزل کی اصلاح کروا کر اپنی غزل بھی ساتھ ہی چھپواتے ہیں۔ وہ شہرت کی خاطر بڑے شعراء، افسانہ نگار اور ناقدین وغیرہ پر تنقید کرنے سے بھی نہیں چونکتے۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ شہرت کے لیے بزم سخن میں بھی مدعو کیے جائیں اس کے لیے وہ شہر کی بڑی انجمنوں سے تعلق وابستہ رکھتے اور مصنف شہرت حاصل کرنے کے لیے بڑے بڑے مصنفین سے دوستی روا رکھتے ہیں تاہم مصنف نے شہرت کے حصول کے لیے نااہل مصنفین کی خوشامد کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ وہ ایڈیٹروں کی خوشامد میں مضامین بھی لکھتے تاکہ ان کو شہرت مل سکے مصنف شہرت کے حصول کے لیے وہ سب ہتھکنڈوں اور نسخوں پر عمل بھی کرتے جن سے عام شہرت کا حصول ممکن ہو سکے مصنف طنز کرتے ہیں۔

> ”واقعہ یہ ہے کہ میں نے تمام عمر لکھنے کی اتنی کوشش نہیں کی ہے جتنی شہرت حاصل کرنے کی۔ میری کوششیں سرتاسر رائیگاں نہیں گئی ہیں۔ لیکن ان کا نتیجہ حسب دل خواہ بھی نہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان اور ہندوستان جیسے ممالک میں ادیبوں اور شاعروں کی شہرت مرنے کے بعد ہوتی ہے۔ ان ملکوں کے باشندے اپنے ادیبوں اور شاعروں کو ان کی زندگی میں نہ پوچھتے ہیں نہ پوجتے ہیں۔“[۵۵]

نظیر صدیقی معاشرے کے تلخ اور کڑوے حقائق بڑی بے باکی سے بیان کرتے ہیں وہ سچ بولنے سے گریز نہیں کرتے۔ وہ خود دکھوں اور پریشانیوں میں گھرے ہونے کے باوجود کبھی بھی اپنی تحریروں میں پنے دکھوں کا برملا

اظہار نہ کرتے ان کا یہ دکھ مختلف روپ دھارتا نظر آتا ہے کبھی ہم اسے طنز میں محسوس کرتے ہیں کبھی اسے اپنی سوچ و فکر سے اسے عیاں کرتے ہیں اور کبھی یہ شدید احتجاج کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ تاہم وہ طنز کا مثبت استعمال کرتے ہیں جس کا مقصد معاشرے کی برائیوں کا جڑ سے خاتمہ کرنا ہے۔ وہ زندگی کی تلخ سچائی کو بہت سادہ انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قاری اس کے سحر میں کھو جاتا ہے۔

نظیر صدیقی کے انشائیوں کے عنوانات نہایت سنجیدہ ہیں۔ ان کے مطابق صرف انشائیے کے عنوان سے انشائیے کی پوری کہانی یا کتھا بیان نہیں ہوتی، ایسا نظم یا کہانی میں تو ہو سکتا ہے مگر انشائیہ میں ایسا ممکن نہیں جب تک قاری پورا انشائیہ پڑھ نہ لے تب تک وہ سمجھ نہیں پاتا کہ انشائیہ نگار کیا بتانا چاہتا ہے۔ نظیر صدیقی منفرد انشائیہ نگار ہیں۔ ان کے انشائیوں کی تعداد بہت کم ہے۔ لیکن ان کا اپنا ایک خاص معیار ہے۔ اگر فکر کے لحاظ سے ان کے انشائیوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے انشائیے برٹرینڈ رسل اور برنارڈ شاہ کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں مذہب کو اخلاقیات سے آزاد کروانے کا پختہ ارادہ بھی موجود ہے۔ وہ نماز پڑھنے والوں کی گنتی کے اضافے کی اہمیت کو تسلیم کرنے کی بجائے برائی اور شر پیشہ افراد میں کمی کو تسلیم کرتے ہیں۔ تاہم ان کے انشائیوں میں کئی طرز کی فکری لہریں دوڑتی محسوس ہوتی ہیں مظفر سید اپنی رائے دیتے ہیں۔

> ”آپ چاہیں تو نظیر صدیقی کے ان مضامین کو ایک فریاد بھی کہہ سکتے ہیں۔ طاقت اور بے انصافی کے خلاف فریاد، جہالت اور بے علمی کے خلاف فریاد، خود غرضی اور خود فریبی کے خلاف فریاد اور کبھی کبھی سارے زمانے کے بلکہ سارے خدائی کارخانے کے خلاف فریاد۔ ان کی فریاد بعض اوقات مردم بیزاری کا روپ بھی دھار لیتی ہے۔“[۵۶]

تاہم ان کے انشائیوں میں فریاد کرنے کا عنصر موجود ہے اور یہ فریاد مردم بیزاری کے وقت بہت تلخ محسوس ہوتی ہے تاہم اس میں مزاح بھی بخوبی موجود ہے اگرچہ نظیر صدیقی کے انشائیوں میں خارجی اور اجتماعی پہلوؤں کی عکاسی موجود ہے اور یہ ان کی تحریروں کا حصہ بھی ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں اپنی ذات کی خوبیوں اور اپنی ذات کی حقیقتوں اور سچائیوں کو بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کی محرومی کو کبھی سب سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی اور کبھی طنز کی صورت میں اس کا اظہار کیا۔

نظیر صدیقی کی صحت پیدائشی خراب تھی اور ان کو زندگی میں بہت سے حادثات کا شکار بھی ہونا پڑا جس کے اثرات ان کی تحریروں میں دیکھے جاسکتے ہیں نظیر صدیقی نے اپنے گھر والوں کے خلاف شادی کی اس وجہ سے ان کی زوجہ کو بھی اپنے سسرال میں اتنی عزت اور احترام نہ مل سکا جس سے ان کی گھریلو حالات بھی عذاب بن گئے

جن کا ذکر اکثر ان کے خطوط میں دیکھا جا سکتا ہے۔ زمانے کی ناقدری کا احساس ان کی تحریروں میں بھی در آیا اسطرح اداسیاں، زمانے کی سرد مہریاں اور محرومیاں مزاح اور طنز کے انداز میں ان کے انشائیوں میں نمایاں ہونے لگیں نظیر صدیقی کی ان کے ادب میں خدمت کے باوجود اتنی پذیرائی نہ ملی جس کا انہیں پوری زندگی شدید احساس رہا وہ زمانے سے ہمیشہ شکوہ شکایت ہی کرتے رہے اور بعض اوقات طنز کی کاٹ اور اس کی دھار انشائیوں میں زیادہ نمایاں ہونے لگتی ہیں اسکی زیادہ وجہ معاشرے اور دنیا کا ان سے برتاؤ تھا۔ نظیر صدیقی بیان کرتے ہیں۔ اس باب میں سب سے پہلے اس بات کا اعتراف ضروری معلوم ہوتا ہے کہ:

> "میں جن حالات و حوادث سے گزر تا رہا ہوں ان کے اثر سے میری زندگی بڑی حد تک غم و غصہ کا شکار رہی ہے یہی غم و غصہ میری شاعری اور میرے انشائیوں کے محرکات رہے ہیں۔ میری شاعری کا محرک غم ہے اور میرے انشائیوں کا محرک غصہ ہے، یہی وجہ ہے کہ میرے انشائیوں میں مزاح سے زیادہ طنز کا عنصر نمایاں ہے۔"[۵۷]

ان کے انشائیے بہتے ہوئے دریا کی مانند ہیں جس کے دو دھارے ہیں ایک دھارا فکر کی وسعت و گہرائی سے بھرپور ہے اور دوسرا دھارا طنز و مزاح کی کاٹ سے بھرپور ہے۔ ہرچرن چاولہ انہیں اپنا پسندیدہ انشائیہ نگار مانتے ہیں اور ان کے بارے میں یہ بھی اکثر کہا جاتا ہے کہ ان کے انشائیوں میں رشید صدیقی کے اسلوب کے اثرات نمایاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں نے سادگی اور احساس کی آمیزش کے ساتھ اپنے انشائیوں کے بحری جہاز کو رشید صدیقی سے الگ ساحل پر لنگر انداز کیا انہوں نے رشید صدیقی کی پیروی ضرور کی مگر انہوں نے اپنے الگ اسلوب کو اپنایا جس کی وجہ سے نظیر صدیقی کا اپنا ایک مقام ہے۔ نظیر صدیقی کا شمار خوش نظر، اعلیٰ فکر، ذہین اور با مطالعہ ادبی شخصیات میں کیا جاتا ہے ان کے انشائیوں میں فکر کا تعمق، وسعت اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ تاہم ان کے انشائیوں میں شگفتگی کا فقدان ہے مگر انکے ہاں پڑھے جانے کی پوری قوت موجود ہے۔ نظیر صدیقی وزیر آغا جتنے انشائیے تو نہ لکھ سکے مگر ان کے انشائیے کسی طور پر بھی کسی بڑے انشائیہ نگار سے کم نہیں ہیں۔

و۔ صلاح الدین حیدر کے انشائیوں کا فکری جائزہ:

صلاح الدین حیدر کا تعلق ملتان سے ہے اور وہ اپنے زیادہ تر انشائیے رسالہ اوراق میں چھپوانے کی بجائے رسالہ فنون، ترنگ خیال اور رسالہ افکار وغیرہ میں چھپواتے ہیں۔ صلاح الدین حیدر کے دو انشائی مجموعے ہیں

"حماقتیں میرے مقدر" کی ۱۹۷۹ء کاروان ادب ملتان سے شائع ہوا اور ڈر اور ڈراما ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ حماقتیں میرے مقدر میں اٹھارہ انشائیے شامل ہیں جن کے عنوانات یہ ہیں۔ تذکرہ دربار کا، باتیں نیند اور خوابوں کی، حماقتیں میرے مقدر کی، بیان منافقت کا، تذکرہ جوانی کا، قصہ ضمیر فروشی کا، تذکرہ بربادی کا، تذکرہ جنون کا، شادی کا بکرا، قصہ انقلابی شوہر کا، قصہ شرافت کا، قصہ جھگڑالو کا، جذبہ خدمت خلق سے محکمہ شہری دفاع تک، قصہ عظیم بننے کا، حُب الوطنی سے بیمہ ایجنسی تک، ثقافت سے حماقت تک اور قصہ ایک عاشق کا۔

انشائیہ "تذکرہ دربار کا" میں صلاح الدین حیدر انسانوں کو دو گروہ میں تقسیم کرتے ہیں ایک دربار لگانے والے اور دوسرے درباری جیسے کہ مصنف اور دوسرا قاری۔ دربار لگانے والے اور مصنف قوت اور اقتدار رکھتے ہیں جبکہ قاری اور درباری اقتدار سے محروم ہوتے ہیں تاہم دربار انسان کی اہم اور روحانی ضرورت ہے اور اس سے وہ تسکین پاتا ہے۔ صلاح الدین حیدر کی رائے میں دربار لگانے کی رسم آج کل کے دور میں بھی موجود ہے یعنی استاد صاحب اقتدار اور طلباء ارد گرد موجود ہوں تو یہ بھی دربار لگانے سے مماثل ہے اس طرح علم کی دنیا میں بھی حکومت کی جاسکتی ہے علاوہ ازیں صلاح الدین حیدر ہمارے تعلیمی نظام کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں کہ اساتذہ اپنے علم پر پورا عبور نہیں رکھتے اور طلباء کو علم سکھانے کی بجائے وقت گزاری ہی کرتے ہیں اس طرح صلاح الدین حیدر کلرکوں کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں کہ ہر کلرک اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے وہ آفس کی فائیلوں سے بس کھیلتا ہے۔

صلاح الدین حیدر "نیند اور خواب" کی انسان کی زندگی میں اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں نیند انسانی زندگی کی نشو و نما اور تعمیر و تشکیل کے لیے بہت اہم ہے۔ پہلے پہل انسان گھنے جنگلوں میں خواب آور گولیوں کے بغیر ہی گہری اور سکون کی نیند سوتا تھا مگر جب ہم افکار و خیالات کی جنگ لڑ رہے ہوتے ہیں تو اس کا گہرا اثر ہماری نیند پر پڑتا ہے اور بعض دفعہ نظام انہظام کی خرابی براہ راست ہماری نیند کو متاثر کرتی ہے۔ صلاح الدین حیدر نیند اور خوابوں کا نظام درست کرنے کی تجویز دیتے ہیں کیونکہ انسانوں نے اپنی نیندیں خراب کر کے ایٹمی اسلحہ کے ذخائر بنالیے ہیں اور دنیا تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے اس لیے انسانوں کو نیند اور خواب اچھے آنے چاہئیں تاکہ معروضی زندگی میں واقعات بھی اچھے رونما ہوں اس لیے نیند اور خواب لازم و ملزوم ہیں۔

صلاح الدین حیدر انشائیہ "حماقتیں میرے مقدر کی" میں انسان کی زندگی میں مختلف موقعوں پر ہونے والی حماقتوں کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں۔ انسان سے جوانی میں بہت سی حماقتیں سرزد ہوتی ہیں اور جوانی اکثر نادانی میں ہی گزر جاتی ہے۔ صلاح الدین حیدر دلیری کو حماقت کہتے ہیں صلاح الدین حیدر اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو بھی بیان کرتے ہیں۔ صلاح الدین حیدر عشق کو حماقت قرار دیتے ہیں جو کہ جوانی میں سرزد ہوتا ہے

تاہم صلاح الدین حیدر کے انشائیے میں شروع سے لے کر آخر تک طنز کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔صلاح الدین حیدر اپنے موضوع پر قائم رہتے ہوئے معاشرے کی کئی برائیوں اور گھناؤنے جرائم کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔تاہم حماقت تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ ہی پروان چڑھتی ہے اور جب انسان اپنے آپ کو بدلنے کی بھی کوشش کرتا ہے اس سے کئی حماقتیں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔صلاح الدین حیدر بیان کرتے ہیں۔

"کوئی حماقت کرنے سے پہلے حماقت کا احساس ہو جائے تو آدمی خود تنقیدی کا شکار ہو کرنا معقول حد تک محفوظ رہتا ہے لیکن جو حماقتیں مقدر میں لکھی جا چکی ہوں وہ سرزد ہو کر رہتی ہیں۔"[۵۸]

صلاح الدین حیدر "بیان منافقت کا" انشائیہ میں بڑھتی ہوئی منافقت اور اس کے سدباب کو طنز و مزاح کی روشنی میں بیان کرتے ہیں۔صلاح الدین حیدر انسان کے منافق رویے پر طنز کرتے ہیں۔

"کپڑوں میں سب انسان ننگے ہیں لیکن سب انسان کپڑے اس لیے نہیں اتار دیتے کہ منافق ہیں سو وہ سچائی ہمیں خاصی ناگوار گزرتی ہے، جس میں آدمی بالکل ہی کپڑوں سے باہر ہو جائے۔"[۵۹]

تاہم منافقت انسان کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ازدواجی زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے اور جو لوگ ان بندھنوں سے آزاد ہیں انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ منافقت کے خلاف بیان دیں۔تاہم انشائیے میں مصنف فلسفے اور معاشرے پر بھی طنز کرتے ہیں۔علاوہ ازیں دنیا کی تمام سنجیدہ اور متانت سے بھرپور حقیقتوں کے پیچھے منافقت پوشیدہ ہوتی ہے تاہم جو دوسروں کے بارے میں سوچا جاتا ہے ان کے منہ پر کہنا بہت مشکل ہوتا ہے تو تب بھی ہم منافقت کا ہی ثبوت دیتے ہیں۔قصہ "ضمیر فروشی کا" انشائیہ میں صلاح الدین حیدر ضمیر فروش کرنے کی وجوہات عمدہ پیرائے میں بیان کرتے ہیں زیادہ تر انسان اپنا ضمیر بیچ کر ہی خوش ہوتے ہیں اور جو شخص اپنے ضمیر کو فروخت کرتا وہ اندر ہی اندر کڑھتا رہتا ہے۔اکثر وہ لوگ اپنے ضمیر کو نہیں بیچ سکتے جس کے ضمیر کو کوئی خریدنے والا نہ ہو۔اکثر جو لوگ ضمیر بیچ دیتے ہیں ان کے چہرے پر خوشی کی لہر ہوتی ہے اور جو ضمیر نہیں بیچتے ان کے چہرے پر مردنی چھائی ہوتی ہے۔

انشائیہ "تذکرہ بربادی کا" میں انسان کے تخریب پرست مزاج کو موضوع بحث بنایا گیا ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے وقت کو، اپنے رشتوں کو، اپنے جذبات گویا ہر چیز کو برباد کرتا آیا ہے۔تاہم انسان اپنی موجودہ شکل میں کتنے تباہی و بربادی والے مراحل کو طے کر کے پہنچا ہے اور تہذیب و ثقافت بھی تباہی کے عمل سے گزرتی رہی ہے۔اس

طرح انسان ہمیشہ موسیقی کی دھنوں کو بھی بربادی کے عمل سے گزارتا رہا ہے گویا بربادی کا عمل زندگی کے ہر شعبے اور ہر دور میں جاری وساری ہے انسان شعوری طور پر اسے محسوس نہیں کر سکتا انسان مختلف طریقوں سے برباد ہوتا ہے۔ صلاح الدین بربادی کا بنیادی تعلق غم سے پیوستہ کرتے ہیں۔ بعض لوگ اپنی دولت، مال اور جان برباد کر دیتے ہیں مگر پھر بھی ہشاش بشاش نظر آتے ہیں۔ بعض لوگ گھر کی ذمہ داری قبول کر کے خود کو برباد کرتے رہتے ہیں اور بعض لوگوں کو معاشرے کی ذمہ داریاں برباد کر دیتی ہیں۔

صلاح الدین حیدر انشائیہ "تذکرہ جنوں کا" میں جنوں پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہیں اور اسے طنز و مزاح کا نشانہ بناتے ہیں طنز و مزاح کی لہر ان کے انشائیے کے آغاز سے لے کر اختتام تک پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارے اکثر شعراء فارسی و اردو کی غزل میں مجنوں کے جنوں کو مشعل راہ بنایا۔ صلاح الدین حیدر اپنی ذات میں بھی جنوں کو تلاش کرتے ہیں۔ صلاح الدین حیدر" شادی کا بکرا" انشائیہ میں شادی، دولہا اور شادی کی رسومات کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں اور معاشرے کی بنی ہوئی رسومات کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ معاشرے کی بنی ہوئی رسومات کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں کہ شادی میں لوگ ایسی ایسی رسومات کے عادی ہو گئے ہیں کہ بعض لوگ تو شادی کی رسومات کا بوجھ ہی نہیں اٹھا سکتے مصنف دولہا کو بکرا کے نام سے مخاطب کرتے ہیں کیونکہ دولہا کو تلاش کرنے کے لیے بڑی بوڑھی عورتیں بہت چھان پھٹک سے کام لیتی ہیں۔

قصہ" انقلابی شوہر کا" میں صلاح الدین حیدر ازدواجی زندگی میں شوہر کا کردار طنزیہ و مزاحیہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ شوہر پر طنز کرتے ہیں کہ شوہر اپنی پوری زندگی بیوی کی اطاعت کرنے میں بسر کر دیتے ہیں نیز شوہر پر ذمہ داریوں کا انبار ہوتا ہے۔ صلاح الدین شوہر کے حق میں آواز بلند کرتے ہیں۔ صلاح الدین حیدر انشائیہ" قصہ شرافت کا" میں شریف آدمی کی صفات بتاتے ہیں۔ عام طور پر لوگ شریف آدمی کو بے وقوف ہی سمجھتے ہیں یا شرافت بے وقوفی کی ایک صحت مند شکل ہے۔ شریف لوگ زیادہ بحث مباحثہ نہیں کرتے اور شریف لوگ برائی کو مٹاتے نہیں بلکہ اسے چھپاتے ہیں اور برائی کو وہی لوگ مٹا سکتے ہیں جنہیں لڑنا آتا ہو اور لڑنے کے لیے بدمعاش بننا پڑتا ہے اور بدمعاش لوگ دلیر ہوتے ہیں۔ صلاح الدین حیدر انسانی زندگی میں بارہا ہونے والے جھگڑے کو موضوع گفتگو بناتے ہیں اور جھگڑا کرنے کی وجوہات بتاتے ہیں۔" جھگڑا دراصل اس وقت ہوتا ہے جب کمزور طاقتور بننے کی کوشش کرتا ہے۔ طاقتور اگر کمزور کو بتاتا رہے تو جھگڑا نہیں ہوتا۔"[۶۰]

تاہم انسانی تاریخ کی ابتداء ہی جھگڑے سے ہوتی ہے اور جھگڑا ہماری کلاسیک روایت کا حصہ ہے۔ جب انسان کے جذبات عقل پر غالب آ جائیں تو جھگڑے کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا۔ انسان کے دو قسم کے جھگڑے ہوتے

ہیں ایک جسمانی اور دوسرا علمی۔ صلاح الدین حیدر انشائیہ "جذبہ خدمت خلق سے محکمہ شہری دفاع تک" میں اپنے تجربات و مشاہدات کو طنزیہ و مزاحیہ انداز میں بیان کرتے ہیں کہ انسان کی زندگی کا مقصد خدمت خلق ہی ہے اور مخلوق خدا کی خدمت کرنے کے لیے مختلف طریقے اپنائے جاسکتے ہیں اور یہ سوال ہمیشہ سے قابل غور رہا ہے کہ اس دنیا میں انسان کا مقصد کیا ہے۔

صلاح الدین حیدر انشائیہ "قصہ عظیم بننے کا" میں بڑا آدمی بننے کی جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں ان کے خیال میں آدمی بننا مشکل کام ہے جبکہ بڑا آدمی بننا آدمی بننے سے قدرے آسان ہے۔ صلاح الدین حیدر انشائیہ "حب الوطنی سے بیمہ ایجنٹی تک" میں حب الوطنی سے بیمہ ایجنٹی تک کے سفر کو احاطہ تحریر میں لاتے ہیں۔ صلاح الدین حیدر بیمہ ایجنٹوں پر طنز کرتے ہیں کہ بیمہ ایجنٹ اپنا کمیشن لینے کے لیے مختلف طریقوں کے قائل ہیں اور قائل کرنے کے لیے مختلف حربے اپناتے ہیں اور تنگ کرتے ہیں اور اس وقت تک گلو خلاصی نہیں کرتے جب تک ان کا اپنا نقصان نہ ہو جائے یا کوئی ان کی بات کو سننا گوارا نہ کرے۔

صلاح الدین حیدر انشائیہ "ثقافت اور حماقت" میں تہذیب و ثقافت پھیلانے کی جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔ صلاح الدین حیدر کی رائے میں ثقافت کے تین عناصر ہیں ان میں حسن، تعلیم اور شائستگی شامل ہیں۔ صلاح الدین حیدر انشائیہ "قصہ ایک عاشق کا" میں عشق کرنے کی خواہش اور عشق کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو طنزیہ و مزاحیہ انداز میں صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں اور اپنی رائے دیتے ہیں کہ عشق میں بہت سی مشکلات پیش آتی ہیں اور اس کی راہ میں حائل رکاوٹوں سے بھی لذت ملتی ہے اور عشق مجازی سے ہی عشق حقیقی تک پہنچا جا سکتا ہے اور کائنات کو بھی تسخیر کر سکتا ہے۔

ان کے انشایئے مزاح کی چاشنی سے بھرپور نظر آتے ہیں اور طنز کی کاٹ بخوبی موجود ہے۔ دبستان سرگودھا کے مصنفین انہیں انشائیہ نگار تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں مگر ان کا انشائیہ "خرد کو غلامی سے آزاد کر" میں دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کی خوبیاں موجود ہیں۔ ان کے انشائیوں میں طنز کی ایک لہر شروع سے آخر تک ان کے انشائیوں میں موجود ہے۔ ان کے انشائیوں میں فقرہ طرازی بھرپور دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کا انشائیوں کا مقصد طنز اور مزاح کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کرنا ہے۔ ان کے انشائیوں میں ذاتی استدلال، تازگی اور شگفتگی موجود ہے۔ وہ ذاتی منطق اور استدلال سے طنز و مزاح کی صورت حال کو پیدا کرتے ہیں۔ وہ معاشرے کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ چارلس لیمب کی مانند سنجیدہ صورتحال کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں۔

صلاح الدین حیدر ترقی پسند تحریک کے ماننے والوں میں سے تھے وہ انسان کی نفسیات اور انسان کے رویوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے وہ معاشرے کی اصلاح اور تربیت کو اپنا فرض گردانتے تھے ان کے انشائیوں میں مزاح کی تیزی بھی بخوبی موجود ہے۔ ان کے انشائیوں میں انکشاف ذات، طنز و مزاح اور شخصی دلائل کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے۔ وہ پرانے موضوعات کا انتخاب کر کے ان میں نئی صورت حال پیدا کرتے ہیں۔ ان موضوعات میں ہنگامی قسم کا مواد نہیں ہے بلکہ وہ اپنے انشائیے عصری حوالے سے لکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے انشائیوں میں وسیع تر موضوعات کے انتخاب کے ساتھ وسیع معانی سے بھی نوازا۔ اس طرح ان کے انشائیوں میں وسعت پیدا ہو گئی جس وجہ سے اس میں سارے بنی نوع انسان شامل ہو گئے گویا ان کے انشائیوں کے بہت سے فقرات ضرب الامثال کی صورت اختیار کر گئے ان کا انداز حقیقت پسندانہ تھا اور کڑوی سے کڑوی بات کو خوشگوار انداز میں بیان کرتے ہیں۔

صلاح الدین حیدر کا دوسرا انشائیہ "ڈر اور ڈراما" ہے جو کہ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں انیس انشائیے شامل ہیں۔ جن کے عنوانات درج ذیل ہیں۔ داستان شامت اعمال، معرکہ حق و باطل المعروف بہ ت "لوار ٹوٹ گئی" انتقال فرمانا، ڈر اور ڈراما، جاگیر دار اور برخودار، نشئی، معذور ہونا، ٹوپی، وجدان اور نادان، گلیاں اور رنگ رلیاں، منزل ہے کہاں تیری، درد لا دوا پایا، خودکشی، مکاں سے لامکاں تک، خرد کو غلامی سے آباد کر، انقلابی والد بزرگوار، جنوں، مجنوں، جنونی، ابلاغ نابالغ البلاغ، اے چارہ گرو۔ ڈر اور ڈراما" کا دیباچہ طرفداریاں کے نام سے فیض عابد عمیق نے لکھا اس کے علاوہ انشائیہ کیا ہے کہ نام سے مصنف نے ایک مضمون بھی اس انشائی مجموعے میں شامل کر دیا ہے اور اس کتاب کا انتساب پروفیسر خلیل صدیقی کے نام ہے۔

"ڈر اور ڈراما" کے انشائیوں میں مصنف نے تاریخی اور سماجی حوالے بھی پیش کیے ہیں ان کے انشائیوں میں ان کے ذاتی تاثرات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں انہوں نے اپنے تجربات کی رو سے تاریخی حوالوں کو بیان کیا ہے۔ مصنف اپنے انشائیوں میں ہنساتا بھی ہے وہ اپنے زندگی کے دن رات کے تجربات کو انوکھے انداز سے پیش کرتے ہیں وہ ایک کردار کی مانند ارد گرد زندگی کے ڈراموں اور تماشوں میں شامل ہوتے ہیں۔ صلاح الدین حیدر معاشرے کے غیر جمالیاتی رویے پر ہماری توجہ مبذول کرواتے ہیں کہ ہم زندگی کی تیز دوڑ میں مریضانہ مسابقت لیے ہوئے، آنکھیں موندھ کر گمراہ کن راستے پر چلے جا رہے ہیں۔ صلاح الدین حیدر اپنی تحریروں سے ہمیں اس بدحالی اور کسالت سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ معاشرے پر تنقید کی نظر ڈالتے ہیں وہ معاشرے کے مردہ رویوں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں وہ اپنے معاشرے کے ہولناک اور ڈرامائی موڑ کو پیش کرنے سے نہیں چونکتے ان کے انشائیے صلاح الدین حیدر کے گھمبیر تجربات کو منفرد انداز میں پیش کرتے ہیں۔ صلاح الدین حیدر کے پہلے مجموعے "حماقتیں

میری مقدر کی "سے ان کا دوسرا انشائی مجموعہ "ڈر اور ڈرامہ" کے انشائیوں کی اندرونی ساخت اور معنویت بہت منفرد اور مختلف ہے۔ "ڈر اور ڈراما" کے انشائیے استعاراتی انداز کے ساتھ موثر بھی ہیں ان کی پہلی کتاب میں تلخی پائی جاتی ہے جبکہ ان کی دوسری کتاب کے انشائیے تلخ تر ہیں تاہم کتاب کا عنوان "ڈر اور ڈراما" معاشرے اور اور سماج کی عکاسی کرتا ہے۔

صلاح الدین حیدر کے اسلوب میں تہہ داری پائی جاتی ہے جس سے معنی کی کئی پرتیں کھلتی ہیں۔ ان کا اسلوب استعاراتی ہونے کی وجہ سے اظہار و ابلاغ میں کافی دشواری ہوتی ہے۔ ان کے موضوعات کافی سنجیدہ ہیں۔ وہ روایتی موضوع کو منفرد انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ موضوع کو بیان کر کے موضوع کے متعلق مختلف حقائق اور نئے مفاہیم کو سامنے لاتے ہیں۔ وہ انشائیوں میں معاشرتی پہلوؤں کے ساتھ طنز و مزاح اور انکشاف ذات کو یکجا کر کے پیش کرتے ہیں۔ صلاح الدین حیدر کے انشائیوں میں معاشرتی پہلوؤں کے ساتھ طنز و مزاح اور انکشاف ذات کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے۔ ان کے ایک ایک لفظ میں ان کا تجربہ و مشاہدہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ عرش صدیقی صلاح الدین حیدر کے بارے میں اپنی رائے یوں دیتے ہیں۔

> "صلاح الدین حیدر بات سے بات نکالنے میں ماہر ہیں وہ ایک موضوع پر بات کرتا ہے تو پھر اور کئی موضوعات کا احاطہ کرتا چلا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ اس سیلانی پن سے اس کے ہاں معنی کی دلچسپ سطحیں ابھرتی ہیں اور پتا چلتا ہے کہ وہ معاشرت اور مہذب زندگی میں اقدار اور صورت ہائے احوال کے پیچ در پیچ رشتوں کا بھرپور شعور رکھتا ہے۔ اس شعور نے انہیں ہر لحاظ سے ایک حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا ہے اور سکھایا ہے کہ تلخ سے تلخ بات کو کس طرح خوشگوار اور قابل قبول انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے۔"[۶۱]

ان کی ابتدائی تحریریں کڑواہٹ اور تلخی سے بھری ہوئیں تھیں کہ ان کو دیکھ کر ہجر گوئی کا احساس ہوتا تھا مگر جب انہوں نے فن برائے فن پر عمل کیا اور ان کی تحریروں میں انکشاف ذات کا پہلو در آیا تو اس سے انشائیے کو چار چاند لگ گئے۔ وہ سنجیدہ صورتحال میں مضحک اور مضحک صورتحال میں سنجیدگی کا پہلو پیدا کرتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں ذاتی استدلال کے ذریعے صورتحال کو بدل دیتے ہیں۔ صلاح الدین حیدر کے ہاں فقرے سماجی و کائناتی وسعت کے حامل ہیں اور ایسے فقرے ضرب الامثال بن کر سامنے آتے ہیں۔ ریاض صدیقی کے مطابق صلاح الدین حیدر کی تحریروں میں رشید احمد صدیقی کی روایت کا عکس جھلکتا ہے۔ اس طرح وہ نئے زمانے اور تہذیب کی طرف قدم جماتے ہیں۔ ان کے انشائیے عصر حاضر کی خوبصورت نمائندگی کرتے ہیں ان کے انشائیے پڑھنے سے

روحانی خوشی محسوس ہوتی ہے اور یہ کتھارسس کا بھی سبب ہے اور اس سے قاری ذہنی تشفی بھی محسوس کرتا ہے۔ ریاض صدیقی کے مطابق صلاح الدین حیدر کی تحریروں میں رشید احمد صدیقی کی روایت کا عکس جھلکتا ہے۔ اس طرح وہ نئے زمانے اور تہذیب کی طرف قدم جماتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں سوچ کی ایک ایسی لہر بہتی نظر آتی ہے جو جس راستے سے گزرتی ہے اس راستے کو سرسبز و شاداب کرتی جاتی ہے۔ ان کے ایک ایک لفظ میں ان کا تجربہ و مشاہدہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ ایک نقطے پر مرکوز رہنے کی بجائے اپنی پرکار فکر مختلف پہلوؤں کو ملا کر ایک دائرہ کھینچتے ہیں۔

ان کے انشائیے پڑھنے سے قاری ہر بار موضوع کے کسی نئے گوشے اور پہلو سے واقف ہوتے ہیں۔ اس سے فکر کا کوئی نیا پہلو اُجاگر ہوتا ہے۔ اس طرح ان کے انشائیوں میں سوچ و فکر کی گہرائی بخوبی موجود ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں قاری کے لیے نئے راستے اور نئی راہیں وا کرتے ہیں۔ وہ چھوٹے اور مختصر موضوع کو نہایت قرینے سے پیش کرتے ہیں کہ بڑے سے بڑا اہل قلم ان کی اس خوبی کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کرنل محمد خان ان کے انشائیوں کے مجموعی اسلوب کو یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ خوبصورت، معنی خیز اور عام فہم بات کرتے ہیں۔ وہ اپنے چھوٹے سے چھوٹے موضوع کو بیان کے ہنر سے ہیر ابنانے میں ماہر ہیں۔

ز۔ شہزاد قیصر کے انشائیوں کا فکری جائزہ:

شہزاد قیصر نے گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجوایشن کیا اور پھر یونیورسٹی آف پنجاب سے فلسفہ میں ایم اے کیا آپ کا شمار دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے آپ دبستان سرگودھا کے مقتضیات پر پورا نہیں اُترتے آپ مشکور حسین اور نظیر صدیقی کے انشائیہ کی صفات کے حامل ہیں۔ شہزاد قیصر نئے لکھنے والوں میں سے ہیں ان کا پہلا انشائی مجموعہ "کلیرنس سیل" ہے جس میں پندرہ انشائیے شامل ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں۔ ہم سفر، گھر کی تلاش، شوہر۔ بیگم اور سسرال، چڑیا گھر کے باسی، کلیرنس سیل، ماہر نفسیات، زبان، کہتے ہیں جس کو عشق، ہیلو ہیلو، توہمات، مہمان۔ میزبان اور ملازم، وقت ناوقت، بکر منڈی، مریض۔ معالج اور تیماردار، قرض کی پیتے تھے مے۔

شہزاد قیصر کا دوسرا انشائی مجموعہ صاف "چھپتے بھی نہیں" ہے جس میں چودہ انشائیے شامل ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں۔ بسنت، انشورنس ایجنٹ، رشتے کی تلاش، آئینہ، نقاد، موسم، بہانہ سازی کی صنعت، آنکھ مچولی، مہمان خصوصی، وضاحت، پنشن خوار، خط، نام، بچوں کی نگہداشت۔ ان کا تیسرا انشائی مجموعہ "آئینہ بنے ہے

پیرہن " ہے جس میں پندرہ انشائیے شامل ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں۔ہاتھ،حافظ،رقیب،لنڈا بازار،بوریت،مصوری،دانشور،لارے،انانیت،دوپٹہ،ایک اور ایک،شک،دھیان،دھاندلی،قوت فیصلہ۔

"لطف آگہی" شہزاد قیصر کے انشائی مجموعوں کی کلیات ہے جو ۱۹۹۹ء میں عبارات لاہور سے شائع ہوا جس میں مزید ۴ تازہ انشائیے شامل کیے گئے ہیں۔جن میں نہاری، لطف آگہی، سفر نامہ اور ماتحتی شامل ہیں۔شہزاد قیصر اپنے انشائیوں میں معاشرے کے جرائم اور برائیوں کو بے باکی سے بیان کرتے ہیں اور معاشرے کے دوغلے پن پر قلم اٹھاتے ہیں۔وہ معاشرے کی منافقت کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔وہ معاشرے کے دوہرے پن کو احاطہ تحریر میں لاتے ہیں اور لوگوں کو ان کا اصل روپ دکھانے سے نہیں چونکتے۔وہ اس کے لیے طنز و مزاح سے بھی کام لیتے ہیں اور بعض جگہ پر تو آپ کا رویہ خطیبانہ بھی لگتا ہے۔عطاء الحق اپنی رائے دیتے ہیں۔

"ان کی طبعیت میں مزاح کا فطری جوہر موجود ہے اس مزاح میں نہ پھکڑ پن موجود ہے اور نہ آج کل لکھے جانے والے انشائیے کی یبوست اس میں نظر آتی ہے۔بلکہ ارد گرد کی نا ہمواریاں اس مزاح کا منبع ہیں جو ہنساتی بھی بہت ہیں اور سلجھاتی بھی بہت ہیں۔"[۶۲]

تاہم ان کے انشائیوں میں حقیقی معنوں میں انشائی رویہ پایا جاتا ہے۔ان کے انشائیوں کی خوبی بے ساختہ پن اور پُر کاری ہے ان کے انشائیوں میں ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی عکاسی جھلکتی ہے،ان کے ہاں خیالات کی ندرت اور جدت پائی جاتی ہے۔ڈاکٹر شہزاد قیصر انشائیہ "بچوں کی نگہداشت" میں بچوں کی پرورش اور بچوں کی نفسیات بیان کرتے ہیں۔انسان اور حیوان میں بچوں کی نگہداشت کرنے میں بہت فرق ہے۔حیوان ایک خاص حد تک بچوں کی پرورش کرتے ہیں وہ صرف اپنے بچوں کی خوابیدہ صلاحیتیں اجاگر کرتے ہیں۔اور اپنی طرف سے ان پر کچھ مسلط نہیں کرتے اور اسی وجہ ان میں خود اعتمادی ہوتی ہے جبکہ انسان اس کے بر عکس ہے اس وجہ سے وہ بچوں کی تربیت پر طنز کرتے ہیں۔اور والدین پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ والدین جن محرومیوں کا شکار خود رہے ہوں ان کا شکار وہ اپنے بچوں اور اولاد کی وساطت سے کرتے ہیں اور بچوں پر اتنا دباؤ ڈالتے ہیں کہ اچھا بھلا بچہ دباؤ کا شکار ہو کر کمزور بچو نگڑا بن جاتا ہے۔تاہم شہزاد قیصر یہاں اپنی سوچ اور فکر کی عکاسی بہت عمدگی سے کرتے ہیں اور گہرا مشاہدہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد قیصر ایک معمولی اور اچھوتے موضوع "نام" کی قدر و اہمیت اور نام کی ضرورت کو صفحہ قرطاس پر طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں بکھیرتے ہیں۔انسان کسی بھی شے،چیز یا انسان کی پہچان نام سے کرتے ہیں اور ڈاکٹر شہزاد قیصر اپنے موضوع نام میں نام کی اہمیت کو بتاتے ہوئے کہتے ہیں کسی بھی شے یا انسان کا نام نہ ہو تو اسے پکارنے

میں کافی دشواری پیش آتی ہے۔ وہ مزید معاشرے کی سوچ کی عکاسی کرتے ہیں اور نام نہ رکھنے کے مثبت پہلوؤں کو بھی سامنے لاتے ہیں اس طرح پولیس ڈیپارٹمنٹ بھی گھناؤنے جرائم کی مرتکب نہ ہو گی کہ نام نہ ہونے کی وجہ سے پولیس کسی غلط بندے کے نام ایف آئی آر درج نہ کر سکے گی اور ووٹروں میں بھی ان ناموں کو درج نہیں کیا جائے گا جو پہلے ہی اس حیات فانی سے کوچ کر چکیں ہوں گے۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر ہماری زندگی میں "خط" کی ضرورت و اہمت بہت عمدہ طریقے سے بیان کرتے ہیں اور خط کے ساتھ خط کی مختلف ادبی صورتوں کو بھی موضوع بناتے ہیں۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر پنشن کے حصول میں حائل رکاوٹوں پر قلم اٹھاتے ہیں اور سرکاری نوکری سے ریٹائرڈ لوگوں کو پنشن خور بننے کے لیے جس مچانوں سے گزرنا پڑتا ہے اسے اپنے گہرے مشاہدے سے انشائیہ "پنشن خوار" میں بیان کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد قیصر "مہمان خصوصی" کو اپنے انشائیے کا موضوع بناتے ہیں وہ عربوں کی قدیم مہمان نوازی کی روایت کو وقت کے ساتھ ختم ہونے اور اس کی جگہ مہمان خصوصی کی جگہ لینے کی بدعت کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں اگرچہ پہلے پہل مہمان خصوصی جیسا طبقاتی تصور موجود نہیں تھا لیکن وقت کے ساتھ لوگوں میں پیار کی جگہ دولت نے لے لی اور حاضرین میں مہمان خصوصی منتخب کیا جانے لگا بایں ہمہ ڈاکٹر شہزاد قیصر لوگوں کی خود غرضی، مطلبی اور مفاد پرستی کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ مہماں خصوصی صرف اعلیٰ اور عہدے دار لوگوں کو مقرر کیا جاتا ہے مگر جب انہیں تقریر کرنے کا موقع ملتا ہے تو پرانے مضامین کو ہر موقع پر دہراتے نظر آتے ہیں۔

انشائیہ "آنکھ مچولی" میں ڈاکٹر شہزاد قیصر ہمارے معاشرے میں پایا جانے والا کھیل آنکھ مچولی پر طنز کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر نے یہاں آنکھ مچولی کو علامت کے طور پر برتا ہے گویا آنکھ مچولی کا کھیل بچوں کا کھیل ہے مگر یہ کھیل ہمارے معاشرے میں اکثر غاصبین ہی کھیلتے نظر آتے ہیں۔ اور وہ عوام الناس میں سے کسی شخص کی آنکھوں پر پردہ ڈال کر اپنی جماعت کے اندر گم ہو جاتا ہے اور وہ شخص اندرونی کرب میں مبتلا ہو کر اسے تلاش کرنے لگتا ہے تاہم ڈاکٹر شہزاد قیصر معاشرے میں پائے جانے والے گندے کھیل کو سامنے لاتے ہیں اور لوگ اس کھیل کو کھیلنے کے لیے عیاری، چالاکی، جھوٹ، حیلہ سازی اور مکر و فریب سے بھی کام لیتے ہیں ہمارے معاشرے میں اکثر لوگ اس کھیل میں مہارت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر انشائیہ "موسم" میں انسان کے رویے، داخلی کیفیات کو موسم کی مناسبت سے پیش کرتے ہیں اور انسان کی نفسیاتی کیفیات کو موسم کے لحاظ سے خوبصورت انشائیے میں سمو دیتے ہیں۔

> "موسم انسانی مزاج کا پرتو ہوتا ہے۔ ایک خطے میں رہنے والے لوگ جس مزاج کے حامل ہوتے ہیں، اس خطے پر موسم بھی ان جیسا ہوتا ہے اور پھر موسم کے مختلف مظاہر انسانی مزاج پر اثر انداز ہوتے ہیں۔"[۲۳]

ڈاکٹر شہزاد قیصر ادب میں نقاد کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں نقاد ادبی تحریروں کی جانچ پرکھ کرتا ہے اور کھوٹا اور کھرا الگ کر دیتا ہے اور اگر کوئی ادیب اپنی تحریر میں پرکھ کی خواہش نہ بھی رکھتا ہو تو نقاد اسے ضرور پرکھتا ہے ڈاکٹر شہزاد قیصر نقاد کو ایک مشورہ دیتے ہیں کہ ادبی دنیا میں جمہوری عمل کو اپنانا چاہئیے اور ادبی آئین مرتب ہونا چاہئیے تاکہ ناقدین الیکشن میں اپنا حصہ ڈالیں اور ادباء کو ووٹ ڈالیں جائیں۔ انشائیہ "آئینہ" میں مصنف آئینے کی ضرورت و اہمیت کو بیان کرتے ہیں اور اسکی خوبیوں اور خامیوں کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں۔ آئینے کی سرشت میں بے فیضی پائی جاتی ہے اور اسے کسی چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں گویا آئینے کو علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے یہاں آئینے سے مراد حقیقت کا سامنا کرنا ہے یعنی جو جیسا ہو اس کو اسی حقیقی صورت میں دکھانا۔ تاہم آئینے کو کسی چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں ہوتی۔

انشائیہ "رشتے کی تلاش" میں رشتے کی تلاش میں آنے والے مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں۔ انشائیہ بہانہ سازی کی صنعت میں ڈاکٹر شہزاد قیصر ہمارے ارد گرد معاشرے میں پھیلی بہانہ جوئی کی خوبی پر قلم اٹھاتے ہیں بہانہ جوئی ایسی واحد صفت ہے جس سے مزدور اور سرمایہ دار دونوں الفت کرتے ہیں بہانہ سازی ہماری ذات میں اس قدر راسخ ہو چکی ہے کہ اس کی غیر موجودگی میں ہم خود کو اکیلا محسوس کرتے ہیں گویا انسان مختلف موقعوں پر مختلف بہانے بناتا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر شہزاد قیصر کا انداز اس طرز کا ہے جیسے وہ قاری کو مشورہ دے رہے ہوں وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو خلوص جذبات اور جراءت سے بیان کرتے ہیں۔

> "شہزاد قیصر کے انشائیے آگہی اور لطافت دونوں کا خوبصورت مرکب ہیں۔ اس حوالے سے وہ اپنے پچھلوں اور اپنے ہم عصروں سے منفرد اور مختلف ہیں۔ وہ انشائیہ لکھتے ہی نہیں انشائیہ بولتے بھی ہیں، شور مچائے بغیر، دھیرے دھیرے، دھیرج دھیرج، درجہ بدرجہ بڑھتے ہوئے، اپنے اصغری اکبری پر دھیان دیے ہوئے وہ سہج اور سہل طور پر اپنے سننے اور پڑھنے والوں کو اپنا ہم نوا اور اسیر بناتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ ان پر اثر انداز ہوتے ہوئے پیش قدمی کرتے ہیں۔" [۶۴]

ان کے اسلوب کی انفرادیت کی وجہ سے ان کے انشائیوں میں بے ساختہ پن اور پرکاری کی خوبی در آئی جس سے ان کے انشائیوں کے حسن میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ شہزاد قیصر اپنے انشائیوں کو معاشرے سے فاسد مادے، دوغلے پن، معاشرے کی ناہمواریت، معاشرے کی برائیوں اور منافقت کا سدباب کرنے کا ذریعہ بھی بناتے ہیں۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگار ان کے صرف چند ایک انشائیوں کو انشائیہ تسلیم کرتے ہیں جن میں گھر کی تلاش، ہم سفر، بکرا منڈی اور چڑیا گھر کے باسی شامل ہیں۔ انشائیوں میں ان کا لہجہ خطیبانہ، طنزیہ اور مزاح سے بھرپور ہے۔ بعض جگہوں پر ان کا مزاح حد سے بڑھ جاتا ہے حتیٰ کہ لطیفہ گوئی کی حد تک پہنچ جاتا ہے وہاں ان کا

انشائیہ ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیہ کے مقتضیات پر پورا نہیں اُترتا اور یہ ہی ڈاکٹر شہزاد قیصر کا انفرادی رنگ ہے۔ ان کے مزاح کی وجہ سے ان کا انشائیہ عطاء الحق قاسمی اور یونس بٹ کے انشائیوں کے قریب ہے۔

شہزاد قیصر نے انشائیہ کے بارے ۱۹۸۸ء لودھراں میں دونوں گروہوں کو اکھٹا کر کے ایک کانفرنس کرائی تھی اور اس ضمن میں شہزاد قیصر اپنا نتیجہ کچھ یوں اخذ کرتے ہیں۔

> ”میں تو اس گھڑی کا منتظر ہوں جب جدلیاتی تضاد ایک مرکب کو پیدا کرنے میں کامیاب ہو گا اس مرکب کی صورت کیا ہو گی یہ تو وقت ہی بتا سکتا ہے میں اپنی کم علمی کی وجہ سے اس کے خدوخال پیش کرنے سے قاصر ہوں البتہ ایک گُر بتائے دیتا ہوں کہ اگر انشائیہ کی ہنڈیا میں نمک مرچ اعتدال سے ڈالا جائے تو کھانا لذیذ تر ہو سکتا ہے۔ مگر مجبوری یہ ہے کہ میرا ایک دوست طبعاً ”پرہیزی“ کھانا کھاتا ہے اور دوسرا لاہور کے ناطے چٹ پٹی غذا پسند کرتا ہے۔“[۶۵]

ڈاکٹر شہزاد قیصر پہلے دو انشائی مجموعوں میں کھلنڈرا بچہ کے صورت میں شرارتیں کرتے نظر آتے ہیں مگر ان کے تیسرے مجموعے میں ان پر بلوغت حاوی ہو گئی۔ ”آئینہ بنے ہے پیرہن“ ان کا ارتقاء یافتہ انشائیوں کی شکل ہے۔ ان کا تیسرا مجموعہ ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا اور اس کے ۸ سال بعد انہوں نے تازہ انشائیے لکھے۔ وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے معنی کشید کر کے قاری کو اس سے آگاہ کرتے ہیں۔ ان کے انشائیے گہری فکر کو سمیٹے ہوئے ہے اور یہ فکر ان کے انشائیوں کے ایک ایک لفظ سے جھانکتی ہے۔

ژ۔ ارشد میر کے انشائیوں کا فکری جائزہ:

ارشد میر نے بہت کم لکھا مگر جتنا تخلیقی کام کیا وہ سب اعلیٰ پایے کا تھا ان کا پہلا انشائیہ کڑھنا کے نام سے ۱۹۸۳ء میں رسالہ اوراق میں چھپا ان کے انشائیوں کا مجموعہ ”مُوڈ“ کے نام سے ادارہ فروغ اُردو سے ستمبر ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کا پیش لفظ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا اور اس کا انتساب انہوں نے اپنی بیٹی ثویلہ ندیم کے نام کیا ہے اس مجموعے میں کل بارہ انشائیے شامل ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں۔ دھوتی، دوپٹہ، مُوڈ، تین تالہ، استعفٰے، گنا، ٹوپی، تولیہ، دروازہ، نعرہ، کُڑھنا، آنسو۔ ارشد میر آغاز میں طنز و مزاح سے انشائیے کی طرف راغب ہوئے مگر وقت کے ساتھ شگفتگی اور تازگی ان کے انشائیوں میں نظر آنے لگی مگر طنز و مزاح کو وہ ترک نہ کر سکے اور طنز و مزاح ان کے انشائیوں کا حصہ بن گیا ان کے انشائیوں پر معاشرے کے غلیظ اور فاسد مادوں پر گہرا طنز دیکھنے کو ملتا ہے وہ معاشرے کی ناہمواریوں پر قہقے لگاتے ہیں وہ معاشرے کے پوشیدہ اور مخفی گوشوں کو اجاگر کرنے

میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ارشد میر معاشرے سے معمولی اور گرے پڑے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جیسے ٹوپی، تولیہ، گنا، نعرہ، دروازہ اور دھوتی وغیرہ اور ان معمولی موضوعات میں سے مصنف نئے پہلو اخذ کرتے ہیں۔ انشائیہ "دھوتی" کے بارے میں سعید شباب یوں بیان کرتے ہیں۔

> "ارشد میر کا انشائیہ دھوتی کلچر اور اگریکلچر کے مابین گہرے تعلق کو شگفتہ انداز میں بیان کرتا ہے۔ دھوتی کے حوالے سے انسان کی ابتداء تک جانے کے باوجود اور بعض اوقات فلسفیانہ اشاروں کے باوجود ارشد میر کا انشائیہ شگفتگی اور تروتازگی کا احساس دلاتا ہے۔"[66]

وہ انشائیہ "آنسو" اور "کُڑھنا" میں آنسو کی اور کُڑھنا کی اہمیت واضح کرتے ہیں۔ انشائیہ آنسو میں آنسو کے بارے میں اپنے تجربات ومشاہدات کو یوں بیان کرتے ہیں۔

> "دیکھا جائے تو آنسو انسانی جسم میں پیام رسانی کا فریضہ بھی بہ طریق احسن سرانجام دیتے ہیں۔ یہ محبت و نفرت کے بہت بڑے سفارت کار اور تبصرہ نگار ہیں۔ انہیں حقیر جاننے والے اور درخور اعتنانہ سمجھنے والے اکثر رسوا ہو کر پچھتاتے ہیں اور وہ جو ان کے قلب و جان سے گرویدہ ہیں ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔"[67]

وہ اپنے موضوع میں خیالات کے ساتھ داخلی احساسات، اندرونی جذبات اور خارجی ادراک کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے تجربات کامل ہیں۔ وہ مشاہدہ کرنے والی زیرک آنکھ رکھتے ہیں اور ان کا مطالعہ وسیع ہے تاہم ان کے انشائیوں میں زندگی کی گہما گہمی دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ معمولی چیز پر قلم اُٹھا کر اسے غیر معمولی بنا دیتے ہیں اور اس طرح ان کے انشائیوں میں جدت نظر آنے لگتی ہے۔ ان کے انشائیے اپنے اردگرد کے ماحول اور معاشرے سے اخذ کیے ہوئے ہیں انشائیہ دھوتی میں سماجی پہلو کی بخوبی عکاسی کی گئی ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں انسانی احساسات و جذبات اور کیفیات کو بھی بیان کرتے ہیں۔ جذبات و کیفیات ان کے انشائیے "استعفیٰ" میں بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔ وہ کیفیات کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں۔ وہ انشائیہ "مُوڈ" میں ان کیفیات کو شعوری سطح پر پرکھتے ہیں۔ وہ موڈ کو کوئی جامد چیز نہیں سمجھتے بلکہ اس کی وسعت پوری کائنات تک پھیلی ہوئی ہے۔ وہ غالب کے خطوط میر کے غم و حزن اور اقبال کی شاعری کو مُوڈ کا نتیجہ ہی اخذ کرتے ہیں۔ ارشد میر اپنی تہذیب و ثقافت سے خوب لگاؤ رکھتے تھے وہ صاحب اسلوب ہونے کے ساتھ صاحب مطالعہ بھی تھے۔ ارشد میر انشائیہ "دوپٹہ" میں دوپٹہ کی تہذیبی اہمیت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

> "چادر، دوپٹہ اور سکارف، تہذیب انسانی کے مختلف ادوار ہیں۔ چادر کا کام چھپانا ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ چادر بد صورتی کے ساتھ خوبصورتی کو بھی چھپا دیتی ہے۔۔۔۔ دوسری طرف سکارف کا کام طشت از بام کرنا ہے۔ آزادی اظہار کو فروغ دینا ہے مگر اس عمل میں وہ

اکثر و بیشتر خوبصورتی کے ساتھ ساتھ بدصورتی کے پنڈورا بکس کا ڈھکنا بھی ہٹا دیتا ہے۔۔۔۔۔۔دوپٹہ ان دونوں کے بین بین ہے وہ چادر سے چھپنے کا ڈھنگ سیکھتا ہے اور سکارف سے کھلنے "کا۔ مگر ان دونوں میں ہمیشہ ایک توازن قائم رکھتا ہے۔"[۶۸]

ارشد میر کے انشائیوں کے انشائیوں میں تخیلات، عمیق مشاہدات اور گہرے تجربات کی وجہ سے جان پیدا ہو گئی اس طرح ان کے انشائیے قاری پر سحر پیدا کر دیتے ہیں۔ تاہم بطور انشائیہ نگار ان کو اتنی شہرت نہ ملی جس کے وہ حقدار تھے۔ وہ زندگی کے عام موضوع کا انتخاب کر کے اس میں رنگ بھر دیتے ہیں اور اس میں انکشاف ذات کی خوشبو بھر دیتے ہیں کہ چمن اس کی خوشبو سے کھل اُٹھتا ہے۔ تاہم ارشد میر کا اسلوب موضوع کے مطابق ہوتا ہے مگر جب اس میں فکر و فلسفہ کے عناصر داخل ہوتے ہیں تو جذبات اور عقل ایک خوبصورت امتزاج بن کر ہمارے سامنے آتا ہے اس وجہ سے ان کے انشائیے قاری پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ ان کا انشائیہ ایک روایتی انشائیہ ہے جس میں خاکہ نگاری، طنز و مزاح، مضمون نویسی مل جل کر انشائی نثر پارے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ان کا چیزوں کو دیکھنے کا زاویہ بہت مختلف اور باریک بین ہے۔ وہ اپنی اعلیٰ و بلند خیالی سے عمودی خط کو ترجیح دیتے ہیں اس وجہ سے ان کا انشائیہ ایک نکتے سے دوسرے نکتے تک سفر کی طرف مائل نظر آتا ہے وہ قاری کو مختلف رکاوٹوں سے بچا کر فرحت انگیز احساس فراہم کرتے ہیں۔ تاہم بطور انشائیہ نگار ان کو اتنی شہرت نہ ملی جس کے وہ حقدار تھے تاہم مختصر لکھنے کے باوجود ان کا شمار بڑے انشائیہ نگاروں کی فہرست میں ہوتا ہے۔

س۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کا فکری تقابل:

انشائیہ زیر تحقیق مقالہ میں دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے منتخب انشائیہ نگاروں کا فکری تقابل کیا گیا ہے۔ دبستان سرگودھا کے چند منتخب انشائیہ نگاروں میں ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، مشتاق قمر، جمیل آزر اور اکبر حمیدی شامل ہیں جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں مشکور حسین یاد، نظیر صدیقی، صلاح الدین حیدر، شہزاد قیصر اور ارشد میر شامل ہیں۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں نے انشائیہ نگاری میں داخلی کیفیات کو شامل کیا ہے اور وہ اپنی ذات کے کشفی پہلوؤں کو انشائیہ میں بڑی چابکدستی سے سمو دیتے ہیں اور انکشاف ذات دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کی بنیادی خوبی ہے۔۔ اس کے برعکس دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں نے اپنی خارجی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کو بھی اپنے انشائیوں میں سمو دیا ہے۔

دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے ہاں فطرت کے عناصر پائے جاتے ہیں سرگودھا کے مصنفین فطرت سے گہرا ربط رکھتے ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا فطرت کے ساتھ دھیرے دھیرے چہل قدمی کرتے ہیں۔وہ فطرت کا گھونگٹ یکدم نہیں اٹھاتے بلکہ آہستہ آہستہ دلدوز انداز میں چاک کرتے ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا فطرت کے ساتھ گویا من اور تو کا سا تعلق رکھتے ہیں۔وہ اپنی آنکھوں سے فطرت کو دیکھتے ہیں تاہم وہ فطرت سے روحانی سا تعلق رکھتے ہیں۔وہ ان مناظر سے تعلق جوڑ کر پیغامات بھی حاصل کرتے ہیں اور اپنے باطن میں اُتارتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس سے معنی کا نیا جہان سامنے آتا ہے۔غلام جیلانی کے ہاں فطرت مختلف اور منفرد رنگ میں موجود ہے۔مشتاق قمر بھی فطرت سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں اور فطرت کی عکاسی ان کے انشائیوں میں پایا جانے والا غالب موضوع ہے وہ فطرت سے گہرا شغف رکھتے ہیں ۔جمیل آزر بھی فطرت کے دلدادہ ہیں تاہم فطرت سے محبت اور لگاؤ ان کے انشائیوں میں موجود ہے۔اکبر حمیدی سمندر کر کے جزیروں سے بات کرتے ہوئے مظاہر قدرت کو بھی موضوع بناتے ہیں اور فطرت کی خوبصورتی کو موضوع بحث بناتے ہیں۔

تاہم دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے انشائیوں میں فطرت کے موضوع کو زیر بحث نہیں بنایا بلکہ زندگی کے تلخ حقائق کے طنزیہ ومزاحیہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔دبستان سرگودھا کے انشائیے مثبت انداز میں لکھے گئے ہیں اور زندگی کے روشن پہلوؤں کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔وہ زندگی کے غمگین، دکھ اور سنجیدہ پہلوؤں میں امید کی کرن سے ہمیں روشناس کرواتے ہیں اور ان کا لہجہ رجائیت سے بھرپور ہے۔جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں سے نظیر صدیقی اور مشکور حسین کے انشائیوں میں قنوطیت اور ناامیدی پائی جاتی ہے۔ تاہم نظیر صدیقی خود اس بات کو تسلیم کرترے ہیں کہ ان کے انشائیوں کا اصل محرک غم وغصہ ہے اور زمانے کی ناقدری کا احساس ان کی تحریروں میں در آیا ہے اسطرح اداسیاں، زمانے کی سرد مہریاں اور محرومیاں مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں ان کے انشائیوں میں موجود ہیں اور اس کی وجہ معاشرے اور دنیا کا ان سے برتاؤ ہے۔تاہم مشکور حسین یاد معاشرے کے المناک حادثات اور برائیوں سے آگاہ ہیں اس لیے وہ سماج سے خوفزدہ دکھائی دیتے ہیں اور بعض جگہوں پر ان کا لہجہ ناامیدی، کلبیت اور قنوطیت سے بھرپور نظر آتا ہے۔صلاح الدین کی ابتدائی تحریریں تلخی اور کڑواہٹ سے بھرپور ہیں اور ان کو دیکھ کر ہجر گوئی کا احساس ہوتا ہے مگر ان کی بعد کے انشائیے پڑھنے سے روحانی خوشی محسوس ہوتی ہے اور قاری اس سے ذہنی تشفی بھی محسوس کرتا ہے جبکہ شہزاد قیصر کا رویہ رجائیت سے بھرپور ہے حتٰی کے بعض جگہوں پر ہمیں مزاح حد سے بڑھا ہوا بھی دکھائی دیتا ہے تاہم ارشد میر کے انشائیوں کا انداز بھی مثبت اور رجائی ہے۔

دبستان سرگودھا کے انشائیے کے موضوعات میں بہت تنوع اور رنگارنگی پائی جاتی ہے۔اس طرح ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں میں بھی تنوع کی خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔وہ عام زندگی سے اپنے انشائیوں کے موضوعات کو منتخب کرتے ہیں۔وزیر آغا قدیم داستانوی ادب اور قدیم اردو ادب سے بھی متاثر ہو کر اپنے انشائیوں کے عنوانات منتخب کرتے ہیں وہ اپنے بعض انشائیوں میں صوفی اور ویدنتی روپ میں بھی نظر آتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں تہذیبی اور تاریخی شعور کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔اس طرح انہوں نے ہر قسم کے موضوعات پر قلم اٹھایا ان کے کچھ انشائیوں میں کیفیات پائی جاتی ہیں۔کچھ خاص اور عام چیزوں کے عنوانات سے اخذ کیے گئے ہیں۔کچھ فعل مصدر کی صورت میں ہیں۔کچھ انشائیے افسانوی طرز کے ہیں اور کچھ عنوانات مظاہر فطرت کی عکاسی کرتے ہیں۔

غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کے موضوعات غیر معمولی ہیں انہوں نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا جن پر پہلے قلم نہیں اٹھایا گیا ان کے انشائیوں کے موضوعات غیر روایتی ہیں اور ان کی اپنی ایک انفرادیت ہے اور وہ ہمیشہ منفرد اور نیا موضوع تلاش کر کے اس پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔مشتاق قمر عام زندگی اور معاشرے سے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں وہ معمولی موضوعات کے اندر داخل ہو کر نئے معنی دریافت کرتے ہیں انہوں نے عام موضوعات پر قلم اٹھایا مگر وہ عام ہونے کے باوجود خاص ہوگئے۔مشتاق قمر تہذیب کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ انسان اور مظاہر فطرت کو بھی موضوع بناتے ہیں۔جمیل آزر نے زندگی کے عام موضوعات پر قلم اٹھایا ان کے ہاں موضوعات کی رنگارنگی ہے انہوں نے معاشرے کے چھوٹے چھوٹے موضوعات پر لکھا تاہم ان کے کچھ موضوعات میں ہمیں منفرد اور انوکھی باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ان کے انشائیوں کے عنوانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی نفسیات و رویے،مشاہدات و تجربات،ان کی زیر استعمال مختلف چیزیں،ان کی ذاتی پسند و ناپسند کس طرح انہیں سوچنے اور فکر کرنے پر مائل کرتی ہیں۔تاہم ان کے انشائیوں میں جدید و قدیم کا تقابل بھی پایا جاتا ہے۔اکبر حمیدی چھوٹی سے چھوٹی اور اعلیٰ سے اعلیٰ چیز کو بھی موضوع بناتے ہیں ایسی چیز جس پر انسان اتنا غور نہیں کرتا ان کے نادیدہ پہلوؤں سے ہمیں روشناس کرواتے ہیں۔

جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے موضوعات کی بات کی جائے تو مشکور حسین یاد انشائیے کے موضوع کو ذات کا حصہ نہیں بناتے اور نہ ہی منفرد اور انوکھے موضوعات کو احاطہ تحریر میں لاتے ہیں بلکہ ان کے انشائیے ان کے تجربات و مشاہدات سے آراستہ ہیں ان کے زیادہ تر موضوعات معاشرے سے اخذ کیے ہوئے ہیں انہوں نے معمولی چیزوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ان کے انشائیوں کے موضوعات اخلاقی اقدار،جنسیات،احساس

اور ذاتی زندگی کے تجربات ہیں۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں کے موضوعات معاشرے سے اخذ کیے ہوئے اور ان کے ذاتی تجربات سے لبریز ہیں۔ ان کے انشائیوں میں زندگی کے تلخ کڑوے حقائق کو اپنا موضوع بنایا گیا ہے۔ صلاح الدین حیدر کے موضوعات انتہائی سنجیدہ ہیں۔ وہ روایتی موضوع کو انتہائی منفرد انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کے موضوعات معاشرتی، تاریخی اور اساطیری حوالوں سے ہیں۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر نے معاشرتی اور زندگی سے متعلقہ موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ تاہم ان کے انشائیوں میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کے موضوعات منفرد قسم کے ہیں۔ ارشد میر معاشرے کی معمولی اور چھوٹی چھوٹی چیزوں پر قلم اٹھاتے ہیں۔ تاہم وہ معمولی چیز پر قلم اٹھا کر اسے غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔ ان کے انشائیے ارد گرد ماحول اور معاشرے سے اخذ کیے ہوئے ہیں۔ وہ زندگی کے عام موضوع کا انتخاب کر کے اس میں رنگ بھر دیتے ہیں اور اس میں انکشاف ذات کی خوشبو بھر دیتے ہیں کہ چمن اس کی خوشبو سے کھل اٹھتا ہے۔

اگر دبستان سرگودھا کے انشائیوں کے مضامین پر بات کی جائے تو ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیے فطرت کے حسن کو بے باک انداز سے پیش کرتے ہیں۔ وہ فطرت کی عکاسی کرتے ہوئے دیہات کو بھی موضوع بناتے ہیں۔ وہ زندگی کی تلخ اور کڑوی حقیقتوں کے مرقعے خوش باش طریقے سے کھینچتے ہیں۔ وہ اپنی سوچ، فکر اور نظریات کا انخلاء کرتے ہیں۔ وزیر آغا کے انشائیوں میں تقابل کی خوبی کثرت سے ملتی ہے اور اسکی مثال انشائیہ "حقہ پینا" ہے۔ وہ قدیم ثقافتی و تہذیبی رنگ کو جدید پر ترجیح دیتے ہیں۔ تاہم مصنف ذاتی و شخصی تجربے کے ساتھ اجتماعی مشاہدات و تجربات کو بھی اپنے انشائیوں میں شامل کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں پاکستانیت عمدہ انداز سے بیان کی گئی ہے۔ ان کے انشائیوں میں مقصدیت اور فلسفہ موجود نہیں ہے۔ وزیر آغا کے انشائیوں میں قدیم داستانوں کے اثرات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے کچھ انشائیوں کے مضامین صوفی اور ویدانت پر بھی ہیں۔ آپ نے معاشرتی اور تہذیبی مسائل پر بھی قلم اٹھایا۔ انہوں نے زندگی کے ہر پہلو سے اپنے مضامین کا انتخاب کیا ہے۔ وہ قدیم داستانوی ادب سے بھی اپنے انشائیوں کو آراستہ کرتے ہیں۔ ان کے انشائیے گہری فکر اور سوچوں سے لبریز ہیں۔ ان کے ہاں فلسفیانہ موضوعات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

غلام جیلانی اصغر کے انشائیے پڑھنے سے فکر کا کوئی نیا پہلو اجاگر ہوتا ہے اس طرح ان کے انشائیوں میں سوچ و فکر کی گہرائی موجود ہے۔ انشائیہ "تسخیر کائنات" میں مصنف خود کو کائنات سے تعبیر کر کے انکشاف ذات کے ایک انوکھے پہلو کو پیش کیا ہے۔ ان کے انشائیوں میں فکر کی رو کناروں کے اندر سفر کرنے کی بجائے کھلے میدان میں سفر کرتی ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔ ان کے انشائیوں میں سوچنے کا انداز ایک ہلکی سی لکیر کی مانند ہے ان کے

ہاں زندگی کا گہرا فلسفہ موجود نہیں ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں دلائل دینے کی بجائے سادہ انداز سے اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے اُتار چڑھاؤ اور تضادات و مشترکات سے مواد اخذ کرتے ہیں۔ مشتاق قمر نے تہذیب کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ انسان اور مظاہر فطرت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ مصنف کے انشائیوں میں فطرت کی عکاسی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مشتاق قمر کے انشائیوں میں گہری سوچ اور فکر کی گہرائی پائی جاتی ہے ان میں سستا پن نہیں جھلکتا وہ اپنے انشائیوں میں دوستانہ انداز سے زندگی کے تجربات بیان کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کے مضامین عام معاشرے سے اخذ کیے ہوئے ہیں۔

جمیل آزر نے معاشرے کے چھوٹے چھوٹے مسائل پر لکھا۔ وہ زندگی اور کائنات کے بارے میں گہری فلسفیانہ باتوں سے آگاہی فراہم کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں زندگی کے آئینوں کے نئے زاویہ ہائے فکر سے ہم روشناس ہوتے ہیں۔ وہ گہری سوچ اور فلسفیانہ سوچ کو نہایت سادہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔ جمیل آزر کے انشائیوں میں تہذیبی و ثقافتی، سیاسی، مذہبی و روحانی اور معاشرتی عناصر ملے جُلے انداز میں نظر آتے ہیں۔ ان کے جدید و قدیم کا تقابل بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ آپ مذہب سے بھی گہرا لگاؤ رکھتے ہیں ایسے انشائیوں میں "لکشمن ریکھا"، "نیکی، دریا اور سمندر" شامل ہیں۔

اکبر حمیدی اپنے انشائیوں میں مختلف جزیروں کی سیر کروا کر انسان کے مختلف رویوں سے ہمیں آشنا کرواتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ایک قسم کی مشترک پائی جانے والی چیز انسان ہے۔ اور وہ ہر طرح سے ان کے انشائیوں میں موجود ہے کہیں انہیں جزیرے کہا گیا ہے کہیں منفی، مثبت صورت میں، کہیں تسخیر کائنات کرتا ہے اور کہیں فاختہ کی صورت میں اور کہیں عقاب پر جھپٹتا ہے اور کہیں درویش کی صورت میں نظر آتا ہے اور کبھی بڑے آدمی کی صورت میں اور کبھی چھوٹے آدمی کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ لہٰذا اکبر حمیدی مختلف موضوعات کا موضوع انسان کو ہی بناتے ہیں کہ اس کائنات کا مرکزی نقطہ بنی نوع انسان کو ہی بنایا گیا ہے۔ ان کے بعض انشائیے گہری فکر اور سوچ میں غوطہ زنی کرتے نظر آتے ہیں۔ تاہم ان کے نو انشائیے شخصی انشائیے ہیں۔

دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں سے نظیر صدیقی کے انشائیوں میں فکر کا تعمق، وسعت اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ ان کے انشائیے بہتے ہوئے دریا کی مانند ہیں جس کے دو دھارے ہیں ایک دھارا فکر کی وسعت و گہرائی سے بھرپور ہے اور دوسرا دھارا طنز و مزاح کی کاٹ سے نمایاں ہے۔ وہ معاشرے کے تلخ و کڑوے حقائق بڑی بے باکی سے بیان کرتے ہیں وہ سچ بولنے سے گریز نہیں کرتے۔ تاہم ان کے انشائیوں میں فریاد کرنے کا عنصر موجود ہے اور یہ فریاد مردم بیزاری کے وقت بہت تلخ محسوس ہوتی ہے تاہم ان کے انشائیوں میں غم و غصہ کی لہر تو ساتھ ساتھ

دوڑتی ہے۔وہ اپنے انشائیوں میں اپُنی ذات کی خوبیوں اور اپنی زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو بھی بیان کرتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں مذہب کو اخلاقیات سے آزاد کروانے کا پختہ ارادہ اور کوشش بھی موجود ہے۔وہ نماز پڑھنے والوں کی گنتی کے اضافے کی اہمیت کو تسلیم کرنے کی بجائے برائی اور شر پیشہ افراد میں کمی کو تسلیم کرتے ہیں تاہم ان کے انشائیوں میں کئی طرز کی فکری لہریں دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

مشکور حسین یاد کے ہاں خارج کی کتھا زیادہ دیکھنے کو ملتی ہے۔آپ نے طنز و فکر اور فلسفیانہ مضامین کے ذریعے اخلاقی مقاصد کی ترویج بھی کی۔مشکور حسین یاد کے انشائیے میں دو انداز دیکھنے کو ملتے ہیں جس میں سنجیدگی اور خشک فلسفہ اور دوسرا طنز و مزاح شامل ہیں۔ان کے انشائیے جذبات سے بھرپور، گہری فکر سے لبریز، گہرائی اور جستجو کی صفات رکھتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں ان کے تجربات و مشاہدات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ان کے انشائیوں کے مضامین اخلاقی اقدار، جنسیات، احساس اور ذاتی زندگی کے تجربات ہیں۔ان کے انشائیوں میں ان کا عہد بولتا نظر آتا ہے وہ زندگی کے گھمبیر مسائل کے حل تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔وہ اپنے انشائیوں میں وقت اور زمانے کو موضوع بناتے ہیں۔

صلاح الدین حیدر کے انشائیوں میں معاشرتی پہلوؤں کے ساتھ طنز و مزاح اور انکشاف ذات کو یکجا کر کے پیش کرتے ہیں۔وہ سنجیدہ صورتحال میں مضحک اور مضحک صورتحال میں سنجیدگی کا پہلو پیدا کرتے ہیں۔ان کے انشائیے مزاح کی چاشنی سے بھرپور نظر آتے ہیں اور طنز کی لہر شروع سے لے کر آخر تک موجود ہے۔وہ اپنے ذاتی تجربات اور معاشرتی تجربات و مشاہدات کو استعاراتی اور علامتی طرز سے پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد قیصر اپنے انشائیوں کو معاشرے کے فاسد مادے،دوغلے پن،معاشرے کی ناہمواریت، معاشرے کی برائیوں اور منافقت کا سدباب کرنے کا ذریعہ بھی بناتے ہیں۔ان کا اپنے انشائیوں میں لہجہ مزاحیہ اور خطیبانہ ہے۔بعض جگہوں پر ان کا مزاح حد سے بڑھ جاتا ہے حتیٰ کہ لطیفہ گوئی تک پہنچ جاتا ہے۔

ارشد میر کے انشائیے اپنے اردگرد ماحول اور معاشرے سے اخذ کیے ہوئے ہیں۔ارشد میر معاشرے کی معمولی اور چھوٹی چھوٹی چیزوں پر قلم اٹھاتے ہیں۔جیسے انشائیہ "دھوتی" اور "تولیہ" وغیرہ۔وہ اپنے انشائیوں میں انسانی کیفیات، احساسات اور جذبات کو بھی عمدہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔تاہم دبستان لاہور کے انشائیہ نگار اپنے انشائیے طنز و مزاح کے انداز میں معاشرے پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں اس کے برعکس دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے انشائیوں میں طنزیہ و مزاحیہ انداز نہیں پایا جاتا۔

حوالہ جات

۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، دھند، خیال پارے، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۴ء، ص ۱۳۰۔۱۳۱

۲۔ وزیر آغا ڈاکٹر، نروان، سمندر اگر میرے اندر گرے، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، مئی ۱۹۸۹ء، ص ۸۳

۳۔ رفیق سندیلوی، ڈاکٹر وزیر آغا: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۶ء، ص ۵۶

۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، درمیانہ درجہ، چوری سے یاری تک، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، مارچ، ۱۹۸۲ء، ص ۱۰۶

۵۔ جمیل آزر، اردو کے بہترین انشائیے، پیش لفظ، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، ۱۹۷۶ء، ص ۱۰

۶۔ منور عثمانی، وزیر آغا کی انشائیہ نگاری، مشمولہ کاغذی پیرہن، (وزیر آغا)، مئی جون ۲۰۰۵ء، ص ۵۹

۷۔ غلام جیلانی اصغر، مکان بنانا، نرم دم گفتگو، راحیل ایسوسی ایٹ، سرگودھا، ۱۹۹۲ء، ص ۳۱

۸۔ غلام جیلانی اصغر، بلڈ گروپ، نرم دم گفتگو، ایضاً، ص ۶۲

۹۔ غلام جیلانی اصغر، ریٹائرمنٹ کے بعد، ایضاً، ص ۱۲۶

۱۰۔ غلام جیلانی اصغر، انشائیہ، مشمولہ، اوراق، انشائیہ نمبر، اپریل مئی ۱۹۷۵ء، ص ۶۵

۱۱۔ مشتاق قمر، بیٹھنا، مشمولہ، ہم ہیں مشتاق، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۷۰ء، ص ۵۷۔۵۸

۱۲۔ مشتاق قمر، دھوپ کھانا، ایضاً، ص ۷۹

۱۳۔۔ مشتاق قمر، کوہ پیمائی، ایضاً، ص ۹۱

۱۴۔ مشتاق قمر، بھول جانا، ایضاً، ص ۱۱۳

۱۵۔ مشتاق قمر، اپالو ٹریجڈی، ایضاً، ص ۱۳۱

۱۶۔ مشتاق قمر، شہرت کی مخالفت میں، ایضاً، ص ۱۵۰۔۱۵۱

۱۷۔ عارف عبدالمتین، فلیپ، ہم ہیں مشتاق، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، اول، ۱۹۷۰ء، ص ۲

۱۸۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، نذیر سنز پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۲۶۰

۱۹۔ جمیل آزر، شاخ زیتون، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، اول، ۱۹۸۱ء، ص ۳۹

۲۰۔ جمیل آزر، بھولے بسرے نغمے، ایضاً، ص ۷۰

۲۱۔ جمیل آزر، اخبار پڑھنا، ایضاً، ص ۹۲

۲۲۔ جمیل آزر، غیر معروف شہری، مشمولہ، رُت کے مہمان، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۳۰

۲۳۔ جمیل آزر، نشہ، ایضاً، ص ۴۸

۲۴۔ جمیل آزر، نیکی، دریا، سمندر، ایضاً، ص ۱۰۲، ۱۰۱

۲۵۔ جمیل آزر، ایک ضروری اعلان، ایضاً، ص ۱۳۳

۲۶۔ جمیل آزر، وقت اے وقت، مشمولہ، وقت اے وقت، مقبول اکیڈمی اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۶

۲۷۔ جمیل آزر، کچے پکے آم، ایضاً، ص ۴۰

۲۸۔ جمیل آزر، مکالمہ، ایضاً، ص ۶۸۔۶۹

۲۹۔ جمیل آزر، مہربان کیسے کیسے، ایضاً، ص ۱۱۸

۳۰۔ اکبر حمیدی، انتظار گاہ، جزیرے کا سفر، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۵ء ص ۲۳

۳۱۔ اکبر حمیدی، درمیانی منزل، ایضاً، ص ۴۵

۳۲۔ اکبر حمیدی، پتنگ، ایضاً، ص ۵۰

۳۳۔ اکبر حمیدی، پرانے کپڑے، ایضاً، ص ۶۸

۳۴۔ اکبر حمیدی، موسم، ایضاً، ص ۷۰

۳۵۔ اکبر حمیدی، باغی، مشمولہ، تتلی کے تعاقب میں، بٹر پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۲

۳۶۔ اکبر حمیدی، غالب کا طرفدار، ایضاً، ص ۸۶

۳۷۔ اکبر حمیدی، سپنوں کا گاؤں، جھاڑیاں اور جگنو، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۲۶

۳۸۔ اکبر حمیدی، باورچی خانہ، ایضاً، ص ۶۴

۳۹۔ اکبر حمیدی، جھاڑیاں اور جگنو، ایضاً، ص ۸۷

۴۰۔ اکبر حمیدی، چہرہ بہ چہرہ، ایضاً، ص ۱۰۱

۴۱۔ اکبر حمیدی، نظام سقہ، ایضاً، ص ۱۱۷

۴۲۔ اکبر حمیدی، شوق فضول مشمولہ، پہاڑ مجھے بلاتا ہے، بٹر پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۲۰

۴۳۔ اکبر حمیدی، یہ توندیں، ایضاً، ص ۷۷

۴۴۔ اکبر حمیدی، کبھی ہم لااُبالی تھے، مشمولہ، اشتہاروں بھری دیواریں، بٹر پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۵۰

۴۵۔ منشایاد، دیباچہ، جھاڑیاں اور جگنو، ایضاً، ص ۱۰

۴۶۔ مشکور حسین یاد، نادانی کا شعور، مشمولہ، جوہر اندیشہ، مکتبہ اردو ڈائجسٹ، لاہور، باراول، ۱۹۷۵ء، ص ۲۷

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۳۴

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۴۹۔ ایضاً، ص ۳۸

۵۰۔ ایضاً، ص ۳۰

۵۱۔ مشکور حسین یاد، ہبوط آدم، مشمولہ، وقت کا استعارہ، الرزاق پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۵۷

۵۲۔ نظیر صدیقی، امتحان گاہ، مشمولہ، شہرت کی خاطر، پاک کتاب گھر، ڈھاکہ، اپریل ۱۹۶۱ء، ص ۱۳۶

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۷۱

۵۵۔ نظیر صدیقی، شہرت کی خاطر، ایضاً، ص ۲۸۲

۵۶۔ مظفر علی سید، دیباچہ، شہرت کی خاطر، مرتبہ مظفر علی سید، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۱

۵۷۔ نظیر صدیقی، کچھ اپنے فن کی تعریف میں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علیگڑھ، ۱۹۸۱ء، ص ۱۵

۵۸۔ صلاح الدین حیدر، حماقتیں میرے مقدر کی، مشمولہ، حماقتیں میرے مقدر کی، کاروان ادب ملتان، ۱۹۷۸ء، ص ۴۱

۵۹۔ ایضاً، ص ۴۶

۶۰۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۶۱۔ عرش صدیقی، مقدمہ، حماقتیں میرے مقدر کی، صلاح الدین حیدر، کاروان ادب، ملتان، ص ۲۲

۶۲۔ عطاء الحق قاسمی، فلیپ، کلیئرنس سیل، شہزاد قیصر، مکتبہ جمال، لاہور، ۱۹۸۰ء

۶۳۔ شہزاد قیصر، ڈاکٹر، موسم، مشمولہ، لطف آگہی، مکتبہ جمال، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۱۵

۶۴۔ معین الرحمٰن، سید، ڈاکٹر، فلیپ، لطف آگہی، شہزاد قیصر، مکتبہ جمال، لاہور، ۲۰۱۴

۶۵۔ شہزاد قیصر، پیش لفظ، انشائیہ کانفرنس ۱۹۸۸ء، جہاں نما پبلی کیشنز، لاہور، نومبر ۱۹۸۸ء، ص ۸

۶۶۔ سعید شباب، ارشد میر کا انشائیہ، مشمولہ، اوراق، لاہور، جولائی اگست ۱۹۸۴ء، ص ۵۸

۶۷۔ ارشد میر، آنسو، مشمولہ مُوڈ، ادارہ فروغ اردو، لاہور، اول ستمبر ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۰۔۱۱۱

۶۸۔ ارشد میر، دوپٹہ، ایضاً، ص ۲۸

باب سوم:

دبستان سر گودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا اسلوبیاتی تقابل

اسلوب کسی بھی ادبی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے اس کا انداز تحریر ہی اس کو منفرد بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ادب کی ہر صنف میں اسلوب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔اسلوب میں انشائیہ کی اہمیت منفرد اور الگ ہے بلکہ دوسری اصناف سے نسبتاً زیادہ ہے۔انشائیہ کا موضوع یا عنوان کوئی بھی ہو اس کا اسلوب انشائیہ نگار کی عکاسی کرتا ہے۔اسلوب میں تازگی، شگفتگی اور منفرد پن جیسی خوبیاں نہ ہوں تو قاری کی اس تحریر میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے۔انشائیہ کے لیے ضروری ہے کہ اس کا اسلوب زیادہ سے زیادہ جاندار، پرکشش اور منفرد خصوصیات کا حامل ہو، تاکہ قاری کی دلچسپی زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔قصہ مختصر یہ ہے کہ انشائیہ کا اسلوب قاری کے لیے پرکشش اور دلچسپی کا باعث ہو، اس کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں کہ:

> "اسلوب ہئیت اور خیال کے باہمی اشتراک سے ترتیب پاتا ہے یہی دو چیزیں ادب کا ظاہر اور باطن ہیں۔ادب ان دونوں کے اس طرح کے باہم کا وسیلہ ہے۔ لفظ کا درست اور برمحل استعمال خیال میں قوت پیدا کرتا ہے اور اس کی گہرائی میں اضافہ کرتا ہے معنویت بڑھاتا ہے اور بالاخر ان سب کی انتظامی صورت سے اس اسلوب کو جنم دیتا ہے۔"[۱]

ہر ادیب اپنے اسلوب کی وجہ سے اپنا مقام بناتا ہے۔ اس کی سوچ و افکار کی مہک، خیالات و افکار، نظریات، تجربات ومشاہدات اور ذاتی آراء یہ سب اسلوب کے ذریعے دوسروں کو معطر کرتی ہے۔ یہ مہک عہد بہ عہد پھیلتی ہوئی نسل در نسل منتقل ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر ادیب اپنے ادب میں اپنی تاریخ برقرار رکھتا ہے۔یہ تاریخ ہی اس کو ادب میں زندہ رکھتی ہے اور اس اسلوب کے بل بوتے پر ہی اس کی تحریریں زندہ رہتی ہیں۔

الف۔ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کا اسلوبیاتی جائزہ:

دبستان سرگودھا کے نمایاں انشائیہ نگاروں میں ڈاکٹر وزیر آغا ایک مشہور اور بہترین انشائیہ نگار ہیں۔ان کے انشائیہ میں جابجا ادبی رنگ نظر آتا ہے۔انشائیہ ڈاکٹر وزیر آغا کی پیدائش ۱۹۲۲ء میں سرگودھا کے ایک گاؤں وزیر کوٹ میں ہوئی۔آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد کی نگرانی میں سرگودھا اور ضلع جھنگ سے حاصل کی آپ نے گونمنٹ کالج لاہور سے معاشیات میں ایم اے کیا آپ کے والد آغا وسعت علی کاشت کاری کا کاروبار کرتے تھے

آپ نے ۱۹۵۸ء میں اردو ادب میں پی ایچ ڈی کی اور آپ کے تحقیقی مقالے کا عنوان اردو ادب میں طنز و مزاح تھا۔ آپ نے مولانا صلاح الدین کے ساتھ رسالہ ادبی دنیا کے مدیر کی حیثیت سے بھی کام کیا اور ڈاکٹر وزیر آغا نے مولانا صلاح الدین کی وفات کے بعد اپنا رسالہ "اوراق" کا بھی اجراء کیا جس کا شمار اردو ادب کے اہم رسائل میں ہوتا ہے۔ تاہم ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت اپنے آپ میں بہت سی تخلیقی پرتیں رکھتی ہے اور ہر پرت دوسرے سے مختلف ہے۔ ان کی تخلیقی شخصیت کبھی، بطور شاعر، انشائیہ نگار، ناقد اور کبھی مدیر کے طور پر سامنے آتی ہے۔ وزیر آغا نے ستمبر ۱۹۵۹ء میں پہلی بار اپنے انشائیہ "چھکڑا" کے لیے انشائیہ کو بطور لفظ استعمال کیا۔ وزیر آغا انشائیہ سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ وزیر آغا باقاعدہ طور پر پہلے انشائیہ لکھنے والوں میں سے ہیں۔ انہوں نے باقاعدہ تصور اور خیال کے تحت انشائیہ کی سمت نمائی کی اور اسے فروغ دیا۔ انہوں نے انشائیہ کی حدود، مقتضیات اور خدوخال مقرر کیے اور اسے طنز و مزاح اور سنجیدہ مضامین سے الگ تصور کیا۔ وزیر آغا سے قبل سرسید سے لے کر وزیر آغا تک انشائیہ ایک الگ اور مختلف شکل میں لکھا جاتا تھا مگر وزیر آغا کے اجتہادی اقدامات نے ایک منفرد صورت میں پیش کیا۔ ان کی پہلی کتاب "خیال پارے" ۱۹۶۱ء، دوسرا "چوری سے یاری تک ۱۹۶۶ء" تیسرا انشائی مجموعہ "دوسرا کنارا" ۱۹۸۲ اور چوتھا انشائی مجموعہ "سمندر میرے اندر گرے" ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ ان کے یہ چاروں انشائی مجموعے کلیات کی صورت ۱۹۹۵ء میں "پگڈنڈی سے روڈ رولر تک" نام سے شائع ہوئے بعد ازاں تھوڑے سے انشائیوں کے اضافے کے ساتھ ۲۰۱۰ء میں "پگڈنڈی" کے نام سے اس کلیات کو دوبارہ شائع کیا گیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں میں مقصدیت اور فلسفہ بہت کم تھا تاہم تازگی اور لطافت ان کے انشائیوں میں بھرپور انداز میں موجود تھی۔ آپ نے انشائیے کو جدید اور منفرد اسلوب سے نوازا۔ خیال پارے کے انشائیے گہرے معنی اور مفاہیم کا سمندر رکھتے ہیں۔ وہ زندگی کی حقیقتوں کو زندگی کی کڑواہٹ اور تلخیوں سے الگ کر کے پیش کرتے ہیں انشائیے میں شخصی تاثر کے علاوہ اپنے مشاہدات کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ انشائیہ نگار انشائیہ لکھتے ہوئے اس دور کے سیاسی، سماجی و معاشی حالات و کیفیات کو بیان کر دیتا ہے تاہم مصنف ذاتی و شخصی تجربے کے ساتھ ساتھ اجتماعی مشاہدات و تجربات کو بھی اس میں شامل کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ آپ نے انشائیے کو ثقافتی روپ میں ڈھالا اور اسے پاکستانیت سے سجایا کہ بہت جلد مقبول عام ہو گیا۔ انشائیے میں انسان اور انسان سے وابستہ چیزوں سے بحث کی جاتی ہے۔ وہ خارج کے ذریعے داخل اور داخل کے ذریعے خارج پر بحث اور غور و فکر کرتے ہیں تاہم وہ جز کے واسطے سے کُل کو جانچتے ہیں۔ تاہم ہر انسان ایک دوسرے سے مختلف ہے انشائیہ نگار انسان کے اندر کی جانچ پرکھ کر کے قاری سے اس کا تعارف کرواتے ہیں۔

اگرچہ وزیر آغا علمی و ادبی موضوعات پر بڑی چابکدستی سے قلم اٹھاتے ہیں وہ پوری زندگی مطالعہ کرتے رہے وہ اپنے خیالات و تصورات کی ترویج بہت عمدہ انداز سے کرتے ہیں علم و ادب سے وابستگی کی بناء پر وہ مختلف علوم اور اصناف پر عبور رکھتے تھے۔ جن میں بنیادی شاعری ہے۔ انشائیہ کا وجود بھی شاعری ہی سے ہے انشائیہ بھی ان کے داخل سے تعلق رکھتا تھا جسے انہوں نے داخل کے ساتھ ساتھ معروضی رنگ و روغن سے بھی سجایا ہوا تھا اس طرح داخل اور خارج سے ایک اچھوتی اور انمول صورت ہمارے سامنے آئی۔ تاہم ہر انسان ایک دوسرے مختلف ہے انشائیہ نگار انسان کے اندر کی جانچ پرکھ کر کے قاری سے اس کا تعارف کرواتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا بچپن دیہات میں گزرا اور وہاں سے ہی آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی اس کے بعد وہ سرگودھا اور پھر وہ لاہور تشریف لے گئے مگر تاحیات وہ دیہات سے جڑے رہے وہ دیہات سے فطرت کے اسرار تک پہنچے تاہم ان کے انشائیوں کا بنیادی موضوع فطرت اور فطرت تک رسائی حاصل کرنا ہے وہ دیہات کی ہر چیز پر فریفتہ ہیں جن میں فصلیں، درخت، کنوئیں، پھل اور پھول وغیرہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق انسان سفر کی مشکلات میں پڑے بغیر چارپائی پر دراز ہو کر بھی پوری دنیا کی سیر کر سکتا ہے اس طرح قاری پر حقیقی سفر کی صعوبتیں اور خواب کی دنیا کی لطافت وا ہو جاتی ہیں، وزیر آغا حقیقی دنیا کی رزم گاہ میں کھو جانے کے عمل کو پسند کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خواہشات کو کائنات میں اہم حیثیت حاصل ہے اور اسی کی وجہ سے انسان زندگی کے تسلسل سے آگاہ ہوتا ہے۔ ان کا انشائیہ "نروان" بھی کائنات میں خواہشات کے ادراک پر منحصر ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے دل میں نروان کا خیال تب آیا جب وہ بچپن میں اپنے والد کے ساتھ درویشوں اور صوفیوں کے پاس جاتے اور وہاں خواہش سے دستبردار ہونے کے بارے میں گفتگو سنتے ان کے خیال میں خواہش ختم کرنا ہی اصل نروان ہے۔ تاہم وزیر آغا کو ہم گیانی کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں اور فکر کی گہرائی بھی اسی گیان کی وجہ سے ہے۔ وہ اپنے تجربے اور مشاہدے سے فلسفے کی گہرائی کو عیاں کرتے ہیں۔ تاہم ان کا تصوف آج کل کے مرشد و صوفیاء کی طرح نہیں ہے بلکہ جس میں پیر و مرشد اور مریدی ہوتی ہے فکر و سوچ کو وہ محسوس کرتے ہیں۔ وہ اپنی سوچ کو دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہیں اس مقام پر معنی اس طرح کُھلتے ہیں اور معنی کا سیلاب الفاظ کی پوشیدہ تہوں میں دوڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا زندگی کی کڑوی اور تلخ حقیقتوں کے مرقعے خوش باش طریقے سے کھینچتے ہیں اوہ اپنی سوچ، فکر اور نظریات کا انخلاء کرتے ہیں کہ بعض ناگوار اور ناپسندیدہ چیزوں کو اس طرز سے بیان کرتے ہیں کہ وہ دل کو بھا جاتی ہیں۔ وزیر آغا کے انشائیوں میں تقابل کرنے کی خوبی کثرت سے ملتی ہے اور اس کی مثال انشائیہ "حقہ پینا" ہے

اس میں جدید اور قدیم ثقافت اور تہذیب اور اس کے طرز عمل کا تقابل کیا گیا ہے اور قدیم ثقافتی و تہذیبی رنگ کو جدید پر ترجیح دی گئی ہے۔

وزیر آغا قدیم داستانوی ادب اور قدیم اردو ادب سے متاثر ہو کر بھی اپنے انشائیوں کے عنوانات کو منتخب کرتے ہیں جیسے سیاح اور طوطا پالنا وغیرہ۔ تاہم وزیر آغا جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں ہر زاویے سے اس موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے موضوعات کے تمام پہلوؤں کا بڑی چابکدستی سے احاطہ کرتے ہیں وہ اپنے انشائیوں میں شخصی تجربے کو شامل کر کے اسے منفرد اور دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ وزیر آغا کے انشائیے ان کی ذات کا پر تو اور عکس ہیں وہ انشائیہ کی تکمیل خارجی دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی ذات سے بھی مدد لیتے ہیں مگر داخلی مواد ان کے انشائیوں میں زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

تاہم تخلیق کار کے تجربات و مشاہدات لاشعوری طور پر اس کی تخلیق میں شامل ہو جاتے ہیں۔ وزیر آغا کے انشائیے مثبت انداز میں لکھے گئے ہیں اور زندگی کے روشن پہلوؤں کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں وہ زندگی کے غمگین، دکھ اور سنجیدہ پہلوؤں میں امید کی کرن سے ہمیں روشناس کرواتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے کل ستر انشائیے لکھے ہیں اور یہ آپ نے پینتالیس سال کے عرصے کے دوران لکھے۔ انشائی مجموعہ "چوری سے یاری تک" ایک ٹھہرے ہوئے مقام کی مانند ہے۔ جہاں تھوڑی دیر ٹھہر کر ہم پر سفر کی نعمتوں کی ایک تصویر نمایاں ہوتی ہے اس کو دیکھ کر سنجیدگی اور صبر و بردباری کی خوبیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ تاہم "خیال پارے" میں سیمابی صفت موجود ہے اور چوری سے یاری تک میں ٹھہراؤ کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انشائی مجموعہ "دوسرا کنارہ" فلسفہ کی گہرائی اور گیان کی خوشی کو عیاں کرتا ہے اور اشیاء ظاہر و باطن کی طرز سے اپنی پہچان بنا رہی ہیں جہاں ہر چیز کو داخل کے حوالے سے سمجھنے اور جاننے کی قوت پیدا ہو گئی ہے اس طرح چیزوں میں نہ بڑائی پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی حیرت جنم لیتی ہے۔ اس سے ایک قسم کی اندرونی خوشی پیدا ہوتی ہے کہ چیزوں کی اصل حقیقت معلوم ہو گئی ہے۔ وزیر آغا اپنے انشائیوں کے چوتھے مجموعے "سمندر میرے اندر گرے" میں فلسفیانہ سوچ کو بیان کیا گیا ہے جس سے قاری سرشار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور جو مسرت کا باعث بنتا ہے۔ ان کے انشائیوں میں پوری زندگی کا تجربہ دیکھنے کو ملتا ہے ان میں گہرا فکری تناظر پایا جاتا ہے تاہم انشائی مجموعے کے عنوان سے یہ بات عیاں ہو رہی ہے کہ قطرہ سمندر میں فنا ہونے کی بجائے سمندر اپنے اندر موجزن ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیہ مجموعہ "دوسرا کنارہ" میں انشائیہ "لاہور" ایک بہترین انشائیہ ہے۔ جس میں شگفتہ اور نرم زبان استعمال کی گئی ہے۔ انشائیہ کے شروع میں "ہم کلامی" کا انداز بہت متاثر کن ہے۔ اس میں مختلف

استعاراتی الفاظ حقیقت کی طرف اپنا سفر گامزن رکھے ہوئے ہیں۔انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ تنہائی اور اکلاپا پن میں وہ ہم کلامی میں ہمیشہ سچ ہی بولتا ہے۔ سچائی اور حقیقت کو بیان کرنے کے لیے شگفتہ اور نرم زبان کا استعمال کرنا غیر معمولی بات ہے۔ لاہور آنے سے پہلے گاؤں میں "ہم کلامی" کے بارے میں لکھتے ہیں :

> "میں تو اپنی ذات کے روبرو کھڑا ہونے اور خود ہی سے ہم کلام ہونے کی کوشش میں ہوں۔ گاؤں میں رہتے ہوئے مجھے صبح شام ہم کلامی کے ہزاروں مواقع حاصل ہوتے تھے مثلاً صبح جب سورج نکلتا اور گندم کے کھیتوں میں اوس کے کروڑوں سبک اندام قطرے یکا یک دمک اٹھتے تو مجھے ہر قطرے میں اپنی ہی شکل دکھائی دیتی اور یوں خود سے ملاقات کی صورت از خود پیدا ہو جاتی یہاں جب اندھیری رات میں آسمان کی سیج پر لاکھوں ستارے موتی ہے کہ پھولوں کی طرح خوشبو بکھیرتے تو مجھے اس خوشبو میں اپنے ہی جسم کی باس کا گمان ہوتا اور یوں خود سے ہم کلام ہونے کی ایک اور صورت پیدا ہو جاتی ہے۔"[۲]

وزیر آغا دبستان سرگودھا کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنے انشائیہ کے اسلوب میں زیادہ تر شگفتہ اور نرم زبان استعمال کرتے ہیں۔ ان کے انشائی مجموعوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کے انشائیے تاریخ کے اوراق کو پلٹتے نظر آتے ہیں۔ان کا اسلوب ماضی کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ان کے دور میں انشائی رجحان سفر طے کر کے تحریک کی شکل اختیار کر چکا تھا کیونکہ انشائیہ اپنی اظہار ذات کو بیان کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ جس میں اپنے خیالات و افکار کے ساتھ انکشافات کائنات کو سامنے لایا جاتا ہے۔ان کے انشائیے زندگی کے مکمل اسرار و رموز کی حقیقی ترجمانی کرتے ہیں۔ان کا انشائیہ "دوسرا کنارہ" فلسفیانہ بلندی اور بہترین اسلوب کا نمونہ ہے۔جس میں اندرونی اور خارجی حقیقتیں اپنی پہچان کرا رہی ہیں۔

وزیر آغا کا تیسرا مجموعہ "دوسرا کنارہ" فکری و فلسفیانہ بالیدگی کی نئی راہیں ہموار کرتا ہے۔، جس میں فکر، احساس، رویے، آزادی، بے نیازی، انفرادیت و اجتماعیت کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔یہ سب جذبات اسلوب کے بغیر بیان کرنا ناممکن ہے۔کسی بھی ادیب یا شاعر کی شناخت میں اسلوب ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔انشائیہ نگار میں نفاست، اعلیٰ مزاجی اور سنجیدگی کا عنصر نمایاں ہونا چاہیے اور یہ تمام خصوصیات وزیر آغا میں پائی جاتی ہیں۔ انشائیہ ایک پیچیدہ، مشکل اور سست رفتار سے چلنے والی ادبی تخلیق ہے۔اس بات کا اندازہ وزیر آغا کے مجموعہ، دوسرا کنارہ" کے عرصہ مدت سے لگایا جاسکتا ہے۔اس مجموعہ کے بارے میں خود فرماتے ہیں :

"یہ میرا انشائیوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔اس میں کل سترہ انشائیے شامل ہیں جو پچھلے سولہ برس میں لکھے گئے ہیں۔گویا سال میں ایک انشائیہ۔یہی شاید انشائیہ کی رفتار بھی ہے۔رفتار جو گھڑی کے ٹک ٹک سے مشابہ نہیں بلکہ فطرت اس کی رفتار کی مانند ہے جو پھول کے اور اوس گرنے میں اپنا مظاہرہ کرتی ہے۔"[۳]

وزیر آغا کا ایک انشائیہ تقریباً ایک سال کی مدت میں لکھا گیا ہے۔جب ایک انشائیہ کو بار بار پڑھا جائے گا۔اس کی نوک پلک سنوارنے کا عمل جاری رہے گا تو اس کے اسلوب میں نکھار آنا معمولی بات ہے۔اس کا اسلوب جامع اور خوبصورت ترین ہو گا۔ ان کے انشائیہ مجموعہ "دوسرا کنارہ" کے انشائیوں میں اسلوب ایک جیسا نظر آتا ہے اگر بعض مقامات پر ان کے اسلوب میں تبدیلی بھی نظر آتی ہے۔ان کی انشائیہ "ہجرت" میں آسان اور سادہ الفاظ کے مجموعے کے ساتھ اسلوب پر کشش اور لطیف ہے۔الفاظ زبان پر آتے ہی ادا ہونے لگتے ہیں۔الفاظ کے چناؤ میں مہارت کا سحر انگیز انداز اختیار کیا گیا ہے کہ قاری کو آسان، سادہ اور روزمرہ زندگی کے الفاظ والا اسلوب اپنی گرفت میں قید کر لیتا ہے۔قاری جب انشائیہ شروع کرتا ہے تو تجسس کا عنصر آگے بڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔اکثر قاری مشکل الفاظ اور پیچیدہ اسلوب کی وجہ سے تحریر کو چھوڑ دیتے ہیں مگر وزیر آغا کے اسلوب میں ایسی بات ناممکن ہے۔

دبستان سرگودھا کے نمائندہ انشائیہ نگار ڈاکٹر وزیر آغا ایسی شخصیت ہیں جنہوں نے انشائیہ کے وسیع پیمانے پر متعارف کرانے، اس کے دائرہ کار اور تخلیقی دائرہ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ان کے اسلوب میں نکھار کی اہم وجوہات میں سب سے اہم یہ بھی ہے کہ وہ بذات خود نقاد بھی ہیں بلکہ انشائیہ نگاری میں اولین نقاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان میں یہ بھی فن ہے کہ وہ موضوع کو پرکھنے کے ساتھ مشاہدے کا زاویہ بھی تبدیل کر دیتے ہیں۔جس سے ایک منفرد امتزاج اور انداز سامنے آتا ہے۔وہ ہر موضوع میں اسلوب کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قاری اس کے ساتھ بڑے دوستانہ ماحول میں باتیں کرنے لگتا ہے۔ان کا انداز نرم، دلکش، پر تکلف اور دوستانہ ہے۔وہ ہم کلامی کے انداز میں غیر رسمی باتیں شگفتہ انداز میں کرتے چلے جاتے ہیں۔وہ اپنی تخلیق کی جدت سے خوبصورت لفظوں کو جملوں کی کڑی میں پرو کر نکھار دیتے ہیں۔ان کا اسلوب تکنیکی ضرورتوں کو پورا کرتے ہوئے تہذیبی اور ادبی شخصیت کو نمایاں کرتا ہے۔

دبستان سرگودھا کی نمائندگی کرنے والے انشائیوں میں وزیر آغا کا انشائی مجموعہ "دوسرا کنارہ" میں انشائیہ "ہینڈ بیگ" میں نعمت خداوندی کا ذکر کرتے ہیں۔ اس انشائیہ میں آسان الفاظ کے ساتھ جملوں میں سختی نظر آتی

ہے۔ قاری کو اس اسلوب میں تجسس کا عنصر تو ملتا ہے۔ بات کو سمجھنے کے لیے انداز تحریر کو ایک سے زیادہ بار پڑھنے کی حاجت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ 'بسنت" میں نرم، دلکش اور شگفتہ اسلوب ملتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

> "بسنت کے موقع پر تتلیوں کا اڑنا رنگ کے علاوہ تخیل کی پرواز کا منظر بھی پیش کرتا ہے۔ بہار میں جذبہ غالب ہوتا ہے اور جذبہ غالب ہو تو بند قبا کے کھلنے سے لے کر گریبان کے چاک ہونے تک مناظر جابجا ابھر آتے ہیں۔ جذبہ، اندھا اور بہار نو خیز ہوتا ہے۔ اس کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ زمین اور جسم کے ساتھ پوری طرح چمٹا بھی ہوتا ہے۔"[۴]

اس کے علاوہ "بارھواں کھلاڑی"، "حقہ پینا"، "کھڑکی"، "میرا البم"، "چلنا"، "میرے بچپن کا دوست" اور "معافی مانگنا" اپنی نوعیت کے اعلیٰ پائے کے انشائیے ہیں۔ جو دوسرا کنارہ کے بہترین مجموعہ کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا دبستان سرگودھا کی ایسی پہچان ہے کہ ان کے انشائیے اپنی منفرد اور جداگانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ انشائیے میں ماحول، موضوع، مقصد اور قاری اسلوب کی تشکیل میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے شعور سے زیادہ لاشعور کا احساس رکھتے ہیں۔۔ الفاظ چن کر لکھنے کی عادت ہو تو یہ عادت فن میں روانی ہے اور انداز تحریر کو جلا بخشتا ہے۔ الفاظ بھی اپنی بقا کو زندہ رکھتے ہیں۔ اس لیے اسلوب میں الفاظ کا چناؤ ایسا ہونا چاہیے کہ یہ تحریر کو زندگی بخشیں، نامناسب الفاظ اسلوب کو موت کی وادی میں دھکیل دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ زمانے کے ساتھ اسلوب میں تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے مگر سادہ اور آسان الفاظ والا اسلوب اپنی اہمیت کو دیرپا قائم رکھتا ہے۔ اس طرح وزیر آغا کے انشائیے کا اسلوب اپنی منفرد اور جداگانہ حیثیت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

دبستان سرگودھا کے انشائیوں میں اسلوب میں شگفتگی، اختصار، انکشاف ذات، غیر رسمی انداز گفتگو اور تنوع نظر آتا ہے۔ وزیر آغا کا انشائی مجموعہ "چوری سے یاری تک" کے پندرہ (۱۵) انشائیے شامل ہیں۔ اس مجموعے کا پہلا انشائیہ "چوری سے یاری تک" میں چوری پر جس انداز میں وزیر آغا نے بات کی ہے۔ اس سے ان کی فنی مہارت اور اسلوب پر مکمل گرفت معلوم ہوتی ہے۔ الفاظ میں شگفتگی نظر آتی ہے تو اختصار کا دامن بھی خالی نہیں ہے۔ وہ انکشاف ذات اور تنوع کے ساتھ اسلوب کو رنگین بنانے میں کمال مہارت رکھتے ہیں۔ چوری کو ظلم قرار دے کر، آریاؤں کو ظالم قرار دے کر خود کو معصوم پیش کیا ہے۔ مویشی چرانے جیسے مختلف قصے سنا کر قاری کو متوجہ کرنے میں کامیاب نظر ہو آتے ہیں۔ اسی انشائیہ میں اسلوب کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"ہم کہتے ہیں کہ چوری ہمارا پیشہ ہی نہیں، مشغلہ بھی ہے۔ تم ہمیں چوری سے باز رہنے کا اپدیش دیتے ہو۔ یوں کیوں نہیں کہتے کہ ہم اپنے سارے کافی سرمائے سے ہی قطع تعلق کر لیں۔ چوری سے کوئی سروکار نہ رکھنے کا مطلب بھی تو ہے کہ ہم اپنی ذات، اپنی انفرادیت، اپنے مزاج کو تج کر بالکل ننگے ہو جائیں خدارا ایسا کوئی ظلم نہ کرو۔ دیکھو، ہم نے سیاست، ادب، کاروبار زندگی کے لا تعداد دوسرے گوشوں کو اپنے ثقافتی سرمائے سے کس طرح منفرد کر دیا ہے۔" [۵]

ڈاکٹر وزیر آغا نے چوری جیسے اخلاقی و قانونی جرم و لعنت کو احسن انداز میں بیان کیا ہے کہ اس کو ایک مشغلہ اور انتقام کی صورت دے دی ہے۔ حقیقت بھی ہے کہ چوری کی دو اہم وجوہات مجبوری اور انتقام ہیں۔ انسان مجبوری کی حالت میں چوری کرتا ہے یا پھر کسی انتقام یا بدلے کے لیے نقصان پہنچانے کے لیے چوری کرتا ہے۔ الفاظ کے بہترین چناؤ نے احسن انداز میں چوری کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔ الفاظ کا گورکھ دھندا ہی کسی ادیب کی تحریر کو چار چاند لگواتا ہے۔ اس میں موجود انکشاف، حقیقت اور سچائی کی عکاسی کرتا ہے۔ انشائیہ نگار اس انداز میں انکشافات کرتا ہے کہ قاری کو یہ انکشاف ذات ہی محسوس ہوتا ہے یہی محسوس پن اسلوب کو کامیابی دلاتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا انداز تحریر ہی انشائیہ کو جدت اور ندرت سے ہمکنار کرتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک منفرد امتیاز یہ بھی ہے کہ ان کے انشائیوں کے موضوعات سب سے زیادہ متنوع ہیں۔ وہ اپنے موضوعات میں اپنی منفرد انفرادیت کے حامل انشائیہ نگار ہیں۔

ان موضوعات میں "بہادری"، "علالت"، "سست روی"، "ہجرت"، " واپسی"، "تنہائی"، "غلامی"، "لاہور"، "بارواں کھلاڑی"، "سیاح"، "چرواہا"، "قطب مینار"، "آسیب"، "اندھی"، " بسنت" اور "دھند" قابل ذکر ہیں۔ ہر صنف ادب کی طرح انشائیہ بھی عمدہ اسلوب کی دولت دنیا کے ہر سو بکھرے رنگوں کو نئی جدت اور پر کشش انداز کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اسلوب ادیب / انشائیہ نگار کا عکس ہوتا ہے جو انشاییہ نگار کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس طرح وزیر آغا کا اسلوب منفرد اور دلکش ہوتے ہوئے ان کی فنی مہارتوں کو سامنے لانے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مجموعہ "چوری سے یاری تک" کے انشائیہ "کچھ رشتہ داروں کی شان میں" میں رشتہ داروں اور دوستوں کے درمیان ایک موازنہ کرتے ہیں۔ اس میں اختصار الفاظ کے ساتھ بات کو بیان کیا گیا ہے کہ رشتہ داروں کی اقسام کتنی ہیں اور رشتہ داروں کی نوعیت کیا ہے؟ تمام رشتہ داروں کو اس اقتباس میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

> "مجھے رشتہ داروں کی اس ساری قوم سے ایک شدید خوف محسوس ہوتا ہے جب میں اپنے مکانی، لامکانی، زمستانی یا انسانی رشتہ داروں پر ایک نظر ڈالتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ سب رشتہ دار کلوروفام کے مختلف اجزاء ہیں اور یہ اجزاء ایک مرکب بن کر میرے نتھنوں میں داخل ہوگئے ہیں اور مجھ میں حرکت کرنے کی آرزو ہی باقی نہیں رہی "۔[۶]

دبستان سرگودھا کی شان ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیے تازگی ،توازن اور فکر و نظر کے منفرد نمونے ہیں۔ ان کے انشائیہ "سیاح" میں انکشافات کے ساتھ کہانی سنانے کا انداز بیان کیا گیا ہے معاشرے اور سماج کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ "دیوار" میں جنت اور جہنم کے درمیان موجود دیوار کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ "طوطا پالنا" میں پالتو جانور یا پرندے پالنے منظر کشی کی گئی ہے جس میں طوطے کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ نگاری میں زبان و بیان کا ایک ایسا انداز اپنایا ہے کہ اس میں معاشرے اور عہد کی نمائش کی جا رہی ہے۔ انہوں نے انداز بیان کا وہ سلیقہ استعمال کیا ہے جو فہم و ادراک کی وسعت کو چھو رہا ہے۔ انہوں نے اپنے انشائیے کے مجموعے "خیال پارے" میں معاشرتی نظام کی عکاسی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ کسی بھی سادہ فہم انسان کو سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ انہوں نے معاشرتی حیوان کی سوچ اور سوجھ بوجھ کو نہایت احسن انداز میں بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے معاشرتی منظر کشی کو نہایت بے تکلفانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے اس انداز بیان میں سلاست اور سادگی نمایاں ہے جیسا کہ دبستان سرگودھا کے دوسرے انشائیہ نگاروں کا وطیرہ ہے۔ ان سب نے لطیف زبان کے استعمال سے معاشرے میں موجود انسانی سوچ اور فہم کو نہایت عمدہ انداز میں بیان کیا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ کیسے کوئی حیوان کسی جذبے کی بنا پر بزدلی کی لگام کو توڑ دیتا ہے اور خود کے اندر سوئے ہوئے جرات اور بہادری کے جذبے کو جگا دیتا ہے۔ اس کے برعکس انسان اپنی سوچ اور افکار کی بنا پر بزدلی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس بارے میں وزیر آغا اپنے انشائیہ "بہادری" میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> "ہاں جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اپنے جذبے کی بے لگامی کے باعث بہادری کا مرتکب ہوتا ہے لیکن انسان اپنی سوجھ بوجھ اور فہم و فراست کے باعث بعض حسین بزدلانہ افعال سر انجام دیتا ہے تو بات کچھ کچھ سمجھ میں آتی ہے۔ دراصل بہادری کا تصور محض حیوانی زندگی کی یادگار ہے اور چونکہ یہ تصور اس کے خون میں رچا ہوا ہے۔ اس لیے انسان نے غیر ارادی طور پر اسے ایک نیک عمل قرار دیا ہے اور پہلی جماعت کے قاعدے میں پورا سبق، اس کی تعریف میں لکھ کر اپنے آباؤ واجداد کی روح کو خوش کرنے کی سعی کی ہے۔ ویسے عملی طور پر انسان روز بروز اس کہنہ تصور کو ترک کرتا جا رہا ہے۔"[۷]

انشائیہ کے اندر جدت اور نکھار پیدا کرنے کا فن دراصل انشائیہ نگار کے زیر دست ہوتا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کے پاس اس فن کی مہارت موجود ہے۔ کسی بھی فن پارے میں اسلوب کا اندازہ اس کی سلاست اور شگفتگی سے نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ نگاری کے عنصر کو بیان کر کے نہایت ہی موزوں بنا دیا ہے۔ انہوں نے اپنے انشائیہ میں نہایت ہی شگفتہ انداز بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنے انشائیہ "آندھی" میں فطرت کو اس سادگی اورادراک کے ساتھ بیان کیا ہے کہ قاری اس کو پڑھنے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ انہوں نے آندھی یا طوفان کو الفاظ کے ایک جھکڑ میں اس انداز سے بیان کیا ہے جیسے الفاظ کی ہوا اپنی رفتار کے ساتھ شگفتگی کو بیان کر رہی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے انداز میں شگفتگی اور الفاظ میں آزادانہ رویہ پایا جاتا ہے۔ایک انشائیہ "آندھی" میں الفاظ اور زبان وبیان کی شگفتگی انہوں نے یوں بیان کی ہے کہ:

"بظاہر آندھی پچاس، ساٹھ یا ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہوئی اس ہوا کا نام ہے جو ایک غول بیابان کی طرح دھول میں اٹی، اپنے بال کھولے، سیٹیاں بجاتی ہوئی آتی ہے۔ اور سوئی ہوئی زندگی کو جھنجھوڑ کر بیدار کرتی اور اپنے پیچھے تباہی اور بربادی کے مناظر چھوڑتی آگے کو نکل جاتی ہے. لیکن آندھی کی برکتیں تعداد میں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کے سامنے اس کی یہ ننھی ننھی بدعنوانیاں گرد ہو کر رہ جاتی ہیں۔ حیرت ہے کہ اہل فکر نے آج تک آندھی کو محض ایک غول بیابان کے روپ میں دیکھا اور اس کی ان حرکات سے چشم پوشی کی۔" [۸]

انشائیہ میں نادر تشبیہات و استعارات کا استعمال اپنے انداز میں کیا گیا ہے۔ انشائیہ میں تشبیہات کا استعمال اس کے انداز کو موثر بناتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ نگاری کے ساتھ اس قدر تعلق بنا رکھا ہے کہ ان دونوں کا ذکر ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہو گیا ہے اور ان دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر گزارا ممکن نہیں ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اردو انشائیہ کے باقاعدہ طور پر پہلے انشائیہ نگار تصور کیے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ابتدائی انشائیہ نگاروں نے اور بعد میں آنے والے انشائیہ نگاروں نے ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیہ کو اپناتے ہوئے اپنی منزلوں کی جانب رخت سفر باندھا۔ کسی عمارت کو بنانے سے پہلے بھی اس کے ڈھانچے کی تشکیل ضروری ہے اور اس کے بعد اس کے خدوخال کی نمائش ہوتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کے خدوخال پیش کیے اور جس بنا پر ان کے انداز و بیان اور فکری عناصر کی نشاندہی ہوتی ہے۔ انہوں نے انشائیہ کے اسلوب میں تشبیہ کا عنصر پنہاں کر کے انشائیہ کی خوبصورتی میں اضافہ کیا اور اس کے خدوخال میں روشنی بھر دی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیہ نگاری میں انہوں نے تشبیہ کو یوں بیان کیا ہے کہ:

"جانے اب کے بہار اتنے مختصر کیوں تھی یہ نہیں کہ باغ میں کوئی ہنگامہ برپا ہوا اور گل بلبل کی داستان دہرائی نہیں گئی یہاں تبسم سحر کے جھونکوں نے آدھ کھلی شرماتی ہوئی کلیوں کے گھونگٹ نہیں الٹے۔ یہ سب کچھ تو ہوا لیکن پھر بھی بہار اب کے برس کچھ معمول سے مختصر ہی تھی۔ وہ ایک نوخیز حسینہ کی طرح آمادہ رقص تو ہوئی تھی لیکن اس کے ہونٹوں سے گیت کا پورا بول بھی نہیں نکلا تھا اور اس کی پائل کی چھنکار نے ابھی بہار کے پجاریوں کو بیدار بھی نہیں کیا تھا کہ وقعتاً وقت کے بوڑھے دیوتا نے برہم ہو کر پردہ گرا دیا۔"[۹]

ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیہ نگاری میں ایک ایسا انداز پایا جاتا ہے کہ سلاست، زبان و بیان، گفتگو میں بے تکلفی اور لفاظی میں کفایت نمایاں نظر آتی ہے۔ "خیال پارے" کے باعث انشائیہ میں آنے والی تخلیقی اور ارتقائی تبدیلیوں نے ایک بااثر حلقہ تخلیق کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی دانشورانہ حیثیت سے کسی طرح بھی انکار ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے مختلف علمی و ادبی موضوعات پر ہمیشہ غور و فکر کی روش اختیار کی ہے۔ ان کے نزدیک انشائیہ شاعری کی طرح ایسی صنف ادب ہے جس کا تعلق ان کی داخلی کیفیت سے تھا اور ان کے نزدیک انشائیہ کے اسلوب میں انفرادیت کا ایک پہلو ان کی شخصیت میں تہذیب و تمدن کا موجود ہونا ہے۔ جس کا اظہار انہوں نے اپنی انشائیہ میں کئی طریقوں سے کیا ہے۔ چونکہ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی ابتدائی زندگی دیہات میں گزاری تھی۔ اس لیے ان کی شخصیت میں گاؤں کی تہذیب کی جھلک نظر آتی ہے اور جس سے ان کا دخلی پہلو انشائیہ کی زینت بنا رہتا ہے۔ انہوں نے تہذیب و روایات اور علاقائی لہجے کو انشائیہ میں ظاہر کیا ہے۔ دیہات سے شہر میں ہجرت کے بعد بھی انہوں نے اپنے لہجے میں دیہات کے اثرات چھوڑے ہیں۔ جو کہ ان کے فن پاروں میں نظر آتا ہے۔ انہوں نے فطرت کے مناظر کو اپنی قلم کی زینت بنایا۔ وزیر آغا اپنے آبائی شہر اور وہاں گزارے ہوئے وقت کی بنا پر قدرت کے مناظر کے بہت قریب تھے۔ اس لیے ان کے ان انشائیوں کا بنیادی عنصر فطرت ہے اور اس کے علاوہ ان کی انشائیوں میں کئی موضوعات ہونے کے باوجود فطرت کا داخل ضرور ہوتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیہ ادب کا احاطہ کیا جائے تو اسلوبیاتی تناظر میں ان کے موضوعات میں قدیم ادب اور داستانوی ادب کی جھلک بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ ہر تخلیق کار اپنے فن پاروں میں اپنے مشاہدات اور تجربات کو ضرور شامل کرتا ہے۔ اگرچہ یہ مشاہدات اور تجربات شعوری طور تخلیق میں شامل نہ بھی ہوں تو پھر بھی غیر شعوری طور پر ان کی تحریروں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ کسی بھی مصنف کے لیے اس کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کی اہمیت

واضح ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں میں داخلی اور خارجی پہلو پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے انشائیہ میں ادب کو بیان کیا ہے کہ کیسے ادب جنم لیتا ہے ادب کے مختلف زاویے کس طرح ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں؟ انہوں نے اپنے انشائیہ میں بیان کیا ہے کہ کس طرح ادب کی ایک صنف غزل نے قصیدے سے جنم لیا اور بتایا کہ کس ایک صنف کی روح دوسری صنف میں منتقل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیہ "غزل" میں بتایا ہے کہ ایک ادب کی صنف کیسے جنم لیتی ہے اور اور اس میں پہلی س کیسے تبدیلی واضح ہوتی ہے؟ نمونہ ملاحظہ ہو:

> ”نکتہ یہ ہے کہ غزل نے قصیدے کی پسلی سے جنم لیا ہے۔ پسلی سے پیدا ہونا اپنے اندر معنویت رکھتا تھا۔ نہ جانے کب سے غزل بے چاری قصیدے کی قید میں تھی، بالکل جیسے داستان کی نرم و نازک شہزادی ہیبت ناک دیو کے طلسم میں گرفتار ہو گئی تھی۔ مگر یہ قید و بند کی بات بھی شاید درست نہیں، کیونکہ غزل تو قصیدے کا اٹوٹ انگ تھی۔ اس کی لا تعداد پسلیوں میں سے ایک پسلی تھی۔ مگر پھر ایک روز یہ پسلی قصیدے کے ڈھانچے سے منحرف ہو گئی۔“ [۱۰]

انہوں نے رمز و ایماء کو انشائیے کے پیرائے میں باندھا ہے اور ایک الگ انداز میں گفتگو کا طریقہ پیش کیا ہے۔ کسی بھی ادیب کی زندگی میں داخلی اور خارجی پہلو اپنی اندر خوشی اور غم کا امتزاج لیے ہوتے ہیں۔ شاعر غم کے پہلو کو منتخب کر کے داد وصول کرتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیے میں امید اور نئی امنگ کو ابھرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے انشائیہ میں زندگی کے روشن پہلوؤں کو ابھارا ہے۔ انہوں نے لطیف زبان اور خود کلامی کی وسعت کو قارئین کی نظر میں ایسے بیان کیا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ منظر آنکھوں کے سامنے اور آواز کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا الفاظ کا چناؤ اور استعمال اس زیرک انداز میں کرتے ہیں ۔ انہوں نے عام واقعات کو بیان کرتے ہوئے علامتوں کا احسن انداز میں استعمال کیا ہے جس کو قاری محسوس کر سکتا ہے۔ انہوں نے ایک چرواہے کی زندگی کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اس کے پاس چھڑی کے لیے کفایت لفظی کا استعمال کیا ہے جیسے کوئی شاعر تخیل میں کھویا ہوا اپنی محبوبہ کی رنگ اور زاویوں کو بیان کر رہا ہے۔ انہوں نے ایک انشائیہ میں چرواہے کی چھڑی کے بارے میں جو کفایت لفظی، لطیف زبان اور استعاراتی زبان کا استعمال کیا ہے وہ کچھ یوں ہے:

> ”کیونکہ چرواہے کی قوت زر یا زمین میں نہیں بلکہ اس کی چھڑی میں ہے اور یہ چھڑی جادو کی وہ چھڑی ہے جو کبھی برق بن کر لہراتی ہے، کبھی شبنم بن کر اترتی ہے، کبھی خیال بن کر اڑتی ہے، کبھی خوشبو بن کر چاروں طرف پھیل جاتی ہے، اور

کبھی دوبارہ چھڑی بن کر ریوڑ کو ہانکنے لگتی ہے۔ بنیا، مزار کوشش کے باوجود اس
چھڑی پر قابض نہیں ہو سکتا کیونکہ قبضہ تو صرف مری ہوئی چیزوں پر کیا جا سکتا
ہے۔"

محبوب کی زلفوں اور پیرہن کی تعریف کرنا شاعرانہ انداز ہے اور الفاظ میں علامتوں کا استعمال بھی اسی طرز میں شامل ہے۔ انشائیہ میں علامتوں کا استعمال کو انشائی اسلوب میں انفرادی حیثیت دلانا ڈاکٹر وزیر آغا کے حصے میں شامل ہے اور اس عمل کو انہوں نے نہایت احسن انداز میں پیش کیا ہے۔

مجموعی طور پر دبستان سرگودھا کے جانشین ڈاکٹر وزیر آغا اردو ادب اور انشائیہ نگاری کے نامور انشائیہ نگار ہیں۔ ان کا انداز تحریر، انداز گفتگو کرنے کا سلیقہ اور اسلوب اعلیٰ مرتبے کا حامل ہے۔ انہوں نے اپنے فنی جمال اور اسلوبیاتی فکر و فن سے انشائیہ کے خد و خال کو جو جلال بخشی ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے جداگانہ حیثیت کی مالک ہے۔ ان کے ہاں طنز، فکر، فلسفہ، ذاتی مشاہدہ و تجربہ، انکشاف ذات، گہرا مطالعہ، اختصار اور موضوعات پر جدت نمایاں ہے۔

ب۔ غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کا اسلوبیاتی جائزہ:

دبستان سرگودھا اور وزیر آغا کے دبستان کی نمائندگی کرنے والے انشائیہ نگاروں میں غلام جیلانی اصغر کا نام نمایاں ہے۔ غلام جیلانی اصغر ایک بہترین شاعر، مزاح نگار، خاکہ نگار اور نقاد ہیں۔ اردو ادب کے ساتھ انگریزی ادب پر بھی انہوں نے بہت کچھ لکھا۔ ان کا انداز تحریر اور اسلوب نہایت سادہ اور سلاست سے بھرپور ہے۔ اردو ادب اور انشائیہ میں جدید اور نئے لہجے کے علمبردار ہیں۔ ان کے انشائیے میں ذہنی خلفشار، مسرت، سکون اور نئی سوچ جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کا مجموعہ "نرم دم گفتگو ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ جس میں انشائیوں کی تعداد بیس (۲۰) ہے۔ زیر نظر انشائی مجموعے کا پیش لفظ ڈاکٹر انور سدید نے لکھا اور غلام جیلانی اصغر کا اپنا ایک مضمون گفتگو کے نام سے کتاب کے آغاز میں شامل کیا گیا ہے۔

غلام جیلانی اصغر کے موضوعات غیر معمولی اور متنوع قسم کے ہیں یہی جیلانی صاحب کی انفرادیت ہے کہ انہوں انہی موضوعات پر انشائیے لکھے، جو انفرادیت کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ ہر انشائیہ میں ان کا انداز تحریر اور اسلوب منفرد اور غیر روایتی سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔

غلام جیلانی اصغر خوبصورت اور ہنس مکھ شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ان کی شخصیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ اپنی زندگی میں شگفتہ طبیعت کے مالک اور آزاد منش انسان نظر آتے ہیں۔ زندگی گزارنے

کے معاملے میں جو بشاشت اور شگفتگی کے نظریے کے قائل تھے، یہی شگفتگی و دل نشینی ان کے انشائیوں میں بھی بکھری ہوئی پڑی ہے۔اسلوب کی یہ صنعت ان کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہے۔ان کا انشائیہ "گالی دینا"اس کی بہترین مثال ہے۔"گالی دینا " جیسے موضوع پر لکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ یہ لفظ اور موضوع ہی غیر مناسب نوعیت کا سمجھا جاتا ہے۔انہوں نے اس کے لیے سادہ اور آسان الفاظ کی جگہ مشکل اور پیچیدہ الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ ان الفاظ کے استعمال سے بھی قاری تمام تاثرات کو سمجھنے میں دقت محسوس نہیں کرتا ہے۔انداز تحریر اور اسلوب میں ان الفاظ کے ساتھ شگفتگی اور بشاشت نظر آتی ہے۔نمونہ ملاحظہ ہو:

> ”گالی کی ساری خوبی اس کی جدت میں ہے۔انہوں نے ہابیل و قابیل کے جھگڑوں میں ناپسندیدہ الفاظ بھی استعمال کیے گیے ہوں لیکن وہ صرف ناپسندیدہ تھے اس لیے نتیجہ قتل عمد۔اگر گالی باوقار اور باوزن ہو تو پھر قتل کرنا حماقت نظر آتا ہے ۔۔۔۔۔وہ شخص جس نے More ever کہہ کر کو چار چاند لگا دیے تھے ایک ایسا ہی فنکار تھا۔ اگر وہ چاہتا تو رقیب سفید فارم کو قتل بھی کر سکتا تھا لیکن اس سادہ سا فعل سے اس کی ساری تخلیقی جدت اور اپج ختم ہو جاتی ۔“ [۱۲]

غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں میں بھی دوسرے انشائیہ نگاروں کی طرح انکشاف ذات کا عنصر بہت نمایاں ہے، بلکہ ان کے انشائیوں میں انکشاف کائنات کیا ہے جس میں اپنی ذات کو آئینہ بنا کر پوری کائنات کا عکس بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس حوالے سے "تسخیر کائنات" بہت ہی خوبصورت اسلوب کا انشائیہ ہے۔یہ مجموعہ ان کا نمائندہ انشائیہ ہے۔ جس میں انہوں نے ذات کو کائنات سے تعبیر کر کے اپنے فن کا اظہار کیا ہے۔جس میں غیر رسمی انداز گفتگو اختیار کیا گیا ہے۔ انہوں نے اس انشائیہ میں اسلوب کو بہترین انداز اور گفتگو سے تمام تر مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنے کی تلقین کی ہے۔ ان مصائب کا دلیری اور مردانگی سے سامنا کر کے آپ اپنی کائنات کو حاصل کر سکتے ہیں۔جو تسخیر کائنات جتنی اہمیت رکھتی ہے۔اس کے لیے "کوہ پیما"، "موجد"، "خلاباز"، "اور"جنگجو" جیسی شخصیات سے تشبیہ دینا بھی ہے کہ جیسے وہ اپنی تمام تر مجبوریوں کے باوجود مشکلات اور مصائب کا سامنا کر کے اپنی منزل کو پالیتے ہیں۔اسی طرح انسان اپنی زندگی میں تسخیر کائنات کرتے ہوئے کائنات کو تسخیر کر لیتا ہے۔اس کے لیے جامع اور دلکش الفاظ کے ساتھ خوبصورت انداز گفتگو استعمال کرتے ہیں۔ تسخیر کائنات کی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے اس کی تصویر کشی کچھ یوں کرتے ہیں:

”تسخیر کائنات کے مہم پر روانہ ہونے سے پہلے جب میں نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی تو مجھے سپیس کی کمی کا اندازہ ہوا۔ ایک کمرے میں میرے بیوی بچے سوتے جاگتے ہیں۔ دوسرے میں میں خود پناہ گزین تھا، تیسرے میں کچن اور باتھ روم تھا۔ اب میں اتنی بڑی کائنات کو کہاں رکھ سکتا ہوں؟ لیکن میں نے اس منصوبے کو بالکل ترک نہیں کیا تھا۔ بلکہ کر سکتے کی سطح سے اتر کر کبھی کر سکوں کے تہہ خانے میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ تہہ خانہ میری ذات کا وہ lumber room جہاں میں نے اپنی زندگی کی متائے عزیز کو چھپا کر رکھا ہوا ہے۔“ [۱۳]

غلام جیلانی اصغر کے انشائیہ میں انگریزی الفاظ جابجا ملتے ہیں، انگریزی رسم الخط کو انشائیوں میں استعمال کر کے اس کے اسلوب کو دلکش اور پروقار بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔" تسخیر کائنات " انشائیہ میں کائنات کی بے شمار وسعتیں بیان کی گئی ہیں۔ جس میں انہوں نے اس کے پوشیدہ گوشوں کا بھی انکشاف کیا ہے۔ جیلانی صاحب اس طرح کے موضوع منتخب کرتے ہیں۔ جس میں اپنی زندگی کے عملی تجربات و مشاہدات کو بنیاد بنا کر بڑی خوش اسلوبی سے انکشاف ذات سے انکشاف کائنات کی طرف سفر کرتے ہیں۔ وہ الفاظ میں توازن و اعتدال برقرار رکھتے ہوئے دلکش انداز تحریر اور اسلوب اختیار کرتے ہیں۔

غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں میں مغرب کی انشائیہ نگاری کا عکس نظر آتا ہے۔ اس لیے ان کے انشائیوں کی شعریات جامع ہیں۔ ان کا انداز تحریر، گفتگو اور اسلوب روایتی انداز سے مختلف ہیں۔ ان کے اسلوب میں سنجیدہ فکر اور فلسفہ کی بجائے ہلکا پھلکا طنز و مزاح کا رنگ نظر آتا ہے ان کے موضوعات معمولی نوعیت کے ہیں۔ اس لیے ان کے انشائیوں میں معمولی اور غیر معمولی چیزوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے خوش اسلوبی کے ساتھ اختصار پر مشتمل انشایئے تحریر کیے ہیں۔ زندگی کے تضادات و مشترکات سے معنی اخذ کرنا ان کی تخلیقی فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کی تحریری کائنات رنگوں کے امتزاج سے نمو پذیر ہوتی ہیں۔ سید ضمیر جعفری نے ان کی فنی شخصیت کا احاطہ ان الفاظ میں کیا ہے:

”پروفیسر غلام جیلانی اصغر کی تحریر ذہین بھی ہوتی ہے اور حسین بھی۔ بیک وقت بچوں کی طرح معصوم اور عالموں کی طرح دانا، علم و بصیرت اس کے ہاں مسکراتے نظر آتے ہیں۔ اس کا فکر اتنا گہرا اور اس کا انداز اتنا چھوتا ہوتا ہے کہ اس کو پڑھتے ہوئے مجھے اپنی بھوک بھول جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ مزاح کے اندر بیٹھ کر مزاح لکھتا ہے۔ اس کے ظرافت کا جادو ہمہ گیر ہے کہ بعض اوقات اہل علم پر

ذہین لوگوں کی نفسیات کی فضیلت کا گمان ہونے لگتا ہے۔میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر غلام جیلانی اصغر انشائیہ نہ لکھتا تو اردو ادب کتنا اداس ہوتا۔" ۱۴

غلام جیلانی اصغر کی شخصیت پر ڈاکٹر وزیر آغا کا اثر نمایاں ہے۔اس وجہ سے ان کے انشائیوں میں انفرادیت اور جامع پن واضح نظر آتا ہے۔مغربی انشائیوں کے خصوصی مطالعہ کرنے کے اثرات بھی واضح نظر آتے ہیں۔ الفاظ کا چناؤ اور فقروں میں ایک ربط و تسلسل انداز تحریر اور اسلوب کو پر کشش بناتا ہے۔ان کے انشائیوں میں "چہرے"، "بچہ پالنا"، "گالی دینا"، "تسخیر کائنات"، "کچھ جھوٹ کی حمایت میں"، "ذمہ داری"، "بستر پر لیٹنا" اور " مکان بنانا" خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے انشائیے پڑھنے سے قاری ہر بار موضوع کے کسی نئے گوشے اور پہلو سے واقف ہوتے ہیں۔اس سے فکر کا کوئی نیا پہلو اُجاگر ہوتا ہے۔اس طرح ان کے انشائیوں میں سوچ و فکر کی گہرائی بخوبی موجود ہے۔وہ اپنے انشائیوں میں قاری کے لیے نئے راستے اور نئی راہیں وا کرتے ہیں۔وہ چھوٹے اور مختصر موضوع کو نہایت قرینے سے پیش کرتے ہیں کہ بڑے سے بڑا اہل قلم ان کی اس خوبی کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کرنل محمد خان ان کے انشائیوں کے مجموعی اسلوب کو یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ خوبصورت، معنی خیز اور عام فہم بات کرتے ہیں۔وہ اپنے چھوٹے سے چھوٹے موضوع کو بیان کے ہنر سے ہیرا بنانے میں ماہر ہیں۔ ان کے انشائیے ان کی زندگی کے عملی تجربات و مشاہدات سے اخذ ہوئے ہیں۔غلام جیلانی اصغر زندگی کو قنوطیت کی بجائے خوش فکری کی نظر سے دیکھتے ہیں۔غلام جیلانی اصغر زندگی میں پابندیوں کو قبول نہیں کرتے بلکہ آزاد پنچھی کی طرح کھلی فضا میں سانس لینے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ زندگی کو ہشاش بشاش دکھاتے ہیں۔غلام جیلانی اصغر نے ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ انشائیہ کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔سجاد نقوی ان کی تقریروں کو زبانی انشائیہ کا بھی نام دیتے ہیں۔تاہم ان کے انشائیوں میں زندگی کے مختلف رنگ پوری آب و تاب سے موجود ہیں۔وہ اپنی تحریروں میں خارج سے داخل اور خارجیت سے داخلیت کے ساتھ تعلق جوڑ کر خیالات، عمیق مشاہدے، علمی بصیرت اور گہرے تجربات کا استعمال کر کے اپنے انشائیوں کو خوشنما اور قاری کے لیے قابل مسحور بنا دیتے ہیں۔وہ زندگی کے اُتار چڑھاؤ اور تضادات و مشترکات سے مواد اخذ کرتے ہیں اور نتیجہ خیزی سے قاری کو آگاہ بھی کرواتے ہیں۔ ان کے ہاں فطرت سے گہرا لگاؤ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں میں انکشاف ذات ،اختصار ،غیر رسمی انداز گفتگو ،شگفتگی اور فطرت سے وابستگی اسلوب کو پر کشش اور جاذب بنانے کے لیے اپناخاص کردار ادا کرتے ہیں۔ مدلل انداز تحریر کی بجائے سادگی اور سلاست سے نظریے اور افکار کو بیان کیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ وزیر آغا کے بعد دبستان سرگودھا اور انشائیہ نگاروں میں خصوصی منصب پر فائز نظر آتے ہیں۔

ج۔ مشتاق قمر کے انشائیوں کا اسلوبیاتی جائزہ:

دبستان سرگودھا کے نمائندہ انشائیہ نگار مشتاق قمر کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ مشتاق قمر بذات خود انگریزی کے استاد تھے اور انگریزی ادب سے خصوصی لگاؤ رکھتے تھے۔ڈاکٹر وزیر آغا کی خصوصی درخواست پر انہوں نے اردو ادب میں انشائیہ لکھنے کی ابتدا کی، جبکہ اس سے پہلے مشتاق قمر افسانے اور طنز و مزاح کی تحریریں تحریر کیا کرتے تھے۔انگریزی ادب سے خصوصی لگاؤ کی وجہ سے ان کے انداز فکر اور تحریروں میں انگریزی ادب کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اس لیے اردو ادب میں مشتاق قمر کے انشائیہ منفرد اور جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ مشتاق قمر تواتر کے ساتھ انشائیہ لکھنے والوں میں سے ہیں۔ان کا پہلا انشائیوں کا مجموعہ ۱۹۷۰ء میں ''ہم ہیں مشتاق'' کے نام سے شائع ہوا۔ ان کو جدید دور کے انشائیہ کے بانیوں میں شامل کرنے تک ڈاکٹر وزیر آغا کا ہاتھ ہے،ڈاکٹر وزیر آغا نے ''انشائیہ کے خدوخال'' کو مشتاق قمر کے نام سے منسوب کیا۔وہ آغاز سے طنزیہ مضامین لکھتے آرہے تھے اس وجہ سے ایک مدار سے نکل کر دوسرے مدار میں آنا بے حد مشکل تھا۔انہوں نے ہمت نہ ہاری اور چار برس تک مسلسل کوشش کر کے انشائیہ لکھنے میں کامیاب ہوگئے۔وزیر آغا نے انشائیہ ''چھتری'' کو بارش کا پہلا قطرہ قرار دیا جو ۱۹۶۶ء میں رسالہ اوراق میں شائع ہوا۔۱۹۶۹ء تک اوراق کے ہر شمارے میں ان کا انشائیہ چھپتا رہا اور فروری ۱۹۷۰ء تک ''ہم ہیں مشتاق'' کے نام سے انشائی مجموعہ پیش کیا اس مجموعے کا دیباچہ پہلا پتھر انور سدید نے لکھا۔''ہم ہیں مشتاق'' میں چودہ انشائیے شامل ہیں جن کے عنوانات یہ ہیں۔بال کٹوانا، چھتری، بیٹھنا، آئس کریم کھانا، دھوپ کھانا، تبدیلی نام، کوہ پیمائی، لونا نہم، بھول جانا، بڑھاپا، اپالو ٹریجڈی، کچھ نیند کی مذمت میں، شہرت کی مخالفت میں اور مرزا غالب زندگی کی ساتویں جہت ہیں۔

مشتاق قمر اردو ادب میں جدید انشائیہ نگار کے نام سے جانے جاتے ہیں۔انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانوی ادب سے کیا اور افسانوں کے دو مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ان کا انشائیوں کا ایک مجموعہ ''ہم ہیں مشتاق'' کے نام سے شائع ہوا۔ مشتاق قمر کے انشائیوں کے حوالے سے سائرہ بتول لکھتی ہیں :

> ''انشائیہ کے شعریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر ان کے فن پاروں کا تجزیہ کیا جائے تو
> یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ انہوں نے طنز و مزاح سے دامن چھڑا کر انشائیے

کی اصل روح تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ان کے انشائیوں میں اس کی ہلکی سی لہر چلتی ہے۔ اس لہر کو ان کے فلیپ نگار عارف عبدالمتین نے ایک خاص نوعیت کے فلسفیانہ اسلوب "تدبیر" کا نام دیا ہے۔" [۱۵]

مشتاق قمر واقعی ایک جداگانہ خیالات و افکار کے مالک ہیں۔ فطرت پرستی ان کی تحریروں پر غالب رجحان ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے انشائیوں میں دیگر کئی بنیادی رجحانات بھی ملتے ہیں۔کسی بھی تحریر میں فطری شناسی انشائیہ کو مزید خوبصورت اور نکھارنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔فطرت سے محبت ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان میں موجود ہوتا ہے۔ فطرت شناس انشائیہ نگار اپنی فطرت پرستی سے قاری کو متاثر کرنے میں جلد کامیاب ہوتا ہے اور فطرت پرستی کی وجہ سے انداز تحریر اور اسلوب پرکشش اور دل نشین ہو جاتا ہے۔ایک سچے اور کھرے انسان کا فطرت سے گہرا ربط ہونا فطری عمل ہے۔ وہ خوبصورت نظاروں سے لطف اندوز ہو کر تسکین محسوس کرتا ہے۔اسی طرح ایک قاری فطرت پرستی ،خوبصورت نظاروں اور مناظروں کو پڑھ کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ایک قاری، فطرت شناس اور انشائیہ نگار احساسات و جذبات کو اپنے اندر اتار کر دلکش نظاروں میں کھو جاتا ہے۔

مشتاق قمر کے انشائیوں میں فطرت سے وابستگی اور شگفتگی پیدا کرنے کا درس ملتا ہے۔ان کے انشائیہ "دھوپ کھانا" فطرت کی عکاسی کرتا ہے۔اس انشائیہ میں محض دھوپ سینکنے کی بجائے اس کے بے کراں فطرت کے حسن لازوال سے ہم آغوش ہونا، ایک اعلیٰ فعل بن گیا ہے۔اس ضمن میں اس انشائیہ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "دیگر موسموں کی طرح دھوپ کا ایک موسم ہوتا ہے۔دھوپ کا یہ موسم چپکے سے آتا ہے اور اس خاموشی سے گزر جاتا ہے۔اس میں پھول بھی کھلتے ہیں۔کلیاں بھی چٹکتی ہیں۔درخت سرسبز جامے اوڑھتے ہیں اور فطرت کا بے رحم ہاتھ ان سے شگوفے اور کلیاں بھی چھین لیتا ہے۔لیکن اس سے دھوپ کے حسن اور پرکاری میں کوئی فرق نہیں پڑتا، جس "دھوپ" کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ ایک ایسی پرمسرت کیفیت کا نام ہے جو ہر صبح آپ کے دروازے پر دستک دیتی ہے اور جب آپ دروازہ کھولتے ہیں تو کسی تکلف کے بغیر اندر آجاتی ہے۔" [۱۶]

مشتاق قمر کے تمام انشائیوں میں فطرت پرستی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔۔ان کے انشائیوں کے موضوعات زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ فطرت اور زندگی جیسے موضوعات ان کی تحریروں کا حصہ بنتے ہیں۔ اپنے انشائیہ میں وہ زندگی کے کسی ایک پہلو یا رخ کا احاطہ کرتے ہیں ویسے بھی انشائیہ میں کسی ایک پہلو کو ہی بیان کیا جاتا ہے۔ ان کا ایک انشائیہ "بھول جانا" ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز اور دلکش اسلوب کے

ساتھ زندگی کا ایک رخ بیان کرتا ہے۔ "بھول جانا" ایک حقیقت نہیں بلکہ نعمت ہے۔اس سے نقصانات سے زیادہ فوائد اور خوشیاں ملتی ہیں۔اس کے لیے انھوں نے اکثر مقامات پر انگریزی الفاظ کو استعمال کیا ہے۔بلکہ ان کے تمام انشائیوں میں انگریزی الفاظ ملتے ہیں "بھول جانا" منفی پہلو ہے مگر مشتاق قمر نے اپنے خیالات و افکار کے فن سے اسے مثبت پہلو کے طور پر پیش کیا ہے۔بھول جانا ایک فطری عمل ہے۔ فطرت شناس نے فطری موضوعات کو چن چن کر ان پر دلکش اور خوبصورت انداز میں اپنے افکار کو قلمبند کیے ہیں۔ہر انشائیے کی طرح اس انشائیے میں سادہ اور آسان الفاظ کا چناؤ اور انگریزی الفاظ کی آمیزش نے ان کے اسلوب کو پر کشش بنا دیا ہے۔الفاظ کا چناؤ اور جملوں کی خوبصورتی ربط کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"بھول جانے والے حضرات انفرادی اجتماعی دونوں صورتوں میں ہمیشہ ہی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔خاندان میں وہی بزرگ مقبول عام ہو سکتے ہیں جو اکثر و بیشتر آپ کے کمرے میں نقدی یا خورد و نوش کی اشیاء رکھ کر بھول جاتے ہیں ا۔اور اگر آپ ٹیوشن نہیں کرتے تو یقینا مجھ سے اتفاق کریں گے کہ کمزور یاداشت رکھنے والے بچے ہی دراصل بھولے بھالے اور پیارے کہلانے کے مستحق ہیں۔تھوڑی دیر کے لیے ان بزرگوں اور عزیزوں کا تصور ذہن میں لا کر دیکھ لیجئے جو یاد رکھنے کے مرض میں مبتلا ہیں اگر آپ کو اپنا ناک نقشہ بھی نہ بھول جائے تو میرا ذمہ۔"[۱۷]

مشتاق قمر کے اس انشائیے میں ان کی شخصیت ، مزاح اور طول کلام کی خصوصیات رچی بسی ہیں۔دبستان سرگودھا کے اس انشائیہ نگار کے تمام انشائیوں کا مجموعی جائزہ لیں تو مشتاق قمر نے اسلوب کی شعریات کو مدنظر رکھتے ہوئے انکشاف ذات ، شگفتگی ، عدم تکمیل ، غیر رسمی گفتگو اور تازگی سے انشائیہ کو تشکیل دیا ہے۔ان کے اسلوب میں دلیل، منطق و محاورات کی بجائے سیدھا سادہ انداز بیاں نمایاں ہے۔وہ سادگی اور سہولت سے آسان اور سادہ الفاظ میں اپنا نقطہ نظر بیان کر جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مشکل اور پوشیدہ الفاظ کی گنجائش نہیں ہے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے آسان اور سادہ انداز تحریر اختیار کرتے ہیں۔

دبستان سرگودھا کے منفرد انشائیہ نگار مشتاق قمر نے اپنے قلم کے فن سے نئے مفاہیم کو سامنے لائے ، اسلوب کی تازگی، پرانی تشبیہوں اور استعاروں میں جان ڈال کر تحریر کو ذی شعور بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ان کے قلم کی بدولت ہی چند الفاظ کا ایک ایسا جال تیار ہو جاتا ہے جو موضوع کو خود ہی آگے کی طرف بڑھنے میں معاون و مددگار ہے۔وہ معمولی کو غیر معمولی اور غیر معمولی کو معمولی بنانے کے فن سے مالا مال ہے۔یہ فن اسلوب کو تازگی بخشتا ہے جس کی مہک تادیر قائم ہے۔

مشتاق قمر کے انشائیہ کے اسلوب پر انگریزی ادب کی اسلوب کے رنگ کے بارے میں انہوں نے مانتین، بیکن، ایڈیسن، سیٹل اور چارلس کے اسلوب سے موازنہ کیا ہے۔مشتاق قمر کے انشائیہ تعداد کے لحاظ سے کم ہی سہی مگر معیار اور دل آویزی کے اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں ۔منفرد انداز بیاں اور دلکش اسلوب سے قاری لطف اندوز ہوتا ہے۔ الفاظ کی ظاہری اور باطنی حسن سے کمال کی مرقع کشی کرتے ہیں۔مشتاق قمر کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔منفرد اور جداگانہ سلوب اور انداز تحریر ان کی اصل پہچان ہے۔مشتاق قمر نے اپنے انشائی مجموعے کا عنوان "ہم ہیں مشتاق" غالب کے ایک شعر ٹکڑے سے لیا ہے اور یہ اپنے طور پر اچھوتا نظر آتا ہے اس میں وہ حقیقت پوشیدہ تھی جو ہر حساس انسان میں موجود ہوتی ہے۔مشتاق قمر نے عام زندگی اور معاشرے سے موضوعات کا انتخاب کیا ہے آپ کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔تاہم جس دور میں مشتاق قمر نے انشائیہ لکھنا شروع کیا وہ انشائیہ کا زریں دور تھا۔ان کے انشائیوں پر کافی تنقید بھی ہوئی مگر انہوں نے آغاز میں ہی بیشتر کمزوریوں پر قابو پالیا اور اس کی راہ میں ہر آنے والی مشکلیں خود دم توڑ گئیں۔ان کے انشائیوں کی اپنی انفرادیت ہے ان کے انشائیوں میں سوچ کی ہلکی سی لہر پائی جاتی ہے اور اس لہر کو ان کے فلیپ نگار عارف عبدالمتین نے ایک خاص نوعیت کے فلسفیانہ اسلوب تدبیر کا نام دیا ہے۔مشتاق قمر نے تہذیب کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ انسان اور مظاہر کی فطرت کو بھی موضوع بنایا ہے۔انشائیہ "بال کٹوانا" میں قدیم اور جدید تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ مشتاق قمر زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنا موضوع بناتے ہیں وہ زندگی کی پوری کہانی کو بیان نہیں کرتے بلکہ زندگی کے ایک پہلو کو اپنا موضوع بناتے ہیں اور اس پہلو کے چھپے ہوئے گوشوں کو اپنا موضوع بناتے ہیں وہ اپنی قوت متخیلہ سے برابر کام لیتے ہیں اور موضوع کو محسوس کرتے ہیں اور پھر اس موضوع کے مخفی مفہوم کو سطح عام پر لانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

مشتاق قمر عام معاشرے سے اپنے موضوعات کو منتخب کرتے ہیں مگر آپ نے معمولی موضوعات سے نئے معنی دریافت کر کے معمولی موضوعات کو بھی خاص کر دیا ہے اس طرح آپ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اپنا قلم ریز کرتے ہیں "اپالو ٹریجڈی" میں مصنف توہمات اور توہم پرستی کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں اور سائنسی ایجادات کو

رد کرتے ہوئے توہم پرستی کا ساتھ دیتے ہیں مشتاق قمر انشائیے میں اپنے علاقے کے بارے میں بتاتے ہیں کہ وہاں لوگ شادی بیاہ گویا ہر موقعے پر لوگ دیا جلانا نہ بھولتے۔عام طور پر دیہاتی علاقوں میں توہم پرستی کا رحجان زیادہ ہوتا ہے قبرستان کی سب سے پرانی قبر پر دیا جلانا، کالی بلی کا راستہ کاٹنا، کوے کے بولنے پر مہمان کی آمد اور زیتوں کی شاخ امن کا باعث وغیرہ وغیرہ۔

مشتاق قمر زندگی کے زاویے کو اپنے رخ سے دیکھتے ہیں اور وہ اپنے انشائیوں میں تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ پیش کرتے ہیں۔مشتاق قمر کی زیرک آنکھ اپنے عمیق مشاہدات، تجربات کے نچوڑ، فطرت اور اشیاء کے مظاہر سے ایک جال تیار کر کے لاشعور کے سمندر میں ڈال دیتی ہے اور گزرتے وقت کے ساتھ یہ چمکدار موتی انشائیہ کی شکل میں ڈھل جاتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں گہری سوچ اور فکر کی گہرائی پائی جاتی ہے ان میں سستا پن نہیں جھلکتا وہ اپنے انشائیوں میں دوستانہ انداز سے اپنی زندگی کے تجربات کو بیان کرتے ہیں اور اس بات کا اندازہ ان کے شگفتہ انداز سے ہوتا ہے۔ مشتاق قمر کے انشائیوں میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے اور ان کے انشائیوں میں ان کی شخصیت جھلکتی نظر آتی ہے۔ مشتاق قمر اپنے منتخب شدہ الفاظ سے ایک ایسا جال بنتے ہیں جس میں موضوع کو آگے بڑھنے میں مدد ملتی ہے اور قاری پر سحر طاری ہو جاتا ہے اور یہ نئے مفاہیم کی ترسیل کا کام بھی کرتا ہے مشتاق قمر آسان سے آسان ترین الفاظ کا چناؤ کر کے اپنے موضوع کو پیش کرتے ہیں وہ اپنے موضوعات کی تہ میں جا کر نئے معنی دریافت کر کے قارئین کو پیش کرتے ہیں اس طرح وہ عام ہونے کے باوجود بہت اہم ہو جاتے ہیں وہ عام زندگی اور ہمارے معاشرے سے موضوعات کو چنتے ہیں۔ تاہم مشتاق قمر کے انشائیے ان کی شخصیت سے مختلف نہیں ہیں بلکہ ان کی ذات ہی ان کے انشائیوں میں جھلکتی ہے۔انہوں نے جتنا بھی لکھا معیاری لکھا اور انہوں نے کسی بھی دلیل کے بغیر سیدھے سادھے انداز میں اپنی نقطہ کو پیش کیا۔

د۔ جمیل آذر کے انشائیوں کا اسلوبیاتی جائزہ:

جمیل آذر نئی نسل کے انشائیہ نگاروں میں منفرد لب ولہجہ، انداز فکر کی ندرت اور جدید انشائیہ نگار ہیں ۔ پاکستان میں انشائیہ نگاری کی تحریک کو ڈاکٹر وزیر آغا کی رہنمائی حاصل رہی ہے۔ نئے انشائیہ نگاروں کے فن کو متعارف کروایا گیا۔ اس تحریک میں ایک نیا نام جمیل آذر کا ہے۔ جمیل آذر نے نہ صرف اعلیٰ اور معیاری انشائیوں کی تخلیق کی بلکہ اس کی تنقید اور تفہیم کا بھی فریضہ انجام دیا اور تخلیقی و تنقیدی ہر دو سطحوں پر اس صنف کے نبض شناس کی حیثیت سے انشائیہ کے فروغ کے سلسلے میں قابل قدر کام انجام دیا۔تحریک خواہ سماجی ہو یا ادبی وہ خود سے وابستہ لوگوں کی شخصیتوں اور سوچ کے

کیلے گوشوں کو تراش کر اپنے رنگ میں ڈھال لیتی ہے ۔ ان کے ذہنوں میں اپنی سوچیں رکھ کر ان کی زبانوں پر اپنا کلمہ جاری کرتی ہے، چنانچہ تحریکات سے وابستہ افراد تحریک کی زندگی جیتے ہیں۔ تاہم آپ کا پہلا انشائیہ "برساتی" کے نام سے رسالہ لیل ونہار میں ۲۹ مارچ ۱۹۵۹ء میں چھپا۔ جمیل آزر کے تین مجموعے منظر عام پر آئے ہیں۔ "شاخ زیتون" ۱۹۸۱ء، "رت کے مہمان" اپریل ۱۹۹۴ء اور "وقت اے وقت" ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئے۔ جمیل آزر نے ۵۶ انشائیے لکھے جن میں سے ۵۵ ان کے انشائی مجموعوں میں جبکہ ایک انشائیہ تحفے ماہنامہ الحمراء میں ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔ جمیل آزر نے زندگی کے عام موضوعات پر قلم اٹھایا ان کے ہاں موضوعات کی رنگا رنگی ہے انہوں نے معاشرے کے چھوٹے چھوٹے موضوعات پر لکھا اور اس سے ان کے انشائیوں میں حیرت انگیز مسرت در آئی۔ جمیل آزر زندگی کی حقیقتوں کو بے باکی سے آر پار دیکھتے ہیں اور زندگی کی تفسیر عمدہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔ مصنف انشائیہ "واشنگ مشین" میں روحوں پر جمی میل اور دلوں میں کینہ، بغض اور منافقت کو دھونے اور صاف کرنے کے لیے واشنگ مشین کی ایجاد جیسا انقلاب لانے جیسے اچھوتے موضوع کو احاطہ تحریر میں لاتے ہیں۔ مصنف واشنگ مشین کو یہاں علامت کے طور پر برتتے ہیں۔ معاشرے میں بھی بہت میل کچیل اور کثافت بھیانک روپ میں پاؤں پسارے نظر آرہی ہے اور مصنف اپنی چھڑی کی معیت میں معاشرے کی میل کچیل دور کرنے کے لیے نکلتے ہیں۔ جمیل آزر کا انداز بیان، گفتگو اور تحریر دوسروں سے مختلف ہے۔ انشائیہ میں اس نئے انداز کو اپنانے والے ابتدائی ذہنوں نے انفرادیت کے جو نقوش ثبت کئے، نئے لوگوں میں ان کی پیروی کے نتائج ظاہر ہوئے اور اس طرح مخصوص انداز تحریر واسلوب کی بنیاد رکھی گئی۔ جمیل آذر اس تحریک کے سابقین میں ہونے کے باوجود آج بھی ان کا ہر انشائیہ ان کے لہجے کی کھنک اور منفر د انداز تحریر کے سبب الگ پہچانا جاتا ہے۔ اپنے انشائیہ " واشنگ مشین "میں لکھتے ہیں۔

> "بچے مشین کے ارد گرد کھڑے خوشی سے تالیاں بجا رہے تھے لیکن جب میں ان کی مسرت کے مہین آنچل میں سے باہر ماحول کو دیکھتا ہوں تو میری نگاہیں دھندلا کر واپس آجاتی ہیں اور میں سوچتا ہوں کاش میرے گھر کے باہر کوئی ایسی واشنگ مشین نصب ہو جائے جس سے گزر کر معاشرہ کے سارے غلیظ اور بد بودار پیراھن ، صاف ستھرے ، اجلے اور سپید ہو جائیں روحوں پر سے صدیوں کی جمی ہوئی میل اتر جائے اور دلوں سے بغض ، کینہ اور منافقت کی بساند دھل جائے تا کہ عظیم انقلاب کی پھلجھڑیاں جو میں اپنے ننھے سے گھر کے اندر دیکھتا ہوں ، باہر بھی دیکھ سکوں۔" [۱۸]

جمیل آذر کے فن انشائیہ نگاری پر گرفت مضبوط ہے۔ ان کی زبان اس کار خیر میں معاون و مدد گار ثابت ہوئی ہے ۔ جمیل آذر بطور انشائیہ نگار اس لئے کامیاب ہیں کہ انھیں لفظ کو گویائی عطا کرنے کا فن آتا ہے۔ ان کے انشائیے ان کی علمیت اور ژرف نگاہی کے باوجود قاری کو مرعوب نہیں کرتے بلکہ اسے رفاقت اور اپنائیت کا احساس دلاتے ہیں ۔

جمیل آذر کے انشائیوں کے مجموعے " شاخ زیتون ۱۹۸۱" میں شامل انشائیوں میں روز مرہ کی زندگی سے متعلق عمومی باتوں سے انشائیہ نگار کے خیال کا سفر شروع ہوتا ہے اور بڑی سبک روی کے ساتھ انکشافات کی حیرت آمیزی سے موضوع کو دلچسپی سے ہمکنار کر دیتا ہے ۔ واشنگ مشین، مچھلی کا شکار اور شاخ زیتون میں گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ہی ایک بے تکلف شخصیت بھی سامنے آتی ہے۔ نیم پلیٹ ، اخبار پڑھنا ، تمباکو نوشی اور مانگے کا سگریٹ وغیرہ انشائیہ نگار کی دل آویز شخصیت کے اظہار کی کامیاب کوشش قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کا اسلوب ہے۔جو قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔ انداز تحریر اور انداز بیان پر کشش اور جاذب ہے۔

جمیل آذر کے انشائیوں میں اسلوب کی پر کشش ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے افراد اور اشیاء کو بنیاد بنا کر اپنا منفرد نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ جو عصری زندگی پر ایک بلیغ تبصرہ ثابت ہوا ہے یوں تو نئے انشائیہ نگاروں کے ہاں اپنے اطراف کی زندگی پر نظر ڈالنے اور نئی اور انوکھی ایجادات کو موضوع بنانے کا رجحان عام ہے لیکن جو چیز جمیل آذر کی امتیازی خصوصیت قرار دی جاسکتی ہے وہ عصری زندگی کے مظاہر کی پیش کش سے ایک قدم آگے بڑھ کر روح عصر تک رسائی کی وہ کوشش ہے جہاں فن کو اعلیٰ معیار اور دوامی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور جو فن کا مطمح نظر بھی ہے کہ در اصل تیسری آنکھ کی کار فرمائی بھی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ ان کے انشائیہ "نیم پلیٹ "میں اسلوب کا نمونہ ملاحظہ ہو:

> "تعجب ہے کہ افلاطون نے اپنے فلسفہ اعیان نا مشہود میں نیم پلیٹ کا کوئی ذکر نہیں کیا ، ویسے مجھے افلاطون کے نظریہ نقل پر مکمل اعتماد ہے فی الواقع ہم اصل کی نقل نہیں تو اور کیا ہیں اور یہ نیم پلیٹ لوح محفوظ کی ایک نقل ہی تو ہے ۔ پس جو تبدیلی نیم پلیٹ پر ظہور میں آتی ہے وہ پہلے لوح محفوظ میں پیدا ہوتی ہے۔ تغیر اور تبدل ایک فطری اور لازمی

امر ہے ۔ یہ تغیر و تبدل کا خوف ہی تو ہے جس نے مجھے آج تک یہ موقع نہیں دیا کہ میں گھر کی چار دیواری کے باہر کوئی خوبصورت نیم پلیٹ آویزاں کر دوں ۔ ویسے میں نے ابھی تک نیم پلیٹ آویزاں کرنے کی کوئی خاص ضرورت محسوس بھی نہیں کی ۔" [۱۹]

جمیل آذر کے انشائیوں میں بے تکلف گفتگو کی کیفیت اور غیر رسمی انداز نمایاں ہے۔ ان کے انشائیے ان کے ہم عصر انشائیہ نگاروں کی تحریروں سے مختلف قسم کی فضا اور تاثر کا احساس دلاتے ہیں۔ یہی ان کے اسلوب کی انفرادیت ہے۔

ہ۔اکبر حمیدی کے انشائیوں کا اسلوبیاتی جائزہ:

اردو ادب میں انشائیہ صنف میں اکبر حمیدی کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔انہوں نے اپنے انشائیوں میں اسلوب پر خاص توجہ دی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے انشائیوں کی تحریروں میں کشش پائی جاتی ہے۔ قاری جب کوئی تحریر پڑھنا شروع کرتا ہے تو وہ اس میں گم ہو جاتا ہے اور آخر تک مکمل پڑھ کر سانس لیتا ہے۔اکبر حمیدی اپنے انشائیوں میں مختلف جزیروں کی سیر کروا کر انسان کے مختلف رویوں سے ہمیں آشنا کرواتے ہیں وہ کائنات کے مظاہر اور کائنات میں موجود ساری اشیاء کو جزیرے کا نام دیتے ہیں۔اکبر حمیدی کے موضوعات رنگا رنگ ہونے کے ساتھ ساتھ وحدت تاثر کا اثر لیے ہوئے ہیں۔وہ افسانوی انداز میں معمولی اور غیر معمولی چیزوں کو موضوع بنا کر سادہ اور شگفتہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ قاری جیسے جیسے انشائیہ پڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے وہ زمان و مکان پر غور و فکر کرتا جاتا ہے۔ان کے انشائیوں میں ایک قسم کی مشترک پائی جانے والی چیز انسان ہے اور وہ ہر طرح سے ان کے انشائیوں میں موجود ہے کہیں انہیں جزیرے کہا گیا ہے، کہیں منفی مثبت صورت میں پیش کیا گیا ہے کہ انسان تسخیر کائنات کرتا ہے اور کہیں فاختہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور کہیں عقاب پر جھپٹتا ہے اور کہیں درویش کی صورت میں نظر آتا ہے اور کبھی بڑے آدمی کی صورت اور کبھی چھوٹے آدمی کا روپ اختیار کر لیتا ہے لہٰذا اکبر حمیدی مختلف موضوعات کے موضوع انسان کو ہی بناتے ہیں کہ اس کائنات کا مرکزی نکتہ بنی نوع انسان کو ہی بنایا گیا ہے۔

اکبر حمیدی سمندر کے جزیروں سے بات کرتے ہوئے مظاہر قدرت کو بھی موضوع بناتے ہیں اور قاری اس سے روحانی مسرت حاصل کرتا ہے۔ان کے انشائیوں کے پہلے مجموعے "جزیرے کے سفر" میں اکیس انشائیے شامل ہیں۔اکبر حمیدی کا دوسرا انشائیوں کا مجموعہ "تتلی کے تعاقب میں ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے کا دیباچہ پروفیسر نظیر صدیقی نے لکھا ہے۔اکبر حمیدی کے انشائیوں میں مزاح کی رنگا رنگی اور زندگی کی رونقیں دیکھی جاسکتی

ہیں اور ان کے موضوعات کسی بھی قسم کے تعصب سے خارج ہیں۔وہ گہری عصری آگہی رکھتے ہیں اور یہ ہی ان کی انفرادی خوبی ہے۔اکبر حمیدی کا تیسرا مجموعہ "جھاڑیاں اور جگنو" ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔

اکبر حمیدی کے انشائیوں کا چوتھا مجموعہ "پہاڑ مجھے بلاتا ہے" ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا اس مجموعے میں اٹھارہ انشائیے شامل ہیں۔جن کے عنوانات یہ ہیں۔اکبر حمیدی کا پانچواں مجموعہ "اشتہاروں بھری دیواریں" ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں اکیس انشائیے شامل ہیں۔اکبر حمیدی خارج سے اپنے موضوعات اکھٹا کرتے ہیں۔اکبر حمیدی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور معاشرے کے دیگر موضوعات پر بھی بات کرتے ہیں اور بعض جگہ پر زندگی کے تلخ حقائق کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔ان کے انشائیوں میں آغاز سے اختتام تک دلچسپی کا عنصر پایا جاتا ہے جو قاری کے لیے کشش کا باعث بنتی ہے۔وہ گہری فکر اور سوچ کے ساتھ فکر کے نئے دریچے وا کرتے ہیں جو کہ قاری کے لیے مسرت کا باعث ہے۔

اکبر حمیدی اپنی شخصیت میں کائنات کا عکس موجود پاتے ہیں۔ان کے انشائیوں کا اختتام کسی سوال، سوچ اور کسی فکر پر کیا ہے جس سے قاری کے لیے تشنگی کا سامان بھی پیدا ہوتا ہے اور قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔اکبر حمیدی نے انشائیہ کو عصری آگاہی سے منسلک کیا اور معاشرے کے مسائل کو موضوع بنایا اس طرح انہوں نے انشائیہ میں ایک نئے رُخ اور ایک نئے پہلو کو تلاش کیا ہے۔ان کے معاشرتی مسائل کو نمایاں کرنے والے انشائیوں میں کامیابی، چڑیا گھر، گھنٹہ گھر، جنگل، آزادی، ذمہ داری، گولڈن چانس، انتظار گاہ وغیرہ شامل ہیں۔وہ معاشرے کے مسائل پر کھل کر بات کرتے ہیں۔وہ بعض جگہوں پر ناصح اور خطیبانہ انداز بھی اپناتے ہیں اکبر حمیدی دلائل کے ساتھ اپنی بات کو پیش کرتے ہیں ان کے انشائیوں میں طنز کی کاٹ بھی پائی جاتی ہے جو کہ مضامین کی خاصیت سمجھی جاتی ہے ان کے انشائیوں میں ان کی سوچ مثبت اور پختہ نظر آتی ہے۔ان کے نئے نئے خیالات اور سوچ قاری کی قوت متخیلہ پر مہمیز لگاتی ہے۔وہ چیزوں کی اچھائی اور برائی دونوں کو سامنے لاتے ہیں کہ سکے کے دونوں رُخ کو دیکھا جا سکتا ہے۔اکبر حمیدی اپنے انشائیہ مجموعہ "ریشم کا ٹکڑا" میں قاری کی ایسے ہی الفاظ کے ساتھ دلچسپی اور توجہ حاصل کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ان کے الفاظ کا چناؤ اور تجسس قاری کو اپنی طرف مائل کرتا ہے۔ان کے الفاظ کی تازگی، گفتگو اور ترتیب اسلوب کو چار چاند لگاتی ہے۔ ان کا بہترین مثالوں سے اسلوب کو جاندار اور پر کشش بنانے میں کوئی ثانی نہیں ہے۔ اس انشائیہ کے آغاز میں رقمطراز ہے:

> "چہرے دیکھنا میرا دل پسند مشغلہ ہے۔بعض چہروں پر نظر جاتی ہے تو پھر واپس نہیں آتی، بعض چہروں کو چھو کر نظر اتنی تیزی سے واپس آتی ہے، جیسے وہاں بجلی کا ننگا تار تھا۔اس کی مثال بالکل اسی طرح ہے جیسے کئی دفعہ ہم ٹی وی کھولتے اور کھولتے ہی بند کر دیتے ہیں مگر کئی دفعہ ہم ٹی وی کھولتے ہیں محض ایک آدھ نظر ڈالنے کے لیے لیکن پروگرام اتنا دلچسپ ہوتا ہے اور سکرین پر منظر اتنا دلکش ہوتا ہے کہ ہم دیکھتے ہی چلے جاتے ہیں۔"[۲۰]

الفاظ کے ساتھ ساتھ جملہ بندی بڑی مہارت سے کرتے ہیں۔ الفاظ کے چناؤ میں خوبصورتی جملہ بندی میں نظر آتی ہے اس لیے ان کے اسلوب میں جملہ بندی جامع ہوتی ہے۔ ایک اچھے اور بہترین ادیب کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ اس کے ادب میں تحریروں میں قاری کے لیے کچھ سمجھنے کے لیے نشانیاں موجود ہوتی ہیں۔ اس کا انداز تحریر اس طرح کا ہونا چاہیے کہ وہ باتوں باتوں میں قاری کو نصیحت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے ایک انشائیہ "مشورہ" میں مشورے کی خوبیاں اور خامیوں کو طنز و مزاح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اس کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے منفی اثرات سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ کسی بھی موضوع کے دونوں اطراف کو بیان کرنا ادب کے ساتھ ایمانداری اور غیر جانبداری کا واضح ثبوت ہے۔ مشورے دینے والوں کے حوالے سے اپنے انشائیہ "مشورہ" میں بہترین اسلوب سے نصیحت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

"دراصل یہ سب وہ لوگ ہیں جو ہماری رہنمائی کے نام پر رہزنی کرتے ہیں۔ پہلے ہمیں غیر محفوظ ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ پھر ہمارے خیر خواہ بن کر ہمیں احساس تحفظ دینے کی یقین دہانی کرواتے ہیں اور تب ہماری آزادی اور آزاد خیالی کو لوٹ لے جاتے ہیں۔ تحفظ دیتے دیتے ہمیں غیر محفوظ کر جاتے ہیں۔" [۲۱]

اکبر حمیدی کے اسلوب میں سادہ آسان اور عام فہم الفاظ کی کثرت پائی جاتی ہے مگر بعض مقامات پر وہ مشکل الفاظ استعمال کر کے اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس کے اسلوب میں خاص بات یہ ہے کہ اردو کے الفاظ کو کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسری زبانوں کے غیر رائج الفاظ کے استعمال سے اجتناب برتا گیا ہے، چونکہ وہ انشائیہ نگار کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ اس لیے ان کے اسلوب میں ایک روانی پائی جاتی ہے۔ الفاظ میں تسلسل موجود ہے اور فنی اسرار و رموز کی تمام تر خوبیوں سے بات کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کا انداز بیان اور گفتگو میں اپنا پن محسوس ہوتا ہے۔ قاری کو تحریر پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اکبر حمیدی صاحب سامنے بیٹھ کر ہم کلام ہیں۔ پروفیسر نظیر صدیقی ان کے اسلوب اور انداز تحریر سے متاثر ہو کر ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: "اکبر حمیدی کے انشائیے دلچسپ ہیں وہ پڑھے جا سکتے ہیں۔ ان سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ یہ دیکھیں خیالات کو غیر شعوری طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ ان کی انشائیوں کو پڑھتے وقت زندگی قابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ ان کا انداز فکر مثبت ہے۔ ان کے ہاں انسان دنیا اور کائنات سبھی کی پذیرائی ملتی ہے۔" [۲۲]

اکبر حمیدی دور حاضر کے نئے انشائیہ نگار ہے۔ انہوں نے گزشتہ چند برسوں میں اپنے فن کمال سے عروج حاصل کیا ہے۔ جس کی اہم وجہ ان کا اچھوتا اور منفرد اسلوب ہے۔ یہ اپنی تحریروں میں مثبت انداز فکر اور ممتاز انداز بیاں کے بل بوتے پر جانے جاتے ہیں۔ اکبر حمیدی چونکہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں اس لیے ان کے انشائیوں

میں شاعری کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ان کے انشائیے حقیقت کے قریب تر ہوتے ہیں اس لیے ان کے انداز گفتگو میں اپناپن سا محسوس ہوتا ہے۔اکبر حمیدی کے بارے میں انور سدید لکھتے ہیں کہ:

"اکبر حمیدی کی انشائیہ کی صنف ادب کی طرف گزشتہ چند سالوں کے دوران راغب ہوتے ہیں تھوڑے سے عرصے میں ہی درمیانی منزل، آزادی، دور اندیشی ،خزاں، کامیابی، میں سوچتا ہوں، گھنٹہ گھر، گفتگواور چھوٹا آدمی جیسے شگفتہ انشائیے لکھ کر اس صنف ادب میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ اکبر حمیدی نے اردو انشائیہ میں غزل کے جمال فن کو برتنے کی سعی کی ہے۔ وہ جزئیات سے حقیقت کا عمومی زاویہ ابھارتے ہیں اور یوں اپنے تجربے کی عالمگیریت پر مہر تصدیق ثبت کرتے جاتے ہیں۔" [۲۳]

اکبر حمیدی کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ قاری کے مزاج میں کروٹ کا پہلو رکھتے ہیں۔ایک ہی نقطہ نظر کے گرد گھومنے کی بجائے قاری کی سوچ کو بدلتے رہتے ہیں تاکہ ان کے محسوسات میں تازگی اور شگفتگی کی لہریں تبدیل ہوتی رہیں۔ اس طرح قاری خود کو پر مسرت اور پر سکون محسوس کرتا ہے اور فکری جہت کی فروانی سے سرشار ہوتا ہے۔ان کے اسلوب میں یہی تو خاص بات ہے کہ بات کو دور تک لے جاتے ہیں مگر واپس اسی مقام پر آکر ٹھہر جاتے ہیں۔

اکبر حمیدی بھی طنز و مزاح میں اپنی قوم کی اصلاح کرتے نظر آتے ہیں۔" خالی گیراج"میں انسان کے خالی دماغ کو مخاطب کرتے ہوئے اس کی اصلاح کرتے ہیں۔انشائیہ کے آخر میں قاری کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"اس ناگوار صورتحال سے بچنے کے لیے دوستو آپ بھی اس بات پر غور کر لیں تاکہ آپ کے گیراج میں اپنی گاڑی کھڑی ہے یا پھر آپ کے گیراج کو بھی خالی گراج کہہ کر ہمسایوں نے اپنی گاڑیوں کے تصرف میں لے لیا ہے۔اگر ایسا ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ایسانہ ہو۔۔۔۔۔۔۔تو پھر جلدی سے اپنی گاڑی لے لیجئے یہ تاکہ آپ کے گیراج میں آپ کی گاڑی نظر آئے۔" [۲۴]

اکبر حمیدی کے اس اقتباس میں گیراج سے مراد انسان کا خالی دماغ ہے جس میں وہ اپنے بارے میں سوچ و بچار کرنے کی بجائے دوسروں لوگوں کے خیالات و افکار کو جمع کر لیتا ہے ۔خود کسی بھی پہلو پر غور و فکر کرنے کی بجائے دوسرے لوگوں کے افکار کو ترجیح دیتے ہیں۔۔اس لیے انہیں نصیحت کرتے ہوئے اپنی گاڑی یعنی اپنی سوچ کو اہمیت دینے پر تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ان کے اسلوب میں طنز و مزاح میں مثبت فکر پائی جاتی ہے۔ انداز

بیان، انداز گفتگو اور انداز تحریر جاندار اور پر کشش ہونے کے ساتھ معنویت سے بھرپور ہوتا ہے۔وہ ہر ادیب کی طرح حقیقت کو بیان کرتے ہوئے ایسے الفاظ کا چناؤ کرتے ہیں کہ کسی کی دل آزاری بھی نہ ہو اور حقیقت بھی بیان ہو جائے یہی بہترین اسولب کی نشانی ہے۔

اکبر حمیدی کے انشائیہ "پہاڑ مجھے بلاتا ہے" میں زندگی اور موت کے درمیانی سفر کو بیان کیا گیا ہے ۔پیدائش سے لے کر پہاڑ مجھے اپنی طرف بلاتا ہے۔موت ایک حقیقت ہے۔اس لیے آکر رہتی ہے۔اس لیے اس کی طرف سفر کرنے سے پہلے اس کی تیاری کرنی چاہیے۔زندگی کے چاروں طرف ضروریات زندگی اور خواہشات کا انبار لگا ہوا ہے۔ جس کو حاصل کرنا ناممکن ہے۔یہ زندگی بس کی طرح ہے، جو مسلسل چلتی جارہی ہے بلکہ فراٹے بھرتی ہوئی جارہی ہے۔اس لیے جب انسان پہاڑ یعنی موت کی طرف دیکھتا ہے تو وہ اس کی ماضی کی مکمل فلم اس کی آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگتی ہے۔ اکبر حمیدی نے اس صورتحال کو اپنے انشائیہ "پہاڑ مجھے بلاتا ہے" میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

> ”لیکن جب بھی میں پہاڑ کی طرف دیکھتا ہوں وہ مجھے اپنی طرف بلاتا ہے--- وہ میرے جذبوں کو------میری ہمتوں کو----------میری سوچوں کو-------میری منزلوں کو بھی میری نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ اسے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے رگ وپے میں بس آگ بھڑکنے لگتی ہے۔میں نے جب بھی اس کی سربفلک چوٹیوں کو دیکھتا ہوں مجھے اپنی منزل یاد آنے لگتی ہے --------جہاں مجھے ایک روز جانا ہے --------ضرور جانا ہے۔“ [۲۵]

اکبر حمیدی نے اپنی تخیل کی کارفرمائی اور انشائیہ پردازی کے قواعد وضوابط سے انشائیہ کو مضبوط کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ان کے خیال ہے آفرینی میں راہ تازگی و شگفتگی موجود ہے۔ جو اردو ادب میں اپنی خوشبوئیں پھیلا رہی ہے۔ صنف انشائیہ کے تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے انداز بیاں کو پرکشش اور جاذب بناتا ہے ۔انشائیہ کے فنی تقاضوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے قلم سے انداز تحریر کو قاری کے سامنے ایسا پیش کیا ہے کہ قاری اس انشائیہ میں خود کو محسوس کرتا ہے۔ ان کے انشائیہ میں تازگی و شگفتگی، موضوعات کی رنگینی، آزاد خیالی اور اختصار جیسے فنی تقاضے کثرت سے ملتے ہیں۔ اکبر حمیدی کا اسلوب نہایت سادہ ہے کہ ایک عام پڑھنے والے کو کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں ہوتا ہے۔ہر انشائیے میں قاری کے لیے دعوت فکر موجود ہے۔جو قاری کو سوچنے سمجھنے کی طرف راغب کرتی ہے جسے سے نئے خیالات وافکار جنم لیتے ہیں۔اکبر حمیدی کا انداز تحریر، انداز گفتگو اور اسلوب

عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ ٹھوس حقائق اور سائنسی معلومات سے بھرپور ہوتا ہے۔خشک ہونے کے ساتھ ساتھ انداز تحریر شائستہ اور مہذب ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس میں چاشنی کا عنصر موجود ہوتا ہے۔اس حوالے سے اکبر حمیدی کا انشائیے کے بارے میں نظریہ کچھ یوں ہے۔

> "انشائیہ ایک ایسی غیر افسانوی صنف نثر ہے۔ جو قاری کو بیک وقت فکری لطف اندوزی، جسمانی تسکین اور جمالیاتی حظ مہیا کرنے پر قادر ہے۔ لہذا اس سے ایک امتزاجی صنف کا نام دیتا ہوں جس میں کہانی کا مزہ شعر کی لطافت، سفر نامے کا فکری تحرک کچا ہو گئے ہیں۔" [۲۶]

انشائیہ اردو ادب میں جدید ترین صنف ہے۔ جس میں قاری کو ایک وقت میں مختلف جہتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس میں موضوعات بڑے دلکش اور دلفریب ہے۔ ہر قسم کے موضوع پر انشائیہ لگار اپنے نظریات وخیالات اور افکار قلمبند کر سکتا ہے۔

اکبر حمیدی کے انشائیے میں بے شمار دلچسپ موضوعات کی بھرمار ہے۔وہ ہر موضوع پر انشائیہ لکھتے کا مکمل حق ادا کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ایک انشائیہ نگار بہترین اسلوب نگار بھی ہوتا ہے۔اس کے اسلوب میں چاشنی، دل، فریبی اور مقناطیسی جیسی قوت پائی جاتی ہے ۔جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔اسلوب میں انشائیہ کا بہترین آغاز اور سبق آموز اختتام ہی اس کی کامیابی کا ضامن ہے۔اس لیے اکبر حمیدی کا اسلوب ہر سطح پر اپنے جلوے بکھیرتا ہوا نظر آتا ہے۔ان کا اسلوب موضوع کے ارد گرد گھومتا ہے۔جو موضوع کا مکمل حق ادا کرتا ہے۔ان کے انشائیہ "کرکٹ" اور ان کے تبصرے بیان کیے ہیں۔ کبھی ان کا اسلوب طنز و مزاح جیسی صورتحال اختیار کرتا ہے تو کبھی سنجیدگی اختیار کر کے نصیحت کرتے نظر آتا ہے۔"کرکٹ" میں سے سنہرے موتی نکال کر اس سے عبرت اور سبق حاصل کرنے کی تلقین کچھ یوں کرتے نظر آتے ہیں:

> "کرکٹ میں جتنا غور کیا ہے اسے زندگی سے بہت قریب ہے---------کرکٹ زندگی کا کھیل ہے----وہ زندگی کا میعار بھی ہے اور وقار بھی-------زندگی آمیز بھی ہے ------زندگی آموز بھی اور زندگی آفروز بھی----------لاکھوں کروڑوں دلوں کی دھڑکن۔" [۲۷]

زندگی کو کرکٹ سے تشبیہ دے کر اس کی اہمیت بیان کی ہے۔زندگی کو کرکٹ سے تشبیہ دے کر اس کی اہمیت بیان کی ہے۔ جس طرح "کرکٹ" لاکھوں دلوں کی دھڑکن ہے۔ اسی طرح ایک زندگی بھی کئی لوگوں کے

لیے بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ ہر رشتے کے لیے اس کی اپنی خاص اہمیت ہے۔ زندگی کے ہر رشتے کے روپ میں اس کا کردار منفرد ہے، مگر اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ یہ کردار مثبت پہلو پر مشتمل ہو۔

اکبر حمیدی کے ایک اور انشائیے "میں کہاں ہوں" پر اپنے تجربات کی روشنی میں چاند مدلل دلائل کے ساتھ اپنے آپ سے مکالمہ آرائی کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی طنز و مزاح میں اپنا مذاق اڑاتے ہیں، تو کبھی سنجیدہ ہو کر زندگی کی حقیقت پر غور و فکر کرتے نظر آتے ہیں۔

ا۔ اصل میں انسان کی خود کی ذات کی کیا حیثیت ہے اس کے وجود کا کیا مقصد ہے اس کی تخلیق کیوں ہوئی؟

۲۔ اس کا ابتدا سے آج تک کا سفر کتنے مراحل سے گزر کر یہاں تک پہنچتا ہے؟

یہ ساری باتیں گفتگو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کرنا اور پھر اس کو منفرد اور دلکش انداز بیاں کے ساتھ قاری کے سامنے رکھنا ایک بہترین انشائیہ نگار کے قلم کا کمال ہے۔ انسان جنگل سے ہوتا ہوا آج نئے سائنسی کرشمات کی وجہ سے عیش و عشرت کی زندگی گزار رہا ہے۔ اس کا موازنہ بہترین انداز گفتگو اس سے کچھ یوں کیا ہے:۔

> "پہلے آدم سے لے کر آج اکیسویں صدی کے آدم تک انسان نے تہذیب و تمدن کا جو طویل اور دشوار گزار سفر طے کیا ہے۔۔۔۔۔ کیا میں اس عظیم سفر کو بے حقیقت کر دوں اور پھر سے واپس جنگل ہی میں چلا جاؤں اور جانور بن جاؤں؟" [۲۸]

اکبر حمیدی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگار کی وجہ سے بہترین نثر نگار بھی ہے کیونکہ انشائیہ نگار ایک اچھا نثر نگار ہوتا ہے جبکہ ایک بہترین نثر نگار ایک اچھا انشائیہ نگار ہو یہ ضروری نہیں ہے۔ اکبر حمیدی کے انشائیہ میں نثر کے اجزاء کو خوبصورتی اور حسن کاری سے لڑیوں میں پرونا اسلوب ہے۔ ان کا انداز بیاں اور انداز تحریر روشن، عام فہم، سادہ اور سلیس ہے۔ ان کی جملہ بندی اور فقرہ شناسی بہترین الفاظ کے انتخاب کا نچوڑ ہے۔ ان کا اسلوب بھی ان کی شخصیت کی مکمل عکاسی اور ترجمانی کرتا ہے۔ ادیب کی بیانیہ صلاحیت اس کے اسلوب اور انداز تحریر سے عیاں ہوتی ہے، چونکہ اسلوب موضوع اور ہیت کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ صرف موضوع کی زینت اور وقار کا نام نہیں بلکہ ایک وسیلہ ہے۔ جو موضوع کو فن میں تبدیل کرتا ہے اس کے بارے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> "شاعر یا مصنف قدم قدم پر پیرایہ بیان کی آزادی کا استعمال کرتا ہے۔ پھر ائیہ بیان کی آزادی کا استعمال شعوری بھی کرتا ہے۔ غیر شعوری بھی اس میں ذوق، مزاج، ذاتی پسند اور ناپسند صنف یا ہیئت کے تقاضوں نیز قاری کی نوعیت کے تصور کو بھی

دخل ہو سکتا ہے۔یعنی تخلیقی اظہار کے ممکنہ امکانات جو وجود میں آ چکے ہیں اور وقوع پذیر ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا دراصل اسلوب ہے۔"[۲۹]

کسی بھی تحریر یا اسلوب میں شعوری اور غیر شعوری موضوعات کی اہمیت خود اس بات کا تقاضا کرتی ہے۔اسلوب دراصل مصنف کے مزاج، پسند ناپسند اور ذوق کا ترجمان ہوتا ہے۔اکبر حمیدی کے انشائیوں میں بھی اسلوب ان کے مزاج اور ذوق کی جھلکیاں دکھاتا ہے۔اکبر حمیدی طنزومزاح میں کمال کی مہارت رکھتے ہیں مگر جب سنجیدگی اختیار کرتے ہیں تو ان کا اسلوب بہترین انداز تحریر کی شکل میں منظر عام میں آتا ہے۔اصل میں اسلوب مصنف کے تخلیقی اظہار کا ذریعہ ہے۔ اکبر حمیدی کے انشائیہ "جزیرے کا سفر" میں انہوں نے جزیرے کے بارے میں مختلف نظریات کو قلم بند کیا ہے۔جس میں فطرت نگاری کو خوبصورت انداز سے منظر عام پر لایا گیا ہے۔انہوں نے "جزیرے کے سفر" کی خواہش ظاہر کی ہے۔ جزیرے کے بارے میں مختلف نظریات کو بیان کرتے ہوئے فطرت نگاری کو خاص ترجیح دی ہے۔اس کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"جزیرے کئی طرح سے وجود میں آتے ہیں۔بعض اوقات سمندر اپنے اندر کی زمین کے ایک ٹکڑے کو اپنے وجود سے کاٹ کر باہر پھینک دیتا ہے۔یہ قطعہ زمین الگ ہو کر جزیرہ کہلانے لگتا ہے۔مگر سمندر اسی ٹکڑے کو کاٹ پھینکنے کے بعد بھی اس سے اپنا رشتہ قائم رکھتا ہے۔یعنی اس سے سکھ چین لینے نہیں دیتا بلکہ کبھی کبھی تو خوش ہو کر اسے نگل بھی جاتا ہے۔"[۳۰]

فطرت ہمیشہ ایک جیسی رہتی ہے، یہ صحیح ہے کہ فطرت بدلتی ضرور ہے مگر اس میں عادتیں وہی پرانی ہے۔کہتے ہیں کہ فطرت کبھی نہیں بدلتی بلکہ اسی طرح اکبر حمیدی جزیرے کو کبھی سمندر کا حصہ قرار دیتے ہیں تو کبھی پہاڑوں اور چوٹیوں کو بھی سمندر کا حصہ قرار دیتے ہوئے جزیرے کا حصہ سمجھتے ہیں۔قصہ مختصر یہ کہ فطرت ہمیشہ ایک ہی رہتی ہے بس اس کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔انشائیے میں جہاں اپنے تجربات بیان کیے جاتے ہیں، وہاں پر واقعات کے ذریعے موضوعات کو بیان کیا جاتا ہے۔واقعات میں انداز تحریر موضوعات کے مطابق ہوتا ہے۔اکبر حمیدی مختلف واقعات کو جا بجا اپنے انشائیوں میں بیان کرتے نظر آتے ہیں۔یہ واقعات تاریخی، مذہبی، معاشی الغرض ہر قسم کے ہو سکتے ہیں۔ ان کے انشائیہ "دور اندیش "میں فلسفیانہ انداز تحریر اختیار کرتے ہوئے مذاق کرتے ہیں۔کہیں "جرنیل" کو دور اندیش بیان کرتے ہیں جو اپنی فوج کی شکست کا سبب بنتا ہے تو کہیں "مقرر" کو

دور اندیش پیش کیا ہے۔ جو اپنی حرکتوں کی وجہ سے بے عزتی کرواتا ہے۔ اپنے ایک دوست کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "ہمارے ایک دوست بڑے دور اندیش واقعہ ہوئے ہیں۔ ہر معاملے میں دور اندیشی سے کام لیتے ہیں مثلاً جب اہل مجلس کسی لطیفے پر قہقہے لگا رہے ہوتے ہیں وہ اس وقت یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ اگر وہ بھی قہقہے لگانے لگیں تو ان کی شخصیت کے بارے میں دوسرے کیا سوچیں گے؟ یا اگر قہقہے لگانے ہی ہیں تو قہقے کی لمبائی، چوڑائی، اونچائی اور گہرائی کتنی ہو گی۔" [۳۱]

اکبر حمیدی نے مندرجہ بالا اقتباس میں حقیقت کو بیان کیا ہے کہ خود کو عقلمند اور دور اندیش سمجھنے والا انسان بہت زیادہ محتاط ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اس کی احتیاط اکثر اسی کی شخصیت پر منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔ اس دنیا کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ "لوگ کیا کہیں گے" اسے ہم لوگوں نے انسانوں کو اپنی خوبیاں سامنے لانے میں ہمیشہ رکاوٹ کا کردار ادا کیا ہے۔ جو انسان اس جملے کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے، کامیابی کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔ اکبر حمیدی نے اختصار الفاظ کے ساتھ بہترین بات کی ہے، انداز تحریر متاثر کن ہے۔ اس میں سنجیدہ پن کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ بے شک باقی تمام انشائیہ طنز و مزاح سے بھرپور ہے مگر اس اقتباس میں سنجیدگی کا عنصر واضح نظر آتا ہے۔ مصنف کا انداز بیان ہی اس کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کے الفاظ میں تازگی اور شگفتگی کا جس قدر زیادہ استعمال ہو گا، اسلوب اتنا ہی دلکش اور جاذب نظر آئے گا۔ مصنف کا انداز گفتگو ہی وہ سحر جمال ہے جس سے انشائیہ نگار قاری کو اپنے دامن خیال میں لپیٹ لیتا ہے اور اس پر اپنے نظریات کا تاثر چھوڑتا ہے۔ اس لیے صحت مند اور توانا اسلوب مصنف کی پہچان کا سبب بنتا ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> "اسلوب شخصیت کا ہی عکس ہوتا ہے اور یہ اپنا جلوہ ہر تحریر میں دکھاتا ہے۔ تاہم انشائیہ میں اس کی اہمیت دوسری اصناف ادب سے نسبتاً زیادہ ہے۔ موضوع کوئی بھی ہو جب تک اسے اسلوب کی تازگی، شگفتگی اور بہجت آفرزی۔۔۔۔ صحت مند انداز میں سہارا نہیں دیتی، قاری اس کی طرف محبت سے دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔" [۳۲]

اکبر حمیدی کے انشائیے بھی کسی افسانے سے کم نہیں ہے۔ ان میں قاری کو افسانے یا شعر جتنا لطف ملتا ہے۔ اکبر حمیدی کے شاعر ہونے کی وجہ سے ان کے انداز تحریر میں شاعری کی مہک سونگھنے کو ملتی ہے۔ ان کی مکالمہ آرائی اور گفتگو میں شاعری کی طرح بحریں کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کے انشائیہ بہترین خیال کی تازگی اور دلکش

اسلوب کے باعث قابل مطالعہ ہیں۔ کیونکہ انشائیہ کی خاصیت ہے کہ وہ اپنے اسلوب کے اندر بھی بیک وقت مختلف کیفیات کو جذب کر لیتا ہے۔ کہیں طنز و مزاح دیکھنے کو ملتا ہے تو کہیں سنجیدگی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات آنسوؤں کو تبسم سے ہم آہنگ کر کے انتہائی لطیف کیفیت کو بھی جنم دیا جاتا ہے۔

اکبر حمیدی کے انشائیہ میں اسلوب کی تازہ کاری سے لے کر خیال کی تازگی اور شگفتگی کا وجود ملتا ہے۔ قاری صاحب ان کے انشائیوں کا مطالعہ کرتا ہے، تو ان کی روح تازہ ہو جاتی ہے۔ اسلوب میں ایک روانی ہے جو تسلسل کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ کسی بھی موضوع پر جب مطالعہ شروع کیا جاتا ہے تو اس کے اختتام تک اس کو چھوڑنے کا دل نہیں کرتا ہے۔ اس میں چٹکلے سے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ ان کے انشائیہ "ذمہ داری" کا آغاز ہی اتنا دلکش ہے کہ قاری میں تجسس پیدا ہو جاتا ہے۔ الفاظ میں ایک روانی ہے کہ الفاظ کی ادائیگی خود بخود ہو جاتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

> "کئی روز میں پوری سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ اب مزید کوئی وقت ضائع کیے بغیر مجھے دنیا کے انتظام کی ذمہ داری سنبھال لینی چاہیے۔ یہ درست ہے کہ ایسا کرنے سے میری ذمہ داریوں میں کس قدر اضافہ ہو جائے گا تاہم جہاں پہلے سے میں نے اتنی ذمہ داریاں سنبھال رکھی ہیں۔ وہاں ایک آدھ ذمہ داری کے اضافے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" [۳۳]

اکبر حمیدی تجسس پیدا کرنے میں کمال کی مہارت رکھتے ہیں۔ یہ تجسس انداز بیاں کے رنگین پن کی وجہ سے تخلیق ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب میں رنگینی کا عنصر نمایاں ہے۔ تجسس کی ایک شکل "سوال" ہے۔ جب انشائیہ نگار اپنی تحریر میں سوالات تحریر کرتا ہے تو قاری میں سوالات کے جوابات کے لیے تجسس پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے جواب کے لیے وہ پوری دلچسپی اور دلچسپی سے مطالعہ کرتا ہے۔ لیکن بعض تحریروں میں انشائیہ نگار اختتام پر چند سوالات چھوڑ کر قاری کو خود اس کے جوابات تلاش کرنے پر معمور کر دیتا ہے۔ اکبر حمیدی کے بھی بعض انشائیوں اس طرز میں ملتے ہیں۔ جن میں وہ اکثر سوالات کے جوابات دیکھ کر ایک یا ایک سے زیادہ سوالات کے جواب کے لیے قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے انشائیہ میں "غلطی کی گنجائش ہے" کے اختتام بھی سوال کے ساتھ کر رہا ہے۔ اس میں وہ غلطیوں سے کنارہ کرنے کا اعادہ کر رہا ہے۔ اصل میں یہ غلطی دماغ کی وجہ سے ہوتی ہے جب وہ سوچ و بچار کے مراحل طے کرنے میں ناکام ہوتا ہے تو غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔ غلطی ہو جانے کے خوف سے اکثر انسان کی مہارتیں اور فن اس کے اندر دفن ہو جاتا ہے۔ غلطی سے انسان اندر سے ٹوٹتا ہے اس کے نتیجے میں ایک نئی سوچ ابھر کر سامنے آتی ہے۔ غلطی انسان کے اندر ہونے کے بعد باہر منتقل ہوتی ہے۔ اس لیے اکثر

غلطیوں پر قابو پا لیا جاتا ہے۔اس لیے انسان کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے غلطی سے اجتناب کرنا چاہیے۔انشائیے کے اختتام پر تجسس سے بھرپور سوال کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"سوال یہ نہیں کہ غلطیوں کو دور کرنے یا ان سے دامن بچانے میں کون کس قدر کامیاب ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ ان سب غلطیوں کے ساتھ کون کتنے سلیقے سے زندگی بسر کر رہا ہے۔" [۳۴]

ایک مثبت تجسس اسلوب کو جاندار بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔اکبر حمیدی کے مختلف موضوعات میں طنز و مزاح اور سنجیدگی کے بعد تجسس کا عنصر نمایاں ملتا ہے۔ان میں "انتظار گاہ"، "پوزیٹو"، "گالی دینے والے کی حمایت میں"، "پرانے کپڑے"، "میں سوچتا ہوں"، "چڑیا گھر" اور "کامیابی" میں تجسس کا عنصر ملتا ہے۔انداز گفتگو تحریر کو تجسس کی طرف لے جاتا ہے۔ اس لیے اکبر حمیدی کو اس پر اچھی خاصی مہارت حاصل ہے کہ کس مقام پر کس انداز میں تجسس کو پیدا کر کے قاری کو اپنی گرفت میں کرنا ہے۔ ان کے اکثر موضوعات تجسس سے بھرپور ہوتے ہیں۔اس لیے اکثر موضوعات کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں تجسس ضرور ہو گا۔انشائیہ میں موضوع اور اسلوب کو خاص اہمیت حاصل ہے بلکہ انشائیہ ان دو چیزوں کے گرد ہی گھومتا نظر آتا ہے۔اس کے بارے میں یاسمین صاحبہ لکھتی ہیں:

"انشائیہ موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے ایک مربوط تسلسل کی حامل صنف ادب ہے۔ہاں اس کا اسلوب کسا ہوا نہیں، جو موضوع کی مرکزیت سے چسپاں ہو کر رہ جائے بلکہ ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے۔ جس میں بات سے بات پیدا کرنے اور ایک بات سے دوسری بات تک کا سفر آسانی سے طے کیا جاتا ہے۔یہی ڈھیلا پن اس کی وسعت کا ثبوت ہے دوسری اصناف میں بہت ہی کم ملتا ہے۔" [۳۵]

اکبر حمیدی انشائیہ نگار کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر ہیں۔شاعر کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنی شاعری میں اختصار کے لیے تشبیہات و استعارات کا استعمال کرتا ہے۔اسی طرح ایک نثر نگار بھی تشبیہات و استعارات کو استعمال کرتے ہوئے بات کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ادب کی کوئی بھی صنف ہو، اس میں اختصار کا استعمال ضرور کیا جاتا ہے۔تاکہ کم از کم الفاظ میں بات کی جا سکے، مگر یہ اختصار زیادہ بھی نہ ہو کہ بات سمجھ نہ آسکے۔اسلوب میں اختصار کا استعمال اس کی خوبصورتی کا موجب ہے۔اس کے ساتھ ساتھ نثر نگاری، بالخصوص انشائیہ میں تشبیہات کا استعمال اشد ضروری ہے۔

اکبر حمیدی نے بھی اپنی تحریروں میں جابجا تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا ہے جس میں اشاروں اور کنایوں سے بات کر کے آگے نکل جاتے ہیں۔ یہ اسلوب کی خاصیت ہے کہ اخلاقیات کے دائرے میں رہتے ہوئے اشاروں و کنایوں کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اکبر حمیدی کے موضوع "نئی پرانی گاڑیاں" میں بھی اشاروں و کنایوں سے بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس نشائیہ میں گاڑیوں کی اقسام، اس کے پیچھے لوگوں کی فطرت اور ان کی اہمیت کو بیان کرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات اور اشاروں و کنایوں کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:۔

> "خاندان۔ معاشرے۔ ملک اور قومیں بھی ایسی گاڑیاں ہیں جو لحہ بہ لحہ حال دل بیان کر رہی ہوتی ہیں۔ پڑھے لکھے معاشرے کے لوگ ان کی زبان سمجھ لیتے ہیں اور حادثہ پیش آنے سے قبل ہی گاڑیوں کے نقائص کو دور کر لیتے ہیں جب کہ ان پڑھ اور نیم خواندہ لوگ اسی زبان کو نا سمجھ سکنے کے باعث حادثوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔" [۳۶]

اکبر حیدی ایک حقیقت نگار پسند شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ حقیقت کو بیان کرتے ہیں، ان کے بے شمار بلکہ اکثریت انشائیے حقیقت پر مبنی ہے۔ وہ انشائیہ کی فنی اور تکنیکی ضرورتوں اور اس کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے ادب کو اپنی ادبی نفاست اور تخلیقی مہک سے معطر کر دیا ہے۔ جس طرح قطروں کے ملاپ سے سمندر بنتا ہے۔ اسی طرح کوئی بھی فن پارہ، بہترین انداز بیان، گفتگو اور جملوں سے وجود میں آتا ہے، چونکہ انشائیہ میں جملے کی ساخت ڈھیلے ڈھالے انداز سے ہونی چاہیے۔ اس لیے الفاظ کا چناؤ اور جملے بناتے وقت کمال مہارت درکار ہے۔ اللہ تعالی نے یہ مہارت اکبر حمیدی کو عطا کی ہوئی ہے۔ اللہ تعالی نے ان کو لفظ آشنائی اور تخلیق جملہ جیسی مہارتیں عطا کی ہیں۔ اس لیے ان کے الفاظ دل میں اترتے ہوئے قلب کو روشن کر دیتے ہیں۔ اکبر حمیدی ضرورت کے مطابق علامت، استعارہ اور اسلوب اختیار کر لیتے ہیں۔ جیسے "نئی پرانی گاڑیاں" میں وہ چیزوں کو گاڑی قرار دے کر زندگی اور اس کے مسائل پر دلکش اظہار خیال کرتے ہیں۔ اسلوب میں الفاظ کا چناؤ اور تخلیقی جملہ بندی کا نمونہ ملاحظہ ہو:

> "میک اپ زندگی کا نام ہے۔۔۔۔ رنگ کا نام ہے۔۔۔ رعنائی کا نام ہے۔۔۔۔ پھولوں کی طرح کھلتے جذبوں کا نام ہے۔ میک اپ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم میں دنیا کو فتح کرنے کا ولولہ موجود ہے۔۔۔۔۔ دلوں پر حکومت کرنے کا جذبہ جوان ہے۔۔۔۔۔ اپنی پسند کے خلاف ہر حالت کو مسترد کرنے اور حسب خواہش تبدیل کرنے کی ہمت کا مظاہرہ ہم کر سکتے ہیں اور یہ کہ ہم نے حالات و واقعات کے سامنے سر نہیں جھکایا ہے۔۔۔۔۔۔ اور ہم کوئی اصیل قسم کے جانور نہیں ہیں کہ سب کچھ چپ چاپ گردن ڈالے سہہ جائیں۔" [۳۷]

میک اپ کا نام آتے ہی ہمارے ذہن میں فوراعورت آ جاتی ہے کہ میک اپ صرف عورت کے لیے مخصوص لفظ ہے۔اکبر حمیدی نے مندرجہ بالا اقتباس میں اس کی بہترین عکاسی کی ہے، یہی اسلوب ہے جو تحریر میں جان اور روح پیدا کرتا ہے۔ ان کا انشائیہ "میک اپ" بہترین انشائیہ ہے۔ اس نے ان کی تخلیقی فن کو چار چاند لگوانے میں ہم کردار ادا کیا ہے۔اکبر حمیدی ہر ادیب کی طرح صفحہ قرطاس پر اپنے جذبات، احساسات، نظریات ،سوچ و افکار اور کیفیات منتقل کرتا ہے، یہی الفاظ اسلوب کو نمایاں کرتے ہیں۔ان جذبات و احساسات کے لیے انداز تحریر توضروری ہے کہ مگر ان کے ساتھ ساتھ انداز بیاں بھی خوبصورت اور دلکش ہوناچاہیے۔اکبر حمیدی کو اللہ تعالی نے یہ فن کمال عطا کیا ہوا ہے کہ وہ اپنے خیالات و نظریات کو بہترین الفاظ اور جملہ بندی کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔اس کے بارے میں اعجاز علی ارشد اپنے مقالہ میں تحریر کرتے ہیں:

> "اسلوب لکھنے والے کی ذہنی کیفیات اور جذبات کا عکاس ہوتا ہے۔یہ لکھنے والے کا کمال ہوتا ہے کہ وہ تمام کیفیات ،جذبات و احساسات کو بڑی کاریگری سے مجسم کرتا ہے دراصل یہی کاریگری اس کی تخلیق کو تاثر سے بھرپور بناتی ہے۔اسلوب میں زور اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب متعلقہ کیفیت مشاہدے اور تجربے کی تیز آنچ میں پگھل کر سامنے آئے موضوع کا جزو بن جائیں۔" [۳۸]

اکبر حمیدی کے انشائیے جہاں بہترین اسلوب کا شاہکار ہیں۔ وہاں پر جذبات و احساسات ،خیالات و نظریات، سوچ و افکار اور کیفیات کا بہترین نمونہ ہیں۔ان میں یہ کاری گری موجود ہے کہ وہ حقیقت کے ساتھ ہی ان کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ ان کے انشائیہ "جھاڑیاں اور جگنو" حقیقت نگاری کا عکاس ہے۔یہ انشائیہ ماضی اور مستقبل کی داستان بیان کرتا ہے۔اس انشائیہ میں اکثر مقامات پر مشکل الفاظ کا استعمال کر کے قاری کی دلچسپی کو بڑھایا ہے۔دیسی ماحول کی منظر نگاری کی جھلک اس میں واضح نظر آتی ہے۔میں گاؤں کی فطرت نگاری کے مختلف مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔بہترین انداز گفتگو اور مکالمہ آرائی قاری کی ذہنی آسودگی میں چمک پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔اس انشائیہ میں وہ جھاڑیاں اور جگنو کو کس سے تشبیہ دے رہے ہیں۔نمونہ ملاحظہ ہو:

> "جھاڑیاں میرا ماضی ہے۔جگنو میرا مستقبل اور حال میں خود ہوں !! جگنو کا تعلق بھی میرے ماضی سے تھا مگر وہ سارے زمانوں کی حدوں سے آگے نکل گیا۔۔۔۔۔ حتی کہ مجھ سے بھی ۔۔۔۔۔اور اب مستقبل کی بھی آخری منڈیروں پر دمک رہا ہے۔" [۳۹]

الفاظ کے چناؤ اور جملہ بندی میں کمال مہارت کے بادشاہ اکبر حمیدی ان صلاحیتوں کی وجہ سے انشائیاں نگاروں میں ممتاز حیثیت کی حامل شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اچھے ادیب کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ایک ایک نقطے میں کہانی بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایک ایک چیز ،ایک ایک منظر،ایک بات غرض پانی کے الگ الگ قطرے پر کہانی کی مہارت رکھتا ہے۔ اکبر حمیدی کے فن کا مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ موضوعات منفرد اور دلکش ہیں ۔ موضوعات سے اس کی کہانی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کا انشائیہ "دنیا ایک کہانی" ایک جامع ہے، جس میں اس دنیا کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ عام فہم اور دلکش اور جاذب اسلوب کے ساتھ اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"مجھے تو یہاں پانی کا ایک قطرہ بھی پراسرار اوراق میں لپٹی ہوئی کہانی دکھائی دیتا ہے ۔۔۔۔۔اس کا سرسبز۔۔۔۔خشک۔۔۔۔۔زرد پتہ بھی اپنی جیب میں ایک کہانی لیے ہوئے نظر آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دونوں کی اپنی اپنی کہانیاں ہیں۔۔۔۔۔۔بلکہ درخت بھی جس پر یہ پتے لہلہاتے دکھائی دیتے ہیں خود ایک کہانی ہے۔۔۔۔۔پھر ہر درخت کی اپنی ایک کہانی ہے۔۔۔۔۔۔جو اپنے مزاج کے اعتبار سے دوسرے کی کہانی سے بہت مختلف ہیں۔" [۴۰]

کہانی تحریر کا فن ہر کسی مصنف کے پاس نہیں ہوتا ہے۔ اچھی کہانی کے لیے بہترین پلاٹ، جاندار کردار، منظر نگاری، مکالمہ آرائی کے ساتھ انداز بیان واسلوب اشد ضروری ہے۔ اسلوب جتنا زیادہ آسان اور سلیس ہوگا، قاری کی دلچسپی کا باعث بنے گا۔ اس لیے ایک اچھا کہانی کار اپنے اسلوب پر خصوصی توجہ دیتا ہے۔ مشکل اور پیچیدہ الفاظ کے ساتھ جملہ بندی سے انداز تحریر کو مشکل بنانے سے اجتناب کرتا ہے۔ روانی میں ادا ہوتے الفاظ کے ساتھ فقرہ بندی کرتا ہے، یہی جملہ بندی اعلی ظرف کے پیراگراف کو تخلیق کرتے ہیں اور یہ پیراگراف کہانی تشکیل دیتے ہیں۔ باتوں سے باتیں بنانے اور ان باتوں سے کام کی باتیں چن چن کر ایک فن پارے میں تخلیق کرنے کا فن آتا ہے اور کمال یہ ہے کہ وہ اس فن کو استعمال کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ ان کے انداز تحریر میں دوستی کا پہلو بھی ملتا ہے۔ وہ مثبت سوچ کے مالک ہیں۔ ان کی سوچ مثبت اور روشن ہے۔ ان کے موضوعات اور اسلوب کے بارے میں منشا یاد لکھتے ہیں :

"موضوعات کی رنگارنگی اور تنوع، اظہار واسلوب کی دلکشی، نقطہ آفرینی، بصیرت آفروزی اور گہری معنویت اور سب سے بڑھ کر زیریں سطح پر شگفتگی ایزی کے انشائیوں کو کامیاب اور بڑا بناتی ہے۔" [۴۱]

کسی بھی کہانی کار کا موضوع بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔اس موضوع میں دلچسپی کا عنصر موجود ہونا چاہیے۔رنگین موضوع ہی قاری کو کہانی کا مطالعہ کرنے کی طرف راغب کرتا ہے۔موضوع جتنا زیادہ رنگین اور دلکش ہوگا۔ قاری کی دلچسپی کا باعث بنے گا۔اسلوب دوسرا مرحلہ ہے،جب ایک قاری مطالعہ شروع کرتا ہے تو وہ انداز بیاں سے اسلوب کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔اسلوب کی جانچ پڑتال کے لیے قاری کا مطالعہ ضروری ہے ۔مطالعہ کے لیے موضوع کا جاذب نظر ہونا اشد ضروری ہے۔اکبر حمیدی کے موضوعات کی رنگینی بہت ہے۔وہ موضوعات ہی تحریر کو جاذب بنادیتے ہیں۔ان موضوعات میں"دوستی کی مخالفت میں "،"ہوائی سڑکیں"،"پیوند لگی زندگی"، "یہ الماریاں"،"اندر کا آدمی"،اور"کورا کاغذ"وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ادیب موضوع کے انتخاب کے بعد ہی اسلوب کی طرف سفر شروع ہوتا ہے۔اکبر حمیدی کے انشائیے " یہ الماریاں" عجیب وغریب ہے،تو اس کی ابتدا اس سے زیادہ دلکش ہے۔سادہ اور آسان الفاظ کے ساتھ انداز تحریر میں اپنا پن جھلک رہاہے۔نمونہ ملاحظہ ہو:

"انشائیہ کے لیے الماریاں کا عنوان پڑھ کر آپ حیران نہ ہوں کہ یہ کیسا موضوع ہے
------تو عرض یہ ہے کہ جب آپ انشائیے کا موضوع بن سکتے ہیں تو الماریاں کیوں نہیں
-----بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر آپ برا نہ مانے تو میں آپ کو بھی یہ الماری ہی سمجھتا
ہوں------اور اگر آپ برا مان رہے ہیں تو سن لیجیے کہ میں خود بھی ایک الماری ہوں
-----ہر انسان ایک الماری ہے-----وہ چاہے تو اپنے الماری ہونے پر فخر بھی کرسکتا ہے
-----الماری ہونا ایک قابل فخر اعزاز ہے۔" [۴۲]

اکبر حمیدی کے اس انشائیے کے مندرجہ بالا اقتباس میں طنزومزاح بھی موجود ہے۔اپنا پن اور محبت و چاہت کا عنصر نمایاں ہے۔اسلوب اور انداز تحریر سادہ اور آسان ہے۔ اس وجہ سے قاری کی دلچسپی اس میں پیدا ہوئی ہے۔مشکل اور پیچیدہ انداز بیان سے قاری اکتاہٹ اور الجھن کا شکار ہوتا ہے۔جس وجہ سے وہ مطالعہ کرنے سے گریز کرتا ہے۔اس لیے آسان اور سادہ انداز گفتگو اختیار کرتے ہوئے اکبر حمیدی نے فن پارے تخلیق کیے ہیں۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ اکبر حمیدی کے تمام انشائیے سادہ اور آسان الفاظ کا مجموعہ ہیں۔ اکثر مقامات پر ضرورت کے تحت مشکل الفاظ کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ ان کے ایک دوسرے انشائیے "جادو نگری"میں وہ اقتباس میں چند مشکل الفاظ کا استعمال کرتے بھی نظر اتے ہیں۔

"پھلوں اور پھولوں سے بھرا سرسبز وشاداب نخلستان تھا کہ حد نگاہ تک میرے راستے میں بچھا
تھا-----میں نے ایک شان بے نیازی-----اور احساس تفاخر کے ساتھ اس میں قدم
رکھا !قدم کا رکھنا تھا کہ پورا نخلستان جھوم اٹھا-------پوری فضا چہچہانے لگی
------پھلوں اور پھولوں سے بھری شاخوں والے شجر جیسے میرے لیے استقبالی گیت
گانے لگے تھے۔" [۴۳]

اکبر حمیدی کے اس انشائیے "جادو نگری "میں مندرجہ بالا اقتباس میں نخلستان اور احساس تفاخر جیسے مشکل الفاظ استعمال کیے گئے ہیں کہ ایک عام قاری کو سمجھنے کے لیے "لغت" کا سہارا لینا پڑے گا، جبکہ باقی سارا اقتباس سادہ الفاظ پر مشتمل ہے۔"سر سبز و شاداب نخلستان" خود ایک حیران کن جملہ اور الفاظ کا مجموعہ ہے۔یہ ایک دوسرے کے متضاد الفاظ کا مجموعہ ہے۔جس کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ قاری ایسے الفاظ پر آکر ایک لمحہ کے لیے رکتا ضرور ہے۔ قاری میں سوچ وافکار کی صلاحیت پیدا کرنا بھی ادیب کی ایک اہم خاصیت ہے۔اکبر حمیدی اپنے سادہ رواں اور شگفتہ انداز سے مظاہر فطرت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں وہ ہمیں خیال افروز حقیقتوں سے آشنا کرواتے ہیں اور ان کا یہ رویہ نیا، اچھوتا اور ترقی یافتہ ہے۔اکبر حمیدی اپنے انشائیوں میں مزاج کا استعمال بہت توازن کے ساتھ کرتے ہیں۔اکبر حمیدی معمولی اشیاء سے غیر معمولی پہلو اخذ کرتے ہیں اور بدصورت چیزوں سے خوبصورتی کی خصوصیات کو نمایاں کرتے ہیں اور یہ ان کی ہی انفرادیت ہے۔اکبر حمیدی انشائیہ نگار کی حیثیت سے تیسری آنکھ بھی رکھتے ہیں جس سے وہ اشیاء کے باطن سے نئے معنی اخذ کرتے ہیں وہ کائنات کے اسرار و رموز اور زندگی کی کھلی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور اپنے مشاہدات کو بے دریغ بیان کرتے ہیں ان کے لیے کائنات کی کوئی چیز عبث اور فضول نہیں ہے۔وہ انسانی نفسیات کو بے نقاب کرتے ہیں اور انسان کی بے حسی کو سامنے لاتے ہیں۔اکبر حمیدی کسی بھی موضوع کو اپنے لیے مخصوص نہیں کر لیتے اور نہ ہی شجر ممنوعہ بناتے ہیں وہ ہر چیز سے نئے مفاہیم اخذ کرتے ہیں۔وہ نہایت ذہانت و ذکاوت سے نئے پہلو کی طرف ہماری توجہ مبذول کرواتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں دلچسپی کا عنصر پایا جاتا ہے جو قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کے لیے کافی ہے تاہم اکبر حمیدی ایک اعلیٰ اور اہم تخلیق کار کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔

اکبر حمیدی کے تمام انشائیوں میں غور و فکر کا عنصر موجود ہے، اب یہ قاری پر منحصر ہے کہ وہ تحریر کے بعد کس حد تک غور و فکر کرتا ہے یا نہیں۔۔۔؟ بلاشبہ اکبر حمیدی ایک بہترین شاعر، نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگار ہے۔ان کی پانچ تصانیف اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے انشائیے اردو ادب میں ایک بہترین اور اچھا اضافہ ہیں۔

ر۔ مشکور حسین یاد کے انشائیوں کا اسلوبیاتی جائزہ:

کوئی بھی فن پارہ مکمل فکر اور فن سے وجود میں آتا ہے۔ اردو ادب کی جدید صنف انشائیہ نثر میں مقبولیت کے مراحل طے کرتے ہوئے کامیابیاں سمیٹ رہی ہے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اپنے ابتدائی دور میں اس کو کافی مشکلات کا سامنا درپیش تھا، پھر رفتہ رفتہ اس میں توازن اور تناسب آتا گیا۔ اردو ادب میں انشائیہ کے مقام و

مرتبہ اس فنکار کے اسلوب پر مبنی ہوتا ہے اور یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ کسی بھی لکھنے والے کا اسلوب ہی اس کی شخصیت اور فن کی عکاسی کرتا ہے۔ اگر لکھاری اپنی شخصیت کو پس پردہ ڈال کر لکھتا ہے تب بھی اس کے فن پارے سے اس کی شخصیت منعکس ہوتی ہے۔ اگر کوئی ادیب اپنی شعور کی وسعتوں سے بھی اپنی شخصیت کو اسلوب سے دور رکھنے کی کوشش کرے تو بھی ایسا ممکن نہیں کہ وہ اس میں کامیاب ہو سکے۔ اسلوب میں کسی لکھنے والے کی شخصیت اور تمام تر خصوصیات اکٹھی ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔ جس سے قارئین نہ صرف لکھاری کی شخصیت سے واقفیت حاصل کرتا ہے بلکہ اس کے شعور سے اٹھنے والی لہروں میں بھی گھیرا چلا جاتا ہے۔

کسی لکھاری کی سوچ، فکر، جذبات، احساسات اور تجربات اس کے اسلوب کے ذریعے عیاں ہوتے ہیں۔ ادیب یا شاعر اپنے اسلوب کے ذریعے اپنے نظریات اور تجربات کی وضاحت کرتا ہے۔ کوئی بھی انشائیہ نگار اپنے الفاظ اور فکر کو ایک سانچے میں ڈال کر قارئین کی نظر کرتا ہے۔ جس سے اس کے نظریات اور تجربات کی جھلک نظر آتی ہے اور اس کی بدولت اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ وہ کیا بیان کرنا چاہتا ہے اور کس طرز میں بیان کرنا چاہتا ہے؟ انشائیہ نگار کی شخصیت انشائیہ پر گہرا اثر رکھتی ہے۔ انشائیہ میں شخصیت کا ظہور قاری کی نظر میں اس کے کردار، اشیاء، واقعات اور حادثات کا آئینہ ہوتا ہے۔ کوئی بھی انشائیہ نگار اپنے انشائیے کو تازہ اور شگفتہ بنانے کے لیے اس میں روزمرہ کی چیزوں کو شامل کرتا ہے۔ انشائیہ کے اسلوب کا سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ خالص نثر ہے۔ انشائیہ کی تکنیک اور مقاصد منحوس تو نہیں لیکن اس میں ایک بات کی اہمیت واضح ہے کہ اس کے اسلوب میں لطافت اور شگفتگی ہونی چاہیے۔ ایسا محسوس ہو کے مزاج کو تسلی بخش احساس ہے، جو کہ ایک انشائیہ نگار کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ بہت سے انشائیہ نگار اس کو حاصل کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔

انشائیہ کے اسلوب کا ایک خاص تقاضہ ہے کہ انشائیہ کے اسلوب میں افسانہ قلمبند نہیں کیا جا سکتا اگر ایسا ہو جائے تو افسانہ انشائیہ تو نہیں بن جائے گا لیکن افسانہ افسانوی رنگ بھی اتار دے گا اور یہ افسانہ نہ رہے گا۔ مختلف عناصر میں رمز و ایما، شگفتگی، غیر رسمی انداز، لطافت، خوش طبعی، حس لطیف شامل ہیں۔ انہی عناصر کی بدولت کسی فنکار کے انشائیہ کے مخصوص کی تشکیل ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار کو اپنے انشائیوں میں دلائل پیش نہیں کرنے پڑتے ہیں۔ اس کو انشائیہ میں نہ ہی تاثرات سے کہانی پیش کرنے پڑتی ہے اور نہ ہی کردار نگاری کے جوہر دکھانے پڑتے ہیں۔ انشائیہ نگار نے بات کو اس انداز میں پیش کرنا ہوتا ہے کچھ ایسے کوئی بات ہی نہ ہو، اس کا سارا زور، تمام تر توجہ اسلوب پر ہوتی ہے۔ اکثر انشائیہ نگار عام زندگی کے چھوٹے اور غیر اہم واقعات کو اپنے انشائیہ کا حصہ بناتے ہیں اور

ان باتوں کو ایک موقع انداز میں پیش کرتے ہیں جیسے اس سے ایک لفظ میں ساری بات کہہ دی ہو یا اس نے کوزے میں سمندر کو سمو لیا ہو۔ اس سب کے اظہار کے لیے اسلوب کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

انشائیہ نگاری ایک ایسا فن ہے جو ذات کے اظہار، کائنات کی تفہیم اور آزادی کے کمالات کا ازالہ کرتی ہے۔ مشکور حسین کی انشائیہ نگاری اظہار ذات اور تفہیم ذات کا ایک عمدہ ذریعہ ہے۔ انہوں نے کائنات اور اس دنیا میں موجود زندگی کی تفہیم اور اس میں غور و فکر کو ایک مصور کی صورت میں بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے انشائیوں میں بصیرت والوں کے لیے ایک الگ دنیا بسی ہوئی ہے۔ ان کے انشائیے کہیں تشنگی اور کہیں پر سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں اور کہیں پر فکر کی گہرائیاں سمندر کی لہروں کے ساتھ ساحل تک رسائی کی منتظر ہیں۔ مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں کہیں کہیں فکر طنز و مزاح کا لبادہ اوڑھے ہوئے اس کو نیا اور منفرد اسلوب دے کر پیش کیا ہے۔ جس سے ان کے اسلوب میں انفرادیت واضح ہوتی ہے۔ ان کا انشائیہ کے بارے میں خیال یوں ہے کہ:-

> ”میں جس وقت انشائیے کو ام الاصناف کہتا ہوں اس سے عموماً میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دنیا کے نثری ادب کی جتنی بھی اصناف ظہور میں آئی ہیں۔ ان کا منبع اور مصدر انشائیہ ہے گویا ام اصناف کہنے سے میرا مطلب زیادہ تر انشائیہ کے ماضی سے ہوتا ہے۔“ [۴۴]

ان کے نزدیک انشائیہ کو اصناف کی ماں کا درجہ حاصل ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر بشیر سیفی انہیں بطور انشائیہ نگار تسلیم نہیں کرتے بلکہ انہیں بطور مضمون نگار اور طنز نگار قبول کرتے ہیں۔ تاہم ان کے انشائیوں میں بھی نکتہ آفرینی کا عنصر موجود ہے ایسے انشائیوں میں لمحے کا دوام، ناک پکڑنے کا عمل اور تجربہ اور ناتجربہ کاری شامل ہیں جبکہ دوسری طرف ڈاکٹر سلیم اختر طنز و مزاح، مفکرانہ انداز اور فلسفیانہ سوچ کو خامی کی بجائے خوبی تسلیم کرتے ہیں اور انہیں بطور اعلیٰ انشائیہ نگار کے روپ میں تسلیم کرتے ہیں۔ تاہم مشکور حسین یاد موضوع کو اپنی ذات کا حصہ نہیں بناتے وہ انوکھے موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں ان کے موضوعات میں ان کے تجربات و مشاہدات بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ بے معنی کیفیتوں اور بے نام جذبات کو خوبصورت نام سے نوازتے ہیں۔ آغاز میں مشکور حسین یاد نے جو انشائیے لکھے ہیں وہ انشائیے کی شعریات پر پورا نہیں اترتی اس وجہ سے انہیں انشائیے کے طور پر مانا نہیں جا سکتا ان کے انشائیوں میں ناامیدی اور کلبیت موجود ہے جو کہ نظیر احمد صدیقی کے انشائیوں کا خصوصیات ہیں وہ معاشرے کی برائیوں اور مسائل سے اس قدر خوفزدہ نظر آتے ہیں کہ ان پر پیار اور محبت کی نظر ڈالنے سے ہی گریز کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے انشائیوں میں سنجیدگی نظر آتی ہے تاہم ان کے انشائیوں میں مثبت سوچ، اخلاقی اقدار اور معاشرے کی بھلائی کا عنصر بھی موجود ہے جنسیات پر مبنی موضوعات بھی ان کے انشائیوں کا حصہ ہیں۔ مشکور حسین

یاد انکشاف ذات کو اپنے انشائیوں کا حصہ تسلیم کرتے ہیں مگر ان کے انشائیوں میں انکشاف ذات کی کمی ہی محسوس کی جاتی ہے۔ وہ اپنے کچھ انشائیوں کا آغاز شعر سے کرتے ہیں شعر کا استعمال انشائیوں کے لیے بالکل بھی درست عمل نہیں ہے۔ ان کے انشائیوں میں سادگی اور روانی بھی پائی جاتی ہے تاکہ ان کے انشائیوں میں دلچسپی کا عنصر قائم رہے۔

کسی بھی انشائیہ کے لیے سب سے زیادہ معاون ماحول، موضوع کا مقصد اور قاری کے ساتھ ساتھ اسلوب ہوتے ہیں لیکن کوئی بھی ادب کسی خاص چیز کا پابند نہیں ہوتا ہے۔ کوئی بھی تخلیق کار شعور کے ساتھ ساتھ لاشعوری کے احساس کے ساتھ ہی اپنے فن پارے کو عمدہ بنا سکتا ہے کیونکہ الفاظ کو اگر چن چن کر لکھا جائے تو زبان کی روانی اس سے اثر انداز ہوتی ہے۔ الفاظ بھی زندگی اور موت کے درمیان چہل قدمی کرتے ہیں اور اس لیے الفاظ کو منتخب کر کے اس کی روانی کو متاثر کرنے سے مراد ان کو موت کی طرف دھکیلنا ہے۔ تخلیق کی زبان جو اسلوب کا درجہ رکھتی ہے مختلف ادوار کے اسالیب مختلف ہوتے ہیں جیسے غالب کے خطوط کا اسلوب الگ تھا اور اقبال کے خطوط کا الگ انداز تھا۔ زبان کی تبدیلی، انداز گفتگو، الفاظ کی سلاست، حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ تبدیلی کی منازل طے کرتے ہیں۔

مشکور حسین یاد کا اسلوب دوسرے انشائیہ نگاروں کی نسبت کافی مختلف ہے۔ مشکور حسین یاد نے ادبی سفر کا آغاز بھی انشائیہ سے کیا اور یہ اس دور کی بات ہے جب انشائیہ تو مکمل طور پر اہمیت بھی حاصل نہیں تھی۔ اس کی اصلاح کافی حد تک نامکمل تھی اور تقریباً ہر کوئی اس سے ناواقفیت رکھتا تھا۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس بات سے ناراضی کا اظہار کرتے ہیں کہ مشکور حسین یاد ایک سینیئر انشائیہ نگار ہیں اور ان کو ان کے عہد سے غیر وابستگی کا اظہار کرنا اور ان کا ذکر بعد کے انشائیہ نگاروں میں کرنا انصاف کے تقاضے پر پورا نہیں اترتا اور وہ اس ضمن میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> "انشائیہ کہ فن و اسلوب سے وابستہ جس بحث کو عملی سطح تک رہنا چاہیے تھا اس نے کردار کشی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ جس کا سب سے بڑا شکار مشکور حسین یاد بنا ہے۔"[۴۵]

مشکور حسین یاد کے ساتھ سب سے بڑی زیادتی اور ناانصافی یہ ہوئی ہے کہ "اوراق" نقاد ان کو سرے سے ہی انشائیہ نگار تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ ان کے انشائیوں کے اسلوب میں انفرادیت پائی جاتی ہے اور ان میں تخیل کی آزادی، طنز اور فکر کے بین بین سفر کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ جس وجہ سے انشائیہ کے کچھ نقاد ان کو قابل توجہ نہیں سمجھتے تھے۔ جب مشکور حسین یاد نے انشائیہ نگاری کی ابتدا کی تھی تو ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کے لیے جو الفاظ استعمال کیے تھے وہ یہ ہیں کہ:

"یاد صاحب نے اپنے پہلے ہی لطیف پارے میں اپنی شخصیت کے ایک پہلو کو بڑے فنکارانہ انداز سے بے نقاب کیا ہے اور ہمیں اپنے تجربے میں شامل کر لیا ہے۔ یاد صاحب نے "لائٹ ایسے" کے بعض دوسرے مقتضیات کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اختصار، تخاطب، غیر رسمی طریق کار اور مزاج کی ہلکی سی آمیزش وغیرہ اور میں انہیں اس کوشش کے لیے کابل مبارک باد سمجھتا ہوں۔"[۴۶]

مشکور حسین یاد کی انشائیوں میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں وہ ان کے معاصرین میں نہیں ملتی کیونکہ یہ بات ایک الگ اہمیت رکھتی ہے کہ ان کے انشائیوں میں مفکرانہ اور فلسفیانہ انداز پایا جاتا ہے۔ جس کی بنا پر ان کو انشائیہ نگار ہی تسلیم نہیں کیا جاتا جو کہ سراسر غلط بات ہے۔ یہ کہنا درست ہو گا کہ ان کے انشائیوں میں فکر و فلسفہ ہی وہ ایک چیز ہے جس کی بنیاد پر ان کو اپنے معاصرین سے انفرادیت حاصل ہے۔ مشکور حسین یاد نئی نسل کے اکثر انشائیہ نگاروں کی طرح موضوع کے ساتھ لپٹنے کی عادت نہیں رکھتے بلکہ وہ اپنے موضوع کی ڈور کو ڈھیلا چھوڑتے ہیں تا کہ موضوع خود ہوا میں اڑتا ہوا اپنے لیے راستہ تجویز کرے اور آزادانہ گھومتا رہے ۔ موضوع کے اندر چھپے ذیلی موضوعات کو الگ سے روشنی مہیا کرتے ہیں تا کہ وہ خود کو اجاگر کر سکیں۔ اس سے اس بات کا ظاہر ہونا ہوتا ہے کہ وہ بیشتر نادر تصورات کو کرید کر ان کو روشن کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ آخر میں ان تمام ذیلی موضوعات کو ایک سرے سے باندھنے کا ہنر بھی رکھتے ہیں۔ انہوں نے فلسفہ اور فکر کی گرہ لگا کر اپنے اسلوب کی انفرادیت کو ظاہر کیا ہے۔ ان کے انشائیوں کے مجموعہ "جوہر اندیشہ" میں موجود ایک انشائیہ "نادانی کا شعور" میں فلسفہ کی گہرائی کو اس طرح ظاہر کیا ہے کہ جیسے وہ خود اس بات سے متفق نہ ہوتے ہوئے بھی اس سے اتفاق کر رہے ہیں:

"کائنات نہ ہے، نہ کبھی تھی اور نہ کبھی ہو گی، ہونے اور نہ ہونے کے درمیان ایک پردہ ہے۔ اصل میں اگر کوئی چیز اگر وجود رکھتی ہے تو وہ یہی پردہ۔۔۔۔ لوگ عدم اور وجود کی بھول بھلیاں میں کھو جاتے ہیں۔ اس پردے کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے، کائنات کے تمام تر کائنات کے تمام تر اثبات کا انحصار اسی پر ہے جس نے اسے نہیں دیکھا، اس نے کچھ نہیں دیکھا، لیکن یوں کہنا چاہیے کہ جس نے اس پردے کی حقیقت کو تسلیم نہیں کیا۔ اس نے کائنات کے وجود سے انکار کر دیا۔ (ظاہر ہے منکر کائنات سے بڑا کافر کون ہو سکتا ہے) یہ پردا کیا ہے؟ آج اور کل کی درمیانی مدت۔ یہ مدت کیا ہے؟ امکانات کے ظہور کا عرصہ۔ ہر لمحہ ایک پردہ اٹھتا ہے اور امکانات کے سہارے کائنات وجود میں آتی رہتی ہے۔ وہ دانا جسے اپنے نادان ہونے کا یقین نہیں ہوتا کبھی اس پردے کو اٹھتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔"[۴۷]

مشکور حسین یاد نے انشائیوں میں مفکرانہ صلاحیتوں کا استعمال کر کے ناقدین کی نظر میں انشائیہ نگاروں کی فہرست سے دور کر رکھا ہے۔ ان کے انشایئے میں موضوع سے متعلق نکات مثلاً نزاکت اور احتیاط کی فلسفیانہ روش کے ذریعے آگے بڑھتا ہے۔ انہوں نے اس انشائیہ میں کائنات اور اس کے حقائق کو فلسفہ کے اس انداز میں پیش کیا ہے کہ اس کے چہرے پر کبھی ایک پردہ ڈالتے ہیں اور کبھی کسی پردے ہی کو حقیقت سے تعلق قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے کائنات پر پردہ ڈال کر اس کے اصل چہرے کو بے نقاب کر دیا ہے اور اس موضوع کو ایک نئی فکری جہت عطا کر دی ہے۔ انہوں نے اپنے اس نئے طرز بیان میں انشائیہ میں طنز و مزاح اور مفکرانہ و فلسفیانہ انداز اپنا کر انشائیہ کے اسلوب کو ایک الگ مقام دلایا ہے۔ ان کے اسلوب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے اشیاء اور مظاہر کو مفکرانہ نظر سے دیکھا ہے۔ وہ نہ تو موضوع کو اپنی ذات کا حصہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی ماحول اور گرد و نواح کے انوکھے پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا دائرہ کار تجربات اور مشاہدات کے گرد گھومتا ہے اور اسی دائرے کے اندر ان کی تخیلات کا وجود معرض آتا ہے۔ دراصل ان کی پوری زندگی کا احاطہ ان کے اسی عمل پر ہوتا ہے۔ ان کے انشائیوں کا نچوڑ اس بات کا احاطہ کرتا ہے کہ وہ بے عنوان اور بے معنی کیفیتوں کو زبان کی گرہ لگانے میں ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں سنجیدگی کے ساتھ رومانیت کا تصور بھی پایا جاتا ہے۔ انہوں نے جیسے کائنات کو ایک پردے کے طور پر بیان کیا تھا۔ اسی طرح وہ حسن کو بے پردگی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اپنے ایک انشائیہ "مبالغہ" میں انہوں نے رومانیت کے بارے میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

> ”حسن بھی تو مبالغہ کا ایک نام ہے. فرق صرف اتنا ہے کہ جب وہ بے نقاب ہوتا ہے تو اسے ہم حسن کہہ دیتے ہیں جب تک پردوں میں رہتا ہے ہمارے دیدہ و دل اس کے تصور سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ انسانی ذہن میں پوشیدہ چہروں کو دیکھنے کی قدرت موجود ہے۔ لیکن ظاہر کی آنکھ اسے ہمیشہ مجبور کرتی ہے کہ حسن پردہ نشیں کی ایک جھلک اسے بھی دکھا دے ورنہ وہ زباں کو اس حسن کے انکار پر آمادہ رکھے گی۔“ [۴۸]

مشکور حسین یاد نے حسن کی تعریف اس فلسفیانہ انداز میں پیش کی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے حسن ان کے فلسفے کی ہی پیدائش ہو، حسن بے پردگی کا محتاج ہے اگر حسن پردے میں ہوگا تو اس کی تسکین صرف دل کے بند دریچوں تک ہی محدود رہے گی لیکن جب تک حسن بے نقاب نہیں ہوگا اس کی تعریف ممکن نہیں، آنکھیں حسن کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ حسن آنکھوں کا محتاج ہوتا ہے۔ حسن تب تک ایک مبالغہ ہی رہے گا جب تک وہ بے پردہ

نہیں ہو جائے گا۔ ان کے انشائیہ سے اس بات کا تعین کرنا بالکل آسان ہے کہ شروع میں ان کی توجہ زیادہ تر سنجید گی کی طرف مائل رہی اور انہوں نے تخیل کی مفکرانہ جہتوں کو ابھارنے اور پھر انہیں اخلاقی مقاصد کے ساتھ وابستہ کرنے میں کامیاب ٹھہرے۔ ان کے اسلوب کی اس جہت کی وجہ سے ان کے فن میں سنجید گی کا بوجھل پن پیدا کر دیا۔

مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں ذات کے انکشاف کا مسئلہ ایک نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انکشاف ذات کے بغیر کوئی بھی ادیب یا شاعر ایک حرف بھی لکھنے سے قاصر ہو گا۔ ان کی اسی بات کا اثر ان کے انشائیوں میں نہ ہونے کے برابر ہے، اگر ان کے انشائیوں کا تجزیہ کیا جائے تو اس بات کا احاطہ کرنا مشکل نہیں ہو گا کہ ان کے اپنے انشائیوں میں انکشاف ذات کا عنصر بہت کم پایا جاتا ہے۔ ان کے ان انشائیوں میں داخلی کیفیت کا اثر بہت کم اور اس کے برعکس خارجی پہلو زیادہ پایا جاتا ہے۔ مشکور حسین یاد کے ہاں جو اسلوب استعمال ہوتا ہے وہ ایک الگ میعار رکھتا ہے۔ کہیں وہ فلسفہ کی گہرائیوں اور کہیں وہ ادب کی بلندیوں کو چھوتا ہے۔ کہیں وہ رومانیت کو بیان کرتے ہیں اور کہیں وہ کسی مثال کو ہی مثال سے اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ تخیل ایک نئے فلسفہ کے گرد گھومنے لگتا ہے۔ انہوں نے اپنے احساسات کو اس انداز میں پیش کیا کہ ایسا محسوس نہیں ہوتا ہے کہ یہ داخلی کیفیت کو بیان کر رہے ہیں۔ ”آزادی کے درد“ میں انہوں نے فکر و فلسفہ سے ہٹ کر کئی نظریات بیان کیے ہیں۔ ان میں سے ایک نظریہ غم کا نظریہ بھی ہے۔ وہ اپنے نظریات کو بھی لطیف الفاظ اور مکمل لہجے میں قارئین کی نظر کرتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیہ "آزادی کا درد" میں غم کے نظریے کو یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> ”غموں کو برداشت کرنا آسان ہے, ان کو سمجھنا مشکل جس طرح ایک لادو جانور آسانی سے اپنے آپ پر کتابیں لدوالیتا ہے اور اس سے ان کے سمجھنے کی کبھی توفیق نہیں ہوتی، اسی طرح عموماًلوگ غموں کو اپنے اوپر لاد تو لیتے ہیں لیکن انہیں یہ سمجھنے کی سعادت کبھی نصیب نہیں ہوتی کہ ان غموں میں کیا کیا بصیرتیں اور توانائیاں موجود ہیں۔ زندگی آدمی کو غمزدہ کرتی ہے اور آزادی غم آشنا۔ باالفاظ دیگر زندگی درد بخشتی ہے اور آزادی ہمیں دردمندی کی دولت بیدار سے مالامال کرتی ہے۔“ [۴۹]

کسی ایک نظریے کی وضاحت کرنا اور اس میں فلسفیانہ پہلو کو پیش کرنا اور اس کو انشائیہ میں ایک خاص جگہ میں اندراج کرنا مشکور حسین یاد کے فن کا خاصہ ہے۔ انہوں نے اپنے طرز بیان میں اس عمل کو احسن طریقے سے

پیش کیا ہے۔ مشکور حسین یاد نے اپنے انشائیہ کو دو مختلف انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کی تحریروں میں سنجیدگی اور فلسفہ آرائی پر طنز و مزاح غالب آگیا ہے یعنی دو مختلف اسلوب انشائیہ میں اکٹھے ہو گئے۔

مشکور حسین یاد کی انشائیوں میں جہاں سلاست اور سادگی سے بات کو بیان کیا گیا ہے اور عام زندگی کے تجربات کو موضوع بنا کر کسی نقطے کے گرد گفتگو کی گئی ہے۔ وہاں ان کے انشائیوں نے احساسات کی بلندیوں کو چھوا ہے اور تخلیقات کا روشن ستارہ ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بعض انشائیوں میں ان کا فلسفہ، فہم و ادراک کی حدبندیوں کو توڑ کر آگے کی طرف سفر کرتا ہے۔ تخیل کے سحر میں جکڑا جاتا ہے تو یہ انشائیہ غیر دلچسپ ہوتے نظر آتے ہیں۔ ان کے اکثر انشائیوں میں لہجہ خالصتاً سنجیدہ اور علمی ہوتا ہوا نظر آتا ہے تو ایسے میں وہ انشائیے مضمون لگنے لگتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں اختصار کا عنصر کم پایا جاتا ہے جبکہ زیادہ انشائیوں میں طوالت پائی جاتی ہے۔

مشکور حسین یاد کے انشائیے کا اسلوب یہ ہے کہ ان کے انشائیوں میں فلسفیانہ انداز کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کا درس بھی موجود ہے۔ انہوں نے وقت، آزادی اور خیر و شر کی بات اپنے انشائیوں میں کی ہے۔ ان کے انشائیوں میں ایک بات کی وضاحت ملتی ہے کہ انسان اس دنیا میں اکیلا نہیں ہے بلکہ معاشرے کا ایک فرد ہے اور وہ آزاد ہے۔ خیر و شر کے معاملات میں اور اپنے آزاد کمال کا ذمہ دار بھی خود ہے۔ چونکہ مشکور حسین یاد کی شخصیت مذہبی اور اخلاقی اصلاح کرنے والی ہے۔ وہ اپنی روح کو بے نقاب کرنے سے کبھی گھبرائے نہیں ہیں۔ ان کا انداز بیان ایسا ہے کہ وہ خود کلامی کریں تو گفتگو لگتی ہے اور گفتگو ایسے محسوس ہوتی ہے جیسے خود کلامی ہو، بظاہر تو ان کے انشائیوں میں خارجی پہلو زیادہ ہے لیکن اس کا ایک پہلو داخلیت سے جڑا ہوا ہے۔ ان کی داخلیت مکمل طور پر کائنات، معاشرے اور اس کے قوانین کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ "سرخاب کا پر" ان کا وہ انشائیہ ہے جس میں مشکور حسین یاد نے وقت کی نوعیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق انسانی زندگی مہینوں اور سالوں سے نہیں بلکہ اعمال کی بنیاد سے بدلتی ہے۔ اس انشائیہ "سرخاب کا پر" میں وہ وقت کی تقسیم اور اعمال کے ساتھ وقت اور انسانی زندگی کے تعلق کو یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> "اعداد و شمار کے حوالے سے آدمی کی عمر کو مختصر کہا جا سکتا ہے لیکن کوالٹی اور خوبی کے اعتبار سے اس کی زندگی کے وقت کو مختصر نہیں کہا جا سکتا، مطلب یہ ہے کہ آدمی کی زندگی کے ماہ و سال کے وقت کو تھوڑا نہیں کہہ سکتے۔ ماہ و سال کو اس کی عمر کا پیمانہ تو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ان کو اس کی زندگی کا پیمانہ ہرگز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ آدمی کی زندگی کے وقت کا شمار اس کے وقت سے لگایا جاتا ہے۔ یعنی آدمی کی زندگی کے وقت کا پیمانہ ماہ و سال نہیں۔" [۵۰]

انشائیہ نگار کوئی بھی اسلوب اپنائے وہ اپنے بنیادی شعور کی حد میں ہی رہتا ہے اور ایسے لوگ جو انشائیہ پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں۔ وہ بھی ان حدود سے باہر نہیں نکل سکتے۔ شعور کی حدود میں رہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری جو بھی ذہنی حالت ہے یا جو کچھ ہم کر رہے ہیں۔ اس سے ہمیں باخبر ہونا چاہیے۔ انشائیہ نگار کا اسلوب اس کی سوچ اور الفاظ کے جوڑ توڑ کے ملاپ سے معرض وجود میں آتا ہے۔ اس کا انداز بیان اور اس کے نظریات مل کر اس کے اسلوب کو بناتے ہیں۔

وہ انشائیہ کے موضوع کے لیے کسی قید کے پابند نہیں ہیں۔ ان کے انشائیوں کے موضوعات اخلاقی اقدار، جنسیات، احساس اور ذاتی زندگی کے تجربات ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ان کا عہد بولتا دکھائی دیتا ہے وہ زندگی کے گھمبیر مسائل بھی تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں وقت اور زمانے کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں ناصح کا روپ بھی دھارتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ان کے تجربات و مشاہدات دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں زندگی ہنستی کھیلتی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے انشائیے کسی شعر کی طرح رواں ہیں ان کے انشائیے جذبات سے بھرپور، گہری فکر سے لبریز اور گہرائی اور جستجو کی صفات رکھتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ شگفتگی اور بے ساختگی ان کی نمایاں خوبیاں ہیں۔

مشکور حسین یاد اپنے عہد کے معاشی، معاشرتی، روحانی اور سیاسی حالات سے قاری کو واقف کرواتے ہیں ان کے اس طرز کے انشائیوں میں واحد متکلم، سنبھالے نہیں سنبھلتا، لے سانس بھی آہستہ، معاشرہ اور کردار، بڑھاپا اور لمحے کا دوام وغیرہ شامل ہیں۔ وہ اشیاء اور ارد گرد کے حالات و مظاہر پر پیار و عقیدت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ وہ انشائیے کے موضوع کو بھی اپنی ذات کا حصہ نہیں بناتے اور منفرد اور انوکھے موضوعات کو بھی احاطہ تحریر میں نہیں لاتے بلکہ اپنے تجربات اور مشاہدات سے اپنا انشائیہ سجاتے ہیں۔ جس سے ان کی پوری زندگی کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے اسرار و رموز کو بھی اپنے انشائیوں میں بیان کرتے ہیں یہی ان کے انشائیوں کی بڑی خوبی ہے۔ ان کے انشائیوں میں تخلیقیت کا عنصر بھی موجود ہے اور یہ احساس کی حد تک جا پہنچتا ہے لیکن جہاں فکر کی سطح بہت حد تک مجرد محسوس ہونے لگتی ہے وہاں مقرون چیزوں سے ان کا واسطہ ٹوٹ کر خلائی شکل کی صورت اختیار کر لیتا ہے وہاں ان کا انشائیہ اپنا معیار کھونے لگتا ہے اور بعض جگہ ان کا انشائیہ بہت سنجیدہ اور فلسفیانہ فکر اختیار کر لیتا ہے۔ مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں مقصدیت بخوبی موجود ہے اور یہ مثبت مقصدیت ان کے انشائیوں کو رونق بخشتی ہے۔ مصنف خیر و شر کے مسئلے کو بھی اپنے انشائیوں کا حصہ بناتے ہیں ان کے خیال میں انسان اپنے اعمال کے معاملے میں آزاد ہے اس لیے وہ اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اس کے لیے وہ معاشرے کو قصور وار نہیں ٹھہرا سکتا

تاہم وہ اپنے آپ کو عام آدمی سمجھتے ہیں۔ مشکور حسین یاد اپنے انشائیوں میں وقت کے فلسفہ پر بھی روشنی ڈالتے ہیں ان کی رائے میں وقت ماضی، حال اور مستقبل کی شکل میں تقسیم نہیں ہو سکتا اور یہ صرف انسان کا اپنا ذہن ہے جو اسے تقسیم کرتا ہے۔

مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں قارئین کو اس عہد کا شعور بولتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے کوئی سامنے والے کو اعتماد میں لے کر آپ سے باتیں کر رہا ہو۔ ان کی انشائیوں کا اسلوب یہ ہے کہ ان انشائیوں میں ثقافت، کلچر، تہذیب، زبان اور محاورے جیتے جاگتے نظر آئیں گے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے الفاظ انسان کو اپنی تشریح خود بیان کر کے دیتے ہیں۔ ان کا انداز اس قدر سلاست والا ہے کہ جیسے محاورے خود تفہیم کے ساتھ نمودار ہو رہے ہو۔ وہ لفظوں میں ایسی لطافت سے بیان بازی کرتے ہیں جیسے کوئی تہذیب خود آنکھوں کے سامنے اپنے ہونے کا احساس دلا رہی ہو۔ انہوں نے ثقافت و فلسفہ کو اس شگفتہ انداز میں بیان کیا ہے کہ فلسفہ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی استاد بچوں کو ابتدائی تعلیم دے رہا ہو۔

انشائیہ نگار کا اسلوب ہی اس کے فن کی نشاندہی اور پہچان کا سبب بنتا ہے۔ انہوں نے اپنے انشائیوں میں نثری محاوروں کا استعمال مثلاہاتھ کنگن کو آرسی کیا، چھلنی بھی بولے اور تشبیہات اور استعارات کے ذریعے مثلاً معمول کی چھتری، سرخاب کا پر وغیرہ سے انشائیوں میں ایک الگ کیفیت کا اظہار کیا ہے۔ جس کیفیت کو نام دینا مشکل ہے۔ انہوں نے انگریزی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے علاوہ ازیں فارسی فقرات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں ۔ ان کے کچھ انشائیے علامتی انداز میں لکھے گئے ہیں اور کچھ استعاراتی انداز میں ہیں جن میں انشائیہ سیدھی راہ شامل ہے۔ مصنف اپنے انشائیوں میں اشعار کا بھی استعمال کرتے ہیں تاہم ان کے انشائیوں میں کلبیت اور قنوطیت کے بھی عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں انشائیہ "غالب خستہ حال" میں نظریہ غم کا نظریہ دیا گیا ہے۔ مشکور حسین یاد اخلاقی اقدار کو احاطہ تحریر میں لاتے ہیں اور برائی کو جڑ سے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں انکشاف ذات اور ذاتی تاثر کا ایک نیا آہنگ نظر آتا ہے ان کے انشائیے "لے سانس بھی آہستہ " میں ذاتی تاثر کا ایک نیا رنگ نظر آتا ہے یہ ان کے مشاہدے اور تجربے کا منہ بولتا ثبوت نظر آتا ہے اس میں خیال کی آزادی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ آپ نے واحد متکلم کا بھی استعمال کیا ہے۔ غیر رسمی انداز بیان اور انکشاف ذات کو بھی برتا ہے۔ مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں ہمیں مغربی ایسے کی تمام خوبیاں دیکھنے کو ملتی ہیں مگر اس کے ساتھ انہوں نے اپنی ملکی انفرادیت کو بھی برقرار رکھا اور اس میں پاکستانیت کا بخوبی اضافہ بھی کیا۔

اس طرح تہذیب و ثقافت کا انشائیوں میں تذکرہ بھی ایک الگ اہمیت کا حامل ہے۔ والدین کی عزت اور خدمت ہمارا تہذیبی شعور ہے۔ اس شعوری کیفیت کو مشکور حسین یاد نے اپنے انشائیہ میں احسن طریقے سے بیان کیا ہے۔ ان کا داخلی کیفیت کو اس انداز میں بیان کرنا کہ جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خارجی پہلو نمایاں ہے، یہ ان کے اسلوب کا نیا طریقہ ہے۔ انہوں نے الفاظ کی ترتیب کو موقع کی مناسبت سے یوں بیان کیا ہے جیسے وہ کسی ایسے شخص کے لیے لکھ رہے ہیں جو عقل و شعور کی وسعت کو چھوتا ہو اور کبھی ان کا انداز بیاں ایسا ہو جاتا ہے جیسے کسی بچے کو اس کی تہذیب کے بارے میں معلومات دینا جس میں ابتدائی جماعتوں کی روایات کا درس دیا جاتا ہے۔ مشکور حسین یاد کا اسلوب نگارش بہت عمدہ ہے اور اس کی عمدگی کو بیان کرنے کا سلیقہ ہر کسی کی قسمت کا حصہ نہیں ہوتا ہے۔ "قدموں کی دھول" میں اس طرز اسلوب کی ایک مثال یوں ہے کہ:

> "میرے بابا اور امی دونوں ہی کوئی خاص پڑھے لکھے نہ تھے لیکن ان کا تہذیبی شعور بہت تربیت یافتہ تھا۔ جس کی ایک ادنٰی سی مثال پیش کر رہا ہوں مجھے والدین کے پاؤں دبا کر بہت لطف آتا تھا۔ لیکن دونوں ہی مجھے اس کا موقع کم دیتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے امی سے کہا، "مجھے آپ کے پاؤں دبا کر خوشی ہوتی ہے لیکن آپ چند لمحوں بعد ہی کہہ دیتے ہیں بس کرو بیٹا" میرا مطلب ہے یہی رویہ ابا جان کا ہوتا ہے اور یہی آپ کا۔۔۔۔ امی فوراً بولیں "ارے میاں! رہنے دو اگر ہم تمہیں اس کام کا زیادہ موقع دیں تو تم اس سے اکتا جاؤ پھر تمہاری خوشی بھی دھری کی دھری رہ جائے اور ہماری عزت نفس کا جو حال ہو وہ الگ۔۔۔" [۵۱]

کسی ادیب کا اسلوب اس طرز حکمت و فلسفہ سے بھرپور بھی ہو سکتا ہے اور انشائیہ میں یہ طریقہ استعمال کرنا، نئے اور منفرد انداز کو جنم دیتا ہے۔ کسی ایک مثال سے دوسری مثال کی وضاحت کرنا مشکور حسین یاد کے اسلوب میں انفرادیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انشائیہ کا آغاز ہی ایسے انداز میں کرنا جس میں حکمت پوشیدہ ہو ان کے طریقہ کار میں انفرادیت کا ایک پہلو ہے۔ سرسید سے پہلے کہانیاں ہوا کرتی تھیں، انہوں نے قصے کہانیوں میں سے عام عنصر کو نکال باہر کیا اور اس میں مقصدیت کا پہلو داخل کیا، بالکل اسی طرح مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں مقصدیت ہے۔ شاعری یا نثر صرف لطف اندوزی یا وقت گزاری پر مشتمل نہیں ہوتے ہیں بلکہ اس میں مقصدیت کا ہونا اس کو با اثر اور کامل بناتا ہے۔ مشکور حسین یاد کی انشائیوں میں مقصدیت ہے جو اسے نکھارتی، سنوارتی اور با معنی بناتی ہیں۔ زندگی کے اس اثبات کے بغیر انشائیہ میں وہ شگفتگی اور تازگی پیدا ہو ہی نہیں سکتی ہے۔

انشائیہ کا ایک اہم مسئلہ معنی اور انداز بیان کا ہے۔ لیکن انشائیہ نگار کو یہ انداز بیان اور تفہیم ہی دوسرے لکھنے والوں سے منفرد کرتا ہے اس پر دیگر اصناف ادب کی پابندیوں کی طرح انشائیہ کی طرف سے کسی قسم کی خاص پابندی عائد نہیں ہوتی۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ انسان سوچ و سمجھ کو ایک ہی معنی میں لیتا ہے لیکن مشکور حسین یاد نے اس کو ایک نئے فلسفہ کی بنیاد پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ہر بات میں حکمت و دانائی کے امر کو اس انداز میں انشائیے کا حصہ بنایا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہر انشائیہ مفکرانہ صلاحیت رکھتا ہے۔ انہوں نے سوچ اور سمجھنے کی صلاحیت کو یوں بیان کیا ہے کہ:

> "قصہ دراصل یہ ہے کہ آدمی سوچے بغیر سمجھ تو سکتا ہے لیکن سمجھے بغیر سوچ نہیں سکتا۔ مگر چونکہ سمجھنے اور سوچنے کے ہر دو عمل اس سرعت سے واقع ہوتے ہیں کہ جلدی سے پتہ ہی نہیں لگتا کہ سوچنے اور سمجھنے میں کون سا عمل پہلے وقوع میں آیا۔ اس لیے عموماً ان اعمال کے تقدم اور تاخر کو قائم کرنے میں انسان سے غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ابھی تک کیا عوام کیا خواص، زیادہ تعداد ایسے افراد کی پائی جاتی ہے۔ جو سوچنے کے عمل کو سمجھنے کے عمل سے پہلے کا عمل قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ قدرت نے انسان کو پہلے سمجھایا اور پھر سوچنے کی صلاحیت ودیعت فرمائی ہے۔" [۵۲]

مشکور حسین یاد نے انسانی فکر کے اس پہلو کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ جیسے قدرت نے ان کو اس بات کی وضاحت کی ہو۔ انشائیہ نگار کے الفاظ اور فکر اس کے اسلوب کو دوسروں سے مماثلت اور انفرادیت کا پرچار کرتے ہیں۔۔ مشکور حسین یاد نے اپنی فکر کو الفاظ کی نفاست سے قارئین کہ سامنے رکھ دیا ہے تاکہ الفاظ کی شگفتگی اور انکشاف ذات سے قارئین لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز ہو سکیں۔ مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں لاہور کے انشائیہ نگاروں کی طرز کا اسلوب پایا جاتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی تحریروں میں اس کی وضاحت دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کی طرح کی ہے۔

تاہم الفاظ کی ثقالت ان کے انشائیوں میں بھرپور پائی جاتی ہے۔ ان کے انشائیے سنجیدہ اور علمی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ ہر لفظ کی وضاحت کے لیے بھی الفاظ کی موجودگی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ہر لفظ اپنے معانی کا الگ رنگ اور ذائقہ رکھتا ہے۔ کسی بات کی وضاحت کے لیے الفاظ کے ساتھ ساتھ ان کا درست استعمال بھی ضروری ہے۔ الفاظ کا درست اور ترتیب سے ہونا فکر کو آسان اور فہم بنا دیتا ہے۔ مشکور حسین یاد کا اسلوب بیان میں الفاظ کو باترتیب اور درست استعمال کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ انہوں نے ایک انشائیہ "شہد کا چھتا" میں لفظ اور اس کے معانی کے بارے میں بھی یہی بیان کیا ہے کہ جیسے شہد کے چھتے میں شہد ہوتا ہے بالکل اسی طرح لفظ اور ان

کے معنی بھی ایک دوسرے میں پیوست ہونے سے طرز بیاں میں سلاست اور چاشنی آتی ہے۔ وہ اس کا نمونہ یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> "ہر لفظ میں اس کے معانی اپنے خاص رنگ و ذائقہ کے ساتھ اس طرح بھرے ہوتے ہیں۔ جس طرح شہد کے چھتے میں شہد۔۔۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ ہر لفظ ایک شہد کا چھتا ہوتا ہے۔ جس طرح چھتے سے شہد نکالنا ایک سلیقہ چاہتا ہے، اسی طرح لفظ سے معنی حاصل کرنا بھی ایک ہنر ہے۔ اس ہنر اور سلیقہ کے بغیر نہ چھتے سے شہد نکلتا ہے اور نہ ہی لفظ سے معنی۔" [۵۳]

مشکور حسین یاد انشائیوں میں بنیادی خیال کے اطراف میں خوبصورت جال بننے لگتے ہیں۔ وہ اپنی بات کو خوبصورت تشبیہات واستعارات سے بیان کرتے ہیں اور یہ ان کے اسلوب کی انفرادیت ہے۔ انہوں نے تحریروں میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے الگ طرز اسلوب کا انتخاب کیا اور معاصرین میں انفرادیت حاصل کی اور انہوں نے اپنے انشائیوں کو خوبصورت رنگ دیا، ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے الفاظ کو زندگی بخشنا ان کا وطیرہ بن گیا ہے۔ اسلوب ہی کسی ادیب کی پہچان ہوتا ہے۔ اس کے بغیر تحریر فضول اور ضائع ہے۔

ن۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں کا اسلوبیاتی جائزہ:

دبستان لاہور میں ایک نام نظیر صدیقی کا ہے۔ نظیر صدیقی بیسویں صدی کے نامور انشائیہ نگار ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کا نام "شہرت کی خاطر "ہے۔ جس میں سولہ(۱۶) انشائیے شامل ہیں۔ دوسرے انشائیہ نگاروں کی نسبت ان کے انشائیوں کی طوالت زیادہ ہے۔ ان کے انشائیے بھی دبستان لاہور کے صلاح الدین حیدر کی انشائیوں کی طرح طنز و مزاح سے بھرپور ہے۔ نظیر صدیقی نے سماج اور معاشرے کے کرداروں کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس مجموعے میں مضامین اور خاکے بھی شامل ہیں۔ یہ مضامین اور خاکے انشائی طرز کے ہیں، اس لیے ان کو ان انشائیوں کے ساتھ اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے۔ نظیر صدیقی کی تحریروں میں مزاح کی نسبت طنز کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ ان کے مضامین اور خاکوں میں انشائیہ نگاری کے اوصاف اور صنف انشائیہ کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ انشائیہ نگاری کے اسلوب انداز تحریر میں طنز و مزاح کو خصوصی اہمیت حاصل ہے بلکہ طنز و مزاح اس کا اہم جزو۔ ہے۔ اس لیے بعض ادیب یا نقاد اس صنف کو طنز و مزاح کے لیے بیان کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس کے اسلوب میں شگفتگی، نفسیات، رومانیت جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس کے فن اور انشائیہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"آج کل اردو ادب میں انشائیہ کے فن سے جس قدر دلچسپی کا اظہار کیا جارہا ہے۔اس کے باوجود مجھے کچھ ایسا محسوس ہو تارہا ہے جیسے اکثر لوگوں کے ذہنوں میں اس فن کا صحیح اور واضح تصور موجود نہیں غالبا یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ انشائیہ کو مزاح نگاری اور طنز نگاری کا مترادف سمجھتے ہیں۔ انشائیہ عموماطنز ومزاح کے عناصر سے خالی نہیں ہوتا۔پھر بھی اسے طنز نگاری،مزاح نگاری کا مترادف سمجھنا صحیح نہیں۔انگریزی ادب میں ممتاز انشائیہ نگاروں کے بہت سے انشائیے ایسے بھی ہیں جن میں طنز کے عناصر بہت کم ہیں یا بالکل نہیں ہیں پھر بھی ان کے اچھے اور معیاری ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔" [۵۴]

نظیر صدیقی کی شاعری میں غم اور دکھ کی جھلک واضح نظر آتی ہے جبکہ ان کے انشائیوں میں غصہ کا اظہار زیادہ ہے۔ اس لیے ان انشائیوں میں طنز کا عنصر زیادہ غالب ہے۔اس بات کا اعتراف اکثر مقامات پر خود بھی کرتے ہیں،اس کتاب میں اپنے فن کی تعریف میں اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ انشائیوں میں مزاح سے زیادہ طنز نمایاں ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ان کے انشائیے طنز کی ترشی کو مزاح سے زائل کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ ان کی تحریروں میں طنز اور غصے کا اظہار کم لگے۔انہوں نے تلخ لہجے کے ساتھ شوخی انداز بھی اپنایا ہے تاکہ قاری کو چبھن کا احساس کم محسوس ہو۔

نظیر صدیقی اپنے انشائیوں میں جزئیات نگاری کا بھی بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں فارسی فقروں اور انگریزی الفاظ کو بھی برتتے ہیں وہ اشعار،اقوال،محاورات،مثل،کو بھی انشائیوں میں استعمال کرتے ہیں۔انکشاف ذات کا پہلو بھی ان کے انشائیوں میں موجود ہے۔نظیر صدیقی اپنے انشائیوں میں زندگی کی تلخ سچائیاں،کڑوے اور بھیانک حقائق کو طنزیہ اور مزاحیہ انداز سے پیش کرتے ہیں اور ماہر نفسیات بھی اس بات کو سراہتے ہیں کہ اگر کڑوے سچ کو طنز ومزاح کے ساتھ پیش کیا جائے تو یہ انسانی ذہن کو زیادہ متاثر نہیں کرتے تاہم نظیر صدیقی طنز ومزاح کو انشائیہ کی اضافی خوبی کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔

نظیر صدیقی کی صحت پیدائشی خراب تھی اور ان کو زندگی میں بہت سے حادثات کا شکار بھی ہونا پڑا جس کے اثرات ان کی تحریروں میں دیکھے جاسکتے ہیں نظیر صدیقی نے اپنے گھر والوں کے خلاف شادی کی اس وجہ سے ان کی زوجہ کو بھی اپنے سسرال میں اتنی عزت اور احترام نہ مل سکا جس سے ان کی گھریلو حالات بھی عذاب بن گئے جن کا ذکر اکثر ان کے خطوط میں دیکھا جاسکتا ہے۔زمانے کی ناقدری کا احساس ان کی تحریروں میں بھی در آیا اسطرح اداسیاں،زمانے کی سرد مہریاں اور محرومیاں مزاح اور طنز کے انداز میں ان کے انشائیوں میں نمایاں ہونے لگیں نظیر صدیقی کی ان کے ادب میں خدمت کے باوجود اتنی پذیرائی نہ ملی جس کا انہیں پوری زندگی شدید احساس رہا وہ

زمانے سے ہمیشہ شکوہ شکایت ہی کرتے رہے اور بعض اوقات طنز کی کاٹ اور اس کی دھار انشائیوں میں زیادہ نمایاں ہونے لگتی ہیں اسکی زیادہ وجہ معاشرے اور دنیا کا ان سے برتاؤ تھا اس وجہ سے نظیر صدیقی کے انشائیوں میں کلبیت، مایوسی اور ناامیدی کا عنصر بخوبی موجود ہے۔ ان کے انشائیے بہتے ہوئے دریا کی مانند ہیں جس کے دو دھارے ہیں ایک دھارا فکر کی وسعت و گہرائی سے بھرپور ہے اور دوسرا دھارا طنز و مزاح کی کاٹ سے بھرپور ہے۔

نظیر صدیقی معاشرے کے تلخ اور کڑوے حقائق بڑی بے باکی سے بیان کرتے ہیں وہ سچ بولنے سے گریز نہیں کرتے۔ وہ خود دکھوں اور پریشانیوں میں گھرے ہونے کے باوجود کبھی بھی اپنی تحریروں میں پنے دکھوں کا برملا اظہار نہ کرتے ان کا یہ دکھ مختلف روپ دھارتا نظر آتا ہے کبھی ہم اسے طنز میں محسوس کرتے ہیں کبھی اسے اپنی سوچ و فکر سے اسے عیاں کرتے ہیں اور کبھی یہ شدید احتجاج کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ تاہم وہ طنز کا مثبت استعمال کرتے ہیں جس کا مقصد معاشرے کی برائیوں کا جڑ سے خاتمہ کرنا ہے۔ وہ زندگی کی تلخ سچائی کو بہت سادہ انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قاری اس کے سحر میں کھو جاتا ہے۔

نظیر صدیقی کے انشائیوں کے عنوانات نہایت سنجیدہ ہیں۔ ان کے مطابق صرف انشائیے کے عنوان سے انشائیے کی پوری کہانی یا کتھا بیان نہیں ہوتی، ایسا نظم یا کہانی میں تو ہو سکتا ہے مگر انشائیہ میں ایسا ممکن نہیں جب تک قاری پورا انشائیہ پڑھ نہ لے تب تک وہ سمجھ نہیں پاتا کہ انشائیہ نگار کیا بتانا چاہتا ہے۔ نظیر صدیقی منفرد انشائیہ نگار ہیں۔ ان کے انشائیوں کی تعداد بہت کم ہے۔ لیکن ان کا اپنا ایک خاص معیار ہے۔ لیکن ان کی انشائیہ نگاری کو اتنی پذیرائی نہ مل سکی جو کہ کھلی ناانصافی ہے۔ ان کے اتنے مخالفین اور تنقید نگار ہونے کے باوجود ان کی انشائیہ نگاری کو پسند کیا جاتا ہو اور اسے پوری دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ اگر فکر کے لحاظ سے ان کے انشائیوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے انشائیے برٹرینڈ رسل اور برنارڈ شاہ کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں مذہب کو اخلاقیات سے آزاد کروانے کا پختہ ارادہ بھی موجود ہے۔ وہ نماز پڑھنے والوں کی گنتی کے اضافے کی اہمیت کو تسلیم کرنے کی بجائے برائی اور شر پیشہ افراد میں کمی کو تسلیم کرتے ہیں۔ تاہم ان کے انشائیوں میں کئی طرز کی فکری لہریں دوڑتی محسوس ہوتی ہیں۔ دبستان لاہور کے نمائندہ انشائیہ نگار نظیر صدیقی کے مجموعے کے پہلے انشائیہ "جہاں میں رہتا ہوں" کے آغاز میں طنز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ سیاست دان کا موازنہ کرتے ہیں۔ مغرب اور پاکستان کے سیاست دانوں کا موازنہ کرتے ہوئے طنزیہ لہجہ خوب گرم رکھا ہوا ہے۔ جیب کاٹنے والے جیب تراش کے حوالے سے بات کرتے ہوئے پاکستان کے کابینہ وزراء کے بارے میں کہتے ہیں:

"اگر آپ ہمارے یہاں کے کسی وزیر کی تعریف میں سب سے بڑی بات چاہیں تو اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے کہ آپ بڑے دیانت دار وزیر ہیں۔ میں یہی بات اگر آپ کے کسی مغربی ملک کے وزیر کے بارے میں کہیں تو وہ اسے اپنی تعریف سے زیادہ توہین پر محمول کرے گا کیا عجب کہ اس قسم کا تعریفی جملہ سن کر وہ آپ پر ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دے۔ اس لیے نہیں کہ مغربی ممالک میں دیانتداری باعث توہین ہے بلکہ اس لیے کہ کسی کی تعریف میں اس قسم کے جملے کا استعمال ایسا ہی ہے آپ کسی کا تعارف کراتے ہوئے کہیں کہ آپ ہیں مسٹر ۔۔۔۔۔شریف آدمی ہے۔ چوری نہیں کرتے ۔" ۵۵

نظیر صدیقی نے اپنے غصے کا اظہار کرنے کے لیے انشائیہ کا انتخاب کیا ہے۔ جس میں انہوں نے طنز کے ذریعے اپنے غصے کا اظہار کیا ہے۔ مذاق کو انہوں نے اپنے طنز سے کم کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس لیے ان کا انداز تحریر دلکش اور آسان ہے۔ الفاظ کا چناؤ اور جملوں میں ربط کا تسلسل قائم ہے۔ جملوں اور فکروں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس انشائیے میں "جہاں میں رہتا ہوں" میں انہوں نے بے روز گاری، سرکاری ملازمین کی بے راہ روی ،جرائم کی روک تھام میں ناکامی اور اداروں میں بد دیانتی کو ہلکی آنچ کے ساتھ بیان کیا ہے۔ رشوت جیسی لعنت کو روکنے کے لیے حکومت نے ایک ادارہ قائم کیا ہے، یہی ادارہ خود رشوت لے کر مجرموں کو چھوڑ دیتے ہیں اور غریب و مسکین کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔

نظیر صدیقی کے انشائیے طویل ہونے کے باعث افسانوی صنف سے بھی مماثلت رکھتے ہیں ۔ان کے انشائیہ افسانوی ادب کے زیادہ قریب ہیں۔ اس حوالے سے ان کا انشائیہ "آزادی اور شرافت" کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس انشائیے کا اسلوب اور انداز تحریر انشائیہ کی بجائے افسانوی ہے۔ جس میں وہ اپنے دوست امجد کی عشق کی داستانوں کی کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ اس میں طنز دیکھنے میں کم ہے مگر اس کے موضوعات میں اخلاقی اقدار، روحانیت، سماجی شعور، فلسفیانہ سوچ اور روحانیت کے ساتھ اس کا انداز تحریر اور اسلوب سادہ اور سلیس ہے۔ اس انشائیہ کے اسلوب اور انداز تحریر کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"امجد نے اپنی زندگی میں اگر کوئی نعرہ لگایا ہے تو وہ صرف محبت کے معاملات میں آزادی کا نعرہ ہے چونکہ وہ افسانہ نگار اور شاعر بھی ہے۔ اس لیے اس نے اپنے کئی افسانوں اور نظموں میں بھی سماج سے آزادی کا مطالبہ کیا ہے لیکن ادھر دو مہینے سے میں اس کی فطرت میں ایک عجیب تبدیلی دیکھ رہا ہوں۔۔۔وہ تبدیلی جس سے اس کی زندگی کا سب سے بڑا انقلاب کہنا چاہیے۔ یہ انقلاب اس کی شادی کا نتیجہ ہو یا نہ ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ انقلاب اس کی شادی کے بعد رونما ہوا ہے۔" ۵۶

نظیر صدیقی کے اسلوب پر رشید احمد صدیقی کا رنگ واضح نظر آتا ہے مگر اس رنگ میں ان کا اپنا اسلوب، انداز اور فکر کا جداگانہ رنگ بھی اپنی اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ رشید احمد صدیقی کی طرح دوٹوک، کھری کھری اور بے باکی سے باتیں کرنے کے عادی ہیں۔ اسی لیے ان کی تحریروں میں طنز کی جھلک زیادہ ہے۔ ہرچرن چاولہ انہیں اپنا پسندیدہ انشائیہ نگار مانتے ہیں اور ان کے بارے میں یہ بھی اکثر کہا جاتا ہے کہ ان کے انشائیوں میں رشید صدیقی کے اسلوب کے اثرات نمایاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں نے سادگی اور احساس کی آمیزش کے ساتھ اپنے انشائیوں کے بحری جہاز کو رشید صدیقی سے الگ ساحل پر لنگر انداز کیا انہوں نے رشید صدیقی کی پیروی ضرور کی مگر انہوں نے اپنے الگ اسلوب کو اپنایا جس کی وجہ سے نظیر صدیقی کا اپنا ایک مقام ہے۔ نظیر صدیقی کا شمار خوش نظر، اعلیٰ فکر، ذہین اور با مطالعہ ادبی شخصیات میں کیا جاتا ہے ان کے انشائیوں میں فکر کا تعمق، وسعت اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ تاہم ان کے انشائیوں میں شگفتگی کا فقدان ہے مگر انکے ہاں پڑھے جانے کی پوری قوت موجود ہے۔ نظیر صدیقی وزیر آغا جتنے انشایئے تو نہ لکھ سکے مگر ان کے انشایئے کسی طور پر بھی کسی بڑے انشائیہ نگار سے کم نہیں ہیں۔

نظیر صدیقی کی تخلیقی صلاحیت اور گہرے فلسفے سے ان کی شعوری افکار کھل کر سامنے آئے ہیں۔ ان کی تحریروں میں طنز و مزاح کے ساتھ فلسفیانہ انداز فکر کا نمایاں ہونا ایک منفرد خوبی ہے۔ دراصل انہوں نے اپنے مزاحیہ انداز میں سماج اور معاشرے کی کڑوی سچائیوں کو بیان کرنے اور حقیقتوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے انشائیوں میں ان کی زندگی کے گہرے تجربات اور عمیق مشاہدات دیکھے جاسکتے ہیں انہوں نے اپنے انشائیوں میں طنز کو مثبت انداز میں استعمال کیا ہے اور ان کے طنز میں بھی صداقت دیکھی جاسکتی ہے اور یہ قاری کو متاثر کرنے کے لیے کافی ہے۔ ان کے انشائیوں میں داخلی غم و غصے کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اس وجہ سے طنز ان کے انشائیوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور اس سے وہ معاشرے کے گھناؤنے جرائم، اور تلخ حقائق کو بے نقاب کرتے ہیں۔

نظیر صدیقی کے انشائیہ ہمارے عہد اور ہم عصر زندگی کی مکمل ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی بنیاد سچائی اور ارد گرد کے واقعات پر مشتمل ہے۔ جن کی تہہ سماج اور معاشرے سے جڑی ہوئی ہے۔ یہ واقعہ فرضی یا خود ساختہ نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا نثری اسلوب منفرد اور جداگانہ حیثیت کا مالک ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو مکمل سچائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے اسلوب میں شگفتگی کی کمی کے باوجود قاری کے لیے کشش ضرور ہے اس کی واحد وجہ طنزیہ و مزاحیہ انداز ہے۔

و۔صلاح الدین حیدر کے انشائیوں کا اسلوبیاتی جائزہ:

دبستان لاہور میں شامل انشائیہ نگاروں میں ایک نام صلاح الدین حیدر رہے۔ سرزمین ملتان سے تعلق رکھنے والے یہ انشائیہ نگار طنزومزاح کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان کے زیادہ تر انشائیے ڈاکٹر وزیر آغا کے رسالے "اوراق" میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے قریبی دوستوں میں صلاح الدین حیدر کا نام بھی شامل ہے۔ ان کے انشائیوں میں طنزومزاح دوسرے انشائیہ نگاروں کی نسبت زیادہ ہے۔ اس لیے ان کے ہاں مزاحیہ انداز اسلوب کی جھلک زیادہ نظر آتی ہے۔ ان کی تحریروں میں طنزومزاح اور شگفتگی کا سلسلہ بھی قائم ودائم ہے۔ ان کے اسلوب سے معاشرے سے ہمدردی کی مہک سونگھنے کو ملتی ہے۔

دبستان لاہور کے نمائندہ انشائیہ نگار صلاح الدین حیدر کے دو مجموعوں میں سے پہلا مجموعہ ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا اور اس میں ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۴ء تک کے انشائیے شامل ہیں۔ اس کا مقدمہ عرشی صدیقی نے لکھا ہے۔ جو ایک طویل مقدمہ ہے۔ اس میں انہوں نے صلاح الدین کے انشائیوں پر تفصیلی بات کی ہے۔ اصل میں صلاح الدین حیدر انشائیہ کے حوالے سے ایک متنازعہ شخصیت ہیں۔ ان کے انشائیوں کو بعض نقاد اور ادیب انشائیہ ماننے سے انکاری ہیں۔ ان کے انشائیوں کو مزاحیہ اور طنزیہ مضمون قرار دیتے ہیں۔ انشائیہ کے لغوی اور اصطلاحی معنی کے لحاظ سے ان کے انشائیہ نامکمل ہیں۔ انکاری گروہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ان کے انشائی لغوی اعتبار سے انشائیہ کی کسی بھی تعریف پر کسی بھی لحاظ سے پورے نہیں اترتے مگر انشائیہ کا دامن شاعری کی طرح وسیع ہے۔ جس میں کئی پیمانوں اور احاطوں کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔ اس مقدمے میں مختلف دلائل سے عرشی صدیقی یہ ثابت کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں کہ صلاح الدین حیدر کا انشائیہ ہر اعتبار اور لحاظ سے مکمل ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

> "اس بحث اور ان تمام دلائل کو دہرانے کا یہ موقع نہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں
> کہ انشائیہ کی کوئی بھی تعریف کی جائے صلاح الدین حیدر کی تحریریں اس تعریف
> پر پوری اترنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ ان تحریروں میں طنزیہ اور مزاحیہ عناصر کی
> فراوانی ضرور ہے لیکن وہ ذاتی استدلال، تمام روایتی جوازات سے آزاد ذہن کی وہ
> منطق جو شخصی انشائیہ سے خاص سمجھی جاتی ہے ان میں موجود ہے۔"[۵۷]

دبستان لاہور کے نمائندہ انشائیہ نگار صلاح الدین حیدر ایک گروہ کی تنقید کے باوجود بھی انشائیہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہیں۔ یہ وہ شخصیت ہیں جن کے تمام انشائیوں میں طنزومزاح کا عنصر موجود ہے۔ سنجیدگی کا رخ بھی اختیار کرتے ہیں مگر اس میں طنزیہ کڑواہٹ کے گھونٹ قاری کو ضرور پینے پڑتے ہیں۔ ان کا طنزیہ اور مزاحیہ

اسلوب ہی ان کی تحریروں کو مضمون سے انشائیوں میں شامل کروانے کا سبب ہے۔طنز و مزاح شخصی انشائیے کے لیے لازمی عنصر کا درجہ نہیں رکھتا لیکن یہ شجر ممنوعہ بھی نہیں ہے۔ان کے انشائیوں میں کہیں ہلکی طنز اور کہیں پر المناک صورتحال پائی جاتی ہے۔پلاٹ اور کرداروں کو مد نظر رکھتے ہوئے اسلوب کو پیش کیا ہے۔ان کا انداز تحریر پر کشش، دل فریب، خوبصورت اور طنز و مزاح سے بھرپور ہے۔انہوں نے شاندار اور احسن طریقے والے انداز تحریر میں جملوں کا استعمال بڑی باریک بینی سے کیا ہے۔

صلاح الدین حیدر کے اس مجموعے میں پہلا انشائیہ ”تذکرہ دربار کا“ ہے۔ان کا یہ انشائیہ ایک شاہکار ہے۔ اس انشائیے میں انہوں نے سماج اور معاشرے کے معاشرتی پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔۔اجتماعی رویے کی جگہ انفرادی رویے کو زیر بحث لایا گیا ہے۔اس پورے انشائیے میں طنز و مزاح اور شگفتگی کی تازگی شروع سے آخر تک بر قرار رہتی ہے۔ذاتی استدلال، غم وغصے اور اکتاہٹ کا احساس کسی بھی مقام پر محسوس نہیں ہوتا ہے۔ ایک بات سے دوسری بات کا تسلسل قائم ہے۔جملوں میں ربط عمدہ اور مضبوط ہے۔ صلاح الدین حیدر بات سے بات نکالنے کا فن رکھتے ہیں۔نمونہ ملاحظہ ہو:

> ”اب تو خیر دربار کی روایت ختم ہوتی جارہی ہے لیکن میرا یقین اس بات پر پختہ ہو گیا ہے کہ درباری اپنے وقت کے ذہین لوگ تھے۔دراصل دربار سے نہ تو فائدہ اٹھایا، دربان لگانے والوں نے اور نہ ہی دربار کے احکام بجالانے والوں نے فائدہ اٹھایا صرف درباریوں نے ایک اچھے درباری کا کمال یہ رہا کہ دربار میں ہمیشہ حاضر رہتا ہے اور صاحب دربار کو نوشتہ دیوار نہیں پڑھنے دیتا۔“ [۵۸]

اس طرح کے جملے انشائیے میں جابجا دیکھے جاسکتے ہیں۔ صلاح الدین حیدر کے باقی تمام انشائیوں میں اسلوب اور انداز تحریر کا یہی انداز ہے۔ان کے ایسے جملے اور فقرے معاشرتی و کائناتی پھیلاؤ کی گہری معنویت کے حامل ہیں۔ایسے فقرے قاری کے ذہن میں نقش ہو کر ضرب المثل کی طرح پختگی کا درجہ اختیار کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ان کے موضوعات ان کی تخلیقی فن اور سوجھ بوجھ سے جنم لیتے ہیں۔غیر مرئی اشیاء کو بھی اپنے اسلوبی فن سے مرئی اشیاء میں تبدیل کر دیتے تھے۔ان کے انشائیوں میں غیر رسمی گفتگو، اختصار، شگفتگی، آزاد خیالی، تازگی

خیال اور طنز و ظرافت جیسے تمام عناصر واضح طور پر موجود ہیں۔ ان تمام خصوصیات کے بغیر ایک معیاری اور تخلیقی انشائیہ تحریر نہیں کیا جاسکتا ہے۔

دبستان لاہور کے نمائندہ انشائیہ نگار صلاح الدین حیدر کا انشائیہ " حماقتیں میرے مقدر کی "ایک تخلیقی انشائیہ ہے۔ یہ انشائیہ ان کی تمام خصوصیات اور خوبیوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس میں فلسفیانہ انداز تحریر ہی اس کو لاجواب کر دیتا ہے۔ اس انشائیہ کے آغاز میں انداز تحریر کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

> "زندگی کو اگر سنجیدگی سے فرصت مل جائے اور جوانی کو نادانی سے مہلت مل جائے تو ایک مسلسل حماقت کا احساس ہو ہی جاتا ہے۔ مردہ دلی اور مردہ پرستی کو لوگ زمانہ خاطر میں نہیں لاتے۔ زندہ پرستوں سے کوئی پوچھے کہ مردوں نے بالخصوص گڑے مردوں نے کا کیا بگاڑا ہے۔" ۵۹

صلاح الدین حیدر کے اس انشائیہ میں فلسفیانہ انداز تحریر اس کو مزید پرکشش بناتا ہے۔ اس انشائیہ میں فلسفیانہ طنز و مزاح کا روپ اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں رومانیت کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ الفاظ اور جملوں میں ربط اور تسلسل تحریر کو خوبصورت اور پرکشش بناتا ہے۔ ایک مقام پر عورت سے ادیب کی پیدائش، ادیب سے فن پارے کی تخلیق، فن پاروں سے نقاد کا جنم اور اس سے آگے تخلیق ہونے والے ادب کو ایک لڑی میں پرویا ہے۔ چند جملوں میں تسلسل اس طرح قائم کیا گیا ہے کہ یہ ایک جملہ محسوس ہوتا ہے۔ انداز تحریر کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہی خوبی ان کی تحریر وں کو انشائیوں میں شامل کرنے کی ایک وجہ ہے۔

دبستان لاہور کے جانے مانے انشائیہ نگار صلاح الدین حیدر انکشاف ذات کرتے ہوئے بھی طنز و مزاح کا پہلو فراموش نہیں کرتے۔ ان کی تحریروں میں شروع سے لے کر آخر تک چاشنی ملتی ہے مگر پھر بھی قاری کو یکسانیت اور اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ انہوں نے طنز و مزاح کے مزاحیہ انداز میں ایسے ایسے رنگ بھرے ہیں کہ یہ تصویر مختلف رنگوں سے خوبصورت لگتی ہے۔ ان کو قاری کی ذہنی تشفی کا مکمل خیال ہے۔ اس لیے ان کے انداز تحریر اور اسلوب میں ابہام نظر نہیں آتا ہے۔ " حماقتیں میرے مقدر کی" مجموعے کے انشائیے " بیان منافقت کا"، "تذکرہ جوانی کا"، "قصہ ضمیر فروشی کا"، "تذکرہ بربادی کا"، "شادی کا بکرا"، "قصہ انقلابی شوہر کا"، "قصہ شرافت کا"، "قصہ جھگڑالو کا" اور "قصہ ایک عاشق کا" موضوعات سے ایک کہانی لگتے ہیں۔ اختصار الفاظ اور جامع انداز تحریر سے معاشرے کی بہترین تصویر کشی کی ہے۔ ان کے انشائیے "قصہ جھگڑالو کا" میں جسم اور علم کے باعث جھگڑے ہوتے ہیں۔ ان دونوں کے ملاپ سے بھی جھگڑے ہوتے ہیں۔ اس انشائیہ میں سماج اور معاشرے کے منہ پر تھپڑ رسید کرتے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

”اگر کہیں جھگڑا ہو جائے تو بیچ بچاؤ کرانے والوں کے سوا سب دیکھنے والوں کے دلوں میں لڈو پھوٹ رہے ہوتے ہیں اور انار چھوٹ رہے ہوتے ہیں۔سچ پوچھیے تو منافقت کے اس دور میں جھگڑا سچائی کا لاشعوری طور پر اظہار ہے۔اسی لیے عموماً ہم اپنے قریبی احباب سے جھگڑتے ہیں دوستوں سے الجھتے ہیں ۔“ [۶۰]

صلاح الدین حیدر نے ہمیشہ اپنی تحریروں کو منفرد بنانے کے لیے کچھ چیزیں شعوری طور پر اختیار کی ہیں۔جن میں اپنے سے معتبر انشائیہ نگاروں کی تحریروں سے استفادہ کرنے کے لیے جملوں کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔دوسرا یہ کہ ایک نقطہ نظر پر اپنی سوچ کو مرکوز کرنے کی بجائے اس کو مختلف نقاط سے گزرتے ہوئے سوچتے ہیں۔اس طرح ان کے خیالات وافکار ایک دائرے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں ۔ان کا علم،مشاہدہ،اور تجربہ ان کے انداز میں جھلکتا ہے۔اس لیے وہ اختصار کے ساتھ کام لیتے ہوئے اپنی تحریروں کو طوالت دینے کی بجائے مختصر مگر جامع بنانے کا فن رکھتے ہیں۔اور یہ فن ہی ان کو دوسرے انشائیہ نگاروں سے انفرادیت بخشتا ہے۔

صلاح الدین حیدر کے دبستان لاہور میں انشائیوں کے دو مجموعے شامل ہیں۔جن میں " حماقتیں میرے مقدر کی" اور "ڈر اور ڈرامہ" شامل ہیں۔اس مجموعے کا انتساب پروفیسر خلیل صدیقی کے نام ہے۔یہ مجموعہ پہلے مجموعے "حماقتیں میرے مقدر کی "اشاعت کے آٹھ(۸) سال بعد شائع ہوا۔جس کا دیباچہ "طرفداریاں" کے نام سے فیض عابد عمیق نے لکھا ہے۔اسی مجموعے میں بیس(۲۰) انشائیے شامل ہیں۔اس مجموعے کے انشائیوں میں ادیب کا اسلوب استعارتی ہے۔جس میں وہ معاشرے اور سماج میں موجود بے شعور آسودگی سے باہر نکالتے ہوئے تنقیدی و تخلیقی سوچ ابھارتا ہے۔طنزومزاح سے چہروں پر مسکراہٹ بکھیرنے کے ساتھ ساتھ تنقیدی خیالات کو جنم دینا صلاح الدین حیدر کے فن کا کمال ہے۔ان کے انشائیے معمولی طرز کے ہیں ۔بعض نقاد ان کے انشائیوں کو انشائیے ماننے سے انکاری ہیں۔ان کا مجموعے کا پہلا انشائیہ ”داستان شامت اعمال“ ہے۔جس میں پرانی یادوں کو تازہ کیا گیا ہے۔اس میں طنز کا عنصر نظر آتا ہے۔طنز کے ساتھ سنجیدگی کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔صلاح الدین حیدر کا اسلوب صرف طنزومزاح پر ہی مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں شگفتگی، نرم مزاج نہ سہی مگر سنجیدگی کی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ان کا اس مجموعہ میں شامل انشائیہ ”انتقال فرمانا“ کے عنوان کے نام سے طنزومزاح کا شاہکار محسوس ہوتا ہے۔ جس میں موت آنے کے مختلف واقعات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔انسان کی موت کن وجوہات کی وجہ سے ہوتی ہے اور موت سے پہلے کون لوگ تیاری کرتے ہیں اور ان کی تیاری کس نوعیت کی ہوتی ہے

؟یہ ساری باتیں طنز و مزاح کے خوبصورت اور دلکش انداز تحریر میں رقم کی گئی ہیں۔موت کی خواہش بھی ایک عجیب داستان ہے کہ اکثر لوگ اس موت کے خواہش مند ہوتے ہیں۔صلاح الدین حیدر صاحب موت کو اردو ادب کے رنگ میں یوں بیان کرتے ہیں :

”جب زبان کے دو دبستان ہو سکتے ہیں۔گفتگو اور لہجے کے دو مکتب فکر ہو سکتے ہیں تو موت اسلوب بدل کر کیوں نہیں آسکتی۔بعض اوقات موت بڑی نستعلیق،بڑی وضعدار اور مرنجان مرنج بن کر آتی ہے۔لیکن میں بہر حال نستعلیق لوگوں کی گفتگو کو اپنے لیے پیغام میں اجل نہیں سمجھتا میری رائے بھی ہے کہ محبوب کے کوچے کی خاک چھان کر مرنا بیابان نوردی کے شوق میں تشنگی سے ہلکان ہونا،اور ادائے بسمل ہو کر تڑپ تڑپ کر مرنا کوئی مرنا نہیں بلکہ وہ اٹھکیلیاں ہیں ۔“ [۱۶]

اردو ادب کے کسی بھی صنف میں طنز و مزاح کا اسلوب سب سے مشکل ترین اسلوب سمجھا جاتا ہے۔انشائیہ جیسی صنف میں طنز و مزاح کا انداز تحریر بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔قاری طنز و مزاح کو پسند کرتا ہے۔اس لیے قاری کو متاثر کرنے کے لیے انداز گفتگو میں چاشنی اور دلکشی ہونا ضروری ہے اور اسے طنز و مزاح کے ساتھ بیان کرنا ایک کھٹن مرحلہ ہے۔صلاح الدین حیدر ترقی پسند تحریک کے ماننے والوں میں سے تھے وہ انسان کی نفسیات اور انسان کے رویوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے وہ معاشرے کی اصلاح اور تربیت کو اپنا فرض گردانتے تھے ان کے انشائیوں میں مزاح کی تیزی بھی بخوبی موجود ہے۔ان کے انشائیوں میں انکشاف ذات،طنز و مزاح اور شخصی دلائل کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے۔وہ پرانے موضوعات کا انتخاب کر کے ان میں نئی صورت حال پیدا کرتے ہیں۔ان موضوعات میں ہنگامی قسم کا مواد نہیں ہے بلکہ وہ اپنے انشائیے عصری حوالے سے لکھتے ہیں۔انہوں نے اپنے انشائیوں میں وسیع تر موضوعات کے انتخاب کے ساتھ وسیع معانی سے بھی نوازا۔اس طرح ان کے انشائیوں میں وسعت پیدا ہو گئی جس وجہ سے اس میں سارے بنی نوع انسان شامل ہو گئے گویا ان کے انشائیوں کے بہت سے فقرات ضرب الامثال کی صورت اختیار کر گئے ان کا انداز حقیقت پسندانہ تھا اور کڑوی سے کڑوی بات کو خوشگوار انداز میں بیان کرتے ہیں۔ان کے انشائیے مزاح کی چاشنی سے بھرپور نظر آتے ہیں اور طنز کی کاٹ بخوبی موجود ہے۔دبستان سرگودھا کے مصنفین انہیں انشائیہ نگار تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں مگر ان کا انشائیہ ”خرد کو غلامی سے آزاد کر“ میں دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کی خوبیاں موجود ہیں۔ان کے انشائیوں میں طنز کی ایک لہر شروع سے آخر تک ان کے انشائیوں میں موجود ہے۔ان کے انشائیوں میں فقرہ طرازی بھرپور دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کا انشائیوں کا مقصد طنز اور مزاح کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کرنا ہے۔ان کے انشائیوں میں ذاتی استدلال،تازگی اور شگفتگی موجود ہے۔وہ

ذاتی منطق اور استدلال سے طنز و مزاح کی صورت حال کو پیدا کرتے ہیں۔ وہ معاشرے کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ چارلس لیمب کی مانند سنجیدہ صورتحال کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں۔

صلاح الدین حیدر اپنے انشائیوں میں بڑی مہارت اور سلیقے سے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں اسلوب طنزیہ اور تلخ نظر ہوتا ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ان کے اسلوب اور انداز تحریر میں انکشاف ذات اور مزاح کے پہلو بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ ان کے فن کو یہ دسترس حاصل ہے کہ وہ سنجیدگی سے طنز و مزاح اور طنز و مزاج سے سنجیدگی کے پہلوؤں کو نکالنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اس ذاتی استدلال کے فن سے اس بدلی ہوئی صورتحال کو نہایت دل نشین انداز میں بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ سنجیدہ نوعیت کے موضوعات پر بھی طنز و مزاح کا رنگ چڑھانے کی کوشش کی ہے۔ سنجیدگی کی بجائے مزاحیہ انداز اسلوب کی ریزہ خیالی کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب میں لطافت و ظرافت کے امتزاج کا عنصر سامنے آتا ہے۔

صلاح الدین حیدر کے اس مجموعے کا انشائیہ "خودکشی" بھی ان کے ذاتی انکشاف اور مشاہدے کی دلیل کا ثبوت ہے اس انشایئے میں مختلف شعراء کی آراء سے استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان شعراء میں فانی، جگر، حسرت، درد، اقبال اور مومن جیسی عظیم شخصیات شامل ہیں۔ اس انشایئے میں "انتقال فرمانا" کی طرح خودکشی کے مختلف طریقوں سے بات نکالتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے وہ متعدد کتابوں کے حوالہ جات دے کر اس پر ہمہ گیر خیالات کا انبار لگاتے ہیں۔ مصنف کے بقول زندگی خود ایک خودکشی ہے۔ ہر انسان مختلف طریقوں سے زندگی میں خودکشی کے کڑوے گھونٹ پی رہا ہے۔ بعض اوقات خودکشی انفرادی ہوتی ہے اور بعض اوقات اجتماعی حیثیت بھی اختیار کر جاتی ہے۔ پوری قوم خودکشی کے مرحلے سے گزرتی ہے۔ اس انشائیہ کے آخر میں مصنف خودکشی کا خودی کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "خودی کا فلسفہ ایک کمزور فلسفہ ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ خودی کا فلسفہ کمزور انسانوں کے لیے نہیں ہے۔ کمزور انسانوں کو صرف میرے فلسفے خودکشی پر غور کرنا چاہیے اور زندگی کے اچھے برے دن ڈائجسٹ رسالے کا مطالعہ کرنے میں گزارنے چاہیے۔ خاص طور پر جرم و سزا اور شکایات کے موضوع پر لکھے گئے مضامین پڑھنے سے اس حقیقت کو فراموش کیا جا سکتا ہے کہ وقت ہر لمحہ ہمیں خودکشی پر مجبور کرتا رہتا ہے۔" [۶۲]

دبستان لاہور کے انشائیہ نگار صلاح الدین حیدر نے ہمیشہ ایسے عنوانات کا انتخاب کیا ہے جن پر بیان کرنا قدر مشکل ہوتا ہے اور ان عنوانات میں ایسا انداز تحریر اختیار کرنا کہ اس میں مزاحیہ طنز و مزاح کی مہک

آئے۔ انہوں نے اپنے انداز تحریر میں ایسے ایسے جملوں کا استعمال کیا ہے۔ جس سے ربط میں پختگی مزید مضبوط ہوتی ہے۔ جملوں میں تسلسل نظر آتا ہے۔ وہ آسان اور سلیس الفاظ کے ساتھ تحریر کو پرکشش بنانے میں کمال کی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کا انشائیہ مجموعہ "ڈر اور ڈرامہ" میں اس دھوکہ باز اور چالاک دنیا میں انسان کی پھرتیوں اور چالاکیوں کو ڈرامہ قرار دیا ہے۔ معصوم اور شریف لوگ ان ڈرامہ باز لوگوں کے ڈرامے میں آکر اپنا ہی نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ پر امن اور شریف النفس شہری ڈرامہ کی زد میں آکر خود ایک ڈرامہ بن جاتے ہیں۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ انسان زندگی کے بھرپور کرداروں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ دھوکہ بازی، فریب اور مطلب پرستی جیسے ڈرامے جنگلوں، بیابانوں اور صحراؤں سے سفر کرتے ہوئے گلیوں، بازاروں، فصلوں، چوباروں اور بندی خانوں تک پہنچ گئے ہیں۔ اس سے بچنا اب ممکن نظر نہیں آتا ہے۔ بعض انسان اپنے ڈر کی وجہ سے ڈرامہ بن جاتے ہیں۔ ان کا ڈر ہی ڈرامہ جیسی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ ہر کوئی دوسرے کی تضحیک اور ذلت پر خوش ہوتا ہے بلکہ یہ اس کے لیے ایک تفریحی ڈرامہ ہے۔ اس ڈرامہ پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "سچی بات تو یہ ہے کہ ڈرامہ عالمی انسانیت کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ دنیا بھوک وافلاس کے ساتھ زندہ رہ سکتی ہے لیکن ڈرامے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس عالمی مسئلے کی طرف اقوام متحدہ کو بھی توجہ دلانی چاہیے لیکن اس غریب کو اپنے ڈراموں سے فرصت نہیں ملتی۔ وہ ڈرامہ نہ کرے تو کوئی نہ کوئی قوم اپنے ڈرامہ شروع کر دیتی ہے دراصل انسان اپنی سرشت کے اعتبار سے جبلی طور پر اور پیدائشی اعتبار سے ڈرامے کا ہی فن کار ہوتا ہے۔"[۶۳]

صلاح الدین حیدر کے اسلوب میں تہہ داری پائی جاتی ہے جس سے معنی کی کئی پرتیں کھلتی ہیں۔ ان کا اسلوب استعاراتی ہونے کی وجہ سے اظہار و ابلاغ میں کافی دشواری ہوتی ہے۔ ان کے موضوعات کافی سنجیدہ ہیں۔ وہ روایتی موضوع کو منفرد انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ موضوع کو بیان کر کے موضوع کے متعلق مختلف حقائق اور نئے مفاہیم کو سامنے لاتے ہیں۔ وہ انشائیوں میں معاشرتی پہلوؤں کے ساتھ طنز و مزاح اور انکشاف ذات کو یکجا کر کے پیش کرتے ہیں۔ ان کے ایک ایک لفظ میں ان کا تجربہ و مشاہدہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اب زندگی اور اس کے ارد گرد ڈرامے ہی ڈرامے ہیں۔ ان سے بچنا ناممکن ہے بلکہ اس کے لیے ہمہ گیر تیار رہنا عقلمندی ہے۔ دبستان لاہور کے نمائندہ انشائیہ نگار صلاح الدین حیدر کے اس مجموعہ میں "ٹوپی"، "بے چارہ گرو"، "گلیاں رنگ رلیاں"، "وجدان اور نادان" اور "مفرور ہونا" قابل فہرست انشائیے ہیں۔ جن کے اسلوب میں طنز و مزاح اور سنجیدگی کا

آپس میں گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ انداز تحریر اس قدر دل فریب اور پر کشش ہے کہ قاری مکمل طور پر ان کے انشائیے میں کھو جاتا ہے۔

ان کی ابتدائی تحریریں کڑواہٹ اور تلخی سے بھری ہوئیں تھیں کہ ان کو دیکھ کر ہجر گوئی کا احساس ہوتا تھا مگر جب انہوں نے فن برائے فن پر عمل کیا اور ان کی تحریروں میں انکشاف ذات کا پہلو در آیا تو اس سے انشائیے کو چار چاند لگ گئے۔ وہ سنجیدہ صورتحال میں مضحک اور مضحک صورتحال میں سنجیدگی کا پہلو پیدا کرتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں ذاتی استدلال کے ذریعے صورتحال کو بدل دیتے ہیں۔ ریاض صدیقی کے مطابق صلاح الدین حیدر کی تحریروں میں رشید احمد صدیقی کی روایت کا عکس جھلکتا ہے۔ اس طرح وہ نئے زمانے اور تہذیب کی طرف قدم جماتے ہیں۔ ان کے انشائیے عصر حاضر کی خوبصورت نمائندگی کرتے ہیں ان کے انشائیے پڑھنے سے روحانی خوشی محسوس ہوتی ہے اور یہ کتھارسس کا بھی سبب ہے اور اس سے قاری ذہنی تشفی بھی محسوس کرتا ہے۔ ان کے انشائیوں میں سوچ کی ایک ایسی لہر بہتی نظر آتی ہے جو جس راستے سے گزرتی ہے اس راستے کو سرسبز و شاداب کرتی جاتی ہے۔ ان کے ایک ایک لفظ میں ان کا تجربہ و مشاہدہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ ایک نقطے پر مرکوز رہنے کی بجائے اپنی پرکار فکر مختلف پہلوؤں کو ملا کر ایک دائرہ کھینچتے ہیں۔ ان کے انشائیے پڑھنے سے قاری ہر بار موضوع کے کسی نئے گوشے اور پہلو سے واقف ہوتے ہیں۔ اس سے فکر کا کوئی نیا پہلو اُجاگر ہوتا ہے۔ اس طرح ان کے انشائیوں میں سوچ و فکر کی گہرائی بخوبی موجود ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں قاری کے لیے نئے راستے اور نئی راہیں وا کرتے ہیں۔ وہ چھوٹے اور مختصر موضوع کو نہایت قرینے سے پیش کرتے ہیں کہ بڑے سے بڑا اہل قلم ان کی اس خوبی کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کرنل محمد خان ان کے انشائیوں کے مجموعی اسلوب کو یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ خوبصورت، معنی خیز اور عام فہم بات کرتے ہیں۔ وہ اپنے چھوٹے سے چھوٹے موضوع کو بیان کے ہنر سے ہیرا بنانے میں ماہر ہیں۔

ھ۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر کے انشائیوں کا اسلوبیاتی جائزہ:

ڈاکٹر شہزاد قیصر کی انشائیوں پر مشتمل جلد "لطف آگہی" ہے۔ یہ تصنیف ۱۹۹۹ء میں منظر عام پر آئی ہے۔ اس سے قبل یہ جلد تین حصوں پر مشتمل تھی۔ جن میں "کلیرنس سیل" ، "صاف چھپتے بھی نہیں" اور" آئینہ بنے ہیں پیرہن" شامل ہے۔ ان کا شمار دبستان لاہور میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر کا انداز تحریر اور اسلوب بے تکلفانہ ہے۔ جس میں خلوص اور جرات مندی سے نظریات کو بیان کیا گیا ہے۔ شہزاد قیصر اپنے انداز گفتگو میں طنز و مزاح کے عنصر کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔ طنز و مزاح سے سماج اور معاشرے کے دوغلے پن اور مکاری کو نشانہ بناتے ہیں۔ طنز و مزاح سے وہ منافقت اور دوہرے معیارات پر تنقید کرتے ہیں۔ طنز و مزاح سے سچائی اور اصل چہروں کو

بیان کرتے ہیں۔ انشائیہ میں طنز و مزاح کی آمیزش کا عنصر زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ نصیحت کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے ایک مناسب حد تک طنز و مزاح کا عنصر استعمال کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ڈاکٹر شہزاد قیصر وہ شخصیت ہیں جو دبستان لاہور میں ہوتے ہوئے بھی دبستان سرگودھا کی شخصیات سے خصوصی لگاؤ رکھتے تھے۔اس لیے ان کے اسلوب میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ اسلوب کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے طنز و مزاح کو نمک مرچ لگا کر استعمال کیا ہے مگر اس میں اعتدال کا دامن نہیں چھوڑا۔ان کے ایک انشائیہ "کہتے ہیں جس کو عشق" میں عاشق کے عشق کرنے کے طریقہ واردات پر روشنی ڈالی ہے۔ ہلکے پھلکے انداز گفتگو میں عاشقوں کی اقسام بھی بیان کر دی ہے۔ آسان اور سادہ انداز تحریر میں روزمرہ زندگی کے واقعات بیان کیے ہیں۔ اس انشائیہ کے آخر میں عشق دوسرے رخ کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں :

> "عشق کی اس روایتی تصویر کے اور رخ بھی ہیں۔ کہیں عشق کی بنیاد ہی جھوٹ، مکر و فریب پر ہوتی ہے۔عاشق لفظوں کا طلسماتی جال بنتا ہے۔ جس میں جھوٹی تعریفوں کے پیوند لگے ہوتے ہیں۔اس میں شہزادی صاحبہ پھنستی چلی جاتی ہے۔اس جال میں تو ہم نے ملکہ عالیہ کو بھی گرتے دیکھا ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ آدمی صرف ان چیزوں کا زبانی دعویٰ کرتا ہے جو حقیقت میں موجود نہیں ہوتی۔" [۶۴]

اس اقتباس میں شہزادی صاحبہ کا لفظ طنزیہ استعمال کیا گیا ہے کہ ہمارے سماج اور معاشرے کی لڑکیاں ان نام نہاد جھوٹے اور ہوس پرست عاشقوں کے جال میں کتنی آسانی سے پھنس جاتی ہیں۔ان طنز بھرے الفاظ کے ذریعے مصنف نے اس کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ آسان اور سلیس الفاظ اور جملے استعمال کیے گئے ہیں۔ فقروں میں چاشنی کا عنصر واضح نمایاں ہیں۔

ڈاکٹر قیصر شہزاد کا انشائیوں کا مجموعہ "لطف آگہی" کے پہلے حصے "کلیرنس سیل" میں پندرہ(۱۵) انشائیے موجود ہیں۔ جن میں بکر منڈی، گھر کی تلاش، کلیرنس سیل، زبان، ماہر نفسیات اور توہمات قابل ذکر ہیں۔ جن میں مصنف نے سماج اور معاشرے کے دوغلے پن اور منافقت کو عیاں کیا ہے۔ اس کے لیے اس اسلوب کو روایتی انداز میں پیش کیا گیا ہے تاکہ قاری کسی بھی ابہام کا شکار نہ ہو۔ مصنف انگریزی اور پنجابی ادب سے بھی تعلق رکھتے تھے، اس لیے الفاظ کی کمی ان کے ہاں نظر نہیں آتی ہے۔ اس وجہ سے انداز تحریر اور اسلوب میں پختگی پائی جاتی ہے۔

دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگار ان کے صرف چند ایک انشائیوں کو انشائیہ تسلیم کرتے ہیں جن میں گھر کی تلاش، ہم سفر، بکرا منڈی اور چڑیا گھر کے باسی شامل ہیں۔ انشائیوں میں ان کا لہجہ خطیبانہ، طنزیہ اور مزاح سے

بھرپور ہے۔ بعض جگہوں پر ان کا مزاح حد سے بڑھ جاتا ہے حتیٰ کہ لطیفہ گوئی کی حد تک پہنچ جاتا ہے وہاں ان کا انشائیہ ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیہ کے مقتضیات پر پورا نہیں اُترتا اور یہ ہی ڈاکٹر شہزاد قیصر کا انفرادی رنگ ہے۔ ان کے مزاح کی وجہ سے ان کا انشائیہ عطاء الحق قاسمی اور یونس بٹ کے انشائیوں کے قریب ہے۔

ان کے انشائیوں میں نفسیات کا عنصر واضح نظر آتا ہے۔ انہوں نے طنز و مزاح سے سماج اور معاشرے کی بگڑی ہوئی نسل کو راہ راست پر لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے، چونکہ ماہر نفسیات ہونے کے ناطے آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کسی بگڑے ہوئے کی اصلاح کس طرح کرنی ہے؟ اس حصے کے ایک انشائیے "بسنت" میں انہوں نے طنز و مزاح کے ایسے تیر چلائے ہیں کہ قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ بسنت ایک خطرناک کھیل کی شکل اختیار کر چکا ہے، بلکہ اب بسنت منانا ایک جرم ہے۔ اس کی حوصلہ شکنی کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ انشائیہ نگار اس کو خوبصورت انداز میں "بسنت" میں یوں بیان کرتے ہیں:

> "بسنت اب اسلحہ کی دوڑ میں شریک ہو چکی تھی۔ اب وقت کا تقاضا یہ تھا کہ ہم پتنگ کی دم پر دھماکہ خیز مواد بھرتے جیسے ہی پتنگ ہوا میں بلند ہوتی اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کرتے۔ ویسے بھی ہمارے معاشرے میں اب تو صرف خوشی کے موقع پر گولیاں چلائی جاتی ہیں۔" [۶۵]

ڈاکٹر قیصر شہزاد نے سماج و معاشرے میں ہونے والی منفی سرگرمیوں پر ہلکے پھلکے انداز میں طنز کے ذریعے اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر پہلے دو انشائی مجموعوں میں کھلنڈرا بچہ کے صورت میں شرارتیں کرتے نظر آتے ہیں مگر ان کے تیسرے مجموعے میں ان پر بلوغت حاوی ہو گئی۔ "آئینہ بنے ہے پیرہن" ان کا ارتقاء یافتہ انشائیوں کی شکل ہے۔ ان کا تیسرا مجموعہ ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا اور اس کے ۸ سال بعد انہوں نے تازہ انشائیے لکھے۔ ان کے اسلوب کی انفرادیت کی وجہ سے ان کے انشائیوں میں بے ساختہ پن اور پرکاری کی خوبی در آئی جس سے ان کے انشائیوں کے حسن میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ شہزاد قیصر اپنے انشائیوں کو معاشرے سے فاسد مادے، دوغلے پن، معاشرے کی ناہمواریت، معاشرے کی برائیوں اور منافقت کا سدباب کرنے کا ذریعہ بھی بناتے ہیں۔ تاہم ان کے انشائیوں میں حقیقی معنوں میں انشائی رویہ پایا جاتا ہے۔ ان کے انشائیوں کی خوبی بے ساختہ پن اور پُرکاری ہے ان کے انشائیوں میں ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی عکاسی جھلکتی ہے، ان کے ہاں خیالات کی ندرت اور جدت پائی جاتی ہے۔

ل۔ ارشد میر کے انشائیوں کا اسلوبیاتی جائزہ:

اردو انشائیہ کو ابتدا ہی میں جن شخصیات نے سہارا دیا۔ ان میں ڈاکٹر وزیر آغا، مشکور حسین یاد، نظیر صدیقی، جمیل آذر، مشتاق قمر وغیرہ جیسے ادباء و انشائیہ نگار شامل ہیں۔ ان نامور شخصیات کے علاوہ چند نام، جو صاحب کتاب نہ ہو کر بھی صنف انشائیہ میں ایسے انشائیے تخلیق کر گئے ہیں کہ اُن کا اسلوب منفرد اور ممتاز ہے۔ ان ممتاز شخصیات میں سے ایک نام ارشد میر کا ہے۔ "اوراق" سمیت چند دیگر ادبی رسائل میں شائع ہونے والی تحریروں سے ان کے انشائی اسلوب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ”اوراق "۱۹۸۳ء میں پہلا انشائیہ "کڑھنا“ کے عنوان سے تحریر کیا، وہ انشائیہ کی لفظی و معنوی خوبیوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس لئے پہلا فن پارہ ہی ایک قابل تحسین انشائیہ قرار پایا۔ وہ اپنے اسلوب میں طنز و مزاح کی جھلک زیادہ رکھتے ہیں۔ اس اسلوب سے انشائیے کی طرف مائل ہوئے۔ انکشاف ذات، شگفتگی اور تازگی بھی ان کی تحریروں میں نظر آنے لگی۔ وہ خیالات و افکار کو ایک موضوع میں پرو کر اس میں داخلی احساسات و جذبات اور خارجی ادراک کی کڑیوں کے سلسلے سے انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں، یہی ان کا فنی اختصاص ہے۔ ان کے انشائیے "کڑھنا“ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ”کڑھنا ذاتی نوعیت کا بھی ہوتا ہے اور نظریاتی بھی۔ طبیعاتی طرز کا بھی اور مابعد الطبیعاتی بھی۔ انسانی علوم کے ماہرین کے نزدیک خواہ جاں گسل لمحات ہوں یا شادی مرگ کی کیفیات ان سے بچاؤ کا بہترین طریقہ کڑھنے سے ہی فیضیاب ہونا قرار پایا ہے۔ دراصل خرابی وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں بعض لوگ کڑھنے سے پائیدار تعلقات استوار کر لیتے ہیں اور دنیا اور مافیہا سے بے خبر اس کے چنگل میں پھنس کر اپنا تیا پانچا کرتے ہیں۔“ [۲۶]

ارشد میر کا اسلوب آسان، فہم اور سادہ ہے۔ وہ زندگی کے ان موضوعات اور پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے ہیں جو منظر کی آنکھ سے پوشیدہ ہیں اور پردے میں محفوظ ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع، قوت مشاہدہ تیز اور تجربہ کامل ہے۔ اس وجہ سے ان کے اسلوب میں جان اور زندگی کی ہماہمی کا لطف پایا جاتا ہے۔ انشائیہ کی تحریک میں ان کا کردار ایک متحرک سپاہی کا ہے۔

ارشد میر الفاظ کو جوڑتے ہوئے اسلوب کے پرکشش جملے ترتیب دیتے ہیں۔ بات سے بات اور نکتہ سے نکتہ نکالتے ہوئے اسلوب کی انفرادیت میں اضافہ کرنے کا فن رکھتے ہیں۔ کسی بھی تحریر میں یکسانیت اس موضوع اور اسلوب کو بے کار کر دیتی ہے۔ اس لیے آپ کی تحریریں یکسانیت کا شکار نہیں ہوتی ہیں بلکہ انفرادیت کو قائم رکھتی ہیں۔ معمولی سے معمولی چیز اور مظہر پر انشائیہ نگار جدید تر کی مہر لگا سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس منفرد اور دلکش اسلوب کی گوند موجود ہے۔ یہ قاری کے احساس کو انشائیہ کے صفحے سے جوڑ لیتی ہے۔ ارشد میر کے ہاں جملوں

اور لفظوں کے ایسے گولر موجود ہیں جن سے اسلوب کی گوند بر آمد ہوتی ہے اور پڑھنے والا انشائیہ کو انجام تک پہنچے بغیر نہیں چھوڑتا۔ ان کے انشائیہ مجموعہ میں سے ایک انشائیے "آنسو" کا یہ اقتباس تو دیکھئے:

”اور پھر یہ بات بھی ہے کہ ہر شخص آنسوؤں کی حد تک خود کفیل ہوتا ہے۔ اس انمول خزانے پر کوئی قارون لاکھ کوشش کرنے کے باوجود براجمان نہیں ہو سکتا۔ البتہ آنسوؤں کے بھی اپنے اصول اور ضوابط ہیں کہ بعض اوقات تو بڑی فیاضی دکھاتے ہیں اور فراخدلی سے بہنا شروع ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھار اڑیل ٹٹو کی مانند کسی قیمت پر چلنا گوارا نہیں کرتے لیکن حالات کی ستم ظریفی کا کیا علاج کہ آنسوؤں کے طے شدہ یہی قوائد پاش پاش ہو کر رہ گئے ہیں۔ چنانچہ موجودہ حالات میں سفید پوش طبقے کی آنکھوں میں جھانکا جائے تو ہر لمحہ نمناک ہی نظر آتا ہے۔“ [۶۷]

ارشد میر کی انشائیہ نگاری کے اسلوب میں تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ جو دوسرے انشائیہ نگاروں میں ملتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں روز مرہ کے واقعات اور سماج و معاشرے کے گرد گھومنے والے موضوعات ہیں۔ ان کے انشائیے اپنے ارد گرد اور سماج و معاشرے سے جنم لیتے ہیں یہ موضوعات نہایت سادہ اور عام ہیں کہ ان پر انشائیے تحریر کر سکتے ہیں ایک دفعہ تو عقل حیران ہو جاتی ہے۔ انہوں نے صحیح معنوں میں سماج و معاشرے کی عکاسی کی ہے۔ مثلاً ”دھوتی" کا آغاز ہی انشائیہ نگار کی سوچ اور اسلوب کو ظاہر کر دیتا ہے جس میں سماجی مطالعے کی گہری جھلک دکھائی دیتی ہے:

”دھوتی ہمارے کلچر اور اگریکلچر کا جاذب نظر سنگم ہی نہیں قابل فخر سرمایہ بھی ہے۔ دیکھا جائے تو اس کا وجود ہی دھرتی کا مرہون منت ہے۔ پھر دونوں میں لے دے کر "گر" اور "ر" کا ہی تو فرق ہے، جو باہم تبادلے میں من تو شدم تو من شدی کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔“ [۶۸]

ارشد میر کے فن انشائیہ نگاری کا یہ کمال ہے کہ ان کے اسلوب کی دلکشی اور دلآویزی جہاں قاری کو محور کرتی ہے وہاں ارشد میر کا قد و قامت بھی پوری طرح ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ارشد میر اپنے مختصر انشائی خزانے کے باوجود بڑے انشائیہ نگاروں کی فہرست میں جگہ بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان انشائیوں میں غیر رسمی طریقہ کار بھی ہے اور ایجاز واختصار بھی، نکتہ آفرینی بھی ہے اور بات سے بات نکالنے کا ہنر بھی۔ پھر اسلوب ایسا رواں اور سادہ ہے کہ کہیں بوجھل پن پیدا نہیں ہوتا۔ ”کڑھنا“، ”دھوتی“، ”تولیا“ اور ”موڈ“ جیسے انشائیے ارشد میر کے پر کشش اور جاذب اسلوب کے نمونے ہیں۔ ارشد میر دراصل ایک صاحب مطالعہ آدمی تھے اُن کا اپنی تہذیب اور

ثقافت سے رشتہ بہت گہرا تھا۔ تجربات اور مشاہدات کی آمیزش اور متخیلہ کی رنگ آمیزی نے ان کی تحریر میں جان پیدا کر دی ہے۔ اس لیے ان کے انشائیے مجبوراً نہیں پڑھنے پڑتے ہیں بلکہ قاری دلچسپی اور تجسس سے پڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ یہ ان کے فن کا سحر ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتا ہے۔

ارشد میر اپنے انشائیہ کی تشکیل اور تعمیر میں سارے محرک اور عوامل نظر میں رکھتے ہیں مگر اسلوب کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ وہ اسلوب میں رنگ آمیزی ایسے کرتے ہیں اور اپنی دل کش شخصیت کی خوشبو تحریر میں اس طرح بھر دیتے ہیں کہ گویا چمنستان کھل اٹھا ہو۔ ارشد میر کی جاندار زبان بھی انشائیہ کے اسلوب سے مطابقت رکھتی ہے۔ احساس اور وجدانی کیفیت میں جب فکری عناصر شامل ہوتے ہیں تو جذبہ و دانش کا ایک امتزاج اُبھرتا ہے۔ اس لیے ان کی تحریر نہ صرف بھرپور اثر رکھتی ہے بلکہ سوچ کو بھی متاثر کرتی ہے۔ انہوں نے اپنا اسلوب روایتی انشاء پردازی کے خمیر سے اٹھایا ہے۔

م۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا اسلوبیاتی تقابل:

زیرِ تحقیق مقالہ میں دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے منتخب انشائیہ نگاروں کا اسلوبیاتی تقابل کیا گیا ہے۔ دبستان سرگودھا کے چند منتخب انشائیہ نگاروں میں ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، مشتاق قمر، جمیل آزر اور اکبر حمیدی شامل ہیں جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں مشکور حسین یاد، نظیر صدیقی، شہزاد قیصر، صلاح الدین حیدر اور ارشد میر کے انشائیے شامل ہیں۔ کسی ادب میں اسلوب مصنف کی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے جو اس کی تحریر اور اس کے انداز بیان کو دوسروں سے منفرد کرتا ہے۔ اسلوب کسی بھی ادب کے لیے پرکشش اور انفرادیت کا حامل ہوتا ہے جو مصنف کی شخصیت کو اس کی تحریروں میں آویزاں کرتا ہے۔ ہر ادیب کا اسلوب اس کے افکار کو بیان کرتا ہے اور اس اسلوب کی بنا پر ہی اس کی تحریروں میں چاشنی اور انفرادیت رونما ہوتی ہے۔

کسی بھی انشائیہ نگار کے اسلوب کی رنگینی اس کے الفاظ اور لہجے کے انتخاب سے ہوتی ہے۔ اگر کوئی انشائیہ نگار اپنے انشائیوں میں سادہ اور عام فہم الفاظ استعمال کرتا ہے تو وہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ دبستان سرگودھا کے انشائیاں نگاروں میں ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں میں مزاج کی عمدگی اور نفاست کا عنصر بہترین انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے انشائیوں میں ملتے جلتے اسلوب نظر آتے ہیں۔ بعض جگہوں پر انہوں نے آسان اور سادہ الفاظ کے استعمال سے اپنے اسلوب کو پرکشش اور قابل توجہ بنایا ہے جس سے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ قاری کسی سحر انگیز منظر میں خود کو مرکوز کر رہا ہے۔ سادہ اور روز مرہ زندگی میں استعمال ہونے والے الفاظ

کا چناؤ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس کے برعکس بعض جگہوں پر دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگار اپنے انشائیوں کو پرتجسس اور پرکشش بنانے کے لیے مشکل اور پیچیدہ الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جو کہ عام قاری کے لیے باعث الجھن ہوتا ہے۔

دبستان لاہور کے سب انشائیہ نگاروں کا اسلوب ایک دوسرے سے مختلف اور منفرد نظر آتا ہے دبستان لاہور کے انشائیاں نگاروں میں مشکور حسین یاد کی انشائیہ نگاری میں یہ فن پایا جاتا ہے کہ وہ کائنات اور اس دنیامیں موجود زندگی کی تفہیم اور اس میں غور وفکر کو ایک مصور کی صورت میں بہترین انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں بصیرت والوں کے لیے ایک الگ دنیابسی ہوئی ہے۔ان کے انشائیے کہیں تشنگی اور کہیں پر سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں اور کہیں پر فکر کی گہرائیاں سمندر کی لہروں کے ساتھ ساحل تک رسائی کی منتظر ہیں۔ مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں کہیں کہیں فکر طنز ومزاح کا لبادہ اوڑھے ہوئے اس کو نئے اور منفرد انداز سے پیش کرتے ہیں۔ جس سے ان کے اسلوب میں انفرادیت واضح ہوتی ہے۔ان کے انشائیوں میں بے تکلفی نظر آتی ہے جو کہ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کی بھی خوبی گردانی جاتی ہے

ڈاکٹر وزیر آغا دبستان سرگودھا کی ایسی پہچان ہیں کہ ان کے انشائیے اپنی منفرد اور جداگانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ انشائیے میں ماحول موضوع، مقصد اور قاری اسلوب کی تشکیل میں معاون ومددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے شعور سے زیادہ لاشعور کا احساس رکھتے ہیں۔ الفاظ چن کر لکھنے کی عادت ہو تو یہ عادت فن میں روانی ہے اور انداز تحریر کو جلا بخشتا ہے۔ الفاظ بھی اپنی بقا کو زندہ رکھتے ہیں۔ اس لیے اسلوب میں الفاظ کا چناؤ ایسا ہونا چاہیے کہ یہ تحریر کو زندگی بخشیں اور یہ ان کا اندازِ بیان ہی ہے جو ان میں انفرادیت پیدا کرتا ہے۔ دبستان سرگودھا کے انشائیوں میں اسلوب میں شگفتگی، اختصار، انکشاف ذات، غیر رسمی انداز گفتگو اور تنوع نظر آتا ہے۔ الفاظ میں شگفتگی نظر آتی ہے تو اختصار سے بھی دامن بھی خالی نہیں ہے۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں میں انکشاف ذات اور تنوع کے ساتھ اسلوب کو رنگین بنانے میں کمال مہارت پائی جاتی ہے۔ یہاں کے انشائیہ نگاروں نے معاشرتی عناصر کو لطیف اور نرم زبان کے استعمال سے واضح کیا ہے۔ ان کا انداز گفتگو ایسا ہے کہ سلاست کے انداز میں گردش کر رہا ہو۔ انہوں نے معاشرتی منظر کشی کو نہایت بے تکلفانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں مشکور حسین یاد کا نام اپنی الگ اہمیت رکھتا ہے۔ مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں ذات کے انکشاف کا مسئلہ ایک نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انکشاف ذات کے بغیر کوئی بھی ادیب یا شاعر ایک حرف بھی لکھنے سے قاصر ہو گا۔ ان کی اسی بات کا اثر ان کے انشائیوں میں نہ ہونے کے برابر

ہے، اگر ان کے انشائیوں کا تجزیہ کیا جائے تو اس بات کا احاطہ کرنا مشکل نہیں ہو گا کہ ان کے اپنے انشائیوں میں انکشاف ذات کا عنصر بہت کم پایا جاتا ہے۔ ان کے ان انشائیوں میں داخلی کیفیت کا اثر بہت کم اور اس کے برعکس خارجی پہلو زیادہ پایا جاتا ہے۔ مشکور حسین یاد کے ہاں جو اسلوب استعمال ہوتا ہے وہ ایک الگ میعار رکھتا ہے۔

غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں میں بھی دبستانِ سرگودھا کے دوسرے انشائیہ نگاروں کی طرح انکشاف ذات کا عنصر بہت نمایاں ہے، بلکہ ان کے انشائیوں میں انکشاف کائنات کیا ہے کو بھی اپنے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جس میں اپنی ذات کو آئینہ بنا کر پوری کائنات کا عکس بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس حوالے سے "تسخیر کائنات" بہت ہی خوبصورت اسلوب کا انشائیہ ہے۔ یہ انشائیہ ان کا نمائندہ انشائیہ ہے۔ جس میں انہوں نے ذات کو کائنات سے تعبیر کر کے اپنے فن کا اظہار کیا ہے۔ جس میں غیر رسمی انداز گفتگو اختیار کیا گیا ہے۔ ان کے انشائیوں میں انگریزی الفاظ جا بجا ملتے ہیں، جسے انگریزی رسم الخط میں اپنے انشائیوں میں استعمال کر کے اس کے اسلوب کو دلکش اور پروقار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگار الفاظ میں توازن و اعتدال برقرار رکھتے ہوئے دلکش انداز تحریر اور اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ غلام جیلانی اصغر کے اسلوب میں سنجیدہ فکر اور فلسفہ کی بجائے ہلکا پھلکا طنز و مزاح کا رنگ نظر آتا ہے۔

دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں طنز و مزاح میں بھی اپنی قوم کی اصلاح کرنے کا انداز نظر آتا ہے۔ طنز و مزاح ادیب کے اسلوب کو بوریت سے بچاتا ہے اور اسلوب میں طنز و مزاح میں مثبت فکر پائی جاتی ہے۔

دبستانِ سرگودھا کے ہر ادیب کے اسلوب کی یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ وہ حقیقت کو بیان کرتے ہوئے ایسے الفاظ کا چناؤ کرتے ہیں کہ کسی کی دل آزاری بھی نہ ہو اور حقیقت بھی بیان ہو جائے یہی بہترین اسلوب کی نشانی ہے۔ اس کے برعکس دبستانِ لاہور کے انشائیہ نگاروں کی تحریروں میں طنز کی جھلک زیادہ ہے۔ ان انشائیہ نگاروں کی تخلیقی صلاحیت اور گہرے مطالعہ سے ان کی شعوری افکار کھل کر سامنے آئے ہیں۔ ان کی تحریروں میں طنز و مزاح کے ساتھ فلسفیانہ انداز فکر کا نمایاں ہونا ایک منفرد خوبی ہے۔ دراصل انہوں نے اپنے مزاحیہ انداز میں سماج اور معاشرے کی کڑوی سچائیوں کو بیان کرنے اور حقیقت سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے ان کے اسلوب میں شگفتگی کی کمی کے باوجود قاری کے لیے کشش ضرور ہے اس کی واحد وجہ طنز و مزاح کا انداز ہے۔

دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں نظیر صدیقی کے معیار اور اسلوب بیان میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ نظیر صدیقی نے اپنے غصے کا اظہار کرنے کے لیے انشائیہ کا انتخاب کیا ہے۔ جس میں انہوں نے طنز کے ذریعے اپنے غصے کا اظہار کیا ہے۔ مذاق کو انہوں نے اپنے طنز کی کو کم کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس لیے ان کا انداز تحریر

دلکش اور آسان ہے۔ الفاظ کا چناؤ اور جملوں میں ربط کا تسلسل قائم ہے۔ جملوں اور فکروں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے موضوعات میں طنز کو ایک الگ انداز میں پیش کیا ہے اور ان کے موضوعات میں اخلاقی اقدار، روحانیت، سماجی شعور، فلسفیانہ سوچ اور روحانیت کے ساتھ اس کا انداز تحریر اور اسلوب سادہ اور سلیس ہے۔

دبستانِ لاہور کے انشائیہ نگاروں کے انداز گفتگو میں طنز و مزاح کے عنصر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ طنز و مزاح سے سماج اور معاشرے کے دوغلے پن اور مکاری کو نشانہ بناتے ہیں۔ اس طنز و مزاح سے سچائی اور اصل چہروں کو بیان کرنا ان کے اسلوب کی پہچان ہے۔ انشائیہ میں طنز و مزاح کی آمیزش کا عنصر زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ نصیحت کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے ایک مناسب حد تک طنز و مزاح کا عنصر استعمال کرنے میں مہارت رکھتے ہیں اور ان انشائیوں میں کہیں ہلکا طنز اور کہیں پر المناک صورتحال پائی جاتی ہے۔ اردو ادب کے کسی بھی صنف میں طنز و مزاح کا اسلوب سب سے مشکل ترین اسلوب سمجھا جاتا ہے۔ انشائیہ جیسے صنف میں طنز و مزاح کا انداز تحریر بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔

کسی بھی تحریر میں فطرت شناسی خوبصورتی بڑھانے اور نکھارنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ فطرت سے محبت ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان میں موجود ہوتا ہے۔ فطرت شناس انشائیہ نگار اپنی فطرت پرستی سے قاری کو متاثر کرنے میں جلد کامیاب ہوتا ہے اور فطرت پرستی کی وجہ سے انداز تحریر اور اسلوب پرکشش اور دل نشین ہو جاتا ہے۔ ایک سچے اور کھرے انسان کا فطرت سے گہرا ربط ہونا فطری عمل ہے۔ وہ خوبصورت نظاروں سے لطف اندوز ہو کر تسکین محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح ایک قاری فطرت پرستی میں خوبصورت نظاروں اور مناظروں کو پڑھ کر خوشی محسوس کرتا ہے۔

جمیل آذر کا شمار دبستان سرگودھا کے منفرد انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے انشائیوں میں اسلوب کی پرکشش ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے افراد اور اشیاء کو بنیاد بنا کر اپنا منفرد نقطہ نظر کو پیش کیا ہے۔ ان کی زبان اس کار خیر میں معاون و مدد گار ثابت ہوئی ہے ۔ وہ بطور انشائیہ نگار اس لئے کامیاب ہیں کہ انھیں لفظ کو گویائی عطا کرنے کا فن آتا ہے۔ ان کا انداز بیان، گفتگو اور تحریر دوسروں سے مختلف ہے۔ شہزاد قیصر اپنے انداز گفتگو میں طنز و مزاح کے عنصر کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔ اس طنز و مزاح سے سچائی اور اصل چہروں کو بیان کرتے ہیں۔ انشائیہ میں طنز و مزاح کی آمیزش کا عنصر زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ نصیحت کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے ایک مناسب حد تک طنز و مزاح کا عنصر استعمال کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر وہ شخصیت ہیں جو دبستان لاہور میں ہوتے ہوئے بھی دبستان سرگودھا کی شخصیات سے

خصوصی لگاؤ رکھتے تھے۔اس لیے ان کے اسلوب میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ اسلوب کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے طنز و مزاح کو نمک مرچ لگا کر استعمال کیا ہے مگر اس میں اعتدال کا دامن نہیں چھوڑا۔

دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں میں اکبر حمیدی کے اسلوب میں رنگینی کا عنصر نمایاں ہے۔انشائیہ نگار کی خاصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے اسلوب کے اندر بیک وقت مختلف کیفیات کو جذب کر لیتا ہے۔ان کی جملہ بندی اور فقرہ شناسی بہترین الفاظ کے انتخاب کا نچوڑ ہے۔ان کا اسلوب بھی ان کی شخصیت کی مکمل عکاسی اور ترجمانی کرتا ہے۔ان کا اسلوب نہایت سادہ ہے کہ ایک عام پڑھنے والے کو کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں ہوتا ہے۔ ان کے انشائیوں میں مثبت فکر پائی جاتی ہے۔ انداز بیان، انداز گفتگو اور انداز تحریر جاندار اور پر کشش ہونے کے ساتھ معنویت سے بھرپور ہوتا ہے۔ ان کا اسلوب ان کو دوسرے انشائیہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔

دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں ارشد میر الفاظ سے الفاظ کو جوڑتے ہوئے اسلوب کے پر کشش بناتے ہیں۔بات سے بات اور نکتہ سے نکتہ نکالتے ہوئے اسلوب کی انفرادیت میں اضافہ کرنے کا فن رکھتے ہیں۔ کسی بھی تحریر میں یکسانیت اس موضوع اور اسلوب کو بے کار کر دیتی ہے۔اس لیے آپ کی تحریریں یکسانیت کا شکار نہیں ہوتی ہیں بلکہ انفرادیت کو قائم رکھتی ہیں۔ ان کا اسلوب آسان، فہم اور سادہ ہے۔ وہ زندگی کے ان موضوعات کے ان گوشوں و پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے ہیں جو منظر کی آنکھ سے پوشیدہ ہیں اور پردے میں محفوظ ہیں۔ان کا مطالعہ وسیع، قوت مشاہدہ تیز اور تجربہ کامل ہے۔

دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں میں یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ ان میں فطرت سے لگاؤ اور ان کی تحریروں میں فطرت خود کو منعکس کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔انشائیہ نگاری ایک ایسا فن ہے جو ذات کے اظہار، کائنات کی تفہیم اور آزادی کے کمالات کا ازالہ کرتی ہے۔دبستانِ لاہور کے انشائیہ نگاروں کی انشائیہ نگاری اظہار ذات اور تفہیم ذات کا ایک عمدہ ذریعہ ہے۔ان انشائیہ نگاروں نے کائنات اور اس دنیا میں موجود زندگی کی تفہیم اور اس میں غور و فکر کو ایک مصور کی صورت میں بہترین انداز میں پیش کیا ہے اور ان انشائیوں میں بصیرت والوں کے لیے ایک الگ دنیا بسی ہوئی ہے۔ان انشائیوں میں کہیں تشنگی اور کہیں پر سنجیدگی کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے اور کہیں پر فکر کی گہرائیاں سمندر کی لہروں کے ساتھ ساحل تک رسائی کی منتظر ہیں۔

دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں میں مشتاق قمر کے اسلوب میں دلیل، منطق و محاورات کی بجائے سیدھا سادہ انداز بیاں نمایاں ہے۔وہ سادگی اور سہولت سے آسان اور سادہ الفاظ میں اپنا نقطہ نظر بیان کر جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مشکل اور پوشیدہ الفاظ کی گنجائش نہیں ہے۔زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے

آسان اور سادہ انداز تحریر اختیار کرتے ہیں۔ فطرت شناس نے فطری موضوعات کو چن چن کر ان پر دلکش اور خوبصورت انداز میں اپنے افکار کا قلمبند کیے ہیں۔ ہر انشائیے کی طرح اس انشائیے میں سادہ اور آسان الفاظ کا چناؤ اور انگریزی الفاظ کی آمیزش نے ان کے اسلوب کو پر کشش بنا دیا ہے۔ الفاظ کا چناؤ اور جملوں کی خوبصورتی ربط ان کے انشائیوں میں عام پایا جاتا ہے۔

دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے انشائیوں میں سنجیدگی کا رخ بھی اختیار کرتے ہیں مگر اس میں طنزیہ کڑواہٹ کے گھونٹ قاری کو ضرور پینے پڑتے ہیں۔ صلاح الدین حیدر کا طنزیہ اور مزاحیہ اسلوب ہی ان کی تحریروں کو مضمون سے انشائیوں میں شامل کروانے کا سبب ہے۔ طنز و مزاح شخصی انشائیے کے لیے لازمی عنصر کا درجہ نہیں رکھتا لیکن یہ شجر ممنوعہ بھی نہیں ہے۔ ان کے انشائیوں میں کہیں ہلکی طنز اور کہیں پر المناک صورتحال پائی جاتی ہے۔ ان کا انداز تحریر پر کشش، دل فریب، خوبصورت اور طنز و مزاح سے بھرپور ہے۔ ان کے انشائیوں میں طنز و مزاح اور شگفتگی کی تازگی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ ذاتی استدلال، غم اور غصے اور اکتاہٹ کا احساس کسی بھی مقام پر محسوس نہیں ہوتا ہے۔ ایک بات سے دوسری بات میں تسلسل قائم ہے۔ جملوں میں ربط عمدہ اور مضبوط ہے۔

اسلوب کی وجہ سے دبستانِ سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے انشائیے اپنی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان ادیبوں کے الفاظ میں کہیں شگفتگی نظر آتی ہے تو اختصار کا دامن بھی خالی نہیں ملتا۔ ان کے ہاں انکشاف ذات اور تنوع کے ساتھ اسلوب کو رنگین بنانے میں کمال مہارت رکھتے ہیں۔ بعض اوقات دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے انشائیوں کے اسلوب میں شگفتگی، اختصار، انکشاف ذات، غیر رسمی انداز گفتگو اور تنوع نظر آتا ہے۔ دبستانِ لاہور کے انشائیہ نگاروں نے اپنے نئے طرز بیان میں انشائیہ میں طنز و مزاح اور مفکرانہ و فلسفیانہ انداز اپنا کر انشائیہ کے اسلوب کو ایک الگ مقام دلایا ہے۔ ان کے اسلوب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے اشیاء اور مظاہر کو مفکرانہ نظر سے دیکھا ہے۔ انھوں نے موضوع کو اپنی ذات کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ماحول اور گرد و نواح کے انوکھے پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا دائرہ کار تجربات اور مشاہدات کے گرد گھومتا ہے اور اسی دائرے کے اندر ان کی تخیلات کا وجود معرض آتا ہے۔

دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے انشائیوں کے انداز بیان میں سلاست اور سادگی نمایاں ہے۔ ان سب نے لطیف زبان کے استعمال سے معاشرے میں موجود انسانی سوچ اور فہم کو نہایت انداز میں بیان کیا ہے کہ اس بات کو سمجھنے کے لیے کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ انھوں نے خود کلامی کے لیے سادہ انداز اور

سلیس الفاظ کا چناؤ کیا ہے۔ کسی بھی فن پارے میں اسلوب کا اندازہ اس کی سلاست اور شگفتگی سے نظر آتا ہے۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں نے انشائیہ نگاری کے عنصر کو بیان کر کے نہایت ہی موزوں بنا دیا ہے۔ انھوں نے اپنے انشائیوں میں نہایت ہی شگفتہ انداز بیان کیا ہے۔ انھوں نے تصور سادگی اور سلاست زبان کو پیش کر کے انشائیہ کی اسلوبیاتی جدت کو پورا کر دیا ہے۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں نے انشائیہ نگاری میں داخلی کیفیات کو شامل کیا ہے اور ان کے نزدیک انشائیہ کے اسلوب میں انفرادیت کا ایک پہلو ان کی شخصیت میں تہذیب و تمدن کا موجود ہونا ہے۔ اس کے برعکس دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں نے اپنے انشائیوں میں خارجی کیفیات کو شامل کیا ہے اور انھوں نے انشائیہ کے اسلوب میں انفرادیت کے لیے تہذیب و تمدن کے نئے پہلوؤں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے انشائیوں کے اسلوب میں لطافت، شگفتگی، رمز و ایماء، غیر رسمی انداز اور حس لطیف اہم عناصر ہیں۔ انشائیہ میں ایک خاص قسم کی ابتداء اور انتہا ہوتی ہے اور اس سے ایک وحدت جنم لیتی ہے۔ تاہم باقی لکھنے والے کی بصیرت پر منحصر ہے انشائیہ کے اتنے ہی اسلوب ہوں گے جتنے انشائیہ نگار کے۔ تاہم انشائیہ میں اسلوب کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے کیونکہ انشائیہ نگار اپنے انشائیے کو نہ کہانی کی صورت میں لکھ سکتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کے دلائل و منطق کو استعمال کر سکتا ہے اور نہ ہی اس میں کردار سازی ممکن ہے بلکہ اس میں اس انداز سے بات کی جاتی ہے کہ جیسے اس نے کوئی بات بیان نہیں کی بلکہ انشائیہ نگار اپنا سارا زور اسلوب پر لگاتا ہے انشائیہ نگار چھوٹے سے چھوٹے موضوع کو منفرد طرز سے بیان کرتا ہے اور بہت ہی دیدہ و بینا سے کام لے کر اس کے لیے منفرد طرز کے اسلوب کا انتخاب کرتا ہے تاہم انشائیہ کو بعض دفعہ مضمون کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے جو کہ سرے سے ہی غلط ہے تاہم اسے بعض دفعہ تاثراتی قسم کی کوئی چیز سمجھ لیا جاتا ہے اور نہ ہی یہ طنزیہ و مزاحیہ مضمون کی مانند کوئی چیز ہے مزاح نگار تفنن طبع کی تخلیق کرتا ہے اور اسی وجہ سے اس کے اسلوب میں شگفتہ پن پیدا ہوتا ہے اس کے مزاح میں معاشرے پر طنز ہوتا ہے اس سے تحقیر کا پہلو نہیں نکلتا۔ انشائیہ کے علاوہ دوسری اصناف میں مصنف نا معلوم سے معلوم تک کا سفر کرتا ہے جبکہ انشائیہ میں مصنف معلوم کے کسی نئے پہلو کو تلاش کرتا ہے۔ انشائیہ میں تخلیقی تازگی اور نئی سوچ انشائیہ کے اسلوب کو بہت متاثر کرتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے میں انشائیہ کیتھارسس سے سراسر محروم ہے کیونکہ یہ انشائیہ کے دائرہ کار میں شامل ہی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اوراق کے بہت سے انشائیہ نگار استعارہ کو انشائیے میں برتنے کو ناپسند کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ڈاکٹر سلیم اختر ایسے اسلوب کو اسپاٹ اسلوب کا نام دیتے ہیں اور ڈاکٹر وزیر آغا ایسے اسلوب کو لطیف نثر کا نام دیتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے میں انشائیہ کی زبان تازہ و شگفتہ، بے تکلف اور ارفع تر ہوتی ہے اور انشائیہ کے عناصر میں شوخی و سنجیدگی، اختصار، فلسفیانہ انداز، تفکر، کفایت لفظی اور تازگی وغیرہ شامل ہیں تاہم انشائیہ کا اسلوب شعری ہوتا ہے اور اس میں مخفی مفاہیم کو منفرد انداز سے بیان کیا جاتا ہے۔ انشایئے کا آغاز اور انجام کہانی کی مانند نہیں ہونا چاہیئے انشائیہ اس قسم کے رویے سے بری ذمہ ہے انشایئے میں کسی تازہ، منفرد اور نئے رویے کو بیان کیا جاتا ہے مگر اسے فلسفے کا روپ نہیں دھارنا چاہیئے ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ نگار اور مزاح نگار کے فرق کو ایک مثال سے بھی بیان کرتے ہیں کہ جب بہت سے لوگ سمندر کا گہرا جائزہ اور مشاہدہ کرتے ہیں تو اس میں ہر شخص کا اپنا نقطہ نظر ہوتا ہے شاعر کی نظر میں سمندر انسانی زندگی سے بہت وسیع اور پھیلا ہوا ہے اور بزنزمین کی نظر سمندر کی موجوں کی بجائے آمدورفت پر ہوگی اور ایک انشائیہ نگار اسے اپنی منفرد نظر سے دیکھے گا وہ سمندر کی طرف پیٹھ کر کے اپنی ٹانگوں میں سے جھانک کر سمندر کو دیکھے گا اور اس کا معائنہ کرے گا جبکہ ایک مزاح نگار سمندر میں جھانکنے کی بجائے اپنی ٹانگوں کی طرف بھی نظر رکھتا ہے تاہم اس مثال سے ڈاکٹر وزیر آغا مزاح نگار اور انشائیہ نگار کے فرق کو بھی واضح کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں کہ ایک شخص جب اپنے آفس سے کام ختم کر کے گھر واپس آتا ہے اور اپنا تنگ لباس اُتار کر ڈھیلا ڈھالا لباس پہنتا ہے اور ایک نرم موڑھے پر دراز ہو کر حقے کی نے سے کش لگاتا ہے اور اپنے دوستوں سے گپ شپ کرتا ہے تو تب انشائیہ تخلیق ہوتا ہے۔

دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگار وزیر آغا انشائیہ کے لیے پرسنل ایسے کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور اس کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ جبکہ مشکور حسین یاد انشائیہ کو انگریزی ایسے کے مترادف قرار دیتے ہیں اورانشائیہ کو پرسنل ایسے کہنا انشائیہ کے صنف کے ساتھ زیادتی قرار دیتے ہیں۔ تاہم رسالہ "اوراق" کے مصنف مشکور حسین یاد اور دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کو انشائیہ نگار تسلیم ہی نہیں کرتے۔ جبکہ ڈاکٹر سلیم اختر دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے حق میں بولتے ہیں دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے انشائیوں میں طنز و مزاح پایا جاتا ہے اور وہ اس طنز و مزاح سے اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ دبستان لاہور کے کچھ انشائیہ نگاروں کے انشائیوں میں کلبیت، ناامیدی اور قنوطیت پائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ان کے انشائیوں میں گہرے فلسفیانہ عناصر اور سنجیدگی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ اپنے انشائیوں کو ذات کا حصہ نہیں بناتے بلکہ ان کے انشائیوں میں انکشاف ذات کی کمی دیکھنے کو ملتی ہے اس کے علاوہ ان کے انشائیوں میں خارجی پہلو کی بھرپور عکاسی دیکھی جاسکتی ہے۔ تاہم نکتہ آفرینی کا عنصر ان کے ہاں بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں زیادہ تجربات ومشاہدات کو بیان کرتے ہیں۔ جبکہ دبستان سرگودھا کے انشائیہ

نگاروں کے ہاں طنز و مزاح کی بجائے زیرلب تبسم کی خوبی پائی جاتی ہے ان کے ہاں بوجھل سنجیدگی کی بجائے ہلکا پھلکا انداز اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ان کے ہاں نکتہ آفرینی پائی جاتی ہے۔ان کے ہاں کلبیت کی بجائے مثبت رویہ پایا جاتا ہے۔وہ موضوع کو ذات کا حصہ بنانے سے گریز نہیں کرتے علاوہ ازیں ان کے انشائیوں میں انکشاف ذات موجود ہے۔وہ انشائیوں میں مصلح یا خطیب کا روپ نہیں دھارتے۔ان کے انشائیوں میں داخلیت بخوبی پائی جاتی ہے۔ان کے انشائیوں میں اسلوب بھی تازہ کاری بھی پائی جاتی ہے۔ان کے ہاں مخفی گوشوں کو نمایاں کرنے کی خوبی بھی موجود ہے۔

دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں الفاظ کی شگفتگی ان کی سادگی کی بجائے الفاظ کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ ان کی گہرائی کو سمجھا جاسکے۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں نے فطرت اور تہذیب و ثقافت کو اپنی تحریروں کا خاص مرکز رکھا ہے جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں نے وقت اور اپنے عہد کے عناصر کو اپنی تحریروں کا حصہ بنا رکھا ہے۔ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں نے داخلی اور خارجی کیفیات کو ایک دوسرے کے برعکس پیش کرنے کی کوشش کی ہے جبکہ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں نے داخلی اور خارجی کیفیات کو ایک ساتھ لے کر چلنے کا ہنر پیش کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، انشائیہ اردو ادب میں، ص۷۵

۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، دوسرا کنارہ، لاہور، ص۴۳

۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، دیباچہ، دوسرا کنارہ ص ۴

۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، دوسرا کنارہ، ص۵۹

۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، چوری سے یاری تک، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۲، ص،۱۶

۶۔ ایضا، ص۹۶

۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، خیال پارے، ص۲۶

۸۔ ایضاً، ص۴۰

۹۔ ایضاً، ص۳۷

۱۰۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، غزل، ص۴

۱۱۔ ایضاً، چرواہا، ص۲۷

۱۲۔ غلام جیلانی اصغر، گالی دینا، نرم دم گفتگو، بک لینڈ پبلشرز لاہور، ۱۹۶۶ء

۱۳۔ ایضاً، تسخیر کائنات، ص ۲۵

۱۴۔ سید ضمیر جعفری، خوش اعترافیاں، مشمولہ ماہنامہ "چہار سو" راولپنڈی، نومبر ۱۹۹۷ء، ص ۵۲

۱۵۔ سائرہ بتول، پاکستانی انشائیہ نگاروں کے لیب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ ۰ نیشنل یونیورسٹی ماڈرن لینگویجز، اسلام اباد، ۲۰۱۲ء

۱۶۔ مشتاق قمر، ہم ہیں مشتاق، دھوپ کھانا، ص۷۷

۱۷۔ ایضاً، ص۱۱۴

۱۸۔ جمیل آذر،

۱۹۔ جمیل آذر، نیم پلیٹ ، شاخ زیتون، لاہور ، ص ۵۳

۲۰۔ اکبر حمیدی، ریشم کا ٹکڑ، تتلی کے تعاقب میں، ص۱۷

۲۱۔ ایضاً، ص۶۷

۲۲۔ نظیر صدیقی، پروفیسر، دیباچہ تتلی کے تعاقب میں ص ۱۰

۲۳۔ انور سدید، انشائیہ اردو ادب میں، مکتبہ فکر و خیال لاہور، ۱۹۸۵ء، ص۲۸۷

۲۴۔ اکبر حمیدی، پہاڑ مجھے بلاتا ہے، بٹر پبلشرز اسلام آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۱۳

۲۵ایضاً، ص ۳۵

۲۶۔ اکبر حمیدی، اردو انشائیہ بعد میں، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۲۹

۲۷۔ اکبر حمیدی، تتلی کے تعاقب میں، ص ۹۲

۲۸۔ اکبر حمیدی، مجھے پہاڑ بلاتا ہے، ص ۱۰۸

۲۹۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ادبی تنقید اور اسلوبیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۵

۳۰۔ اکبر حمیدی، جزیرے کا سفر، مکتبہ جدید پریس لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۹

۳۱۔ اکبر حمیدی، جزیرے کا سفر، ص ۳۲

۳۲۔ انور سدید، انشائیہ اردو ادب میں، ص ۷۵

۳۳۔ اکبر حمیدی، جزیرے کا سفر، ذمہ داری، ص ۸۵

۳۴۔ اکبر حمیدی، جزیرے کا سفر، (غلطی کی گنجائش ہے) ص ۱۱۵

۳۵۔ یاسمین، پاکستان میں اردو انشائیہ اسالیب موضوعات، ص ۴۳

۳۶۔ اکبر حمیدی، جھاڑیاں اور جگنو، نئی پرانی گاڑیاں، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام اباد، ص ۱۷

۳۷۔ اکبر حمیدی، جھاڑیاں اور جگنو، (میک اپ) ص ۳۲

۳۸۔ اعجاز علی ارشد، اسلوب و معانی، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۲۷

۳۹۔ اکبر حمیدی، جھاڑیاں اور جگنو، ص ۸۵

۴۰۔ اکبر حمیدی، اشتہاروں بھری دیواریں، دنیا ایک کہانی، بٹر پبلشرز اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴

۴۱۔ منشا یاد، دیباچہ، جھاڑیاں اور جگنو، ص ۱۲

۴۲۔ ایضاً، ص ۲۵

۴۳۔ ایضاً، ص ۴۵

۴۴۔ مشکور حسین یاد، ممکنات انشائیہ، ص ۵۷

۴۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ کی بنیاد، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۳۵۷

۴۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا، پڑھنے والوں کے خطوط، ادب لطیف لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۲۷

۴۷۔ مشکور حسین یاد، جوہر اندیشہ، ص ۲۴

۴۸۔ ایضاً، ص ۴۵

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۳۶

۵۰۔ ایضاً، ص۸۹

۵۱۔ ایضاً، ص۱۷۱

۵۲۔ ایضاً، ص۱۷

۵۳۔ ایضاً، ص۷۹

۵۴۔ نظیر صدیقی، شہرت کی خاطر، اپنے فن کی تعریف میں، ص ۹

۵۵۔ ایضاً، ص ۵۳

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۵۴

۵۷۔ صلاح الدین حیدر، مقدمہ، حماقتیں میرے مقدر کی، ص۶

۵۸۔ صلاح الدین حیدر، ، حماقتیں میرے مقدر کی، ص۲۴

۵۹۔ ایضاً، ص ۳۶

۶۰۔ ایضاً، ص ۱۱۰

۶۱۔ صلاح الدین حیدر، ڈر اور ڈرامہ، انتقال فرمانا، شرک پرنٹنگ پریس لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۳۶

۶۲۔ ایضاً، ص ۹۹

۶۳۔ ایضاً، ص۴۳

۶۴۔ قیصر شہزاد، ڈاکٹر، لطف آگہی، شوکت نور پرنٹنگ لاہور، ۲۰۱۴، ص۵۴

۶۵۔ ایضاً، ص ۹۴

۶۶۔ ارشد میر، موڑ، ص ۴۵

۶۷۔ ایضاً، ص ۶۷

۶۸۔ ایضاً، ۹۸

باب چہارم:

دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا موضوعاتی و تکنیکی تقابل

الف۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا موضوعاتی تقابل:

انشائیہ نگاری اردو ادب کی منفرد اور اعلیٰ صنف ہے۔ اس کے موضوعات طنز و مزاح سے نکل کر اب سماج اور معاشرے کے ہر موضوع کی عکاسی کرتے ہیں۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کی انشائیہ نگاری کے موضوعات کا تقابل وقت کی اہم ضرورت ہے۔ تقابل سے مراد دو یا چند فنکاروں کی تخلیقات کا موازنہ ہے۔ مختلف زبانوں کی ادبی تاریخوں کے مطالعہ سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ فنی نمونوں اور تخلیقات کا باہمی موازنہ و تقابل اور مطالعہ ہر دور میں موجود تھا۔ اسی طرح انشائیہ نگاری میں دونوں دبستان کے انشائیہ نگاروں کا آپس میں تقابل، موضوعات کے حوالے سے اخذ کرنا اردو ادب کی تحقیق کا اہم موضوع ہے۔ موضوعاتی تقابل میں دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائی مجموعوں میں سے سماجی، ادبی، فلسفیانہ، نفسیاتی اور رومانوی جہتیں شامل ہیں۔ ان دس انشائیہ نگاروں کے مندرجہ بالا موضوعات کا مختصر تقابل مندرجہ ذیل ہے۔

ب۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا فلسفیانہ تقابل:

ا۔ وزیر آغا کے انشائیوں کا فلسفیانہ جائزہ:

وزیر آغا نے صنف انشائیہ کو ایک مقبول اور منفرد صنف بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بحیثیت نقاد انہوں نے اس صنف کی نئی خصوصیات کو اجاگر کیا۔ انشائیہ کے خدوخال اور امتیازی اوصاف کو نیا رنگ دیا ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے انشائیہ کی تحریروں میں ہر رنگ ملتا ہے۔ انہوں نے فلسفی انداز کو منفرد اور دلکش طریقے سے قارئین کے سامنے رکھا ہے۔ ان کے انشائیے زندگی کی حقیقت کو فلسفیانہ انداز کے ساتھ ایک نئی طرز فکر میں پیش کرتے ہیں اور یہی انداز انشائیہ کا بہترین جز اور خیال کی تازگی کہلاتا ہے۔ وزیر آغا کے انشائیے اختصار، ندرت اور معنی خیز کی خصوصیات سے مالامال ہیں۔ اس طرح ان کے موضوعات میں فلسفیانہ جہت کے عناصر موجود ہیں۔ زندگی بے شمار کیفیتوں کا نام ہے۔ ہر ادیب و شاعر نے اس کو مختلف اشیاء کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ زندگی اگر خوشی ہے تو غم بھی موجود ہے۔ زندگی اگر عیاشی کرواتی ہے تو غربت میں ذلیل و خوار بھی کرتی ہے۔ زندگی مسکراہٹ اور قہقہے لگواتی ہے تو تکلیفوں میں چیخ و پکار بھی کرنی پڑتی ہے۔ وزیر آغا نے اپنے انشائیہ "اسم اور فعل" میں زندگی کو کس سے تشبیہ دی ہے؟ نمونہ ملاحظہ ہو:

"خود زندگی ایک صبا رفتار اونٹنی کی طرح ہر دم متحرک رہتی ہے بلکہ زندگی تو اونٹنیوں کی ایک قطار، دوڑتے ہوئے لمحوں کی ایک زنجیر ہے۔ یہ ایک خاص مقام سے چلی تھی اب ایک خاص نقطے پر موجود ہے۔ آئندہ کسی اور جگہ دکھائی دے۔"[1]

زندگی چلتی ہوئی ٹرین بھی ہے اور ساکن درخت کی مانند جامد بھی ہے۔ زندگی بدلتی ہوئی کیفیت کا نام ہے۔ لکھاری حضرات فلسفی انداز میں اپنے نظریات کو تحریروں کا حصہ بناتے ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے یہ فلسفی رنگ قارئین پر چڑھا جاتا ہے۔ فلسفیانہ سوچ، خیالات اور نظریات ہر کسی کے مختلف ہیں اور ان سے قارئین سبق حاصل کرتے ہیں۔ یہ فلاسفر لوگ اپنی فلسفیانہ باتوں سے قارئین کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ فلسفیانہ انداز سے حقیقت اور سچائی کو بیان کرتے ہیں۔ وزیر آغا نے ان فلاسفروں کو بھی اپنی تحریر کا حصہ بنایا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

"یہ فلاسفر لوگ بھی عجیب ہیں۔ انسان کی ایک ننھی سی، معصوم سی آرزو سے کتنا غلط فائدہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر انسان کی فطرت میں واپسی کا یہ نازک سا جذبہ موجود نہ ہوتا تو پھر میں دیکھتا کہ یہ فلاسفر کس طرح لاکھوں صفحات کالے کر کے خلق خدا کے کرب میں اضافے کا موجب بنتے ہیں؟۔۔۔ وہ تو شاہد ایک لفظ تک نہ لکھ سکتے۔"[2]

وزیر آغا نے نام نہاد فلاسفر بننے والوں کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ تاہم وزیر آغا زندگی میں ترتیب اور بے ترتیبی کے فلسفے کو بھی عیاں کرتے ہیں۔ ہمارے ارد گرد ہر چیز میں بے ترتیبی ہے اور بے ترتیبی میں ہی خوبصورتی ہے اسی میں کشش اور خوبصورتی کی صفت موجود ہے اگر ہمارے ارد گرد ترتیب موجود ہوتی تو اس میں سنگلاخ کیفیت موجود ہوتی اور اس میں کوئی لچک موجود نہ ہوتی اور وہ اپنی سختی سے ہی ٹوٹ جاتی ڈاکٹر وزیر آغا زندگی کے اس فلسفے کو بہت خوبصورتی سے یوں بیان کرتے ہیں۔

بے ترتیبی زندگی کی مظہر ہے۔ اس میں ایک بہاؤ ایک رواں دواں کیفیت، گرم گرم لہو سی بے قراری اور ہر لحظہ تبدیل ہونے اور نئے حالات کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت ہے لیکن ترتیب میں ایک سنگلاخی کیفیت ہے۔ ترتیب تو اُس سوکھی شاخ کی طرح ہے جسے ذرا سا جھکائیں تو تڑاخ سے ٹوٹ جائے۔ اس میں نمی، لچک اور زندگی تو ہئی نہیں۔[3]

خدا نے ہر چیز کو مقید کیا ہوا ہے جیسے ستارے، چاند اور سورج آسمان پر مقید ہیں پودے زمین کے اندر قید ہیں مچھلیاں سمندر اور پانی میں ہی قید رہ سکتی ہیں اور ارواح انسانوں کے اندر قید ہے گویا ہمارے ارد گرد ہر چیز کسی نہ کسی چیز میں قید ہی ہے مصنف زندگی کے اس فلسفے کو بھی انشائیہ ''بارش کے بعد'' میں بہت عمدہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔اس طرح وقت بھی سوئیوں کے جھکڑ میں قید ہے سورج نکلے اور غروب ہونے کا ایک وقت ہے چاند اور ستاروں کے چمکنے کا بھی ایک وقت مقرر ہے اور اس طرح ہر چیز وقت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے شہر کی تیز رفتاری میں انسان اس قدر کھو جاتا ہے کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا جبکہ شہر کی نسبت گاؤں میں وقت سست رفتاری سے گزرتا ہے مصنف وقت کے فلسفے کو انشائیہ ''سُست روی'' میں یوں بیان کرتے ہیں۔

> ''پھر بھی شہر کی ہنگامہ خیزی، شوریدہ سری اور تیز رفتاری میں اس احساس کی نمود کہ وقت کی رفتار تیز ہو گئی ہے، محض ایک واہمہ ہے۔وقت تو ایک خاص رفتار سے رواں دواں ہے نہ یہ تیز ہوتا ہے،نہ مدھم۔البتہ شہر کے ماحول میں خود آپ وقت کی نسبت سے تیز ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔لیکن کیا اس کے ساتھ ساتھ وقت کا رتھ بھی تیز ہوتا ہے؟ ہر گز نہیں!وقت تو اسی طرح گھڑی کی سوئیوں میں جکڑا ہوا ہے یا طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کی طلائی زنجیروں میں قید ہے۔''[۴]

مصنف وقت کی اہمیت اور وقت کے ہر لحظہ تبدیل ہونے کو عمدگی سے بیان کرتے ہیں کہ وقت لمحہ لمحہ بدلتا رہتا ہے اور ہر گزرتا وقت بہت سی تبدیلیوں کی وجہ بنتا ہے زندگی میں کوئی ضابطہ یا قانون نہیں ہے جو زندگی کو واپسی کی طرف کھینچ سکے اور ہر گزرتا لمحہ آگے کی طرف ہی بڑھتا ہے گویا وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا اور یہی قدرت کا اصول ہے۔انسان پر قدرت کی طرف سے مختلف کیفیات ودیعت کی گئی ہیں اس میں سے کچھ کیفیات انسان کو سکون بخشتی ہیں اور کچھ بے سکون کرتی ہیں کچھ منفی تاثر چھوڑتی ہیں اور کچھ مثبت گویا مصنف ان کیفیات کو اپنے انشائیے ''اکلاپا اور تنہائی'' میں یوں بیان کرتے ہیں۔

> ''اکلاپا اور تنہائی۔۔۔دو بالکل مختلف کیفیات ہیں۔ایک منفی ہے اور دوسری مثبت!ایک مجسم کرب ہے اور دوسری مجسم فرحت!مگر ساتھ میں یہ بھی جان گیا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔میں ہر لحظہ کٹ بھی رہا ہوں اور جُڑ بھی رہا ہوں۔اگر کٹ جانے کے کرب سے نہ گزروں تو پھر جڑ جانے کے کرب سے آشنا ہی کیسے ہو سکتا ہوں۔''[۵]

اس طرح مصنف غلامی کے فلسفے کو بھی عمدگی سے بیان کرتے ہیں اور اسے ایک کریہہ حقیقت کہتے ہیں اور اس میں انکساری، عاجزی، پیار اور شفقت کو ضروری گردانتے ہیں اور اس کے برعکس آزادی کو برق کا کوندا کہتے ہیں اور یہ بہت ہی پُر نور لمحہ ہوتا ہے اور اس کے ارد گرد تاریکی ہی تاریکی ٹھاٹھیں مار رہی ہوتی ہے۔ اس طرح زندگی خدا کی دی گئی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے مصنف زندگی کو ایک زینے کی مانند قرار دیتے ہیں کہ انسان جب ایک زینے سے دوسرے زینے کی جانب جست بھرتا ہے تو یہ ہی زندگی ہے۔ تاہم مصنف زندگی، وقت اور معاشرے کی مختلف حقیقتوں کے فلسفے کو اپنے انشائیوں میں سمو دیتے ہیں۔ تاہم فلسفیانہ خیالات تخلیق کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی عطا، وسیع مطالعہ اور فن تحریر کی خصوصیات کا حامل ہونا ضروری ہے۔ وزیر آغا ان تمام خصوصیات سے مالا مال ہیں اور ان کی فلسفیانہ سوچ ہی ان کے فلسفی انداز کو ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

۲-غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کا فلسفیانہ جائزہ:

غلام جیلانی اصغر کے لیے انشائیہ کا موضوع اصل مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس موجود پر اسرار پہلوؤں کو تلاش کرنا ہے۔ قاری کے لیے ان پہلوؤں کا احاطہ کرنا اشد ضروری ہے۔ چنانچہ مصنف اپنے انشائیوں میں فلسفے کے ہر پہلو پر غور کرتے ہیں مذہب کے بارے میں اپنی سوچ اور فکر کو انشائیہ "سردی" میں یوں بیان کرتے ہیں۔ "مذہب تو آدمی کو اپنے محدود حلقہ سے باہر نکلنے کی تلقین کرتا ہے اور اس کا مقصد تو فرد کی محدود ذات کو حقیقت عظمیٰ کی لا محدود وسعت میں گم کرنا ہے۔"[۱۶]

اس طرح انشائیہ "بستر میں لیٹنا" میں مصنف فلاسفروں کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ جب سوچنا ہوتا تو اکثر بستر میں لیٹ کر سوچتے اور بڑے بڑے فلسفے اخذ کرتے ان میں سے اکثر علماء لمبے لمبے چوغے پہن کر بستر میں لیٹ کر طمانیت سے سوچتے۔ اس طرح مصنف اٹھنے بیٹھنے کے فلسفے کو بیان کرتے کہ بھاگنے والا ہمیشہ خوف میں مبتلا ہوتا ہے جبکہ بیٹھنے والا کسی بھی خوف سے آزاد ہوتا ہے۔ مصنف اپنائیت کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بھی پیش کرتے ہیں کہ اپنائیت ہمیشہ پانی کی مانند ہوتی ہے جس طرح پانی کا قطرہ پانی میں مل کر پانی ہو جاتا ہے اور طالب مطلوب سے مل جاتا ہے۔ مصنف وقت کے فلسفے کو بھی تسخیر کائنات میں یوں بیان کرتے ہیں۔

> "مجھے لمحوں کے جبری تسلسل سے ڈر آنے لگا۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی نادیدہ قوت مجھ سے جبری بیگار لے رہی ہو۔ مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ وقت کی جبریت کا صرف اس وقت احساس ہوتا ہے، جب ہر لمحہ دوسرے کے ساتھ پیوست ہو کر ایک تھکا دینے والی یکسانیت میں بدل جاتا ہے۔"[۱۷]

انشائیہ پس" آئینہ "میں مصنف حقیقت کو ہمارے سامنے لاتے ہیں آغاز میں چیزوں کی حقیقت ہمارے سامنے نہیں ہوتی آہستہ آہستہ جب ہم چیزوں سے دور ہوتے ہیں صورتیں نمایاں ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور جب کسی بھی چیز کے آپ بہت قریب آجائیں تو حقائق ہم پر اتنے واضح ہو جاتے ہیں کہ یہ آہستہ آہستہ مبہم ہو جاتے ہیں۔ تاہم جس طرح ایک فوٹو گرافر کسی شے کا غیر معمولی زاویہ تلاش کر کے اس کو خوبصورت بناتا ہے۔ بالکل اسی طرح کسی ایک موضوع پر انشائیہ میں موجود موضوعات کو تلاش کرنا ہی اس کی خوبصورتی ہے کیونکہ انشائیہ نگار نے بڑی خوبصورتی سے ایک موضوع میں متعدد موضوعات کو سمو دیا ہوتا ہے۔ منفرد اور غیر رسمی موضوع جیلانی کی شخصیت کا پہلو ہے۔ اس کے بارے میں سائرہ بتول لکھتی ہیں:

> "جیلانی صاحب کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے ایسے موضوعات پر انشائیہ لکھے جن پر پہلے انشائیہ نہیں لکھا گیا ہے۔ ہر انشائیہ میں ان کا غیر روایتی زاویہ نگاہ نمایاں ہے۔ منفرد موضوع کا انتخاب ان کی منفرد اور غیر روایتی سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔"[۸]

غلام جیلانی اصغر کی خاصیت ہے کہ انہوں نے ہمیشہ منفرد اور نئے موضوع پر انشائیہ لکھا۔ انشائیہ تحریر لکھتے ہوئے وہ مختلف موضوعات کو زیر بحث لاتے ہیں اور اصل موضوع سے دور بھی نکل جاتے ہیں لیکن پھر واپس اپنے موضوع کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ گویا ڈور کا ایک سرا ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہیں۔ اس فن کی بدولت ہی وہ زندگی کے مختلف رنگ پوری چمک دمک سے دکھاتے ہیں۔ جس میں تخیل، مشاہدے، تجربے اور علمی بصیرت کو فن میں لاتے ہوئے مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان کے مشہور انشائیوں کے موضوعات میں تسخیر کائنات، بچہ پالنا، پس آئینہ، سوال اٹھانا، سفر جاری ہے، بستر میں لیٹنا، عادت، وارثت اور ملاقات قابل ذکر ہیں۔ فلسفیانہ موضوعات نے اپنے اندر بے شمار سماجی، نفسیاتی اور فلسفیانہ موضوعات کو سمویا ہوا ہے۔

۳۔مشتاق قمر کے انشائیوں کا فلسفیانہ جائزہ:

مشتاق قمر کے انشائیوں میں فلسفیانہ جہت جابجا ملتی ہے۔ مشتاق قمر کے موضوعات غیر رسمی انداز نگارش کے عمدہ نقوش ہیں۔ جن میں فلسفہ، رومانویت اور سماجی موضوعات کی بھرمار ہے۔ انشائیہ "کوہ پیمائی" میں فلسفیانہ رنگ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اصل میں ان فلسفیانہ خیالات اور مفکرانہ سوچ سے اصلاح کے پہلوؤں کو تلاش کرتے ہیں۔ جن سے ادبی تحریریں عروج کی طرف رخت سفر باندھتی ہیں۔ اس انشائیہ میں کوہ پیما کے تصورات کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

”تجریدی تصور کے مالک داخلی طریق کار اپناتے ہیں۔ وہ جسم کی بجائے روح کی بالیدگی کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک روح، تصور اور تخیل جیسی تجریدی قوتوں کو جسم اور مادہ پر فضیلت حاصل ہے۔ اس لیے وہ اکثر کسی وسیلے کے بغیر ہواؤں میں اڑنے کی جدوجہد کرتے ہیں اور بیٹھے بٹھائے ساری دنیا کے گرد چکر لگالینے کے خواب دیکھتے ہیں۔“[۹]

کسی بھی شعبے سے منسلک انسان کے تصورات اس کی سوچ سے مختلف ہی ہوتے ہیں یعنی قدیم تصورات اور خیال یہ انسان کو نکارہ بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مشتاق قمر صاحب نے فلسفی انداز میں ایسے ہی تصورات کا احاطہ کیا ہے۔ کوہ پیمائی ایک محنتی اور جفاکش شوق ہے۔ یہ تصورات میں بڑا آسان اور عام سا لگتا ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مشتاق قمر کے ایک دوسرے انشائیہ ”کچھ نیند کی مذمت میں“ میں زندگی، فطرت، نیند اور موت کے درمیانی تعلق کو فلسفی انداز میں یوں بیان کر رہے ہیں:

”فطرت کے کسی بھی شعبے میں نیند یا اس کی سوتیلی بہن موت پسند خاطر نہیں۔ یہاں تو خود زندگی موت کی کوپ سے جنم لیتی ہے۔ اور دوبارہ موت میں ضم ہونے سے پہلے زندگی کی ایک نئی کونپل سجا جاتی ہے۔“[۱۰]

موت کو نیند کی سوتیلی بہن سے تشبیہ دینا مشتاق قمر کے فن کی مہارت ہے کہ وہ فلسفیانہ انداز میں بات کہنے کے عادی ہیں۔ یہ اپنے فن کو بڑی مہارت اور بہترین الفاظ کے ساتھ ادا کر رہے ہیں۔ فلسفیانہ انداز گفتگو، مفکرانہ سوچ، غور و فکر، فکر کی نئی راہیں اور کائناتی مسائل پر مشتاق قمر کی تحریریں لاجواب ہیں۔ مشتاق قمر اردو صنف انشائیہ کا بہترین قلم کار اور تخلیق کار ہے۔ جنہوں نے بے شمار موضوعات پر اپنے فن کا مظاہرہ کر کے اپنی تخلیق کی صلاحیتوں کو منوایا ہے۔

۴۔ جمیل آذر کے انشائیوں کا فلسفیانہ جائزہ:

جمیل آذر کے انشائیوں کے متعلق سے یہ بات منظر عام پر آتی ہے کہ ان کی تحریروں میں فلسفے کی نوعیت دوسرے انشائیہ نگاروں سے قدرے مختلف ہے۔ اس کی وجہ ان کا منفرد اسلوب نگارش اور تکنیک ہے۔ ان کے موضوعات میں بھی فلسفیانہ جھلک واضح نظر آتی ہے۔ اس لیے انہوں نے سماج اور معاشرے کے افراد میں فلسفیانہ سوچ اور خیالات کو موضوع بنایا ہے بلکہ انکشاف ذات کا استعمال ہی ان کے فلسفیانہ سوچ کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کے انشائیہ ”بھوک ہڑتال“ میں بھوک ہڑتال کرنے والوں کے بارے اپنے نظریات و خیالات کو قلمبند کیا ہے۔ یہ نظریات و خیالات ان کی فلسفیانہ سوچ کی مکمل ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں. نمونہ ملاحظہ ہو:

"سچ تو یہ ہے کہ بھوک ہڑتال کمزور اور بے بس انسانوں کا ایک نہایت قوی اور موثر ہتھیار ہے۔ یہ تو محکوم کا حاکم سے، چھوٹے کا بڑے سے، بچے کا باپ سے کچھ جائز اور کچھ ناجائز مطالبات منوانے کا آخری حربہ ہے۔ وہ لوگ جو بنی نوع انسان کو اس فطری حق سے محروم کرنے کے حامی ہیں۔ وہ نہ تو اپنے سینے میں باپ کا شفیق دل رکھتے ہیں اور نہ ماں کا نرم کلیجہ "[11]

فلسفیانہ خیالات میں کائناتی سچائی کا عکس واضح نظر آتا ہے یہ سچائی ہے کہ بھوک ہڑتال اپنے مطالبات منوانے کے لیے آخری حربہ ہے۔ اس سے آگے معاشرے بغاوت اور دہشتگردی کی طرف جانے لگتے ہیں۔ اس لیے انشائیہ نگار نے اس فطری حق سے محروم کرنے والوں کو آڑے ہاتھوں لیا ہے کہ وہ انسانیت کے دائرے سے خارج ہیں۔ اقتدار ایک نشہ ہے اقتدار کی قوت ایسے ہے کہ جس سے آدمی ہر دم رواں دواں رہتا ہے اور جس کے ہاتھ اقتدار کا نشہ لگ جائے اس کی زندگی پُر رونق ہو جاتی ہے اور اقتدار کے بغیر زندگی بے رونق اور پھیکی سی لگتی ہے اور جس کے ہاتھ اقتدار کا نشہ لگ جائے وہ اس نشے کو کھونا نہیں چاہتا۔ مصنف انشائیہ "نشہ" میں اقتدار کے نشے کو اور زندگی میں اقتدار کے نشے کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ مصنف وقت کے فلسفے کو بھی بہت عمدگی سے بیان کرتے ہیں کسی بھی کام کے کرنے کے لیے انسان کو وقت درکار ہوتا ہے اور وقت نے ہر چیز کو اپنی جکڑ میں لے رکھا ہے ہر کام کو کرنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے مصنف انشائیہ "ریلوے پلیٹ فارم" میں بیان کرتے ہیں۔

"وقت نے نہایت پُراسرار طریقہ سے ہر شے کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے، وقت ہم سب پر حاوی ہے کوئی کام وقت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ہر شے کی تکمیل کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔"[12]

اس طرح انشائیہ "وقت اے وقت" میں مصنف شیلے کا وقت کے بارے میں فلسفے کو بھی بیان کرتے ہیں ان کے خیال میں وقت بہت سنگدل ہے اور سمندر انسان کے نمکین آنسوؤں سے بھرا ہوا ہے اور وقت ہی انسان کو تباہی کے دہانے پر لے آیا ہے یہ انسان کو دھوکا دیتا ہے اور چالیں چلتا ہے جمیل آزر وقت کو پُراسرار بھی کہتے ہیں اور یہ بہت بے رحم ہے وقت کے ساتھ ساتھ پُرانی عمارتیں ختم ہو رہی ہیں اور ان کی جگہ نئی اونچی عمارتوں نے لے لی ہے اور کئی شہر وقت کے ساتھ ساتھ تباہ و برباد ہو گئے ہیں اور نئے نئے شہر آباد ہو رہے ہیں وقت کے ساتھ انسان نئی نئی ایجادیں بھی کر رہے ہیں اور فلک بوس عمارتیں تعمیر کی جا رہی ہیں۔ جمیل آزر انشائیہ "وقت اے وقت" میں وقت کے بارے میں رقمطراز کرتے ہیں:

"آہ وقت کتنا بے رحم قاطع ہے جو ہمیں لحہ لحہ قطع کر رہا ہے اور لیر لیر اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمیں ہوا میں بکھیر رہا ہے۔ یہ کہیں حسن کو برباد کر رہا ہے کہیں رشتوں اور ناطوں کو منقطع کر رہا ہے۔ ہمارے وہ بہن بھائی جو کبھی ہمارے دامن شفقت سے چمٹے رہتے تھے اب لا تعلقی کے حصار سے جکڑے ہوئے ہیں۔"[۱۳]

تاہم مصنف روسو، افلاطون، سقراط اور ان کے شاگرد کریٹو کا ذکر بھی کرتے ہیں اور ان کے زندگی کے بارے مین فلسفے کو بھی اپنے انشائیوں میں کہیں کہیں بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ مصنف وقت کے فلسفے کے ساتھ ساتھ زندگی کی حقیقت پر بھی قلم اٹھاتے ہیں۔ انسان اپنے آپ میں ایک چھوٹی سی کائنات ہے اور انسان قدرت کا شاہکار ہے اس طرح زندگی نام ہی دریافت کرنے کا ہے۔ مصنف انسان کے اندر موجود موٹر فورس پر بھی بات کرتے ہیں اور اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ انسان کے اندر قوت محرکہ کا کام کرتی ہے اور اس فکر کے باعث ہی کائنات میں سارے کام اپنے تعین کیے گئے وقت پر انجام دیے جا رہے ہیں۔ سورج اپنے وقت پر نکلتا اور غروب ہوتا ہے پرندے شام کو اپنے گھونسلوں میں چلے جاتے ہیں بارش اپنے تعین کیا گئے وقت پر برستی ہے اور آسمان پر ستارے اپنے تعین کیے گئے وقت پر چمکتے ہیں اور یہ سب کام خالق حقیقی نے ان کی قسمت میں لکھ دیا ہے اور اس طرح ہر کام اپنے وقت پر انجام پا رہا ہے۔ مصنف وقت کے ماضی، حال اور مستقبل کے فلسفے پر بھی لکھتے ہیں:

"ہمارے ماضی کی تمثیلیں جتنی زیادہ حرکی ہوں گی، ہمارا حال اور مستقبل اتنا زیادہ ہی تابناک ہو گا، ماضی ہمیں اعتماد بخشتا ہے تو حال ہمیں جہد مسلسل کی طرف ابھارتا ہے اور مستقبل ہمیں کامیابی کی نوید دیتا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کے اس پُر اسرار تسلسل کو ہم علیحدہ علیحدہ کر ہی نہیں سکتے یہ تو بیک وقت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔"[۱۴]

جمیل آزر کتاب کے بارے میں بھی بیان کرتے ہیں کہ کتاب پڑھتے ہوئے ہمیں ہر چیز پر غور و فکر کرنا پڑھتا ہے اور کتاب میں بعض موضوعات اس قدر پیچیدہ ہوتے ہیں کہ دن رات سوچنے اور غور و فکر کے بعد ہم اس نکتے کو سمجھ پاتے ہیں۔ انشائیہ "جنگ کرنا" میں زندگی کے بارے میں مصنف اپنا فلسفہ بیان کرتے ہیں کہ زندگی مسلسل جنگ کرنے کا نام ہے اور اس کے لیے آپ کو ہر مخالف قوت سے ٹکر لیتے ہیں اور جہد مسلسل کے بعد ہی آپ کامیاب ہیوتے ہیں برٹرنڈرسل زندگی بھر جنگ کی مخلفت کرتا رہا مگر وہ خود پوری زندگی جنگ ہی لڑتا رہا۔ جمیل آزر کے انشائیوں میں سچائی اور حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ انسان کو انکشاف ذات محسوس ہوتا ہے۔ ادبی، نفسیاتی، سماجی اور اخلاقی موضوعات سچائی اور حقیقت کے گرد گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح جمیل آزر کے

فلسفیانہ نظریات میں بھی یہی عکس نظر آتا ہے۔ جس میں کمال مہارت سے فلسفیانہ نظریات میں کائنات کی سچائی کو نہایت احسن انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اپنے انشائیہ "سفر" میں ایک سفر کی فلسفیانہ حقیقت کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں: "اگر دیکھا جائے تو انسان کی پوری زندگی ایک سفر ہی ہے۔ خود یہ سفر مہد سے لے کر لحد تک ہو، یا بچپن سے بڑھاپے تک اور خواہ سحر سے افطار تک۔"[۱۵]

مندرجہ بالا اقتباس میں کائنات کی تین سچائیاں بیان کی گئی ہیں۔ یہ فلسفی انشائیہ نگار ہونے کی نشانی ہے۔ یہی جمیل آزر کی فلسفیانہ سوچ کا خاصہ ہے۔

۵۔ اکبر حمیدی کے انشائیوں کا فلسفیانہ جائزہ:

اکبر حمیدی اردو ادب کے افق پر چمکتا ستارہ ہے۔ انشائیہ نگاری میں اکبر حمیدی کا نام ایک روشن ستارے کی مانند چمک رہا ہے۔ ادبی دنیا میں ابتدا سے ہی وہ ایک اچھے انشائیہ نگار کی حیثیت سے متعارف ہوئے، وہ بڑی سرعت سے صنف انشائیہ میں اپنا ذاتی تجربات اور منفرد فکر کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے انشائیے سادگی، شگفتگی، خیال آفرینی اور لطف اندوزی جیسے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے اور انشائیے میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اکبر حمیدی کے انشائیوں میں تقریباً تمام موضوعات کی جھلک ملتی ہے۔ ان کے انشائیوں میں فلسفیانہ موضوعات کی تصویر بڑی واضح ہے۔ وہ بڑی مہارت سے فلسفی انداز میں فلسفیانہ سوچ کو بیان کرتے ہیں۔ ان کے انشائیہ "رنگ دار شیشے" میں حقیقت پسندی کے حوالے سے فلسفی سوچ کو کچھ یوں بیان کیا گیا ہے:

> "حقیقت پسندی اچھی چیز سہی مگر ضرورت سے زیادہ حقیقت پسندی بھی انسان کی زندگی کو تلخ بنا دیتی ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ تلخ حقائق اور ہمارے درمیان رنگ دار شیشوں کی ایک دھندلی سی دیوار تنی رہے۔ یہ دیوار چار من روئی کی بھی ہو سکتی ہے اور چار من لوہے کی بھی۔"[۱۶]

اکبر حمیدی کی فلسفی سوچ کی تازگی بہت تازہ ہے اور اس کی پرواز کافی بلند ہے۔ وہ خود بھی غور و فکر اور تخیل کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ قاری کو بھی غور و فکر کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ نہایت مہارت سے کائناتی مسائل کو بیان کرتے ہیں اور فکر کی نئی راہیں تلاش کرنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ غور و فکر اور ناصحانہ عناصر ان کے انشائیوں میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ انسان کی زندگی میں راحتیں، خوشیاں، کامیابیاں، ناکامیاں، نا امیدیں، امیدیں سب کچھ ہوتا ہے مگر انسان اپنی حماقت سے ان سب کو گڈمڈ کر دیتا ہے جس سے وہ ٹھیک طرح سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا اس طرح انسان مختلف تجربات سے سیکھتا ہے جو کہ بہت خطرناک کام ہے بعض دفعہ تو محنت بہت زیادہ درکار ہوتا ہے مگر سمجھدار لوگ دماغ سے کام لیتے ہیں۔

مصنف انشائیہ ”ایک فلسفی کی مخالفت میں“ میں فلسفی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ معاشرے میں انسا کچھ اس طرز کے فلسفی موجود ہوتے ہیں جو کہ انسان کو بڑے بڑے آدرش دیتا ہے اور بہتر رویئے کی تعلیم دیتا ہے مصنف ایسے فلسفیوں پر طنز بھی کرتے ہیں۔اس طرح مصنف خوبصورتی کے فلسفے پر بھی لکھتے ہیں کہ خوبصورتی ہمیشہ بد صورتی پر حاوی ہوتی ہے اگر چھوٹی سی کوئی بد صورتی ہو تو وہ بڑی خوبصورتی کو بھی ماند کر دیتی ہے اس طرح انسان کی فطرت میں ہی خوبصورتی دیکھنا ہے اور بد صورتی کو برداشت کرنا انسان کی سرشت میں نہیں ہے۔انسان کی زندگی تغیر آشنا ہے اور اس کے قاعدے اور قانون مقرر نہیں ہیں کیونکہ ہر قوم،ملک اور ذات کے اپنے اپنے مزاج ہوتے ہیں مصنف کے خیال میں زندگی آزادی کا ہی دوسرا نام ہے کہ انسان جہاں چاہے جب چاہے اپنی مرضی سے زندگی بسر کر سکتا ہے۔مصنف انشائیہ ”پتنگ“ میں زندگی کو پتنگ کا بھی نام دیتے ہیں۔انسان کی زندگی کائنات کی مانند بہت وسعتوں تک پھیلی ہوئی ہے اور یہ ہر وقت تبدیلی کے عمل سے گزر رہی ہے۔

مصنف انشائیہ ”موسم“ اور ”پُرانے کپڑے“ میں بھی ہمیں وقت کے فلسفے کے بارے میں بتاتے ہیں۔جوں جوں وقت گزرتا ہے کپڑے پُرانے ہوتے رہتے ہیں اور پرانے کپڑے ہم پھینک دیتے ہیں اس طرح وقت بھی گزر کر ماضی کا حصہ بن جاتا ہے۔اس طرح موسم اور وقت بھی ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں وقت بڑی تیزی سے گزر رہا ہے انشائیہ ”گھنٹہ گھر“ میں مصنف وقت کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔

> ”وقت واقعات،حادثات اور کیفیات کا نام ہی تو ہے! جیسے سمندر از خود تو کوئی چیز نہیں۔پانی طویل و عریض پانی،اس کی گہرائیوں اور گہرائیوں میں پلنے والی ساری طوفانی مخلوقات کا نام ہے۔اس طرح ہم گزرتے وقت کو واپس لا سکتے ہیں۔وہ سب کچھ جو کبھی گزرا تھا ابھی تک اس وسیع و بسیط کائنات میں سنّنا رہا ہے۔میرے خیال میں وہ سب چیزیں جنہیں انسانی حواس کسی نہ کسی صورت میں موصول کرتے ہیں کائنات میں کسی نہ کسی حالت میں ضرور موجود ہوتی ہیں کیونکہ بغیر وجود کے کوئی چیز اپنا احساس نہیں دلا سکتی۔“[۲۱]

تاہم اکبر حمیدی کے ہاں گہری سوچ اور زندگی کا فلسفہ موجود ہے وہ کائنات پر گہرا غور و فکر کرتے ہیں اور اپنی سوچ کو اپنے انشائیوں میں بکھیر دیتے ہیں۔تاہم اکبر حمیدی نے فلسفیانہ موضوعات کو منفرد اور دلکش انداز میں قاری کے سامنے رکھ دیا ہے۔جس کے لیے وہ محاوروں،جملوں اور ضرب المثل کو بھی استعمال کرتے ہیں۔واقعات اور مثالوں کی دلیل سے اپنی سوچ اور خیالات کو مضبوط اور پختگی عطا کرتے ہیں۔اپنے انشائیہ "اشتہاروں بھری دیواریں" کے آخر میں فلسفیانہ رنگ یوں بھرتے ہیں:

"سچ پوچھئے تو یہ کائنات مجھے اشتہاروں پر ایک دنیا نظر آتی ہے۔ جس کی دیواریں۔۔۔۔۔
سب دیواریں اشتہاروں سے بھری ہیں۔ بلکہ خود انسان جہاں کہیں بھی ہے۔۔۔۔ دیوار بن
گیا ہے۔۔۔۔ اور اس دیوار پر نظریوں، اعتقادوں، ملکوں، قوموں، نسلوں، طبقوں، مشغلوں
کہ اشتہار چسپاں ہیں۔۔۔۔ جو کہیں طرح کے تضادات سے بھرے ہیں۔۔۔۔ اصل انسان
تو اشتہاروں کے نیچے کہیں چھپ گیا ہے۔۔۔۔ غائب ہو گیا۔۔۔۔" [۱۸]

اکبر حمیدی کے منفرد اور دلکش نظریے ہی کی ان کی فلسفی سوچ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جس میں وہ جاذب اور خوبصورت الفاظ اور بہترین انداز بیان سے غور و فکر اور ناصحانہ عناصر کو ترجیح دیتے ہیں۔

۶۔ مشکور حسین یاد کے انشائیوں کا فلسفیانہ جائزہ:

مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں فلسفہ اور فلسفیانہ موضوعات کی بھرمار ہے۔ اس لیے ان کے موضوعات فلسفہ کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ کائنات مسائل پر غور و فکر اور مفکرانہ سوچ کو بیدار کرنا مشکور حسین یاد کا کمال ہے۔ رزق حلال کمانا زندگی کی اولین ترجیح ہے اور رزق حلال کے بعد اظہار تشکر لازم و ملزوم ہے۔ ان کے انشائیہ "کسب زر" شکر گزاری اور اظہار تشکر پر فلسفیانہ سوچ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

"مزدور کی مزدوری اس کی محنت کا صلہ نہیں ہوتا، اظہار تشکر کا طریقہ ہوتا ہے۔ ہم کسی کے
شکر گزار اس لیے ہوتے ہیں تاکہ وہ ہمارے لیے اپنے احسانات کا سلسلہ جاری رکھے۔ شکر
گزاری میں عزت و احترام کی نسبت مزید احسان کی توقع زیادہ شامل ہوتی ہے۔ ویسے ایک کام
کرنے والا کام لینے والے سے ہر حال میں برتر ہوتا ہے، لیکن ہم اس برتری کو عموماً تسلیم نہیں
کرتے۔" [۱۹]

فلسفہ اور اخلاقیات کے موضوعات مشکور حسین یاد کا خاصہ ہیں۔ شکر گزاری، اظہار تشکر اور عزت و احترام اخلاقیات کے موضوعات ہیں۔ پورے انشائیہ میں رزق حلال اور شکر گزاری پر مثبت خیالات و افکار قلمبند کرنا ہی مشکور حسین یاد کا کمال ہے۔ جہاں اخلاقی اقدار پر روشنی ڈالی ہے وہاں پر منفی رویوں کی حوصلہ شکنی بھی کی ہے۔ لالچ، ناشکری، سستی، نااہلی، ہڈ حرامی، گالی، جھوٹ اور چوری جیسی منفی اور گھٹیا موضوعات کو بھی اصلاح کے لیے چنا ہے۔ سماج و معاشرے کے افراد میں ان خصلتوں کے لیے دلائل کے ساتھ حوصلہ شکنی کرتے ہوئے اس کی ممانعت کی ہے۔ ان جیسے موضوعات میں مشکور حسین یاد کی انشائیے "تجربہ اور ناتجربہ کاری" منافق، نادانی کا شعور، ناجائز تعلقات اور ہرجائی شامل ہیں۔ جن میں اخلاقی اقدار اور منفی خصلتوں کے متعلق موضوعات کو اختیار کیا گیا

ہے۔ ان موضوعات کا مقصد سماجی اصلاح ہے۔ جس میں معاشی پہلو، گھریلو مسائل، رسم ورواج اور سیاسی اثر ورسوخ کے موضوعات بھی ملتے ہیں۔ ان کے مجموعہ "جوہر اندیشہ" میں فلسفیانہ، سماجی اور اخلاقی موضوعات ملتے ہیں۔

مشکور حسین یاد کا انشائیہ مجموعہ "بات کی اونچی ذات" میں اکتیس انشائیے ان کی سترہ سالہ (۱۹۷۰ء تا ۱۹۸۷ء) صلاحیتوں کا نچوڑ ہے۔ اس مجموعہ میں بہت سے ملے جلے موضوعات ملتے ہیں مگر فلسفیانہ موضوعات کی کثرت پائی جاتی ہے۔ ان کے انشائیہ "عالی ظرفی" کا عنوان یا موضوع ہی فلسفیانہ سوچ کی عکاسی ہے۔ انہوں نے قاری کو بڑے فلسفیانہ اور اس مفکرانہ انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ عالی ظرفی کی بدولت ہی زندگی کا اصل مزہ ہے۔ ہمارا دین اسلام بھی عالی ظرفی کا درس دیتا ہے۔ انشائیہ کے آغاز میں نصیحت آمیز رویہ اختیار کرتے ہوئے شرافت اور عالی ظرفی کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "شرافت کو ایک حد تک زندگی کی وسعتوں، گہرائیوں اور بلندیوں کو اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ عالی ظرفی کے یہاں کس طرح کی کوئی حد نہیں، وہ تو ان وسعتوں، گہرائیوں اور بلندیوں کو مسلسل شکار کرتی رہتی ہے اور شکار کر لینے کے بعد انہیں شرافت کے حوالے کر دیتی ہے۔ شرافت کی سب سے بڑی کامیابی ان کی دیکھ بھال ہے۔ عالی ظرفی کا کام دیکھ بھال کرنا نہیں، فروغ دینا ہے۔"[۲۰]

مشکور حسین یاد نے سماجی موضوعات کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ معاشرے اور سماج میں مثبت پہلوؤں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ "عالی ظرفی" سماجی مثبت رویہ ہے۔ اس موضوع کی وسعتوں کو مکمل گہرائیوں کے ساتھ قاری کے سامنے رکھ دیا ہے۔ عالی ظرفی کا ش شرافت کے علاوہ بغاوت اور انقلاب کے ساتھ موازنہ کر کے ایسے فلسفیانہ موضوعات کو سامنے لایا گیا ہے کہ جس سے سماجی رویوں میں پھلنے پھولنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

۷۔ نظیر احمد صدیقی کے انشائیوں کا فلسفیانہ جائزہ:

ایک مصنف اگر اپنی تصانیف میں فلسفہ کو جگہ دے گا تو اس کی تحریروں میں رنائیت پیدا ہو گی۔ نظیر صدیقی نے اپنے انشائیوں میں فلسفانہ انداز کو اپنا کر انشائیوں کو ادبی پہلو میں ایک الگ مقام بخشا ہے۔ تحریر لکھنا اور اس کو سادگی سے بیان کرنا اور اس میں ایسے الفاظ کا شامل کرنا جو بے معنی ہو کسی مصنف کی تحریروں کو نمایاں نہیں کرتا لیکن اس کے برعکس مصنف اپنی تحریروں میں ایسے الفاظ کا چناؤ کرے جو اپنے اندر ایسے بامعنی فکر کو چھپائے رکھے، جو تحریروں میں وزن پیدا کرے تو ایسے مصنف کے فن پاروں کو کافی پذیرائی ملتی ہے۔ ایک مصنف کے اندر

ایک فلسفی کا ہونا لازم نہیں لیکن اگر ایسا ہو جائے تو وہ اپنی تحریروں میں چھپی کیفیات کو قارئین کے دلوں تک لے جاتا ہے اور ایک فنکار کا کام بھی دراصل یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے فن میں علم و حکمت کو عیاں کرے۔ نظیر صدیقی نے اپنے انشائیوں میں فلسفانہ رنگ کو بہتر انداز میں پیش کیا ہے اور اس بات کی مثال ان کے ایک انشائیہ " یہ انسان" میں یوں ملتی ہے کہ کیسے انہوں نے خدا کو ماننے اور نہ ماننے والے انسانی فکر کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ خدا کو ماننے سے کیسے ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا ہے اور خدا کو نہ ماننے سے کیسے ابہام پیدا ہوتے ہیں:

> "خدا کو مان لینے سے انسان کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں نہ ماننے سے اندیشوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ خدا کو ماننے کے لیے عقل کا کمزور اور عقیدے کا مضبوط ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے اور نہ ماننے کے لیے عقیدے کا کمزور اور عقل کا مضبوط ہونا ضروری نظر آتا ہے۔ عقیدہ انسان کو اور کچھ دے یا نہ دے سکون ضرور عطا کرتا ہے، عقل انسان سے اور کچھ لے یا نہ لے سکون ضرور چھین لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو عقل کے مقابلے میں عقیدے کا سودا زیادہ پسند رہا ہے۔"[۲۱]

نظیر صدیقی کے انشائیوں میں فلسفیانہ رنگ نمایاں پایا جاتا ہے انہوں نے اپنی تحریروں میں خدا اور انسانی فکر کا موازنہ کیا ہے کہ کیسے خدا کے ہونے کا احساس انسان کی زندگی اور اعمال کو متاثر کرتا ہے اور خدا کے ہونے کہ احساس زندگی گزارنے اور عبادات میں کیسے انسان ایک دائرے میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس خدا کو نہ ماننے والا ظاہری طور پر ازاد لیکن وہ فکری تناؤ کا شکار رہتا ہے۔ فلسفہ دراصل عقل اور شعور کا پیروکار نہیں ہوتا اور ایسے ہی خدا کی ذات عقل سے ماورا ہوتی ہے۔ نظیر صدیقی نے اپنے انشائیوں میں انسانی سوچ کے چند ایسے پہلوؤں کا ذکر کیا ہے جو سوچ اور عقل سے دوری اختیار کرتے ہوئے نظر اتے ہیں۔ انہوں نے ایک عقل مند اور بے وقوف انسان کی سوچ کا اپنے انشائیوں میں ایک خوبصورت انداز میں محاصرہ کیا ہے۔ نظیر صدیقی نے اپنے ایک انشائیہ "بور" میں انسانی خوبصورتی اور بدصورتی کے بارے میں یوں بیان کیا ہے کہ:

> "بور قسم کے لوگوں کا بدصورت یا بے وقوف ہونا ضروری نہیں۔ سچ پوچھیں تو یہ کہنا بہت ہی مشکل ہے کہ ان کے لیے کیا کچھ ضروری ہے اور کیا کچھ ہونا ضروری نہیں۔ مشاہدے نے مجھے بتایا ہے کہ بے وقوفوں سے عقل کی باتیں سرزد ہوں یا نہ ہوں لیکن عقلمندوں سے حماقتیں اکثر سرزد ہوتی ہیں پھر جب عقلمندوں سے حماقتیں ممکن ہیں تو حسین اور ذہین ادمیوں کا بور ہونا کیوں کر ناممکن ہو سکتا ہے۔"[۲۲]

نظیر احمد صدیقی بلاشبہ ایک فلسفی انشائیہ نگار ہے۔ اس کا واضح ثبوت ان کی انشائیہ نگاری ہے۔

۸۔ صلاح الدین حیدر کے انشائیوں کا فلسفیانہ جائزہ:

صلاح الدین حیدر کی تحریروں میں فلسفیانہ موضوعات کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ وہ معاشرے اور کائنات کی حقیقتوں کو فلسفی انداز میں بیان کرنے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔ ان کا انشائی مجموعہ "حماقتیں میرے مقدر کی" میں اس کا تسلسل ملتا ہے۔ انشایئے کا عنوان ہی فلسفیانہ محسوس ہوتا ہے۔ اس انشائیہ کا آغاز ہی فلسفیانہ حقیقت سے شروع کیا گیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

> "زندگی کو اگر سنجیدگی سے فرصت مل جائے اور جوانی کو نادانی سے مہلت مل جائے تو ایک مسلسل حماقت کا احساس ہو ہی جاتا ہے۔ مردہ دلی اور مردہ پرستی کو لوگ فی زمانہ خاطر میں نہیں لاتے۔"[۴۳]

زندگی کی الجھنیں اور مشکلات انسان میں فلسفی سوچ کو بیدار کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ زندگی کی بے ترتیب اور تہہ در گھاٹیوں سے فرار ہونا ناممکن ہے۔ زندگی سے موت کی طرف سفر اٹل حقیقت ہے اور زندگی حماقت کا ایک مسلسل سفر ہے۔ اس لیے اس پر شرمندہ ہونے کی بجائے اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ صلاح الدین حیدر نے بھی یہی فلسفیانہ سوچ کے ذریعے قارئینِ کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے سنجیدگی کے ساتھ طنز و مزاح رویہ بھی اختیار کیا گیا ہے۔ اپنے دوسرے مجموعے "ڈر اور ڈراما" کی تحریروں میں بھی یہی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے اس مجموعے کے انشائیہ "جاگیر دار اور برخودار" میں زندگی اور موت کا ذکر فلسفیانہ انداز میں پایا جاتا ہے۔ اس انشائیہ میں موت کے وقت کے بارے میں اپنے نظریات و خیالات کو فلسفی انداز میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> "ایسی حالت میں محسوس ہوتا ہے کہ وقت بڑا ظالم اور سوچ مظاہر فطرت کا کوئی بڑا جاگیر دار ہے۔ بہر حال فنا کے قانون کی زد سے کوئی شے بھی باہر نہیں، ہر ایک کو آخر کار موت سے ہمکنار ہونا پڑتا ہے۔"[۴۴]

بچپن اور جوانی کے شب و روز کو گزارنے کے بعد بڑھاپے اور موت کی طرف سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ موت اٹل حقیقت اور کائنات کی سچائی ہے۔ دنیا کا ہر حربہ استعمال کرنے کے بعد بھی حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے گناہوں کی آلودگی سے بہتر ہے کہ انسان نیکیوں کے عطر سے خود کو معطر کرے تاکہ دنیا میں انے کا مقصد پورا ہو۔ صلاح الدین حیدر کی تحریروں میں یہ فلسفی انداز انشائیہ کو جان ڈالتا ہے۔ یہ یہ تحریر غور و فکر کرنے کی طرف راغب کرتے ہیں۔ کائناتی سچائیوں کا سامنا کرنے کا درس دیتی ہیں۔

۹۔ڈاکٹر شہزاد قیصر کے انشائیوں کا فلسفیانہ جائزہ:

ڈاکٹر شہزاد قیصر کی انشائیہ نگاری کا فن ان کی ابتدا سے ہی ارتقائی منازل کو طے کرتا ہوا سفر کرتا جا رہا ہے۔ ان کے انشائیے شگفتگی اور مزاج کی چاشنی کا حسین امتزاج ہیں۔ ان کے انشائیوں میں سنجیدگی، تفکر اور نفسیاتی موضوعات کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ پہلو کی کثرت پائی جاتی ہے۔ڈاکٹر شہزاد قیصر کی شخصیت میں صوفیانہ عناصر ہونے کی وجہ سے فلسفیانہ رنگ واضح اور کثرت سے نظر آتا ہے۔ ان کی جبلت کے رگ وریشے میں فلسفہ اور تصوف گندھا ہوا ہے اور یہ دونوں عناصر ان کی شاعری میں بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کا کمال یہ ہے کہ ادب اور فلسفہ کا یہ تال میل ان کے موضوعات پر کسی قسم کا پیچیدہ تاثر نہیں چھوڑتا بلکہ اس کی دلکشی اور دل نشینی کو مزید قائم و دائم رکھتا ہے۔ڈاکٹر شہزاد قیصر کے زرخیز تخیل سے نت نئے فلسفیانہ شگوفے چھوٹتے ہیں اور ایک خوش مزاج ہنستے ہنسانے والا فلسفی ادب کے نخلستان کو ہر ہر دم سیراب کرتا ہے۔ انسان کی جبلت میں یہ خوبی شامل ہے کہ وہ کسی بھی حال میں مسلسل خوش نہیں رہتا زیادہ مصروفیات ہو جائے تو شکوہ، اگر آرام دہ طبیعت ہوتی تو بوریت کی شکایت، بہر حال بوریت کے حوالے سے شہزاد قیصر اپنے فلسفیانہ خیالات یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> ”جب کوئی شخص خود سے بور ہونا شروع ہوتا ہے تو اس کی ذات کے امکانات شعور میں آنا شروع ہوتے ہیں۔ ایسی کیفیت کو ہم باطنی بوریت سے تعبیر کر سکتے ہیں جو ہر شے سے ماورا ہوتی ہے۔ اس کے معرض وجود میں آتے ہی تمام خارجی حتیٰ کہ انسانی فکر ہیجانات اور نفسیات سب بے معنی لگتی ہے۔“[۲۵]

ڈاکٹر شہزاد قیصر وقت کا فلسفہ بھی بہت عمدہ انداز سے پیش کرتے ہیں وقت مستقل رہنے والی چیز نہیں ہے اور نہ ہی دولت مستقل چیز ہے اور نہ کوئی ہمیشہ اونچے عہدے پر فائز رہتا ہے ماضی، حال اور مستقبل تینوں میں وقت کی حیثیت بدلتی رہتی ہے۔ مصنف کائنات کی جبریت پر بھی قلم اٹھاتے ہیں جیسے سورج دن کے وقت نکلتا ہے جب کہ روشنی کی ضرورت رات کے وقت بھی ہوتی ہے موسموں میں انسان کی فطرت کے خلاف تغیر بھی تو ہوتا رہتا ہے۔ ”یہ کائناتی جبر جب انسانوں کی دنیا کا رُخ کرتا ہے تو اس جبر میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ کھلے انسانوں کی پابندی وقت کی زنجیروں میں جکڑ لیتا ہے۔ ہر جگہ اس پابندی کا جال بچھا ہوتا ہے۔“[۲۶]

تاہم وقت کی جبریت انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے اور یہ انسان کے بس میں نہیں ہے۔اس طرح مصنف انشائیہ ''مصور'' میں بھی فلسفیانہ موضوع پر بات کرتے ہیں کہ مصور اپنی مصوری سے انسان کی شکل تو بنا سکتا ہے مگر اس کی حیثیت سوائے بت کے کچھ بھی نہیں ہے یہ صرف المصور کے ہاتھ میں ہے کہ وہ اس بت میں جان بھی ڈال دے اور انسان کو تخلیق کر کے اس کی صورت بنا دے۔مصنف اپنے انشائیے'' دانشور'' میں بھی سقراط اور افلاطون پر قلم اٹھاتے ہیں اور ان کو محض گفتگو بناتے ہیں۔

انشائیہ '' قوت فیصلہ '' میں بھی مصنف انسان کی قوت فیصلہ پر فلسفیانہ بات کرتے ہیں کہ انسان کے ئ لیے یکسوئی بہت ضروری ہے اور کسی بھی چیز کو جانچتے اور سوچتے ہوئے مکمل دھیان سے کام کرے اور انسان تقسیم نہ ہو اور وقت سے پہلے اس بات کا فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ فلاں چیز غلط ہے یا صحیح اس بات کا حقیقی فیصلہ وقت کرتا ہے۔اس طرح دھیان کا قائم رہنا بہت ضروری ہے اگر یہ ہی دھیان بٹ جائے تو بہت سی اشیاءہاتھ سے نکل جاتی ہیں اور بعض دفعہ تو بہت کچھ ہمارے دھیان سے بہت دور پرے نکل جاتا ہے کہ اس کے نشان تک نہیں دوبارہ ملتے اس بارے میں مصنف انشائیہ '' دھیان'' میں لکھتے ہیں:

> ''دھیان کا وجود موجودات کی سب سے قوی دلیل ہے۔دھیان کا عمل بے مغز نہیں ہوتا بلکہ مفعول بہ ہوتا ہے۔اس میں داخلی اور خارجی حلقے کی تفریق نہیں ہوتی۔کسی شے کا دھیان میں آنا اس چیز کی غمازی کرتا ہے کہ وہ شے موجود ہے۔''[۲۷]

ڈاکٹر شہزاد قیصر کے انشائیوں کا مجموعہ "لطف اگہی" میں انشائیوں کے سفر میں پر ہر نئے دن اور ہر نئی تحریر میں پختگی اور شگفتگی میں اضافہ ہو رہاہے۔اسی طرح ان کے ابتدائی انشائیوں میں فلسفیانہ پہلو کم اور آخری انشائیوں میں فلسفیانہ رنگ زیادہ گہراا ور پر اثر نظر اتاہے۔ان کے انشائیوں کے مجموعے میں "لطف آگہی" انشائیہ میں وہ خود کلامی کے ایک طرز بیان کو بیان کرتے ہیں یہ انشائیہ ان کے فن کی کمال کا عروج ہے اس میں ایک مقام پر خوشامد کے حوالے میں وہ یوں تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''خوش آمد ایک طبقاتی قدر ہے جس کے ناطے ایک کمزور اور کم تر شخص بھی کسی طاقتور اور اعلی شخص کے ناک میں نکیر ڈال کر اسے ادھر ادھر لیے پھرتا ہے اور بوقت ضرورت وہ تفریح اس سے ناچ بھی کروا سکتا ہے۔خوش آمد کی نکیل دوسری تمام نکیلوں سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے اس کی گرفت سے بچنا محال ہوتا ہے اس طبقاتی معاشرے میں ہمیں اس نکیل کو ہم وقت اپنے ساتھ رکھنا چاہیے۔''[۲۸]

ڈاکٹر شہزاد قیصر کسی بھی جذبے اور رویے کی بہترین الفاظ میں ترجمانی کرسکتے ہیں۔خوش آمدجیسے رویے پر یہ خیال ان کے فن کی ایک عمدہ مثال ہے ان کی تحریریں فکر انگیز، پر مغز اور بامعنی ہوتی ہیں۔تجربات حیات کا عطر اور جوہر کشید خیالات ان کے فلسفانہ اور مفکرانہ فن کا کمال ہے۔ہر موضوع میں محبت، عزت، احترام اور چاہت کے عناصر بکثرت پائے جاتے ہیں۔فلسفیانہ اور مفکرانہ انداز ان کے فن کی اولین ترجیحات میں شامل ہے۔بہترین اسلوب اس وقت تک ہی ممکن ہے جب تحریروں میں فلسفیانہ خیالات کا امتزاج ہو اور مفکرانہ سوچ کی ترجمانی کی جائے۔ڈاکٹر شہزاد قیصر کے انشائیے میں یہ عناصر بہت عمدگی سے بیان کیے گئے ہیں اور ان کا یہ انداز ان کے فن اور مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

۱۰۔ارشد میر کے انشائیوں کا فلسفیانہ جائزہ:

ارشد میر کے انشائیے پڑھنے سے طنز و مزاح اور سنجیدگی دونوں کے عناصر ملتے ہیں مگر طنز و مزاح کا عنصر غالب آجاتا ہے۔انہوں نے طنز و مزاح اور مزاحیہ موضوعات کو قہقہوں میں بدلنے کے علاوہ ان کو منفرد انداز میں بیان کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔انہوں نے اپنے انشائیوں میں انسانی رویوں اور جذبوں کی کھل کر فلسفیانہ انداز میں ترجمانی کی ہے۔فلسفیانہ موضوع میں خیالات و افکار کے لیے الفاظ کی قلت ازل سے ہی رہی ہے مگر ارشد میر کے پاس ایسے موضوعات کے لیے الفاظ کی بھرمار کے ساتھ ساتھ واضح دلائل بھی موجود ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> "ارشد میر نے اپنے طنزیہ، مزاحیہ مضامین میں فرد اور معاشرے کی ناہمواریوں کو موضوع بنا کر قہقہوں کو بیدار کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے مگر انشائیوں میں انہوں نے ایسے انسانی نقطوں کو ابھارنے میں سارازور صرف کیا ہے جو روشنی کے کوندوں کی طرح موضوع کو منور کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔"[۲۹]

ارشد میر کی تحریروں میں ایسے انشائی نقطے نظر آتے ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ انہوں نے زندگی کے ساتھ جڑے ہوئے موضوعات کو ایک نئے زاویے کے ساتھ تحریر کیا ہے اور پھر فلسفیانہ اور پختہ دلائل اور مثالوں کے ساتھ ان موضوعات کو جاندار بنایا ہے۔ارشد میر کے انشائیہ کے فلسفیانہ موضوعات سے جو کرنیں پھوٹ رہی ہیں، جو وہ اردو ادب کو سیراب کر رہی ہے اور یہی ارشد میر کی اصل کامیابی ہے کہ ان کے فلسفی موضوعات میں مضبوطی اور پختہ پن موجود ہیں۔جو کسی بھی انشائیہ نگار کو زندہ رہنے کے لیے اشد ضروری ہے۔

ج۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا سماجی تقابل:

ا۔ وزیر آغا کے انشائیوں کا سماجی جائزہ:

ادب اور سماج کا چولی دامن کا ساتھ ہے تاہم ادب کا تعلق سماج کے ساتھ ساتھ فنکار کی ذات سے بھی ہوتا ہے اور ادیب ہمارے معاشرے سے تعلق رکھتا ہے اور جو کچھ وہ اپنی ارد گرد معاشرے سے اخذ کرتا ہے وہ ہی اپنی تخلیقات میں لکھتا ہے اگرچہ وزیر آغا اردو ادب کی ایک عہد ساز اور ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ انہوں نے انشائیے کے ساتھ شاعری، تحقیق اور تنقید میں اہم ادبی کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ہر موضوع کی طرح سماجی جہت کے موضوعات بھی ملتے ہیں۔ انہوں نے ان موضوعات کے ذریعے اردو ادب کو جدید میلانات اور رجحانات سے روشناس کروایا اور اہل ادب کی آبیاری کی۔ موجودہ دور میں جدیدیت کی وجہ سے سماجی موضوعات کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔ سماج اور معاشرے کے مسائل اور مشکلات کے علاوہ خوشیوں اور غموں کو بھی بیان کیا ہے۔ وزیر آغا نے جدیدیت کے سماجی موضوعات پر روشنی ڈالتے ہوئے قدیم سماجی موضوعات اور ضروریات کا حوالہ بھی دیا ہے۔ مختلف ادوار اور عہدوں کو تقسیم کر دیا ہے۔ اس حوالے سے ان کی انشائیے "چرواہا" میں حوالہ ملتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

> "اب میں سوچتا ہوں کہ تاحال انسانی تہذیب صرف تین ادوار سے آشنا ہوئی ہے۔۔۔۔۔ پہلا "چرواہے کا دور" جو گزر چکنے کے باوجود ابھی تک نہیں گزرا، دوسرا "کسان کا دور" جو اپنی عمر طبعی گزار چکنے کے بعد اب جان بلب ہے اور تیسرا "بنیئے کا دور" جو ابھی ابھی شروع ہوا ہے۔ بنیئے کی ساری قوت "زر" میں ہے. وہ اس ہتھیار کی مدد سے نہ صرف ہر قسم کے زنگ آلود تالوں کو کھولنے پر قادر ہے، نہ صرف انسانوں اور سلطنتوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا مجاز ہے بلکہ دنیا کے عقبی کے لذائذ اور اثمار کی بھی گارنٹی دے سکتا ہے۔"[۳۰]

وزیر آغا کی سماج اور معاشرے پر گہری نظر ہے، اس لیے ان کے انشائیوں میں سماجی موضوعات کثرت سے ملتے ہیں۔ ان کے انشائیہ کے عنوانات بھی سماج کی عکاسی کرتے ہیں۔ مصنف معاشرے کی ایک اہم برائی چوری پر بھی اپنا قلم اٹھاتے ہیں اور چوری کے پیشے کی تاریخ بھی بتاتے ہیں کہ آریا قوم نے جب ہم پر حملہ کر کے ہمارے قلعوں کو برباد کیا تو انتقام کے طور پر رات کے وقت ہمارے لوگوں نے ان کے مویشی چوری کرنے شروع کر دیے اور نتیجے کے طور پر وہ ہمیں بددعائیں دینے لگے مگر وقت کے ساتھ ہم نے اسے پیشے کو اپنی پوری زندگی پر محیط کر لیا ہے۔ آریا قوم ہماری قوم کے ناچ گانے اور شراب کو بھی دھیرے دھیرے اپنانے لگے اور نتیجے کے طور پر وہ خوابوں میں مست رہ گئے اور ہماری قوم انہیں کھا گئی تاہم ہماری تہذیب کی ہر پرت پر چوری کی صفت موجود ملتی ہے۔

”چوری ہمارا پیشہ ہی نہیں، مشغلہ بھی ہے اور ہم نے لیل و نہار کی ہزار کروٹوں کے باوجود نہ صرف اسے زندہ رکھا بلکہ اس میں لاتعداد موشگافیاں اور فنی باریکیاں بھی پیدا کی ہیں۔ دروغ بر گردن راوی، لیکن یہی سنا ہے کہ ہمارے اس پیشے کا ذکر رگ وید میں بھی موجود ہے۔“[۳۱]

انشائیہ ”رشتے داروں کی شان میں رشتے داروں کی اقسام پر لکھا گیا انشائیہ ہے۔ انشائیہ ”درمیانہ درجہ“ میں مصنف ریل گاڑی کے تین درجوں کو علامت کے طور پر برتتے ہین اونچا درجہ، درمیانہ درجہ، اور نچلا درجہ۔ اونچے درجے کے لوگ ٹھنڈی میٹھی، پُر سکون اور طمانیت سے بھرپور لمبی تانے سوتے ہیں انہیں کسی قسم کا ڈر اور خوف نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ زمانے کی مختلف الجھنوں میں گرفتار ہوتا ہے اور نچلے درجے کے لوگ بھی ڈر، خوف اور معاشرے کی الجھنوں سے بے نیاز ہوتے ہیں اور انہیں نیند کم ہی میسر ہوتی ہے اور نہ ہی وہ کسی قسم کا خواب ہی دیکھتے ہیں جبکہ درمیانے درجے کے لوگ اکثر خواب جیسی کیفیت میں ہی مبتلا رہتے ہیں۔ وہ کبھی میٹھے، کبھی ڈراؤنے اور کبھی بھیانک خواب دیکھتے ہیں درمیانے درجے کے لوگوں کی حالت قابل رحم ہوتی ہے۔ درمیانے درجے کے لوگ خود کو سمجھتے ہیں کہ وہ نچلے درجے کے لوگوں سے بہتر ہیں مگر یہ ان کی غلطی ہوتی ہے تاہم ڈاکٹر وزیر آغا معاشرے کے مختلف پہلوؤں، انسانی تہذیب اور تاریخ پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس طرح سماجی پہلو ان کے انشائیوں میں ہمیں جا بجا بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

۲۔ غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کا سماجی جائزہ:

دبستان سرگودھا کے نمایاں انشائیہ نگار غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کے مجموعہ "نرم دم گفتگو" کے موضوعات کا جائزہ لیا جائے تو اس میں سماجی، نفسیاتی، فلسفیانہ اور ادبی جہت کے موضوعات ملتے ہیں۔ ان کے موضوعات فنی اعتبار سے ایک ایسے نقطہ اتصال کو پیش کرتے ہیں، جس میں زیر لب تبسم، فلسفہ، سماج اور نفسیاتی پہلوؤں کو بہ حسن و خوبی بیان کیا گیا ہے۔ ان کی انشائیوں میں شوخی و شگفتگی پوری برجستگی کے ساتھ موجود ہے تو اس کی وجہ مختلف موضوعات کو چن چن کر بیان کرنا ہے۔ سماج و معاشرے کے رسم و رواج، گھریلو مسائل کی لمبی داستانیں، غربت، سیاسی اثر و رسوخ، کرپشن اور تعلیم و صحت جیسے موضوعات پر اپنے خیالات و افکار بیان کیے ہیں۔ شگفتگی اور برجستگی کی ڈوری کو مضبوطی سے تھامے ہوئے سماجی و فلسفیانہ موضوعات کو قلم کی طاقت سے ایسے بیان کیا ہے کہ ان کی گفتگو میں بھی اصلاح کے پہلو نظر آتے ہیں۔ غلام جیلانی اصغر کے انداز تحریر میں نفس مضمون کی گہرائی صاف نظر آتی ہے۔ ان کے خیالات و افکار ان کی بصیرت اور فلسفیانہ سوچ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ اپنے بے تکلفانہ انداز تحریر، فلسفیانہ اور سماجی انداز گفتگو کی نئی معنویت سے موضوع کو ایسے بیان کرتے ہیں کہ منفی پہلوؤں میں بھی مثبت اثرات نظر آتے ہیں۔ ان کے موضوع کے حوالے سے محمد اسد اللہ لکھتے ہیں:

”غلام جیلانی اصغر موضوع کے ان پہلوؤں کو اپنے انشائیہ میں پیش کرتے ہیں جو عام طور پر ہماری نظر سے اوجھل ہوتے ہیں۔ ان کے انشائیے "گالی دینا" میں ان کا منفرد سوچ کا انداز ہمیں حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ گالی دینا ایک مذموم فعل ہے لیکن اس کے نفسیاتی پہلو کو وہ اس طرح واضح کرتے ہیں کہ اس سے نفرت ہو جاتی ہے۔“[۳۲]

غلام جیلانی اصغر انشائیہ ”ملاقات“ میں ملاقات کے طور طریقوں کو زیر بحث لاتے ہیں اور ملاقات کے آداب پر بھی بات کرتے ہیں ملاقات کرنے سے قبل جگہ، گفتگو کا موضوع اور دوسرے کے موڈ کو جانچ لینا چاہئیے اس طرح عام آدمی سے ملاقات تو صرف رسمی تعارف ہی ہوتا ہے اگر خود ساختہ آدمی ہو تو وہ بلندی سے آپ کی شخصیت کا جائزہ لے گا اگر ملاقات کرتے وقت آپ دوسروں کی خوشامد بھی کریں تو ملاقات کا دروازہ آپ کو کھلا ہی ملے گا اور اگر ملاقاتی سے آپ کی ذہنی وابستگی نہ ہو تو آپ صرف ملنے کو ہی کافی سمجھیں۔ اس طرح مصنف انشائیہ ”ریٹائرمنٹ کے بعد“ میں معاشرے کے ایک پہلو کی طرف ہماری توجہ مبذول کرواتے ہیں کہ جس میں ریٹائرمنٹ اور ریٹائرمنٹ کے بعد کے حالات کو شگفتہ انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ عام طور پر ریٹائرمنٹ کو آرام اور آسودگی میسر کرنے کا سبب سمجھا جاتا ہے مگر ریٹائرمنٹ کے بعد گھریلو ناآسودگی ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آدمی کو وہ عزت نہیں ملتی جو حاضر نوکری کے وقت ملتی تھی ریٹائرمنٹ سے پہلے آدمی کو وافر امکانات ملتے ہیں ہر دن نیا اور بہتر ثابت ہوتا ہے۔ تاہم ریٹائرمنٹ کے بعد بہت سے مسئلوں کے ساتھ پنشن وصول کرنے کا بھی مسئلہ درپیش آتا ہے۔

غلام جیلانی اصغر تنقیدی بصیرت کے مالک ہیں۔ اس لیے ان کے موضوعات میں تنقیدی رنگ چھلکتا ہے۔ انشائیہ کے مجموعے کا نام "نرم دم گفتگو" میں بھی تنقیدی پہلو موجود ہے۔ اس مجموعے میں متنوع موضوعات کے ساتھ بیس انشائیہ موجود ہیں۔ ان کے انشائیہ "غیر ذمہ داری" کا مطالعہ کریں تو ان کے تنقیدی بصیرت کا رنگ واضح ہوتا ہے۔ غیر ذمہ داری جیسے موضوع ہی منفی اور لاپرواہی کا ثبوت دیتا ہے مگر غلام جیلانی اصغر نے ان کے مثبت پہلو پر طنزیہ روشنی ڈالی ہے کہ انسان غیر ذمہ دارانہ ہونے پر فخر محسوس کرنے لگتا ہے۔ تنقیدی بصیرت رکھنے والے اس میں بھی اصلاح کے پہلو تلاش کرتے ہیں۔ ذمہ داری جیسے عمل کو بوریت اور قدیم جبکہ غیر ذمہ داری کو اچھوتا خیال، نیاپن، مثبت اور کارآمد رویہ قرار دیا ہے۔ اس حوالے سے اس انشائیہ کا نمونہ ملاحظہ ہو: ”ذمہ داری کے سپاٹ پن اس کا اس بات سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ذمہ دار لوگوں کے طرز فکر اور طرز عمل کے متعلق آپ آنکھ اور ذہن بند کر کے بھی صحیح پیشگوئی کر سکتے ہیں لیکن غیر ذمہ داری کا ہر دم بدلتا ہوا بوقلموں پیکر اتنا غیر یقینی اور اچھوتا ہوتا ہے کہ اس کے متعلق کوئی بیان دینا انتہائی احمقانہ فعل ہے۔“[۳۳]

غلام جیلانی اصغر کے انشائیہ کے مندرجہ بالا اقتباس میں سماج و معاشرے کے ایک فعل کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جس میں فلسفیانہ انداز اختیار کیا گیا ہے اس انشائیوں میں نفسیاتی پہلوؤں کو یکسر نظر انداز نہیں کیا گیا بلکہ معاشرے کی نفسیاتی موضوعات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ جس میں ذہنی کشمکش، عزت، ذلت، اچھائی اور برائی کے نفسیاتی رویوں کو احسن انداز اور بڑی برجستگی سے منظر کشی کی گئی ہے۔ ان کے انشائیوں میں زندگی کے تجربات و مشاہدات کی جھلک نظر آتی ہے۔ بلکہ انور سدید کے مطابق یہ انشائیے غلام جیلانی اصغر کی اپنی تصویریں ہیں۔ جو اس مجموعے کے پیش لفظ کے آغاز میں بہترین تشبیہ دے کر قرار دی گئی ہیں۔

۴۔مشتاق قمر کے انشائیوں کا سماجی جائزہ:

مشتاق قمر کا انشائی مجموعہ "ہم ہیں مشتاق" کے نام سے شائع ہوا۔ آپ کا شمار دبستان سرگودھا کے ممتاز انشائیہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔ مشتاق قمر صاحب ایک فطرت شناس شخصیت کے مالک ہیں۔ اس لیے ان کی تحریروں میں سماجی موضوعات کی جھلک بڑی واضح نظر آتی ہے۔ فطرت پرستی ان کے انشائیوں میں کثرت سے ملتی ہے۔ ان کے انشائیہ "نیند کی مذمت میں" سے لے کر "آئس کریم کھانا" تک مختلف موضوعات سے بھرے پڑے ہیں۔ دل افروز موضوعات کا تنوع بھی ملتا ہے۔ مشتاق قمر کے حوالے سے جمیل آذر لکھتے ہیں:

> "مشتاق قمر ہماری اردو انشائیہ نگاری کا ایک معتبر نام ہے۔ اس کے ہاں زندگی کے بیش با افتادہ موضوعات سے انشائیہ کی قندیلیں روشن ہوتی ہیں۔ چھڑی، آئس کریم کھانا اور بال کٹوانا معنی آفرینی کی عمدہ مصالحے پیش کرتے ہیں۔"[۳۴]

مشتاق قمر صاحب ایک موضوع کو منتخب کر کے اس کی تہوں سے دیگر موضوعات کی پرتیں کھولنے میں ماہر ہیں۔ بلکہ اس موضوع کے مختلف گوشوں کو منور کرنا اچھی طرح جانتے ہیں اور اس کے ہر گوشے میں سماجی زندگی کے راز تلاش کرنا ان کا فن ہے۔ ان کی خاصیت یہ ہے کہ یہ موضوع کو مکمل بیان کرنے کی بجائے نامکمل چھوڑ دیتے ہیں۔ تاکہ قاری کی تخلیقی صلاحیتیں بھی اجاگر ہوں، ان کے تخیل میں اضافہ ہو۔ انہوں نے انشائیہ میں بے شمار موضوعات کی قندیلیں روشن کر دی ہیں، جن میں سماجی موضوعات سرفہرست ہیں۔ مشتاق قمر معاشرے میں پھیلی برائیوں پر بھی قلم اٹھاتے ہیں۔ انشائیہ "اپالو ٹریجڈی" میں مشتاق قمر توہم پرستی اور توہمات کے بارے میں لکھتے ہیں۔ مشتاق قمر انشائیے میں اپنے علاقے کے بارے میں بتاتے ہیں کہ وہاں لوگ شادی بیاہ گویا ہر موقعے پر برگد کے تنے پر لوگ دیا جلانا نہ بھولتے عام طور پر دیہاتی علاقوں میں توہم پرستی کا رجحان زیادہ ہوتا ہے قبرستان کی سب سے پرانی قبر پر دیا جلانا، کالی بلی کا راستہ کاٹنا، کوے کے بولنے پر مہمان کی آمد، زیتون کی شاخ امن کی علامت وغیرہ وغیرہ۔ مصنف توہم پرستی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”دراصل توہم پرستی (جسے بدقسمتی سے اچھے الفاظ میں یاد نہیں کیا جاتا) علامتوں کی زبان ہے اور اس سے پوری طرح استفادہ کرنے کے لیے ان علامتوں کی گھتیاں سلجھانا اور ان کی زبان کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔“[۳۵]

توہمات اکثر سچی ثابت نہیں ہوتیں اور اگر یہ سچی ثابت ہو بھی جائیں تو اس کے پیچھے حادثات کا ہاتھ ہوتا ہے تاہم حادثات تو سائنسی ایجادات میں بھی حائل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح انشائیہ ”شہرت کی مخالفت میں“ میں مصنف معاشرے کی ایک اور تلخ حقیقت کی طرف ہمارا رُخ موڑتے ہیں کہ انسان اکثر اپنی پوری زندگی شہرت حاصل کرنے اور داد وصول کرنے میں صرف کر دیتا ہے مگر مشتاق قمر شہرت سے زیادہ گمنامی کی زندگی کو پسند کرتے ہیں انسان جب شہرت یافتہ ہو جاتا ہے تو اس کی شخصیت کے اور مبہم پہلو کی بھی تحقیق کی جاتی ہے اور اس کی زندگی کے سب پوشیدہ پہلو بھی عیاں ہو جاتے ہیں تاہم شہرت کا دور دور حقیقت سے کوئی تعلق واسطہ نہیں یہ صرف سراب اور واہمہ ہے۔ گمنام شخص کی شش جہات ہوتی ہیں اور جب چاہے، جہاں چاہے مکمل آزادی کے ساتھ ادھر اُدھر جا سکتا ہے۔ اور اپنا پہلو بدل سکتا ہے۔

مشتاق قمر کے انشائیوں کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کے سماجی موضوعات سادہ اور معمولی ہیں مگر انوکھے اور منفرد انداز سے پیش کیے گئے۔ مثال کے طور پر ”بال کٹوانا“ میں مردوں کے بال کٹوانے کو معزز ہونے کی علامت قرار دیا ہے۔ اور مصنف بال کٹوانے کے تہذیبی پہلو کو بھی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ ”آئس کریم کھانا“ میں مختلف دلائل سے مذمت کی گئی ہے یہ کہ آئس کریم کھانا خوش ذوقی کی نشانی نہیں ہے بلکہ چائے کو آئس کریم پر ترجیح دی گئی ہے۔ مشتاق قمر کے انشائیوں میں بے شمار موضوعات میں سماجی موضوعات کو خاصی فوقیت حاصل ہے۔

۴۔ جمیل آذر کے انشائیوں کا سماجی جائزہ:

جمیل آذر نے اپنی تحریروں میں سماج اور معاشرے کے موضوعات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سماجی موضوعات اس معاشرے کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انکشاف ذات اور معاشرے کے افراد کو درپیش مسائل اور ان کے واقعات کو اپنے قلم سے بیان کرنا کا فن جمیل آذر کے پاس ہیں۔ ان کے انشائیہ "برساتی" کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ معاشرے کے کلرک کی بدحالی اور مالی حالات کے ساتھ معاشرے کی بے بسی کو کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان مسائل کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ راولپنڈی جیسے بڑے شہر میں زیادہ

بارشوں کی وجہ سے برساتی کا ہونا ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ دفتر جاتے ہوئے بارش میں بھیگ جانا برساتی کی اہمیت میں اضافے کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہاں پر ایک بے حس کرنل کا ناکارہ برساتی کو دھوکے سے کلرک کو فروخت کرنا اس معاشرے کی صحیح معنی میں ترجمانی ہے۔ بارش میں برساتی کے باوجود گھر پہنچنے پر کلرک کی تصویر کچھ یوں پیش کی ہے:

"انگیٹھی میں آگ دہک رہی تھی۔ نزدیک پہنچ کر برساتی اتار دی۔ کپڑے بالکل گیلے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کرنل ٹیلر نہیں یہ برساتی کیوں بیچی تھی۔ اس میں تو جان ہی نہیں تھی پانی اندر رس آیا تھا۔ واٹر پروف کی گارنٹی جواب دے چکی تھی۔ برساتی کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔"[۳۶]

جمیل آذر نے سماج کی عکاسی کی ہے۔ یہ دنیا دھوکے باز، فریبی، مطلبی اور بے حس ہے، اس تلخ حقیقت کو سچائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ انسانیت کے مثبت واقعات کو احسن انداز میں بھی بیان کیا ہے۔ اپنے ایک انشائیہ "نیم پلیٹ" میں معاشرے کی ترجمانی یوں کرتے ہیں کہ:

"سائن بورڈ اور نیم پلیٹ میں کوئی زیادہ فرق نہیں، اگر سائن بورڈ ادویات و ملبوسات یا مشروبات کا اشتہار ہے تو نیم پلیٹ صاحب خانہ کی شخصیت اور ذہنیت کا، مقصد دونوں کا ایک ہی ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ کسی کولا کا اشتہار ایک لمبے چوڑے سائن بورڈ پر کسی چوک کی نکڑ یا کسی عظیم اور باوقار بلڈنگ کے اوپر اس طرح لگا ہوتا ہے کہ دن میں ایک میل کے فاصلے سے اور رات کو کئی میل کے فاصلے سے نظر آتا جاتا ہے۔"[۳۷]

سائن بورڈ کی طرف نیم پلیٹ ہر انسان کی شخصیت، کردار اور خامیوں و خوبیوں کو ظاہر کرتی ہے۔ خوبصورت سے خوبصورت ترین نیم پلیٹ انسان کی ذہنی سوچ کی عکاسی کرتی ہے۔ اس طرح انشائیہ "وقت اے وقت" میں گزرتے وقت کے ساتھ ترقی اور تبدیلی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز واقعات رونما ہو رہے ہیں وقت گزرنے کے ساتھ سائنس ترقی کر رہی ہے اور بوسیدہ سڑکوں اور شاہراہوں نے نئی اونچی و بالا عمارات نے لے لی ہے اور گھوڑا گاڑی کی جگہ اب گاڑیاں، رکشے اور ہوائی جہاز آگئے ہیں۔ فکر انسان کو تحریک دیتی ہے پہلی دنیا کے لوگ فکر کرنے کی وجہ سے خوشحالی و کامرانی کی زندگی گزارتے ہیں وہ نئی نئی ایجادات کرتے ہیں۔ آسمانوں پر کمندیں ڈالتے ہیں۔ مصنف انشائیہ "فکری نہ کرو" انسان کی فکر نہ کرنے کے نقصانات بھی بتاتے ہیں کہ تیسری دنیا کے لوگ اسی وجہ سے ترقی نہیں کر پاتے کہ وہ کسی بھی قسم کی فکر کرنے سے

قاصر ہوتے ہیں اور جھینگر کی طرح چیونٹیوں سے مانگنے میں ہی مشغول رہتے ہیں۔ اس طرح مصنف انشائیہ "شاید برومائیڈ ہوں" میں مصنف شہری زندگی اور دیہاتی زندگی کے بارے میں بتاتے ہیں۔

"شہری زندگی ہمیں ہر لمحہ عدم مساوات، تفاخر بے جا، حسد و بغض، تعیش پسندی، نفس پرستی، کمزوری ایمان و ایقان اور غلامی کی دلدل میں دھکیلتی چلی جاتی ہے۔ فطرت ہمیں مشینی زندگی کی غلامی اور یکسانیت کی یبوست سے نجات دلا کر آزاد اور حسب منشا زندگی گزارنے کا دلآویز سبق دیتی ہے شہری زندگی آمریت اور جبریت کی علامت ہے۔ دیہی زندگی ہمیں فطرت کے قریب کر کے فطری انسان بناتی ہے۔"[۳۸]

مصنف انشائیہ دعوت ولیمہ، اشتہار زدہ دیواریں، بدل جاتے ہیں لوگ / شادی کے بعد!، کتابوں کو دوستوں سے بچاؤ، مہربان کیسے کیسے بھیک مانگنے والے، تیرے جانثاروں کو سلام، واشنگ مشین، جنگ کرنا، کچھ فیشن پر، غیر معروف شہری، آرٹس سٹوڈنٹس، نشہ، ہائیڈ پارک، جن، مسٹر رائٹ مین، شمولیت، عظیم نشر گاہ وغیرہ میں وافر مقدار میں سماجی پہلو پر لکھتے ہیں۔

تاہم جمیل آذر نے اپنی تحریروں میں اس طرح کے سماجی موضوعات کو زیر بحث لا کر خوبصورت انداز میں کاری کے سامنے رکھ دیا ہے۔ یہ تحریریں سماج اور معاشرے کے گرد گردش کرنے والی کہانیاں ہیں۔ جو سچائی اور حقیقت پر مبنی ہیں۔

۵۔ اکبر حمیدی کے انشائیوں کا سماجی جائزہ:

اکبر حمیدی کا مشاہدہ اور تجربہ گہرا اور نظر عمیق ہے۔ وہ بات سے بات پیدا کرنے کے ماہر اور مسائل و واقعات کو الفاظ کے جال میں قید کرنے کے فن سے مالامال ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑھتے ہوئے گہری فکری اور فلسفیانہ موشگافیوں کوئی تک کرتے ہوئے سماج کے موضوعات پر اپنے خیالات قلمبند کرتے ہیں۔ اختصار الفاظ کے ساتھ جامع مضمون بیان کرنے کا فن ان کے پاس ہے۔ سماجی موضوعات پر مشاہدات و تجربات کی روشنی میں تحریریں تحریر کرتے ہیں۔ سماج اور معاشرے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ سماج اور معاشرے کی بدلتی ہوئی تہذیب کے بارے میں انشائیہ "پھولوں میں گرا کانٹا" میں یوں بیان کرتے ہیں:

"ہم ایک پابند اور محصور روایات کے معاشرے میں رہنے کے عادی ہو گئے۔ ہماری اخلاقیات اگرچہ کچھ کچھ تبدیل ہو رہی ہیں۔۔۔۔۔ مگر یہ تبدیلی کسی فکری تبدیلی کے باعث نہیں ہو رہی ہے بلکہ دوسری تہذیبوں کے زیر اثر ہے۔۔۔۔۔۔ یہاں بھی۔۔۔۔ دوسری

تہذیبوں کے اثرات قبول کرنے میں ہماری سوچ بچار اور غور و فکر کو دخل حاصل نہیں بلکہ معقولات اور منقولات کو قبول کرنے کی طرح یہ قبولیت بھی ذہنی طور پر دوسروں کے زیر اثر آجانے کی وجہ سے ہے۔"[۳۹۹]

اکبر حمیدی نے ایک تہذیب پر دوسری تہذیب کے اثرات کو بیان کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض کے اثرات کم اور بعض کے زیادہ ہیں۔ یہی اثرات سماج کے بدلتے رنگ اور رویے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اسی طرح سماجی موضوعات میں منفی اور مثبت رویوں کو اپنانے اور چھوڑنے کی وجوہات پر اپنے خیالات و افکار کو تجربات و مشاہدات کی روشنی میں بیان کیا جاتا ہے۔ یہ عادات بھی ایک تہذیب کے دوسری تہذیب سے اثرات قبول کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ منفی عادات کیوں پیدا ہوتی ہیں؟ مثبت عادات کو سماج کے افراد کیوں اختیار کرنے سے قاصر ہیں؟ اس طرح کے سوالات کے جوابات میں بھی اکبر حمیدی جوابات تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"گالی دینے والے کو باہر لوگ بد اخلاق، اجڈ اور غنڈہ خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ ذمہ داری تو اس شخص، اس ماحول، اس سماج پر عائد ہوتی ہے، جس نے اسے گالی سکھائی اور پھر گالی دینے پر مجبور کر دیا۔ گالی دینے والا تو ظلم اور ناانصافی کے سامنے سپر انداز نہ ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔ گالی دینے والا ظالم اور منافق معاشرے کے نام ایک مجسم گالی ہے۔"[۴۰۰]

اکبر حمیدی نے اس معاشرے اور سماج میں منفی جذبوں اور رویوں کی نشاندہی کی ہے تو اس کی وجوہات کو تلاش کر کے اس کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح مثبت جذبوں کی حوصلہ افزائی کے لیے تعریفی کلمات کو اختیار کیا ہے۔ اکبر حمیدی نے سماجی جہت کے موضوعات کو چن چن کر اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سماجی موضوعات پر ان کا قلم سماج کی سچائی اور حقیقت پر مبنی حقائق بیان کرتا ہے۔

۶۔ مشکور حسین یاد کے انشائیوں کا سماجی جائزہ:

مشکور حسین یاد کے انشائیہ مجموعہ "بات کی اونچی ذات" میں سماجی موضوعات کی بھرمار ہے۔ ان کے اس مجموعے میں سماجی موضوعات پر مبنی انشائیے "خوبصورت لوگ، انکسار کے آسمان، سچ کا ذائقہ، اچھا زمانہ، تخت سلطنت، بنی نوع آدم کا شرف، ایفائے عہد، خوف اور جائے پناہ ہیں۔ جن میں سماجی موضوعات کے ساتھ فلسفیانہ اور نفسیاتی پہلوؤں کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ عالی ظرفی اور شرافت سماجی رویوں کے دو مثبت پہلو ہیں اور ان کا آپس میں

چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشکور حسین یاد کے موضوعات میں سماجی اور فلسفیانہ انداز زیادہ ہے۔ جہاں ہم عالی ظرفی کی بات کر رہے ہیں وہاں پر ان کے انشائیہ ''خود غرضی'' کا جائزہ لینا بھی اشد ضروری ہے۔ انشائیہ نگار نے اس خود غرضی کو ایمان کا اصل اصول قرار دیا ہے۔ خود غرضی ایک پیاس ہے، اس پیاس کی تشنگی کبھی نہ ختم ہونے والی ہے۔ اس انشائیہ میں منفرد انداز تحریر اور مفکرانہ افکار سے خود غرضی کو مثبت انداز میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ یہ خود غرضی ہی اس کی اصل طاقت ہے۔ اس کی بدولت ہی وہ اپنی منزلیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار نے دور جدید کے انسان کی خود غرضی کی منظر کشی کچھ یوں بیان کی ہے:

> ''عہد جدید کہ انسان کی سب سے بڑی مصیبت یہی ہے کہ وہ خود غرض نہیں رہا، خود غرضی ہوش و حواس ٹھکانے لگائے رکھتی ہے اور آج کا انسان بد حواس بھی ہے اور گھبرایا ہوا بھی۔ اس کے ہوش و حواس قائم نہیں رہے، وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے بوکھلاہٹ میں کر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ سے خود غرضی کا دامن کیا چھوٹا وہ بری طرح بے مایہ اور بے سہارا ہو کر رہ گیا ہے۔''[۴۱]

سماجی رویوں پر مشتمل موضوعات میں فلسفیانہ اور مفکرانہ انداز، معاشرتی موضوعات پر کائنات و حیات کے فلسفے بیان کرنا مشکور حسین یاد کے فنی محاسن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ بے معنی اور بے عنوان کیفیتوں کو زبان دینے کے ماہر ہیں۔ سنجیدگی اور فلسفیانہ جہتوں کے ذریعے اپنے موضوعات میں اخلاقی رنگ بھرتے ہیں۔ بعض دفعہ سنجیدگی اور توجہ مبذول کروانے کی کوشش سے بوجھل پن محسوس ہوتا ہے مگر ان کے موضوعات پر اس کا اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔

اس طرح انشائیہ ''اطمینان'' میں ترقی یافتہ معاشرے کے بارے میں کہتے ہیں کہ ترقی یافتہ معاشرہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے اور مطمئن اور پُرسکون ہوتا ہے اور جو معاشرہ جمود کا شکار ہوتا ہے سستی اور کاہلہ ان کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے وہ ہمیشہ غربت اور معاشرے کی دوسری برائیاں چوری، ڈکیتی اور راہزنی وغیرہ کی مرتکب ہوتی ہیں۔

معاشرے میں دو طرح کے پہلو پائے جاتے ہیں اچھائی اور برائی، خیر و شر، نیکی و بدی مگر بنی نوع انسان نے انسانیت اور آدمیت کو اپنانے کی بجائے برائی، شر اور بدی کا ساتھ زیادہ دیا ہے جس سے معاشرے میں اچھائی مفقود نظر آتی ہے اور دھیرے دھیرے انسانیت خطرے میں گھیرتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ انسانی معاشرے میں انسان کا کردار بہت اہمیت رکھتا ہے اور اگر انسان کا مضبوط کردار ہو تو ایسا معاشرہ ہی ترقی کرتا ہے اور

ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے اور اسی مضبوط کردار کی وجہ سے معاشرے کے کردار پر ضلال و جمال جیسی صفات آشکار ہوتی ہیں۔

انسان کو معاشرے میں زندہ رہنے کے لیے کچھ انسانی رویے اپنانے پڑتے ہیں اسی رویے میں سے ایک منافقت ہے اور آج کل معاشرے میں منافقت عام ہو چکی ہے اور ہماری تہذیب منافق رویے سے ہی ترقی کر رہی ہے اور اس وجہ سے معاشرے میں اخلاقی اقدار آہستہ آہستہ غائب ہو رہی ہیں۔

> "بے چارے انسان نے یہ گُر اپنے ضمیر کو بصد مشکل ٹھنڈی، میٹھی نیند سُلا کر حاصل کیا ہے، آپ اسے منافقت کا نام دے کر بنی نوع آدم کے سب کیے دھرے پر کیوں پانی پھیر دینا چاہتے ہیں۔ آج کی ساری تہذیب سارے بین الاقوامی ادارے، سارے کاروبار، ساری ترقیاں محض اس گُر پر کاربند رہنے سے قائم ہیں۔ اگر انسان اس گُر کا استعمال ترک کر دے تو چشم زدن میں تمام رونقیں تباہ و برباد ہو جائیں۔"[۴۲]

سماجی رویوں پر اخلاقی درس جیسے موضوعات کی ادب کو اشد ضرورت ہے۔ جس سے مثبت رویوں کی طرف سفر جاری و ساری رہے، اس مجموعہ کے ایک انشائیہ "فتح و شکست" میں فتح و شکست پر بے شمار دلائل اور مثالوں کے ساتھ اخلاقی درس جابجا ملتا ہے۔ اس انشائیے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو: "شکست یا ہار کسی نوعیت کی کیوں نہ ہو اس میں آدمی کو ندامت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔۔۔ اور۔۔۔ کسی شخص کو ندامت کی زد میں آئے ہوئے دیکھنا ہے۔ میرے خیال میں کسی انسان کے بس کا روگ نہیں، کم از کم میں کسی کو اپنے سامنے نادم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔"[۴۳]

تاہم مشکور حسین کے ہاں جابجا سماجی رویے اور سماج کی برائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں وہ معاشرے میں پنپتی برائیوں کو اپنی تخلیقات سے مٹانا چاہتے ہیں اور معاشرے معاشرے کا گہرا جائزہ لیتے ہیں۔

۷۔ نظیر احمد صدیقی کے انشائیوں کا سماجی جائزہ:

کوئی بھی انشائیہ نگار اپنے فن میں عقل و شعور کی منزلوں کو ناسمجھی اور لاشعوری کے راستے سے طے کرتا ہے۔ انشائیہ میں عقل و فہم کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگاری کی حماقتوں کا تذکرہ بھی پایا جاتا ہے۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں میں سماج، معاشرت اور رسومات کا تذکرہ عام ہے۔ انہوں نے اپنے طرز بیاں میں ملکی و غیر ملکی سماج کا تذکرہ بہت عمدہ انداز میں کیا ہے اور اس سماج میں پائے جانے والے کئی کردار بھی ایسے پائے جاتے ہیں کہ جن سے

مصنف کا سماجی شعور سامنے آتا ہے۔ کوئی بھی فرد واحد جس معاشرے کا حصہ ہوتا ہے۔ اس معاشرے کے تمام افعال میں اس کی شمولیت کا موجود ہونا لازمی ہے اور ایک مصنف اپنے ماحول اور اپنے سماج میں ہونے والے تمام تاثرات کو اپنے فن کا حصہ بنالیتا ہے۔

نظیر صدیقی نے اپنے معاشرے میں پائے جانے والے تمام عناصر کو اپنے انشائیوں کا حصہ بنایا ہے اور اپنے سماج کے تمام تر مقاصد اور عوامل کو انشائیہ میں شامل کر کے انشائیے میں وسعت پیدا کی ہے۔ انہوں نے اپنے انشائیوں میں معاشرے کے چند عناصر کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ جیسے کسی نے خوبصورت منظر کو پیش کیا ہو اور اس منظر کشی کا عالم یوں بیان کیا جاتا ہے جیسے قاری خود اس معاشرے کا حصہ ہو۔ انہوں نے اپنے انشائیوں کے مجموعہ ''شہرت کی خاطر'' کے پہلے انشائیہ ''جہاں میں رہتا ہوں'' میں معاشرے کے بارے میں یوں بیان کیا ہے کہ:

> ''جہاں میں رہتا ہوں وہاں شرفا، پولیس اور عدالت دونوں سے خائف رہتے ہیں حالانکہ پولیس اور عدالت سے خائف رہنا جرائم پیشہ لوگوں کا حق ہے لیکن یہاں جرائم کی سرپرستی یا تو پولیس کرتی ہے یا عدالت۔ یہاں کی پولیس اور عدالت میں فرق صرف اتنا ہے کہ پولیس والے جرائم پیشہ لوگوں سے دوستانہ، مخلصانہ اور برادرانہ تعلقات رکھتے ہیں اور عدالت کے عملے خود ہی جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔''[۴۴]

نظیر صدیقی نے سماج کے عوامل کو اپنے انشائیے میں نہایت احسن انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

اس طرح انشائیہ ''بور'' میں بھی نظیر صدیقی لوگوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں جو خود بوریت کا شکار ہوتے ہیں لیکن اس کا الزام دوسرے پر دھرتے ہیں ہمارے معاشرے میں بوریت سے فائدہ بھی اٹھایا جاتا ہے اور اس کے لیے مختلف طریقے بھی اپنائے جاتے ہیں بور ہونے کی کچھ خاص شرائط نہیں ہیں اگرچہ یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ بور ہونے والا خود بور ہوتا ہے یا انہیں بور کیا جاتا ہے بور ہونے کی وجہ کوئی بھی ہو سکتی ہے جیسے محبت، حماقت، صورت، سیرت، سادہ لوحی، چالاکی، سادگی، اخلاق، تکلف، اُصولی، بے اصولی، مذاق، کم علمی یا لاعلمی وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح انشائیہ میں مصنف شادی کے نقصانات اور فوائد کو زیر بحث لاتے ہیں اور جہیز جیسی لعنت کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ انشائیہ ''یہ انسان'' میں انسان کو موضوع بحث بنایا گیا ہے کہ انسان آغاز سے ہی خود فریبی میں مبتلا رہا ہے اور خدا پرست واقع ہوا ہے انسان کی صفت اور کمزوری و کوتاہی یہ ہے کہ وہ خدا کے وجود اور عدم وجود کو ثابت نہیں کر سکا انسان کی آفاقی خوبی یہ ہے کہ انسان بڑھاپے میں پرہیز گار ہو جاتا ہے جوانی میں کھلنڈرا اور عیاشی کرتا ہے اگر انسان کی تاریخ کی طرف نظر دوڑائیں تو انسان حماقت اور جراءت کی طرف مائل رہا ہے انسان کو ایسی فطرت ودیعت

کی گئی ہے کہ وہ حق و باطل کے جھگڑوں میں جھگڑا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ "امتحان گاہ" میں مصنف ہمارے ملک کے طلباء سے لیے جانے والے ت امتحان اور اس دوران آنے والی مشکلات کو زیر بحث لاتے ہیں۔ نظیر صدیقی نے اپنے سماج کے چند ناسور وجوہات کو یوں پیش کیا ہے جیسے معاشرے کا ان کے بغیر گزارا ممکن نہیں ہے۔ کوئی مصنف اگر معاشرے میں رہتا ہو اور اس کی تاثیر کو اپنے اندر جذب نہ کرتا ہو تو یہ اس کی خامیوں میں تصور کیا جاتا ہے۔ معاشرے میں سماجی انقلاب کو اپنے فن کا حصہ بنانا فنکارانہ صلاحیت ہوتی ہے اور انھوں نے ادیب کو معاشرے کے ساتھ منتقلی اور منسلک ہونے کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے معاشرے کے چند غیر معیاری عوامل کو اپنے انشائیہ "مستقبل کا ادیب" میں سماجی ابہام کو یوں بیان کیا ہے کہ:

> " جس ملک کو معاشرے میں رشوت ستائی، منافع خوری، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، اسمگلنگ اور اسی قبیل کے دوسرے کام مفید ثابت ہوتے ہوں اور مقبول بھی۔ اس حد تک مقبول کے وزرائے کابینہ تک نے ان کاموں کو اپنا محبوب مشغلہ بنالیا تھا وہاں ادیب بننے کی ہوس یا حماقت کیا معنی۔ "[۴۵]

نظیر صدیقی ایک ایسے مصنف ظاہر ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے سماج میں موجود چیدہ چیدہ ایسے عناصر کو بیان کیا ہے جو معاشرے کا حصہ تو ہیں لیکن ان کا وجود معاشرے میں اعتدال اور ترقی و کامیابی کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے انشائیوں میں معاشرت کی تمام عناصر کو اس انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے جس کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ وہ سماج میں پائے جانے والے تمام ان عناصر کو بھی بیان کرتے ہیں جو معاشرے میں ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

۸۔ صلاح الدین حیدر کے انشائیوں کا سماجی جائزہ:

انسان انکشاف ذات میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کرتا ہے تو اسی طرح سماج اور معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں پر کڑی نظر رکھتا ہے۔ یہ تبدیلیاں ظلم و ستم پر مبنی اور یا پھر محبت کی داستانیں، مرد کی عورت پر ظلم و ستم کی کہانی ہو یا امیر طبقے کی غریب عوام کے حقوق پر ڈاکہ کی داستان، الغرض سماج اور معاشرے میں ہونے والی سرگرمیوں کو محسوس کرتا ہے۔ ادیب و شاعر حضرات ان سرگرمیوں کو الفاظ کی مدد سے بیان کرتے ہیں۔ صلاح الدین حیدر نے بھی سماجی جہد کے اکثر موضوعات کو بیان کیا ہے۔ سماج اور معاشرے میں افراد کے مختلف رویوں اور ذمہ داریوں کے بارے میں ایک تصویر اپنے انشائیہ "نشئی" میں یوں کھینچتے ہیں:

"نشئے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ جن کے بغیر نشہ کاروں کا گزارا نہیں ہوتا۔ نشئی بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں، جن کا بوجھ شرفا سے لبریز معاشرے کو گوارا نہیں ہوتا۔ لیکن نشئی پیدا ہوتے رہے ہیں اور پیدا ہوتے رہیں گے اور انہیں سرزنش کرنیوالے اور اصلاح کا راستہ دکھانے والے بھی اپنی معاشرتی اور ناصحانہ ذمہ داریوں کو بروئے کار لاتے رہیں گے۔ ذمہ داریاں جہاں بھی آجائیں نشہ ہرن ہو جاتا ہے اس لیے مجھے نشئیوں سے ہمدردی ہے۔"[۴۶]

نشئی اور بے روزگار افراد ہمارے معاشرے کا حصہ ہیں۔ ان کی فلاح و بہبود کے لیے ہمدرد اور ذمہ دار افراد کو آگے بڑھ کر ان کا سہارا بننا چاہیے بلکہ بنتے بھی ہیں۔ مگر اس میں اضافے کی اشد ضرورت ہے۔ صلاح الدین حیدر نے اپنی تحریروں سے سماج کے بااثر افراد کی اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔

انشائیہ "باتیں نیند اور خوابوں کی" میں مصنف ہمارے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں کہ انسان تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے اور انسان نے دنیا کو تباہ و برباد کرنے کے لیے ایٹمی اسلحہ کے ذخائر لگا لیے ہیں تا کہ ایک ملک دوسرے ملک سے جیت سکے اور دوسرے ملک کا چین و سکون برباد کیا جا سکے اقوام متحدہ کو دنیا میں امن و سکون قائم رکھنے کے لیے اقدام اٹھانے چاہئیں۔

صلاح الدین انشائیہ "تذکرہ دربار کا" میں ہمارے تعلیمی نظام کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں کہ اساتذہ اپنے علم پر پورا عبور نہیں رکھتے اور طلب کو علم سکھانے کی بجائے وقت گزاری ہی کرتے ہیں۔ اس طرح صلاح الدین حیدر کلرکوں کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں کہ ہر کلرک اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے اور وہ بس اپنی آفس کی فائیلوں سے کھیلنا ہی جانتا ہے۔

صلاح الدین حیدر کے انشائیوں میں طنز کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ صلاح الدین حیدر اپنے موضوع پر قائم رہتے ہوئے معاشرے کی کئی برائیوں اور گھناؤنے جرائم کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں انشائیہ "حماقتیں میرے مقدر کی" حماقت کے بارے میں اپنا نقطہ نظر واضح کرتے ہیں کہ بعض دفعہ لوگ دوسروں کی تکلیف دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اس لیے دوسروں کو اپنے دکھ میں شریک کرنا سراسر اکثر حماقت ثابت ہوتا ہے بعض دفعہ لوگ اپنے آپ کو پوری زندگی دانا اور عقلمند سمجھتے ہیں لیکن دفعتاً وہ اپنے آپ کو احمق سمجھ بیٹھتے ہیں اور بعض پوری زندگی اپنے آپ کو عقلمند سمجھتے رہتے ہیں مگر اچانک احمق ثابت ہوتے ہیں اور بعض اپنی پوری زندگی تذبذب کا شکار رہتے ہیں کہ وہ کتنے فیصد عقلمند ہیں اور کتنے فیصد بے وقوف ہیں۔ صلاح الدین حیدر انشائیہ "قصہ ضمیر فروشی کا" میں تلخ

حقائق کو بیان کرتے ہیں کہ انسان ہمیشہ اپنا ضمیر بیچنے کے درپے ہوتا ہے اور ضمیر بیچنے کے علاوہ انسان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوتا کیونکہ انسان اکثر اوقات جھوٹ کا سہارا لیتا ہے تو گویا وہ اپنا ضمیر بیچ دیتا ہے اس طرح معاشرے کی بہت سی برائیاں ہیں جہاں کبھی نہ ک ھی اپنا ضمیر بیچ دیتا ہے۔

انشائیہ ''تذکرہ بربادی کا'' میں مصنف ان لوگوں پر طنز کرتے ہیں جو لوگ دوسروں کو لمبی لمبی تقریریں سنا سنا کر وقت برباد کرتے ہیں۔ تاہم ''قصہ جھگڑالو کا'' میں صلاح الدین حیدر انسانی زندگی میں بارہا ہونے والے جھگڑے کو موضوعِ گفتگو بناتے ہیں اور جھگڑا کرنے کی وجوہات بھی بتاتے ہیں تاہم انسانی تاریخ کی ابتداء ہی جھگڑے سے ہوتی ہے اور جھگڑا ہماری کلاسیکی روایت کا حصہ ہے جب انسان کے جذبات عقل پر غالب آ جائیں تو جھگڑے کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا۔ انسان کے دو قسم کے جھگڑے ہوتے ہیں ایک جسمانی اور دوسرا علمی۔ اس طرح اگر جھگڑا ختم کروانے والے نموقعے پر موجود نہ ہوں تو تو یہ جھگڑا دنگا فساد میں بدل جاتا ہے جس کی وسیع شکل جنگ ہے اور داخلی شکل خانہ جنگی ہے۔

صلاح الدین حیدر نے سماج کے منفی پہلوؤں پر تبادلہ خیال کیا ہے۔ منفی پہلوؤں پر اظہار خیال کرنا آسان مرحلہ ہے مگر اصلاحی انداز میں منفی پہلوؤں سے اس کی اصلاح کی کوشش ایک اچھے اور بہترین ادیب کی خوبی ہے۔ قاری کو تحریر پڑھتے ہوئے ادیب کے ان پہلوؤں پر غور و فکر کرنا چاہیے۔ صلاح الدین حیدر کے انشائیے "بیان منافقت کا" میں منافقت کے حوالے سے سماج کے افراد کے بارے کچھ قلمبند کرتے ہیں:

> ''ویسے بھی ہمارے عوام جس کے جنازے کو کندھا دیتے ہیں۔ اس کی میت پر رواں تبصرہ کرنا نہیں بھولتے۔ بھلا کون مرنے والا چاہتا ہو گا کہ اس کی میت پر اس کی مرضی کے خلاف تبصرہ ہو، اور کون ادیب یہ چاہتا ہو گا کہ اس کی کتاب کو پڑھے بغیر تبصرہ ہو۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہوتا ہے اور ظاہر ہے اسی صورت میں منافقت کی پروان چڑھ سکتی ہے۔''[۴۷]

صلاح الدین حیدر نے سماجی پہلوؤں اور موضوعات کو اصلاحی انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں وہ کامیاب و کامران نظر آتے ہیں۔

۹۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر کے انشائیوں کا سماجی جائزہ:

ڈاکٹر شہزاد قیصر کے انشائیوں کا مجموعہ ''لطف آگہی'' تین الگ الگ مجموعوں کا مشترکہ مجموعہ ہے۔ جس میں مصنف کے تین انشائی مجموعے ''کلیرنس سیل''، ''صاف چھپتے بھی نہیں'' اور ''آئینہ بنے ہے پیرہن'' شامل ہیں۔ دبستان لاہور کے اس انشائیہ نگار کا موضوعاتی مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان کے تینوں

مجموعوں کے موضوعات میں سماجی پہلو کے حوالے موجود ہیں۔ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس مجموعے کے انشائیوں میں "کہتے ہیں جس کو عشق"، "ماہر نفسیات"، "توہمات"، "ہیلو ہیلو"، "کلیر نس سیل"، "چڑیا گھر کے باسی" اور "قرض کے پیتے تھے مے" شامل ہیں۔ان کے انشائیوں میں فلسفیانہ خیالات و افکار، کائناتی مسائل اور غور و فکر کی مختلف راہیں موجود ہیں۔ان میں فلسفیانہ جہات کے موضوعات کی اہم وجہ انگریزی ادب سے لگاؤ تھا۔ڈاکٹر شہزاد قیصر نے اردو ادب کے ساتھ پنجابی اور انگریزی میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ مغرب اور انگریزی ادب میں اکثریتی شاعر اور نثر نگار فلسفیانہ سماجی خیالات و افکار کے مالک ہوتے ہیں۔کلیر نس سیل کے مجموعے کے آخری انشائیہ "قرض کی پیتے ہیں مے" میں سماجی انداز اختیار کیا گیا ہے۔انہوں نے انشائیے کے شروع یا آخر میں فلسفیانہ انداز گفتگو کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ضرورت کے تحت انشائیے کے کسی بھی مقام پر فلسفیانہ انداز اپنا کر موضوع کو نکھارا ہے۔اس انشائیہ میں نمونہ ملاحظہ ہو:

> "قرض ایک ایسی معاشرتی حقیقت ہے جس کا اس جہاں میں کوئی منکر نہیں، البتہ نکیر ضرور دیکھنے میں آتے ہیں۔وہ پہلا شخص بہت خوش نصیب ہو گا جس نے قرضہ مانگا اور اسے فوراً مل گیا، اب تو قرض مانگنا ایک آرٹ بن چکا ہے اور اس رقم کو واپس لینا ایک مکمل سائنس، مقروض اور قرض خواہ ندی کے دو کنارے ہیں۔ ادھار کی رقم ندی کا پانی ہے جو اکثر خشک رہتا ہے۔"[۴۸]

واقعی قرض ایک معاشرتی حقیقت ہے جو ایک لعنت کی شکل اختیار کر چکی ہے جیسے شراب پی کر دوبارہ واپس نہیں آ سکتی ہے۔اسی طرح مقروض بھی قرض کی شراب پی کر بھول جاتا ہے کہ اس کو قرض واپس بھی کرنا ہے۔اس اقتباس میں غور و فکر بھی موجود ہے اور کائنات مسائل کا وجود بھی۔ ہمیں ایسی لعنت سے چھٹکارا کیسے مل سکتا ہے یا اس حقیقت کو مثبت معنوں کے مطابق استعمال کیسے کیا جا سکتا ہے؟ ایسے موضوعات پر قلم اٹھانا اور خیالات و افکار کو بیان کرنا ایک فن ہے اور شہزاد قیصر اس فن سے مالا مال ہیں۔

۱۰۔ارشد میر کے انشائیوں کا سماجی جائزہ:

ارشد میر کا شمار ان انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے جو صاحب کتاب نہ ہو کر بھی صنف انشائیہ میں تخلیقی کام کر گئے ہیں۔ ان کا اسلوب ہی ان کی پہچان بنا چند ادبی رسائل میں شامل تحریروں سے ان کے انشائی اسلوب کا اندازہ ہوتا ہے۔ ارشد میر کا اسلوب سادہ اور آسان ہے۔وہ زندگی کے موضوعات پر اپنے خیالات اور افکار کا اظہار کرتے

ہیں۔وہ نظر سے اوجل زندگی کے موضوعات کے گوشوں کو بے نقاب کرتے ہوئے طنز ومزاح کے اسلوب میں اپنا مدعا بیان کر جاتے ہیں۔ ان کے ہاں انشائیہ نگاری کی تمام خوبیاں ملتی ہیں۔ ان کے موضوعات سماج اور معاشرے سے جنم لیتے ہیں۔ ان کے انشائیہ " دھوتی" میں سماجی مطالعے کی گہری جھلک دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے سماجی موضوعات جیسے دھوتی ،دوپٹہ ،تولیہ ،ٹوپی ، آنسو، گنااور دروازہ پر انشائیہ لکھ کر سماج ومعاشرے کی ترجمانی کی ہے۔ انہوں نے ایسے سادہ اور عام سے موضوعات پر مدبر اور پختہ دلائل کے ساتھ کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ دھوتی نام سن کر بڑا عجیب وغریب لگتا ہے مگر اس کی اہمیت وافادیت پر ان کے نظریات دل کو چھو لیتے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ کریں:

> "دھوتی کی عظمت کا میں ہی معترف نہیں ہوں، اس کے پرستاروں میں کئی نامور شخصیات اور صف اول کے قائدین بھی شامل ہیں۔ اس سلسلہ میں علامہ اقبال کی زیر مثال ہمارے سامنے ہے جنہوں نے یورپ کی زمستانی ہواؤں میں نہ تو آداب سحری سے کنارہ کشی اختیار کی اور نہ دھوتی کو فارغ خطی قرار دینے پر آمادہ ہوئے بلکہ اس قومی لباس کے فروغ کے لیے کمربستہ رہے۔ یوں اگر دھوتی کو کمربستہ کا اعزازی نام بھی دے دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ ہر لحاظ سے موزوں بھی ہے۔"[۴۹]

دھوتی ہمارے معاشرے میں لباس کا ایک حصہ ہے بلکہ دیہاتی لوگ اس کو پہن کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ پاکستان بھارت سمیت اکثر ممالک میں اس کو قومی لباس کی حیثیت بھی حاصل رہی ہے۔ پنجاب میں اس کو فخر سے زیب تن کیا جاتا ہے۔ مصنف معاشرے کی برائیوں پر بھی قلم اٹھاتے ہیں جھوٹ، بغض ،منافقت اس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے مصنف انشائیہ آنسو میں منافقت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "انسانی زندگی میں منافقت روز اول سے لے کر آج تک کسی نہ کسی صورت میں موجود رہی ہے۔ کیونکہ یہ انسانی سرشت میں کسی نہ کسی روپ میں موجود رہتی ہے۔ یہ علیحدٰہ بات ہے کہ بعض لوگ اپنی اعلیٰ انسانی اقدار کی وجہ سے اسے پنپنے کے مواقع فراہم نہیں ہونے دیتے یا اپنی خداداد حکمت عملی سے اسے قابو میں رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، لیکن کوئی مانے یا نی مانے فی زمانہ منافقت پورے شباب اور جوبن پر ہے کوئی شعبہ حیات اس کی گرفت سے آزاد نہیں۔"[۵۰]

ارشد میر کے سماجی موضوعات پر پختہ دلائل ان کے وسیع مطالعے کی پختہ دلیل ہے۔ سادہ اور عجیب و غریب موضوعات کو چن چن کر زیر بحث لانا، مدلل انداز گفتگو سے خیالات وہ افکار کے انبار کا ذخیرہ اور طنز و مزاح کو فروغ دینا ارشد میر کے فن کا ایسا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جس نے ان کو نامور انشائیہ نگاروں کے مد مقابل کھڑا کیا ہے۔ ان کا انداز بیان جاندار اور موضوع سے مطابقت رکھتا ہے۔ ان کے الفاظ موضوع سے اس قدر جڑے ہوئے ہیں کہ اس کے احساس اور کیفیت کے فکری عناصر سے ایک ایسا امتزاج ابھرتا ہے۔ جو قاری کی سوچ کو متاثر کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے۔ ان کی اشیاء کے دیکھنے کا نقطہ نظر بہت مختلف ہیں۔ ان کی نظر اس شے کا مکمل احاطہ کرتے ہوئے ایک موضوع کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

د۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا ادبی تقابل:

ا۔ وزیر آغا کے انشائیوں کا ادبی جائزہ:

وزیر آغا ایک انشائیہ نگار کے ساتھ ایک اچھے اور اعلیٰ پایہ کے نقاد بھی ہیں۔ وہ بڑی اچھی طرح سے انشائیہ کے مزاج کو سمجھتے ہیں۔ ان کی تحریریں انشائیہ کے معیار کی وجہ بنی تو تو دوسری طرف ادب کے فروغ میں اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔ انہوں نے ادب کے فروغ کے لیے ادبی جہت کے موضوعات کو انشائیہ تحریروں میں زینت دی ہے۔ اس لحاظ سے وزیر آغا کا نام متحرک اور منفرد شخصیت کا حامل ہے۔

وزیر آغا نے انشائیہ میں حسب ضرورت شعر، انگریزی اور فارسی الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ اردو کے ساتھ دوسرے ادب کے ساتھ موازنہ اور تقابل انشائیہ میں الگ ہی جان ڈالتا ہے۔ شعراء و ادباء کی مثالیں اور واقعات کو وقتاً فوقتاً بیان کرنے سے ادبی جہت کو فروغ ملتا ہے۔ شعراء کی شاعری کی خصوصیات اور خامیاں، ادیب کی صنف کا انداز بیاں اور اسلوب پر اپنا نظریہ پیش کرنے سے ادبی جہت کی پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ شعراء کے سوچنے کے انداز پر وزیر آغا کے خیالات ان کے انشائیہ "ڈبویا مجھ کو ہونے نے" میں کچھ یوں کرتے ہیں:

> "غالب مسکرا کر کہتا ہے۔۔۔۔ یار! دیکھ ہی زندگی کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ میں تو یا وہ۔۔۔۔۔۔ سب موم کے پتلے ہیں۔ موم کے پتلے ہیں۔ موم کے پتوں کی لاف زنی یعنی چہ؟۔ اس لیے اے میرے پیارے دوست! مسکرا، دیکھ کسی نے ہم سے مذاق کیا ہے کیوں نہ ہم بھی اس سے مذاق کریں؟۔ مگر اقبال اس طرح نہیں سوچتا۔ وہ بے حد سنجیدہ ہے۔ اس کے سامنے ایک عظیم مقصد ہے۔ وہ کہتا ہے۔۔۔۔ دیکھو، تمہیں کیا ہونا چاہیے تھا اور تم کیا ہو۔ اٹھو! اٹھو! کچھ بن جاؤ۔ اپنی شخصیت کی تعمیر کرو۔"[51]

وزیر آغا کے مندرجہ بالا اقتباس کے دو شعراء کی سوچ اور مقصدیت شاعری کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غالب طنز و مزاح کا شاعر ہے۔ ہنس مکھ اور مزاحیہ شاعری کو پسند کرتے ہیں۔ بلکہ اقبال کی شاعری میں اس طرح کے عناصر دور دور تک نہیں ہیں۔ فلسفہ خودی اور بیداری مسلمان کے مقاصد لے کر شاعری کرتے ہیں۔ غالب کی شاعری میں بھی مقصدیت اور تصوف کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس طرح کے موازنہ کرنے سے بھی ادبی جہت کو فروغ ملتا ہے۔ جس میں وزیر آغا نے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔

وزیر آغا کے فن انشائیہ نگاری پر نظر ڈالی جائے تو نہ صرف شعراء و ادباء کے واقعات سامنے آتے ہیں بلکہ آغا صاحب کے تنقیدی اثرات ان کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ ادبی شخصیات کے ساتھ ادبی مباحث اور لسانی مباحث کے نمونے جا بجا ملتے ہیں۔ جن میں وزیر آغا نے کمال مہارت سے ادبی مباحث کو بیان کیا ہے۔

۲۔ غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کا ادبی جائزہ:

غلام جیلانی اصغر نے اپنے خیالات و افکار کے اظہار کے لیے ادب کا سہارا لیا اس طرح ادبی فروغ میں بھی اہم کردار ادا کیا اور پائیدار اور اعلیٰ بصیرت پر مشتمل ادب، ادب کے سپرد کیا۔ ان کی تحریریں سادہ اور آسان، معنی خیز، خوبصورت، ثقافتی و سماجی بصیرت اور ذہنی ارتقاء پر مشتمل ہیں۔ ان کی ادبی تحریروں میں مطالعے کی وسعت، تجربے کی گہرائی اور مشاہدے کی سچائی اور فلسفیانہ سوچ و بچار کی کرنیں جا بجا منعکس ہوتی ہیں۔ ان کی ادبی تحریریں ان کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ اور یہ تصویریں اتنی دلکش، جاذب اور حقیقت افروز ہیں کہ انہیں بار بار پڑھتے ہوئے آنکھوں میں اتارنے کو دل کرتا ہے۔ اردو ادب کی یہ تصویریں ادب کے مختلف موضوعات کی عکاسی کرتے ہوئے جیلانی صاحب کی شخصیت کو متاثر کن بنانے میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔

غلام جیلانی اصغر نے ادب کو بااثر بنانے کے لیے وراثتی ادب کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں وہی ادب دیرپا اور دلکش ہو گا، جو ایک کڑی کی صورت میں نسل در نسل منتقل ہوتا ہے۔ ان کے انشائیہ "وارثت" میں اردو ادب کے حوالے سے کچھ یوں بیان کیا گیا ہے:

> "اردو ادب میں بھی وہی شاعر زیادہ معروف ہوئے، جن کی وراثت میں ادب کے جرثومے موجود تھے۔ جن حضرات نے غیاث اللغات کے سہارے زندہ رہنا چاہا وہ بہت دیر تک زندہ نہ رہ سکے۔ اس لیے جب کبھی کسی معروف ادیب یا شاعر کو پڑھنے کا ارادہ کرتا ہوں تو اس کی تعلیم نظر انداز کر کے اس کی وراثت پر زیادہ توجہ دیتا ہوں۔ کیونکہ یہی وہ سرچشمہ ہے جس سے سارے دریا پھوٹتے ہیں۔"[۵۲]

غلام جیلانی اصغر ادبی جہت کے حوالے سے اپنا منفرد نظریہ رکھتے ہیں۔ اور ان کے پاس اس نظریے پر دلائل کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ ان انشائیوں میں انگریزی الفاظ کا استعمال جا بجا ملتا ہے۔ شعری اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں وقت ضرورت ایک مصرا بھی استعمال کرتے ہیں۔ استعارات و تشبیہات سے تحریر کو پر کشش بنانے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ تقابل اور موازنہ بڑی باریک بینی سے کرتے ہیں۔ اس کے لیے معمولی سے معمولی بات پر غور و فکر کرنا ان کا فن ہے۔ اس حوالے سے ان کا ایک نمونہ انشائیہ "وراثت" میں ملاحظہ ہو:

"اس شعری رقابت یا روایتی ہم آہنگی کی سب سے عمدہ مثال غالب اور ذوق کی ہم عصرانہ چشمک ہے۔ دونوں ایک ہی شہر میں رہتے تھے۔ دونوں لال قلعے سے وابستہ تھے اور دونوں شہنشاہ گردوں وقار سے تقریباً ۳۰ سے ۳۵ روپے تک ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ لیکن اس دانست کے باوجود ایک دوسرے پر چوٹ کرنے کا موقع ضائع نہ کرتے۔ حالانکہ دوسرے شرفا جو دربار سے متعلق تھے اور شعر سے واجبی دلچسپی رکھتے تھے دونوں کو بیک وقت داد دیتے۔"[۵۳]

غلام جیلانی اصغر کی ادبی جہت کے حوالے سے ان کے انشائیوں میں ادب کے مختلف موضوعات ملتے ہیں۔ وراثتی جرثومہ اور شعری رقابت کا موزانہ کے علاوہ بھی موضوعات ملتے ہیں۔ ان کی ادبی جہت کے لیے فکری تجسس اور وجدانی ادراک کا فن بڑی مہارت کا حامل ہے۔ ان کے انشائیے "بستر میں لیٹنا"، "کچھ ریٹائرمنٹ کے بارے میں"، "بچہ اور باپ" اور "گالی دینا" اہل ادب کے لیے بہترین ادبی تحریروں کے نمونے ہیں۔ ان کی ادبی دنیا استدلال و آگہی کے معنی خیز صفحات سے بھری پڑی ہے۔ جس میں ادبی جہت کے بے شمار موضوعات ملتے ہیں جو اردو ادب کے فروغ میں معاون و مددگار ثابت ہو چکے ہیں۔

۳۔ مشتاق قمر کے انشائیوں کا ادبی جائزہ:

مشتاق قمر دبستان سرگودھا کی جانی پہچانی ادبی شخصیت ہے۔ ان کا ادب سے گہرا تعلق ہے۔ ان کے انشائیے ادب میں خصوصی مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ادب میں سماجی، فلسفیانہ اور نفسیاتی جہتوں کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہاں پر ان کا ادبی جہت کے لیے کردار خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے ادبی شخصیات کو خصوصی مقام و مرتبہ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے، ان کے فن اور خیالات کی تعریف کی ہے۔ تنقید کرتے ہوئے اصلاح بھی کی تو ایسے انداز میں کی کہ ادبی شخصیت کی دل جوئی محسوس ہو۔ ادبی جہت کے فروغ کے لیے ادبی

شخصیات کی انتھک کوششوں کو خراج تحسین بھی پیش کرتے اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے تحریریں بھی لکھ دیتے تھے۔

مشتاق قمر نے انشائیوں میں بھی ادبی شخصیات کے ادبی فن اور خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک فن کی تخلیق میں ادب کن کن مراحل سے گزر کر ادب کی ایک شکل اختیار کرتا ہے۔ اس حوالے سے وہ اپنے انشائیہ "بیٹھنا" میں ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "خود شاعر اور ادیب کو ایک اچھی سی نظم یا افسانہ تخلیق کرنے کے لیے پہروں، ہوٹلوں، کیفوں میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ تب کہیں تخلیق کا جرثومہ الفاظ کا لبادہ اوڑھ کر ذہن کے کاؤنٹر سے برآمد ہوتا ہے۔"[۵۴]

ادب کی تخلیق کے لیے یہ ایک چھوٹی سی جھلک ہے۔ ابتدائی مرحلہ طے کرنے کے بعد اس ادب نظم یا افسانے کی بار بار مطالعہ سے نوک پلک سنواری جاتی ہے۔ تنقیدی نظر کے مرحلے سے گزرنے کے بعد ایک نظم یا افسانہ ادب کی صورت اختیار کرتا ہے۔ مشتاق قمر کا ادبی فن کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ ان کے انشائیوں میں ادبی رنگ بہت گہرا ہے۔ ادبی مباحث اور ادبی مکالمے جا بجا ملتے ہیں۔ دلائل اور مثالیں دے کر ادبی رنگ کو مزید نکھارنے میں آپ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اپنے انشائیہ "دھوپ کھانا" میں دلائل اور مصالحے دیکھ کر فطرت نگاری کو اجاگر کیا ہے۔ اپنی دلیل کی تقویت کے لیے شعری مصرے بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کے لیے فارسی شعری مصرے کے استعمال سے ادبی جہت کے مقام و مرتبے میں اضافہ ہوتا ہے۔ فارسی کے علاوہ انگریزی الفاظ کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ مشتاق قمر کے انشائیوں میں ادبی شخصیات کے حوالے اور لسانی مباحث کے تذکرے ملتے ہیں۔ انشائیہ کا طرز تحریر مضمون سے ملتا جلتا ہے۔ استعارات و تشبیہات کا استعمال کر کے اپنے دلائل کو پختگی عطا کی ہے۔ محاورات اور ضرب المثل کے استعمال سے اپنے انشائیے کو خوبصورت بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسلوب سادہ اور آسان، انداز گفتگو میں اپنا پن اور تحریر پر کشش اور جاذب ہے۔ یہی خوبیاں مشتاق قمر کی ادبی جہت کو نمایاں کرتی ہیں۔ منفرد اور انفرادی ادبی جہت میں ان کا نام ممتاز ہے۔ اس لیے انشائیہ میں ادبی رنگ کو اوڑھنے میں مشتاق قمر نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

۴۔ جمیل آزر کے انشائیوں کا ادبی جائزہ:

انشائیہ میں ادبی جہت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں ادب کو خوبصورت اور دلکش بنانے کے لیے ادبی شخصیات اور لسانی و ادبی مباحث کا ذکر کیا جاتا ہے۔ محقق و ناقدین کی رائے کو پرکھا جاتا ہے۔ کیونکہ ادب کا تعلق

فرد کے تخلیقی عمل سے ہوتا ہے۔ جس میں اس کے فکری اور فنی صلاحیتوں کا احاطہ کرنا آسان ہوتا ہے۔ پروفیسر جمیل آذر کی تحریروں میں ادبی جہت میں اردو کے علاوہ فارسی ادب کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں ادبی موضوعات کو جگہ دینے کے علاوہ بلکہ عالمی سطح کے ادیبوں کے حوالے بھی اپنے انشائیوں میں بیان کیے ہیں۔ تخلیق کار اور نقاد کے حوالے سے اپنے انشائیہ "ہائیڈ پارک" میں کچھ یوں تحریر کرتے ہیں:

> "فنکار اپنے تخلیق کو سامنے سے دیکھتا ہے جبکہ نقاد اسے عقب سے دیکھتا ہے۔ اور ان پہلوؤں کی نشاندہی کرتا ہے جو فنکار کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ جونہی میری نوک قلم سے صفحہ قرطاس پر کوئی تحریر نمودار ہوتی ہے۔ تو میں اسے ہر زاویے سے فکر و نظر کی گرفت میں لاتا ہوں اور کانٹ چھانٹ کر کے از سر نو لکھتا ہوں۔"[۵۵]

ایک اچھا ادیب و انشائیہ نگار ہونے کے لیے نقاد ہونا بھی ضروری ہے۔ نقاد کی خوبیاں اور صلاحیتیں موجود ہونا ایک اچھے انشائیہ نگار کی خوبی ہے۔ جمیل آذر بھی ایک اچھے نقاد ہیں اس لیے ان کی تحریروں میں شگفتگی اور شائستگی پائی جاتی ہے۔ کیونکہ ان کی تحریریں تنقیدی مراحل سے گزر کر ادب کا حصہ بنتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں ادبی نکھار کی ایک اہم وجہ اشعار کا استعمال بھی ہے۔ اکثر انشائیوں میں انہوں نے اشعار کو استعمال کیا ہے۔ بعض خیالات و افکار کو شعری صنف میں بہترین انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس لیے اکثر مقامات میں شعری اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔

پروفیسر جمیل آذر نے تنقیدی مراحل اور شعری اصطلاحات کے علاوہ دوسرے ادب کے محاورے بھی استعمال کیے ہیں۔ جن میں فارسی اور انگریزی قابل ذکر ہیں۔ ان کے انشائیوں میں انگریزی ادب کا رنگ واضح نظر آتا ہے۔ ان کے انشائی ادب میں بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "مجھے اس وقت آئرلینڈ کے معروف شاعر ییٹس کی وہ نظم یاد آرہی تھی جس میں اس نے مادر وطن کے حضور میں ایسی دلآویز پیش رفت آسمانی منقش ردا جس پر رنگ و نوری کام کیا ہوا ہو، پیش کرنے کی شدید خواہش کی تھی۔ مگر وہ ایسا کرنے سے معذور تھا۔ لیکن میں اس حقیقت کو اپنے سامنے عریاں دیکھ رہا تھا۔"[۵۶]

پروفیسر جمیل آذر کا ادبی لحاظ سے مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اردو، فارسی، انگریزی اور پنجابی ادب میں خصوصی لگاؤ ہونے کی وجہ سے ادبی جہت پر پختگی کے وسیع دلائل موجود ہیں۔ اس کی ایک اہم وجہ پروفیسر صاحب کا وسیع مطالعہ ہے اور یہی ان کی خاص خوبی ہے۔

۵۔اکبر حمیدی کے انشائیوں کا ادبی جائزہ:

اکبر حمیدی انشائیہ نگاری میں ایک بڑا نام ہے۔ وہ الفاظ سے کھیلنے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔ وہ الفاظ کی جوڑ توڑ، الٹ پھیر سے طنز و مزاح پیدا کرنے کے ماہر ہیں۔ وہ شگفتگی اور بے ساختگی سے اپنی بات کہہ جانے والے انشائیہ نگار ہیں۔ فن انشائیہ کے رموز سے بخوبی آگاہ ہیں اور ان کی تحریروں میں اس کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی جہت کے موضوعات کو منفرد اور الگ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں ادبی جہت کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ جس میں ادبی شخصیات اور ادبی مباحث کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ چونکہ اکبر حمیدی ایک منجھے ہوئے ادیب اور انشائیہ نگار ہیں تو اکثر نوجوان لکھاری اور مختلف نئی ادبی تنظیمیں اپنی ادبی تحریروں کی اصلاح کے لیے تشریف لاتے یا بذریعہ ڈاک بھیج دیتے تھے۔ اسی حوالے سے اپنے انشائیہ "خالی گیراج" میں یوں رقمطراز ہیں:

> "ملک بھر سے کئی طرح کی رنگارنگ تنظیمیں مجھے اپنا لٹریچر بھیجتی رہتی ہیں۔ جن میں انہوں نے اپنے نہایت مفید اغراض و مقاصد بیان کیے ہوتے ہیں۔ اپنا منشور بھی درج کیا ہوتا ہے۔ نہیں یہ بات بڑی وضاحت سے اور زور دے کر بیان کی گئی ہوتی ہے کہ اس زمانے میں خصوصاً اس قسم کے حالات میں ان کی تنظیم کا وجود بے حد ضروری ہے۔"[۵۷]

ادبی جہت میں ادبی شخصیات، ادبی موضوعات اور لسانی مباحث کے علاوہ ادبی تنظیموں کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اکبر حمیدی نے ان تنظیموں کو مفید اور ناصحانہ مشورے دے کر ادب کی خدمت کے لیے تیار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے جہاں نئی ادبی تنظیموں اور نئے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کی ہے وہاں پر ادب میں نئی جہت پر بہت زور دیا ہے۔ مغربی ادب میں نت نئی ادبی جہتیں متعارف ہو رہی ہیں۔ اس لیے اردو ادبی جہت میں نیا رنگ آنا چاہیے۔ پرانے اور فرسودہ نظام سے باہر نکلنا ہوگا۔ ادب کے پرانے اور فرسودہ مدار کے بارے میں انشائیہ "پھولوں میں گھرا کانٹا" میں لکھتے ہیں:

> "اگرچہ غالب اور سرسید جیسے لوگوں نے کوشش ضرور کی کہ ہم ان صدیوں پرانی لکیروں کو پیٹتے رہنے کی بجائے اب اس فرسودہ مدار فکر سے باہر تشریف لے آئیں۔ جہاں نئی دنیا ہماری منتظر ہے۔۔۔۔ مگر اس فرسودہ مدار فکر کو اس قدر مضبوط بنا دیا گیا ہے اور اس کی دیواروں میں پاکیزگی اور تبرکات کے ایسے فولادی عنصر بھر دیے گئے ہیں کہ ان سے باہر آنے کو۔۔۔۔ بلکہ باہر آنے کی کوشش کو بھی سخت ناپسندیدہ کہہ کر۔۔۔ باہر آنے کی کوشش کرنے والوں کو معیوب قرار دیا گیا ہے۔"[۵۸]

اکبر حمیدی کے انشائیوں میں ادبی رنگ دوسرے انشائیہ نگاروں سے قدرے مختلف ہیں۔ نیا انداز اور نئ سوچ ادب کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس لیے ان کی تحریروں میں ادبی موضوعات ادب کے نئے فن کی طرف لے جاتے ہیں اور یہ ایک صحت مندانہ کاوش ہے۔

۶۔ مشکور حسین یاد کے انشائیوں کا ادبی جائزہ:

مشکور حسین یاد اپنے انشائیوں کے حوالے سے ایک ادبی اور اخلاقی شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ معاشرے کی ایسے فرد کی نمائندگی کرتے ہیں جو اپنی تحریریں میں مکمل طور پر آزاد ہے۔ اس لیے وہ اپنے تجربات ومشاہدات کو ادبی موضوعات میں قلمبند کرتے ہیں۔ تجربات ومشاہدات کو ادبی موضوعات دے کر سماجی تاثر دینا ادبی ہونے کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان تحریروں میں سماج اور معاشرے کی حقیقت اور سچائی کو بیان کیا جاتا ہے۔ اس لیے ادبی موضوعات میں سماجی موضوعات ضرور ملتے ہیں۔ جمیل آزر صاحب نے مشکور حسین یاد کو ادبی شخصیت قرار دیا ہے تو اس کی وجہ ان کا ادب سے محبت، ادبی موضوعات سے بھرپور تحریریں اور اخلاقی اقدار سے مالامال ہونا ہے۔ اس مجموعہ کے پہلے انشائیہ "خوشی کا بار عظیم" قران پاک کی ایک آیت کا تجزیہ ہے۔ سورت احزاب کی آیت نمبر ۷۲ کی روشنی میں تجزیہ تحریر کیا گیا ہے۔ ادبی موضوعات میں کتب اسلامی پر تبصرے انشائیہ نگاروں کے موضوعات کا حصہ ہیں مگر قرانی آیت پر تجزیہ منفرد اور انفرادی ہے۔ اس انشائیہ میں مشکور حسین کے اپنے خیالات وافکار بھی ادبی موضوعات سے بھرپور ہیں۔ اس انشائیہ کے موضوع میں ہی خوشی ظاہر ہوتی ہے۔ اس آیت کی روشنی میں "خوشی" جیسے موضوع پر دلائل کے ساتھ یاد کرنا فن کمال ہے۔ اس انشائیہ کے آخر میں اس تجزیے کا نچوڑ کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> "سچی خوشی نہ ظلم کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ جہالت کے ذریعے۔ سچی خوشی کے لیے تو انسان کو عادل اور عقلمند ہونے کی ضرورت ہے مگر کیا عدل اور کیا عقل ان دونوں کا حصول ہی انسان کے لیے سہل ترین حصول ہے۔ بشرطیکہ انسان اپنی فطرت کے آسان راستے پر قائم رہے۔"[۵۹]

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ اصل خوشی وہی ہے جس میں انصاف ہو اور غور وفکر اور سوچ وبچار کے بعد حاصل ہو، یہ تب ہی ممکن ہے جب اس خوشی میں چاہت اور اپناپن ہو۔ مشکور حسین یاد کے اس مجموعے "وقت کا استعارہ" کے انشائیوں کے موضوعات پر سرا سری جائزہ لیں تو ان میں ادبی رنگ نظر آتا ہے۔ جن میں "نزاکتوں کا مرقع"، عقیدہ، اسم کا جسم، بہشت میں، پہلا قدم، تنہائی کا شور اور جنم جنم کا شمار قابل ذکر ہیں۔ جہاں ادبی موضوعات

ہوں گے وہاں اخلاقیات اور اخلاقی اقدار کو موضوع بنایا جائے گا۔ اخلاقی اقدار کے موضوعات پر ادبی انشایئے کی تعداد کم ہے۔ مشکور حسین یاد جیسی شخصیت کا اخلاقی اقدار اور ادب پر خود کلامی، ذاتی مشاہدات اور انکشاف ذات کے ذریعے انشایئے کسی درس سے کم نہیں ہیں۔ اخلاقیات کی بات ہو اور انسانیت پر لفظ کشائی نہ ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے، سب سے بڑی محبت انسانیت کے لیے چاہت ہے۔ انسانیت کے لیے درد دل رکھنے والی شخصیت کے مالک مشکور حسین یاد کسی کے دکھ درد میں اپنا درد محسوس کرتا ہے۔ ظالم اور سفاک دنیا میں جہاں خونی رشتے ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ خون کا رنگ سفید ہو چکا ہے عورت اور دولت کے لیے ایک دوسرے کے گریبان پر ہاتھ ڈالا جا رہا ہے۔ انہوں نے ایسے ماحول میں سماج کی اصلاح اور انسانیت کے دکھ درد کم کرنے کے لیے اپنے قلم کو استعمال کیا ہے۔ ادبی انداز میں اصلاحی پہلو کو سامنے لایا گیا ہے۔ ادبی موضوعات میں اخلاقی اقدار پیدا کرنے کی ایک کوشش کا نام مشکور حسین یاد ہے۔

۷۔ نظیر احمد صدیقی کے انشائیوں کا ادبی جائزہ:

نظیر صدیقی کے انشایئے ادب سے تزئین ہیں اور یہ کہنا بھی موضوع ہو گا کہ انتہائی ادب سے لبریز ہیں۔ ان کے انشائیوں کو ادبی میراث کا حصہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا۔ مصنف اگر صرف ایسا انشائیہ لکھتا ہے جو صرف معاشرے میں موجود برائیوں کو بیان کرے تو وہ صرف ایک قصہ کہانی ہی لکھے گا نہ کہ وہ اس میں ادب اور ادبی تصورات کو بیان کرنے والا ہو گا۔ نظیر صدیقی نے اپنے انشائیوں میں ادبی مقولات کا اندراج اس طرح سے کیا ہے کہ کسی کہانی میں کہاوتوں سے اس کی مثال کی وضاحت بیان ہوتی ہے۔ انہوں نے ادب کو اپنے انشائیہ کا حصہ بنایا ہے کسی مشہور کہاوت کو بیان کر کہ اس کو روز مرہ کی زندگی سے منسلک کرنا ایک اچھے انشائیہ نگار کی خوبی ہوتی ہے لہذا انہوں نے اس خوبی کو بہت احسن انداز میں اپنے انشائیوں کی خوبصورتی میں اضافے کے لیے پیوست کیا ہے۔ جس طرح جن و انس خدا کی مخلوق ہیں یہ کائنات خدا کی تخلیق کرتا ہے اور انسان کا وجود اور فکر و شعور بھی خدا کی دین ہے اسی طرح انسان اپنی عقل و شعور کا معتبر ہوتا ہے اور اپنی عقل کو اپنی تخلیق سمجھتا ہے۔ اس کی سوچ سے بننے والے الفاظ اس کے ماتحت ہوتے ہیں اسی طرح ادب کا انسانی فکر سے گہرا تعلق ہے۔ نظیر صدیقی نے ادب سے متعلق اپنے انشایئے "یہ انسان" میں خدا کے وجود کو شیکسپیئر کے ڈراموں سے منسلک کیا ہے اور اس کا بارے میں وہ یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> "خدا کے وجود کا مسئلہ بڑی حد تک شیکسپیئر کے ڈراموں کے مسئلے سے مشابہ ہے۔
> مہذب انسان اتنی مدت سے اتنی عقیدت اور ارادات کے ساتھ شیکسپیئر کی پرستش
> کرتا آرہا ہے کہ اب قدرتی طور پر اس کا جی نہیں چاہتا کہ شیکسپیئر کے ڈرامے کسی
> اور کے ڈرامے ثابت ہوں۔"[۶۰]

نظیر صدیقی کا ادبی لگاؤ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ شیکسپیئر کے معترف ہیں اور انہیں اس کے ڈراموں میں خدا کے وجود اور اس کے انداز اور اسلوب کا پتہ ہے کہ کیسے شیکسپیئر نے اپنی عقلی کسک کو ڈراموں میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنے انشائیوں میں ادب کا پرچار کیا ہے اور انہوں نے ادب اور اس کے متعلقات کو اپنی تصنیف کا حصہ بنایا ہے۔ انہوں نے گاندھی ازم کو ترقی سے جوڑا ہے کہ جو شخص گاندھی ازم کا پیروکار ہے وہ ذہنی پسماندگی کا شکار رہے گا اور کبھی بھی ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا انہوں نے ادب کے مبصرین کو بھی اپنے انشائیوں کا حصہ بنایا ہے اور انہوں نے اپنے انشائیہ "غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارو" میں ادیبوں کا بے شمار تذکرہ کیا ہے اور ان کے ادب کو بھی ایک الگ انداز سے سراہنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ادیبوں کو خراج تحسین پیش کرنے کا جو انداز اپنے انشائیہ میں بیان کیا ہے وہ یوں ہے کہ:

> "راجندر سنگھ بیدی افسانہ پڑھیں گے
> کیفی اعظمی نظم پڑھیں گے
> وشوامتر عادل مکالمہ پڑھیں گے
> اور مہندر جی رپورٹ پڑھیں گے کرشن چندر نے برجستہ چوتھا مصر لگا دیا تمام حاضرین ہنس پڑے"[۶۱]

نظیر صدیقی ایک ایسے انشائیہ نگار ہیں جنہوں نے اپنے انشائیوں میں ادبی اصطلاحات کو پیش کرنے کا ایک الگ انداز بیان کیا ہے اور یہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ ان کا ادبی لگاؤ کس قدر زیادہ ہے۔

۸۔ صلاح الدین حیدر کے انشائیوں کا ادبی جائزہ:

صلاح الدین حیدر کے انشائیوں میں ادبی جہت کا جائزہ لیا جائے تو اس میں ادبی شخصیات و مباحث اور لسانیات کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ کہیں اردو ادب کے ساتھ فارسی، پنجابی اور انگریزی ادب کی ممتاز شخصیات کا ذکر بھی کیا جاتا ہے تو کہیں اردو ادب میں ادبی و لسانی مباحث کا تقابل بھی پایا جاتا ہے۔ ادب کے فروغ کے لیے تحریروں کے ساتھ تقابل بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اپنے انشائیہ میں ادبی جہت پر موضوعات کو بیان کرنے سے اس کی اہمیت و افادیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ صلاح الدین حیدر اپنے ایک انشائیہ "جاگیر دار اور برخوردار" میں ادبی شخصیات کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

> "چناچہ میں بھلے شاہ کی کافیوں اور قانون قدرت کے ساتھ معاملہ بندیوں، میر تقی میر کی غم سے شکستہ قبروں جیسی غزلوں اور مرزا اسد اللہ خان غالب کی مزار کے دیے کی طرح ٹمٹماتی ظرافتوں پر دیسی گھی کھا کر بھی اور بڑھی ہوئی بڑکوں کو ترجیح دیتا ہوں۔"[۶۲]

ادبی شخصیات کی ادبی تحریروں کو کسی چیز سے تشبیہ دے کر صلاح الدین حیدر نے اپنی تحریروں میں جان ڈال دی ہے۔ نثر نگاروں کی نثر نگاری، شعراء کی شاعری کی مختلف اصناف کو مختلف نام دیکھ کر صلاح الدین حیدر نے اپنی تحریروں کو جاندار بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں شاعری کو دل کا سکون کہا جاتا ہے تو کہیں غم کی لہر محبوب کی یادوں میں مگن، تو کہیں جدائی کے ہجر میں تڑپتا ہوا محبوب دکھائی دیتا ہے۔ ادبی جہت کے موضوعات میں ادبی شخصیات کی ادبی تحریروں کے درمیان موازنہ اور تقابل بھی کیا جاتا ہے۔ کوئی سنجیدگی کا علمبردار ہے تو کوئی طنز ومزاح کا شیدائی، کوئی آسان و تفہیم فقرہ بندی کو ترجیح دیتا ہے تو کوئی مشکل الفاظ کی گتھی میں الفاظ کو قید کر دیتا ہے۔ شعراء کے حوالے سے صلاح الدین کے حیدر کے انشائیے "تذکرہ جنوں کا" میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> "خدائے سخن میر تقی میر کے کلام میں جنوں کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اقبال کے کلام پر جہاں پڑی جنوں کی عظمت کا ذکر پایا، فیض صاحب کی جنوں میں جتنی بھی گزری کارآمد گزری ہے۔ غرض غزل کی تاریخ پڑھتے پڑھتے ہماری طبیعت بھی للچائی۔ تصور ہی تصور میں اپنے آپ کو عصر حاضر کا خدائے سخن بنتے دیکھا، اور یہ بات واضح ہو گئی کہ ہماری ذات میں جنوں کی کمی ہے اور جنوں ذات پر ریاضت کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔"[۶۳]

شاعری کی صنف غزل کا جنوں کے ساتھ موازنہ اور جنون کے بغیر غزل کی اہمیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس طرح کی ادبی تحریریں اور موضوعات ادبی جہت کے زمرے میں آتے ہیں۔ صلاح الدین حیدر کے ہر انشائیہ میں آپ کو ادبی شخصیت اور ادبی موضوعات کی بلندی ضرور نظر آئے گی۔ ادبی شخصیات کے حوالے سے صلاح الدین کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور وہ ادبی شخصیات کی ادبی جہت پر مضبوط گرفت رکھتے ہیں۔

۹۔ڈاکٹر قیصر شہزاد کے انشائیوں کا ادبی جائزہ:

قیصر شہزاد صاحب کے انشائیہ مجموعہ "لطف آگہی" تین مجموعوں کا مشترکہ مجموعہ ہے۔ ان کے موضوعات مختلف ہیں۔ وقت کے ساتھ موضوعات میں تبدیلی معمولی بات ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریریں ان کے گہرے معاشرتی تجربوں، انسانی رویوں اور وستعوں کے باہم میل جول کی زندہ تصویریں ہیں۔ یہ اپنی تحریروں میں گرجنے برسنے، کرتب دکھانے یا کارنامے بتانے کی بجائے ادبی اصطلاحات کو ترجیح دیتے ہیں۔ ضبط نفس، شائستگی و شگفتگی، لطافت اور عزت واحترام دینے میں وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہیں۔ ان کے انشائیے آگہی اور لطافت کا خوبصورت مرکب ہیں۔ خود اظہاری اور خوش گفتاری ہی ان کو منفرد و ممتاز بناتی ہے۔ یہ انفرادیت ادبی جہت میں آپ کی شخصیت کو چاند چاند لگوانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

ڈاکٹر شہزاد قیصر ایک ایسی ادبی شخصیت کے مالک ہیں کہ ان کے ادبی سوچ بہت وسیع و بلیغ ہے شاید اس کی وجہ انگریزی ادب سے لگاؤ تھا۔ انگریزی الفاظ و محاورات کا استعمال ان کی اردو تحریروں میں بھی ملتا ہے بلکہ اکثر اوقات ان کا موازنہ بھی پیش کرتے ہیں۔ اس مجموعے کے پہلے اس کے ایک انشائیہ "زبان" میں تین زبانوں یعنی تین ادب کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ”ہماری روز مرہ زندگی کا نام ”اران پنچ“ ہے۔ اس میں اردو کی شرینی، انگریزی کی رعنائی اور پنجابی کی شناسائی ہے۔ ہم نے برسوں کی محنت کے بعد تین مروجہ زبانوں کا امتزاج پیدا کیا ہے۔ یہ ہماری وسعت نظر کی روشن دلیل ہے۔ یہ وسعت یہیں تک محدود نہیں بلکہ لامتناہی ہے۔ اس میں دنیا کی دیگر زبانوں کو بھی دعوت عام دی گئی ہیں۔ ہمارا شعور اور ضمیر تنگ نظری کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔“[۶۴]

یہ اقتباس ادبی جہت میں لسانی مباحث کی صحیح معنوں میں یہ ترجمانی کرتا ہے۔ ہر انشائیہ نگار اپنے ادبی جہت کو فروغ دینے کے لیے اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر نے انگریزی ادب سے اردو ادب کو بہت کچھ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں انگریزی الفاظ و محاورات کا استعمال، ادبی موزانہ اور لسانی مباحث کا تقابل ملتا ہے۔ اچھے اور بہترین ادب کے لیے ضروری ہے کہ وہ تنقیدی مرحلے سے گزر کر ادب کا حصہ بنے۔ ہر ادیب و انشائیہ نگار زندگی کے تجربات و مشاہدات اور خیالات و افکار کو ادبی تحریر بنانے کے علاوہ ادب کے فروغ اور اصلاح کے لیے ادب کو استعمال کر رہا ہے۔ ان کے ایک انشائیے ”نقاد“ میں ادبی جہت کے لیے نقاد کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں:

> ”موجودہ دور میں ایک کامیاب نقاد وہ بن سکتا ہے۔ جو اپنی زندگی میں محرومیوں کا شکار رہا اور اس کی زندگی میں ڈھیر ساری صعوبتیں ہوں اور اس سے انسانوں سے سخت نفرت اور خدا کا واسطے کا بیر ہو۔ ہر کسی کی پگڑی اچھالنے کا عزم رکھتا ہو۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برستے ہوں اور اس کی زبان ہر جگہ زہر اگلتی ہو۔ تنقید نگاری بغیر داخلی کڑواہٹ کے پھیکی ہوتی ہے۔“[۶۵]

تنقید کے لیے ایمانداری اور جرات مندی نقاد کی اہم خوبیاں ہیں۔ رکھ رکھاؤ سے پرہیز اس صورت میں ہی ہو سکتا ہے جب اقتباس میں تحریر کی ہوئی خوبیاں نقاد میں موجود ہوں ورنہ وہ رکھ رکھاؤ میں صحیح تنقید کرنے سے قاصر رہے گا۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر کے انشائیوں میں ادبی جہت اور ادبی رنگ زیادہ واضح ملتا ہے۔ اس کے لیے موضوع تنقید ہو یا تخلیق، موازنہ ہو یا تقابل، جائزہ لینا ہو یا احاطہ کرنا، الغرض ادبی جہت کی جھلک بڑی واضح اور وسیع ہے۔

۱۰۔ارشد میر کے انشائیوں کا ادبی جائزہ:

ارشد میر کی انشائیہ نگاری میں ادبی جہت کا رنگ منفرد اور الگ انداز میں ہے۔ارشد میر انشائیہ نگاروں میں منفرد انشائیہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ان کے انشائیوں کا اختصار، معنویت سے بھرپور فقروں کی ترتیب اور موضوع کو فنکارانہ انداز میں پرت در پرت کھلنے کا سلیقہ انھیں دیگر انشائیہ نگاروں میں ممتاز حیثیت عطا کرتا ہے۔ ان کی تحریروں میں قلم کار آپ بیتی اور جگ بیتی کے دوراہے پر کھڑا، اپنے تجربات و مشاہدات بیان کرتا ہے۔وہ روز مرہ زندگی کے واقعات اور نظر کے سامنے موجود اشیاء کو اپنے تفکر تخیل اور مشاہدات کے تناظر میں رکھ کر ایک نئی روشنی میں دیکھتے ہیں۔وہ اپنے انشائیوں میں ذہانت اور دانشمندی کا مظاہرہ خود انکشاف ذات کی شکل میں کرتے ہیں۔ان کے بیشتر انشائیے اوراق، لاہور میں شائع ہوئے۔

ارشد میر خود ادبی شخصیات میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کی ادبی تحریروں میں ادبی اصطلاحات کا استعمال کر کے انہوں نے اپنی تحریروں میں جان ڈال دی ہے۔انشائیہ نگاروں کی انشائیہ نگاری کی مختلف اصناف کو مختلف ادبی نام دیکھ کر انہوں نے اپنی تحریروں کو جاندار بنایا ہے۔یہی وجہ ہے کہ کہیں ادبی رنگ لسانی مباحث میں نظر آتا ہے، تو کہیں ادبی شخصیت کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ ان کے ادبی موضوعات میں ادبی شخصیات اور ادبی موضوعات کے درمیان موازنہ اور تقابل بھی کیا جاتا ہے۔ کہیں سنجیدگی نظر آتی ہے تو کہیں طنز و مزاح کا رنگ زیادہ غالب ہے۔ کسی انشائیہ میں آسان و تفہیم الفاظ کا استعمال کیا جارہا ہے تو کسی انشائیہ میں انشائیہ نگار مشکل جملوں میں مدعا بیان کرتا ہے۔یہی کمال ارشد میر کی ادبی جہت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ر۔دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا رومانوی تقابل:

ا۔وزیر آغا کے انشائیوں کا رومانوی جائزہ:

وزیر آغا کی ادبی تخلیقات کی مختلف اصناف ہیں۔ ہر صنف اپنے اندر انفرادیت رکھتی ہے۔ صنف انشائیہ چونکہ طنز و مزاح کے لیے کثرت سے استعمال ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ اس میں سماج کے بے شمار موضوعات کو بیان کرنے کی روایت پڑنے لگی۔ان موضوعات میں ہلکا مزاح کا رنگ ضرور موجود ہوتا ہے، شگفتگی اور چاشنی سے بھرپور تحریریں مختلف موضوعات کو بیان کرتی ہیں۔ان موضوعات میں رومانوی جہت بھی شامل ہے۔رومانوی جہت پر ہر ادیب و شاعر نے اپنے فن کا اظہار کیا ہے۔ کوئی عورت کے حسن میں کھو جاتا ہے، کوئی فطرت کے خوبصورت نظاروں سے دل کو لبھاتا ہے، کوئی تفریحی مقامات سے لطف اندوز ہوتا ہے، کوئی خواب و خیال کی اپنی دنیا بسالیتا ہے۔

وزیر آغا کے انشائیوں میں ان سب موضوعات کی تصویریں جابجا ملتی ہیں۔ سورج کے غروب ہونے کا دلکش اور خوبصورت نظارہ دل کو موہ لیتا ہے۔ وزیر آغا اس کی تصویر کشی اپنے انشائیے "ٹھنڈا برف ہات" میں یوں بیان کرتے ہیں۔

> "ہمیں پتہ بھی نہ چلا کہ کب سورج غروب ہوا، کب شام اپنے سرخ روسی لباس میں ڈولی سے اتری، کب اس کا سہاگ اجڑا اور کب اس کی آنکھوں میں ایک موٹا سا تابعدار آنسو جگمگا اٹھا، میں نے چونک کر چاروں طرف نظر دوڑائی، کھیتوں نے کالی عبا اوڑھ لی تھی اور رات کے رخسار بھیگ سے گئے تھے۔"[٦٦]

وزیر آغا فطرت نگاری کی دلکش اور جاذب تصویریں کھینچنے میں کمال کی مہارت رکھتے ہیں۔ برف کے پگھلنے کے حسین نظارے، پہاڑوں میں سے ڈوبتا سورج، آبشاروں میں گرتا ہوا ٹھنڈا یخ پانی، ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے، اڑتے بادلوں کے دلکش منظر اور بل کھاتی ہوئی ٹھنڈے پانی کی ندیاں فطرت نگاری کے انمول نظارے ہیں۔ یہ فطرت کے شاہکار نمونے ہیں۔ ڈوبتا سورج ان اعلیٰ شاہکاروں میں سے ایک ہے۔ جس کی بہترین انداز میں فطرت نگاری وزیر آغا نے کی ہے۔ وزیر آغا عورت کے حسن و جمال سے متاثر بھی ہیں۔ عورت کے حسن و جمال کو مختلف انداز میں بیان کرتے رہتے ہیں۔ اس کے عشق و محبت کے قصے، بے وفائی کے واقعات اور اداؤں پر مر مٹنے والے عشاق کا تذکرہ جابجا ملتا ہے۔ خوبصورتی میں ڈوبی ہوئی عورت کی دلکش آنکھیں، کالے ناگن کی سیاہ زلفیں، بل کھاتی ہوئی کمر الغرض عورت کے ہر حصے اور ادا کو بیان کرنا رومانوی موضوعات کی لڑی ہے۔ اس لڑی کی ایک جھلک ان کے انشائیے "کچھ خوبصورتی کے بارے میں" میں دیکھتے ہیں:

> "ایک شام میں اور "ن" حسب معمول سڑک کے کنارے اس "جنگلی" حصے سے گزر رہے تھے۔ جہاں کسی ذی روح سے ملاقات کا خدشہ تک نہیں تھا، ہمیں سڑک کے کنارے پتھر پر بیٹھی ہوئی ایک سیاح عورت دکھائی دی۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس جیسی حسین عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی تو آپ بے شک مجھے ٹوک دیجیے اور کہیے کہ "آپ نے حسین عورتیں دیکھی ہی کب ہیں" لیکن جب ہم اس کے قریب سے گزرنے لگے تو اس نے اپنی جھکی جھکی پلکوں کو اٹھا کر ایک نظر ہماری طرف دیکھا اور اگر میں یہ کہوں کہ ایسی حسین و دلفریب آنکھیں میں نے آج تک نہیں دیکھیں تو آپ بے شک پورے جوش اور اعتماد کے ساتھ مجھے ٹوکیے اور کہیے "آپ نے حسین آنکھیں دیکھی ہی کب ہیں۔"[٦٧]

حسین نظاروں اور حسین عورت کی تعریف ہی رومانوی جہت ہے۔ وزیر آغا کے انشائیوں میں رومانیت کا رنگ دوسرے انشائیہ نگاروں سے منفرد اور جُدا گانہ ہے۔ اس لیے ان کی رومانوی موضوعات میں ہر موضوع کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ فطرت نگاری سے لے کر حسین عورت کی اداؤں تک، خواب وخیال کے دلکش و دلفریب نظاروں سے لے کر تفریحات تک ہر موضوع ملتا ہے اور یہی وزیر آغا کے فن کا کمال ہے کہ انھوں نے ہر موضوع کو بیان کیا ہے۔

۲۔ غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کا رومانوی جائزہ:

غلام جیلانی کے انشائیوں میں رومانوی جہت تلاش کرنا معمولی بات نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کی شخصیت، بصیرت، فلسفہ اور سماجی موضوعات تو کثرت سے ملتے ہیں۔ عشق و محبت اور فطرت پرستی کے لیے الفاظ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ رومانویت ہر انسان کے اندر سمائی ہوتی ہے۔ جس کا اظہار انسان نہ بھی کرے تو دیکھنے والے اس کو دیکھ لیتے ہیں۔ اسی طرح رومانوی جہت کے موضوعات غلام جیلانی کے انشائیوں میں پوشیدہ راز ہیں۔ جن کو بے نقاب کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

غلام جیلانی اصغر کے انشائی مجموعے انشائیہ "تسخیر کائنات" میں اپنی خواہش کو اپنی مجبوریوں کے باعث مکمل نہ کرسکنے پر ان خواہشات کو ایک تہ خانے میں قید کر دیا جاتا ہے۔ ان خواہشات میں "تسخیر کائنات" صف اول میں شامل ہے۔ اپنے ازدواجی فرائض اور بچوں کی پرورش کے لیے اپنی خواہشات کو ترک کر کے قید خانہ میں قید کر دیا ہے۔ اپنی اور دیگر خواہشات کو قید کرنے کے حوالے سے کچھ یوں منظر نگاری کرتے ہیں۔

> "یہ طے خانہ میری ذات کا وہ Lumber Room ہے۔ جہاں میں نے اپنی زندگی کی متاع عزیز کو چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اس میں میری پہلی محبت بھی ہے۔ جس کی تسخیر میں مجھے ناکامی ہوئی۔ اس میں میری وہ نوکری بھی تھی جس کا آخری سرا صوبہ کی گورنری سے جا کر ملتا ہے۔ اس میں میرا وہ نکاح ثانی بھی تھا۔ جس کے لیے میں ہیلن آف ٹرائے سے لے کر الزبتھ ٹیلر تک باسلیقہ خواتین کی ایک باقاعدہ فہرست مرتب کر رکھی تھی۔ پھر عمر جوں جوں بڑھتی گئی اس نہاں خانہ میں بیشتر خواتین میری عدم موجودگی میں فرار ہو گئیں۔"[۶۸]

رومانوی ایک ایسا جذبہ ہے جو ہر انسان کے اندر موجود ہے۔ بے شک وہ کسی کونے میں جا چھپا ہوا ہو، جیلانی صاحب ایک اور انشائیہ "غیر ذمہ دار" میں عاشق کی مصروفیات کے حوالے سے طنزیہ انداز میں لکھتے ہیں:

"عاشق انتہائی غیر ذمہ دار ہوا کی طرح، موج خوشبو کا تعاقب کرنے والا، کبھی وہ محبوب کے کوچے میں جا نکلتا ہے، کبھی اپنے گھر۔ وہ رات بھر اختر شماری کرتا ہے اور دن بھر بیکاری۔ وہ محبوب کے والد کو دربان سمجھ کر اس کے قدم لے لیتا ہے اور پھر نتائج بھگتتا ہے۔"۶۹

غلام جیلانی ایک مہذب اور سلجھی ہوئی شخصیت کے مالک ہیں۔ رومانوی انداز ان کی تحریروں میں نہ ہونے کے برابر ہے مگر رومانیت کی جھلک ان کی تحریروں میں جا بجا ملتی ہے۔ یہ رومانوی انداز تحریر طنزیہ بھی ہے اور مزاح سے بھرپور بھی۔ ان تحریروں میں سنجیدگی کی بجائے اصطلاح کا پہلو دیکھنے کو ملے گا۔ محبت و پیار ایک ایسا جذبہ ہے۔ جو انسان کے اندر بے شمار روپ میں بستا ہے۔ ادب سے محبت و عشق ان کا خاصہ ہے۔

۳۔ مشتاق قمر کے انشائیوں کا رومانوی جائزہ:

مشتاق قمر کے انشائیوں کا جائزہ لیا جائے تو اس موضوعات میں سب سے زیادہ رومانویت کا عنصر ملتا ہے۔ ان کے انشائیہ فطرت پرستی کی بہترین اور عمدہ مثالیں ہیں۔ اس میں ان کا بہترین انشائیہ "دھوپ کھانا" ہے۔ اس میں خوبصورتی کے دلکش نظاروں کو بڑی دلفریبی سے بیان کیا گیا ہے۔ زندگی کی مصروفیات کو کم کرتے ہوئے وقت نکال کر فطرت پر غور و فکر کرتے ہوئے حسین نظاروں کے دلکشی میں گم رہنا بھی ایک فن ہے۔ اس کے لیے بہترین مشغلہ دھوپ سیکنا ہے۔ جس سے اس کے اندر آرام کے ساتھ دیگر صلاحیتیں بھی بیدار ہوں گی۔ انہوں نے شگفتہ دلائل سے موضوعات کو پختگی عطا کی ہے۔ فطرت پر ان کا انشائیہ "کوہ پیمائی" ان کی فنی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جس میں بلندی کی طرف جانے کی جبلی عادت کو بیان کیا گیا ہے۔ جس طرح انسان کسی بھی چوٹی پر جانے کے لیے منصوبہ بندی کرتا ہے پھر اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنی کوششیں تیز کرتا ہے۔ اسی طرح کوہ پیمائی میں وہ حقیقت کو نظر انداز نہیں کرتا بلکہ اس طرح زندگی میں بھی ہمیں حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ حقیقت کا سامنا کرنا چاہیے۔ فطرت پرستی کے علاوہ تفریحات، اجنبی دنیائیں، غور و فکر اور فکر کی نئی راہیں جیسے موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔ رومانوی جہت کے ساتھ دیگر موضوعات کی جھلک بھی واضح نظر آتی ہے۔ اس انشائیے کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

"اگر آپ کو میری طرح سوچ بچار کرنے کی عادت ہے تو یقیناً کبھی نہ کبھی آپ کے ذہن میں یہ خیال تر ایا ہو گا کہ آخر انسان کیوں اچھے بھلے صاف ستھرے کپڑے اتار کر کوہ پیمائی کا جناتی لباس پہنے۔ کہیں کہیں پاؤنڈوزنی آکسیجن کے ٹھیلے اُٹھائے۔ یہ ہزار وقت پہاڑ کی چوٹی ہانپتا کانپتا جائے اور اس سے کہیں زیادہ مصائب کا سامنا کرتے ہوئے واپس نشیب میں بھی آ جائے۔ اگر آپ نے کبھی ان خطوط پر سوچا ہے تو مجھے پوری طرح اپنا ہم نواز سمجھیے۔"۷۰

مشتاق قمر کے انشائیوں میں رومانوی جہت کے پہلو زیادہ نمایاں ہیں۔ ان کا ایک انشائیہ "بھول جانا" ہے، جس میں سماجی موضوعات کے ساتھ ذہنی کشمکش پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے رویوں پر مختصراً اپنے خیالات بیان کیے گئے ہیں۔ یاد اور بھول جانے پر مختصراً اقتباس ملاحظہ ہو:

"یاد ایک ایسی سلگتی چنگاری ہے۔ جس کے لیے شعلہ فشاں ہونا مقدر ہو چکا ہے۔ بھول جانے میں سکون و عافیت اور صبر و قرار کے تمام معتدل عناصر پائے جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ بھول جانے کی قوت کو پروان چڑھائے بغیر دائمی سر درد کا اصول ممکن ہی نہیں۔"[۱]

مشتاق قمر نے ہمیشہ سادہ اور معمولی نوعیت کے موضوعات پر انشائیہ تحریر کیے ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ ان کے انشائیہ بھی معمولی نوعیت کے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں رومانیت کے موضوعات کی پختگی مکمل دلائل کے ساتھ ملتی ہے۔ سماجی اور نفسیاتی موضوعات کے پہلوؤں کو بھی یکسر انداز نہیں کیا گیا بلکہ ان کی معاونت سے رومانویت کو عروج بخشا۔

۴۔ جمیل آزر کے انشائیوں کا رومانوی جائزہ:

جمیل آزر ایک ایسا انشائیہ نگار ہے جس کے اسلوب میں بے پناہ روانی اور اپنا پن ملتا ہے۔ ان کا انداز بیاں قاری کو اپنی طرف راغب کرتا ہے ہر انسان کی طرح جمیل آزر کے انشائیوں میں رومانویت اور فطرت نگاری کی جھلک نظر آتی ہے جس سے قاری کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے ان کے انشائیے فطرت کے مفاہیم کی خوشبو لے کر قاری کو معطر کرتے ہیں۔ ان کی رومانویت کی جھلک سے ان کے انشائیے ہشاش بشاش رہتے ہوئے تحریروں میں ایک روحانی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اکثر و بیشتر انشائیوں کا آغاز ہی فطرت کے مناظر کو خوبصورتی سے بیان کرنے سے کیا ہے۔ ان کے ایک انشائیہ "شاخ زیتون" کا آغاز فطرت نگاری کے ایک ایسی منظر کشی سے آغاز ہوا ہے۔ جس سے ان کا فطرت سے لگاؤ واضح ہوتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

"میں علی الصبح نسیم سحری کی لطیف خشک لہروں کے سمندر میں سے گزرتا ہوا شہر کے باہر ایک ذراعتی فارم پر پہنچ جاتا ہوں۔ یہاں خاموشی دور دور تک پھیلے ہوئے سبز پیلے اور ٹیالے کھیت اپنے وسیع دامن پھیلائے میرا خندہ روئی سے استقبال کرتے ہیں کہ جیسے انہیں میرا پہلے سے ہی انتظار تھا۔"[۲]

پروفیسر جمیل آزر کی فطرت نگاری ان کی اندرونی کیفیت کی جھلک ہے۔ جو اللہ تعالی کے خوبصورت اور دلکش نظارے کو دیکھ کر صفحہ قرطاس میں منتقل ہونا شروع کر دیتی ہے۔ فطرت نگاری کے علاوہ حسن پرستی کی جھلک

ہی نظر آتی ہے۔ رومانویت جہت عورت کے حسن کے بغیر ادھوری ادھوری سی لگتی ہے۔ شاعری میں رومانویت کی نوعیت الگ ہے۔ صنف انشائیہ میں اس کی تصویر کچھ الگ انداز میں بیان کی جاتی ہے۔ رومانویت کے انداز کو پیش کرنے کے حوالے سے اقتباس ملاحظہ کرے:

> ”ابھی میں چند قدم ہی چلتا ہوں کہ میری ملاقات اس عیسائی خاتون سے ہو جاتی ہے جو کبھی صدر بازار کی ایک غیر ملکی لائبریری میں لائبریرین کے فرائض سر انجام دیتی تھی۔ اس وقت اس پر جوانی ٹوٹ کر گری تھی۔ اٹھتا ہوا بوناسا قد، سفید رنگت، متناسب ستواں ناک، آنکھوں پر سنہری باریک کمانی کا چشمہ، لانبے لانبے ہلکے سنہری رنگ کے بال جو نیچے کمر تک سانپ کی طرح بل کھائے ہوئے لہراتے تھے۔“[۳۳]

انسانی فطرت ہے کہ اس میں عورت کی حسن پرستی کی کشش موجود ہوتی ہے۔ بعض شاعر و ادیب اپنے فن سے الگ الگ انداز میں اس کو پیش کرتے ہیں۔ پروفیسر جمیل آزر بھی اس معاملے میں کمال کی مہارت رکھتے ہیں لیکن وہ فطرت نگاری اور حسن پرستی کے قائل ہیں اور اس کو خوبصورت اور دلکش انداز میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انشائیہ نگار رومانویت کے تمام مناظر کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ انہوں نے کائنات کے ان خوبصورت اور دلکش نظاروں کو جاذب انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے انشائیوں میں کائنات کی گہما گہمی وسعت اور شعری کیفیت کو خوبصورتی اور نہایت عمدگی سے رنگارنگی سے منسلک کیا گیا ہے جو قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے اور رومانویت سے متاثر کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔

۵۔ اکبر حمیدی کے انشائیوں کا رومانوی جائزہ:

اکبر حمیدی کے انشائیوں میں رومانیت کا جائزہ لیا جائے تو یہ رومانیت ہمیں عورت کی بجائے ادب اور فطرت میں نظر آئے گی۔ اکبر حمیدی کی تحریروں میں محبت موجود ہے مگر یہ محبت اپنے فن اور خوبصورت نظاروں میں پائی جاتی ہے۔ یہ جذبہ قدرتی ہے اور اس کی شدت کس طرف زیادہ ہے یہ ہر کسی میں مختلف ہے۔ کہیں پہاڑوں کی بلندی میں کھو جانے کا نام محبت ہے۔ ہے کہیں سرسبز باغات اور ہرے بھرے کھیتوں میں دل کو تروتازہ کرنے کا نام محبت ہے۔ بادلوں اور برستی بارش میں بھیگنے کی چاہت بھی نرالی ہے۔ یخ اور ٹھنڈی ہواؤں میں لرزنے کا لطف بھی محبت ہے۔ چاند کی چاندنی میں چھپی محبت بھی رومانیت کے زمرے میں آتی ہے۔ موسم بہار اور خزاں کی بہاریں دل کو تروتازہ کرتی ہیں۔ موسم خزاں کے حوالے سے انشائیہ ”خزاں“ میں لکھتے ہیں:

”تب خزاں روایتی عاشق کی طرح زرد چہرے کے ساتھ ہر چیز کو اداس نظروں سے دیکھتی، ٹھنڈی آہیں بھرتی۔ جھکے جھکے قدموں سے منظر میں داخل ہو گئی۔ یہ کیسے زرد رو اور اداس آنکھوں والے مسافر کی طرح جس کے آتے ہی سارے منظر پر زردی پھیل جاتی ہے اور سارا ماحول اداس اداس دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس اداسی اور زردی کا صحیح لطف محبت بھرے۔۔۔ فراق زرد لوگ ہی اٹھا سکتے ہیں۔ بہار اور خزاں کو دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے دو چاہنے والے اپنے اپنے رنگ میں ایک دوسرے کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔“[۴]

اکبر حمیدی کی تحریروں میں فطرت نگاری کے پہلو کثرت سے ملتے ہیں۔ انہوں نے سماج اور معاشرے کے خوبصورت نظاروں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس لیے ان کی رومانوی جہت میں فطرت نگاری کا عکس واضح دیکھا جا سکتا ہے۔ عشق و محبت، پیار و چاہت وغیرہ جیسے جذبوں کے لیے بھی حسین نظاروں اور فطرت نگاری کا سہارا لیا گیا ہے۔ حسین نظاروں کے ساتھ دنیا اور کائنات میں دل کو چھو جانے والے مناظر میں بھی رومانوی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اس حوالے سے ان کا نمونہ انشائیہ ”مچھلیوں بھرے تالاب“ میں ملحوظ ہو:

”ویسے بھی میرا خیال ہے جو مزہ کنڈی سے مچھلی پکڑنے میں ہے۔ وہ چارے سے پکڑنے میں نہیں، کنڈی سے پکڑنے میں صبر و سکون، انتظار، آہستگی اور تفریح طبع کا سامان ہے جبکہ جال سے مچھلی پکڑنے میں ہوس کاری“[۵]

فطرت نگاری اور تفریحات رومانوی جہت کے موضوعات میں شامل ہیں۔ ان پر اکبر حمیدی کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ ہلکے پھلکے اور دلکش انداز میں فطرت نگاری کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ قاری خود کو اس تفریحی مقام میں محسوس کرتا ہے۔ جس کے سحر میں خود کو گرفتار پاتا ہے۔ اکبر حمیدی کے انشائیوں میں فطرت نگاری کے علاوہ حسن و عشق اور عورت کی اداؤں کے بے شمار نمونے ہیں مگر رومانوی جہت میں فطرت نگاری میں ان کی تحریریں زیادہ پر کشش ہیں۔

۶۔ مشکور حسین یاد کے انشائیوں کا رومانوی جائزہ:

مشکور حسین یاد کا تعلق دبستان لاہور سے ہے۔ مشکور حسین یاد کو انشائیہ کے بانیوں میں تصور کیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ہی انشائیہ سے کیا اور اسی طرف زیادہ مائل رہے ہیں۔ یہ اس عہد کی بات ہے جب انشائیہ صنف کی اصطلاح بھی پوری طرح مروج نہیں ہوئی تھی۔ مشکور حسین یاد کو وزیر آغا کے انشائیہ شعریات کے مطابق انشائیہ نگار تصور نہیں کیا جاتا۔

مشکور حسین یاد کا انشائی مجموعہ "جوہر اندیشہ "۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ جس میں احمد ندیم قاسمی کے ابتدائیہ کے علاوہ تیس انشائیے موجود ہیں۔ مشکور حسین یاد کا انشائیوں کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔ انشائیہ میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہے، انشائیہ نگار دل کھول کر اپنی بات کہہ سکتا ہے۔ انکشاف ذات کر سکتا ہے، کائنات کے وجود اور اشیاء پر اظہار خیال کر سکتا ہے۔ ایک موضوع یا مربوط موضوعات کو ملا کر خیالات و افکار قلمبند کر سکتا ہے۔ اپنے خیالوں، جذبوں، تجربات و مشاہدات کو انشائیہ کے متعین کردہ اصول و ضوابط میں بیان کرنے کا نام ہی انشائیہ ہے۔ ان اصول وضوابط کو اختیار کرتے ہوئے مشکور حسین یاد نے اپنے انشائیے تحریر کیے۔

مشکور حسین یاد مذہبی، اخلاقی اور رومانوی موضوعات پر گرفت رکھتے ہیں تو حسن و جمال ان کی روح تک سمایا ہوا ہے۔ حسن و جمال میرے پروردگار کی ایک نعمت ہے۔ عورت کے حسن و جمال کے علاوہ بھی حسن و جمال کی ایک دنیا ہے بلکہ یہ دنیا ہی حسن و جمال کا ایک گوارہ ہے۔ حسن پردہ میں زیادہ پرکشش اور جاذب نظر آتا ہے، جوں جوں پردے ختم ہوتے جاتے ہیں۔ حسن و جمال میں دلکشی کم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر عورت کو دیکھ لیں، عورت پردے میں خوبصورت اور حیا کا پیکر اور پردے کے بغیر بے حیائی کا سبب ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مقدس ذات نے اپنی خوبصورت کائنات کے حسن و جمال کو پوشیدہ رکھا ہوا ہے۔ ضرورت کے تحت نقاب اتارا جاتا ہے۔ انہی خیالات کو مشکور حسین یاد اپنے ایک انشائیہ میں تحریر کرتے ہیں:

> "گویا حسن ہر وقت سفر میں ہے اور سفر میں گرد و غبار اور دیگر آلائشوں سے بچنا بھی ضروری ہے۔ لہذا حسن کے لیے نقاب بے حد ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ کائنات عالم کا ذرہ ذرہ نقاب پوش ہے۔ نقاب پوش ڈاکو نہیں، نقاب پوش حسینہ کی طرح۔۔۔۔۔۔ چنانچہ نقاب صرف حسن کی حفاظت ہی نہیں کرتا، اس کو اصل روپ میں سامنے لانے کی ضمانت بھی ہے۔"[۲۶]

مشکور حسین یاد کے موضوعات دوسرے انشائیہ نگاروں سے قدرے مختلف ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس جس انشائیہ سے لیا گیا ہے۔ اس کا نام "پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے" ہے۔ مگر اس موضوع یا عنوان کو دیکھا جائے تو عورت کے حسن و جمال اور اس کے پردے کے بارے میں فوراً ذہن میں آتا ہے۔ اس طرح دنیا کی ہر چیز محبت کی طالب ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ اس کا لگاؤ ہو اور اس کو دل و جان سے چاہا جائے اور اس محبت میں وفا کا ہونا ضروری ہے تا کہ وفا نبھا کر محبت کا تقاضا پورا کیا جا سکے مشکور حسین یاد وفا کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

"وفا کا مطالبہ ،کائنات کا سب سے بڑا مطالبہ ہے،اس کی ہر چیز وفا کی طالب ہے،ہر چیز کی خواہش ہے کہ اسے اپنا بنایا جائے،اس سے محبت کی جائے اس کو اپنی ذات کا جزو خیال کیا جائے۔۔اس کو اپنے رگ و پے میں رچایا اور بسایا جائے۔"[۷۷]

مشکور حسین یاد ازدواجی زندگی اور جنسی موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں۔وہ طنزیہ انداز میں میاں بیوی کے تعلقات کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں کہ میاں بیوی کے تعلقات ہمیشہ بگڑے ہی رہتے ہیں وہ میاں بیوی کے تعلق کو اونٹ کی کل سے تشبیہ دیتے ہیں اور یہ کل کبھی سیدھی نہیں ہوتی نیز مشکور حسین میاں بیوی کے منشا کے خلاف تعلق کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور ایسے تعلق کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔انشائیہ "ناجائز تعلقات" میں یوں بیان کرتے ہیں:

"انسانی تعلقات کی بنیاد آزادی اور ایجاب و قبول پر ہے۔اگر ایسا نہیں تو انسان جانوروں سے بھی گئی گزری مخلوق ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جانوروں سے بھی گئی گزری مخلوق۔"[۷۸]

یہی خاصیت ہے کہ ان کے موضوعات بھی فلسفیانہ ہیں اور ان کی تحریروں میں فلسفہ موجود ہے۔سماجی موضوعات کی جھلک بھی نظر اتی ہے۔موضوع فلسفیانہ ہو یا نفسیاتی، ادبی ہو یا رومانوی، سماج و معاشرے سے اس کا تعلق لازمی ہوتا ہے۔

۷۔نظیر صدیقی کے انشائیوں کا رومانوی جائزہ:

بیسویں صدی میں انشائیہ کو تنقیدی اور تخلیقی ہر دو سطحوں پر متعارف کرنے والوں میں نظیر صدیقی اس صنف کے ممتاز انشائیہ نگار ہیں۔انہوں نے رومانوی جہت کے موضوعات اور خیالات کا اظہار کیا ہے۔ان رومانوی جہت کے موضوعات میں منفرد بات ہی انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ انشائیہ میں رومانوی جہت کے ممتاز اور منفرد انشائیہ نگار ہیں۔

نظیر صدیقی کے انشائیوں کا مجموعہ "شہرت کی خاطر" اپنی تحریروں میں رومانوی خصوصیت کے ساتھ انشائیہ کا ایک نیا رنگ و آہنگ پیش کرتا ہے۔مصنف انشائیہ "شادی"،شادی کے نقصانات اور فوائد اور ازدواجی زندگی پر لکھتے ہیں۔مصنف کی رائے میں شادی ایک شامت ہے جس سے بچنا محال ہے اور شادی کے بعد شوہر کو بیوی کی ذمہ داریاں اٹھانا مہلک محسوس ہوتا ہے اور بیویوں کو اپنے سر شوہر منڈھنے کا غم ہوتا ہے اگر شادی نہ کی جائے تو دوست احباب مختلف ہتھکنڈوں سے شادی کے فوائد سے آگاہ کرتے اور سمجھاتے ہیں شادی کے معاملے میں نوجوان محبت کی شادی کو پسند کرتے ہیں جبکہ بوڑھے افراد منکوحہ سے محبت کو پسند کرتے ہیں اور یہ تضاد آغاز سے ہی

نوجوانوں اور بوڑھوں میں پایا جاتا ہے۔ انشائیہ "دوست اور دوستی" میں نظیر صدیقی دوستی کے رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے قربت سے زیادہ دوری کو ضروری قرار دیتے ہیں تاہم دوستی ایک نعمت ہے لیکن دوستی کی کوئی معیاد نہیں ہوتی بعض اوقات دوستی کسی عداوت و دشمنی کے بغیر ختم ہو جاتی ہے وہ بیان کرتے ہیں:

"قربت واقعی انسانی تعلقات کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے اس لیے دوستوں کو ہی نہیں رشتہ داروں کو بھی ایک دوسرے کے قریب نہیں آنا چاہیئے۔ خصوصاً جسمانی طور پر۔ یعنی دوستوں کا ایک ساتھ رہنا دوستی کو بڑھانے سے زیادہ گھٹانے میں مدد دیتا ہے۔"[۷۹]

بعض ناقدین کا یہ خیال ہے کہ نظیر صدیقی کی ظرافت چونکہ طنز کی جراحت سے حد درجے آشنا ہے اس لئے انھوں نے اس کتاب کے دیباچے میں انشائیہ کے متعلق اپنے نظریات میں اسی عنصر پر زور دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"میں جن حالات و حوادث سے گزر تا رہا ہوں ان کے اثر سے میری زندگی بڑی حد تک غم و غصے کا شکار رہی ہے یہی غم و غصہ میری شاعری اور میرے انشائیوں کے محرکات رہے ہیں۔ میری شاعری کا محرک غم ہے اور میرے انشائیوں کا محرک غصہ۔ یہی وجہ ہے کہ میرے انشائیوں میں مزاح سے زیادہ طنز کا عنصر نمایاں ہے۔"[۸۰]

نظیر صدیقی انشائیوں میں رومانوی جہت میں غم اور خوشی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ نظیر صدیقی کے انشائیہ رومانوی جہت سے مزین ہیں اور یہ کہنا بھی درست ہو گا کہ بے جا رومانوی اور عشق و محبت کی بجائے رویے سے لبریز ہیں۔ ان کے انشائیوں کو رومانوی میراث کا حصہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔

۸۔ صلاح الدین حیدر کے انشائیوں کا رومانوی جائزہ:

صلاح الدین حیدر کے انشائیوں کی ادبی تحریریں ان کے فن کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہ ادبی تحریریں اکثریت میں انکشاف ذات، ذاتی تجربات، مشاہدات اور اپنی آپ بیتی پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس لیے ہر ادیب و شاعر کی تحریر میں رومانوی جھلک ضرور ہوتی ہے۔ محبت، چاہت، عشق، انس اور پیار جیسے الفاظ کے ساتھ رومانوی جہت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ادبی شخصیات میں یہ جہت دوسرے عام شخصوں سے کچھ زیادہ بھی ہوتی ہے بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ یہ رومانوی جہت ہی ان کو ادبی شخصیت بننے کی ترغیب دلاتی ہے۔ سماج اور اپنے اندر چھپی ہوئی رومانویت کو الفاظ کی خوبصورت اور دلکش تصویر میں اتار کر بیان کرنے کی کی صلاحیت ایک اچھے ادیب کی خوبی ہے۔ صلاح الدین حیدر اپنے انشائیہ "قصہ انقلابی شوہر کا" میں اس رومانیت کے اثرات پر اپنے خیالات کو قلمبند کرتے ہیں. اس انشائیہ میں شوہر کی مختلف اقسام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"بعض لوگ پیدائشی طور پر حقوق زوجیت ادا کرنے کی صلاحیت کے ایسے بہرہ ور ہوتے ہیں کہ بیوی کی پوری طرح اطاعت کرتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں جو بیوی کی عبادت کرتے ہیں۔ اطاعت کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ عبادت کی جائے لیکن عبادت کرنے والا پہلے اطاعت گزار ہوتا ہے۔ تو عبادت گزار کو تنگ نظر "رن مرید" بھی کہتے ہیں۔"[۸۱]

صلاح الدین حیدر کے انشائیہ مجموعہ "حماقتیں میرے مقدر کی" میں اکثر انشائیے "قصے" کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً قصہ جھگڑالو کا، قصہ شرافت کا اور قصہ ضمیر فروشی کا قابل ذکر ہیں۔ اس کے ساتھ کچھ "تذکرے" اور "بیان" بھی شامل ہیں۔ جب انشائیہ نگار انکشاف ذات کو زیادہ ترجیح دے تو پھر رومانویت کچھ زیادہ بیان کی جاتی ہے۔ صلاح الدین حیدر فطرت کی خوبصورتی پر بھی قلم اٹھاتے ہیں فطرت کی خوبصورتی انسان کے دل کو بھی معطر کر دیتی ہے وہ فطرت کی اس خوبصورتی کو محسوس کرتے ہیں اور اس سے رومانیت کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ فطرت کی خوبصورتی کو رومانوی الفاظ اور عبارت میں یوں بیان کرتے ہیں۔

"تاروں بھرا آسمان تھا، درختوں کے سائے گلے مل رہے تھے، فضا میں بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی، چاند سرگوشیاں کر رہا تھا، میرے ذہنپر نیند کسا ہلکا ہلکا خمار طاری ہونے لگا۔ اتنے میں درختوں کے درمیان دو دھڑکتے اور لرزتے ہوئے سائے ایک دوسرے سے ملاقات کرنے کے لیے آگے بڑھے۔"[۸۲]

صلاح الدین حیدر کے دوسرے مجموعے "ڈر اور ڈراما" میں بھی ادبی جہت اور رومانیت جہت کی تحریریں زیادہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس کی ایک جھلک ان کے انشائیہ "انقلابی والد بزرگوار" میں ملتی ہے:

"جب اہل دل کنوارے ہوتے ہیں۔ محبت کے مارے ہوتے ہیں، تو جگر کی آتش گل کی طرح مہکتے اور فیض کی دست صبا کی طرح دہکتے رہتے ہیں، اور پھر جب اہل دل اپنی شخصیات کے تاریخی جبر کے سامنے سرنگوں ہو جائیں۔ یعنی شادی شدہ ہو جائیں تو دل کا خانہ خالی ہو جاتا ہے بلکہ خانہ خراب ہو جاتا ہے۔ اور وہیں اہل دل سیدھے سادے اہل خانہ اور اہل محلہ میں شمار ہونے لگتے ہیں۔"[۸۳]

صلاح الدین حیدر کے انشائیوں میں رومانیت کی زیادہ جھلک شادی کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ مندرجہ بالا دونوں اقتباسات میں شادی پر تبصرہ خیال کیا گیا ہے یا پھر شادی کے لیے مارے مارے پھرنے والے کنواروں کی حالت پر قلم کاری کی گئی ہے۔ بس ہر انشائیہ نگار کی رومانیت کی جہت کا رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

۹۔ڈاکٹر شہزاد قیصر کے انشائیوں کا رومانوی جائزہ:

ڈاکٹر شہزاد قیصر کی شخصیت سنجیدہ اور مہذب ہے۔ ان کی تحریروں میں عشق و محبت کی داستانوں کی جھلک تو نظر نہیں آتی مگر حسن و جمال اور فطرت پرستی کے نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ سرکاری آفیسر ہونے کی وجہ سے متعدد اضلاع میں تعینات رہے۔ جس سے انہوں نے وہاں کے خوبصورت نظاروں میں تحریروں کو قلم بند کر دیا۔ رومانیت ایک فطری جذبہ ہے یہ ہر کسی کے دل میں پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی مقدار کم یا زیادہ ہو سکتی ہے مگر یہ جذبے ہر انسان کی فطرت میں شامل ہوتے ہیں۔ عشق و محبت زندگی کا ایک ایسا جزو ہے جس کے بغیر زندگی کا وجود ممکن نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر ایک مہذب اور سادگی پسند شخصیت کے حامل ہیں۔ وہ ان الجھنوں سے دور رہنے میں فوقیت سمجھتے ہیں اس لیے ان کی تحریروں میں عشق و محبت کے ذاتی تجربے مشاہدے شامل نہیں ہیں مگر سماج و معاشرے میں اس جذبے کے تجربات کو لازمی تحریروں کا حصہ بناتے ہیں۔ اس لیے ان کے ایک انشائیہ "رقیب" میں اس کے بارے میں کچھ یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

> "عشق فقط ذات ہی نہیں بلکہ وہ تو کچھ بھی نہیں پوچھتا۔ اگر عشق کچھ پوچھتا ہو تو کسی منکوحہ سے آنکھ لڑانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ دل لگی تو دل کی مجبوری سے جنم لے سکتی ہے مگر عشق آزادی کے بغیر نہیں پنپ سکتا۔ اسے تو ہر لمحہ آزاد فضا میں سانس لینے کی ضرورت ہوتی ہے فقط آزادی کا چناؤ عشق کو پروان چڑھاتا ہے۔"[۸۴]

کسی بھی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں رومانوی موضوعات دوسرے موضوعات کی نسبت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اس میں عورت اور مرد کے درمیانی رشتے کی داستانیں پائی جاتی ہیں۔ پیار اور محبت کے قصے بیان کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر نے اپنے ایک انشائیے "موسم" میں اسی طرح کے موضوع پر اپنے افکار کو یوں بیان کیا ہے کہ:

> "صنفِ نازک پر جب بہار اتی ہے تو موسم کا مزاج یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہر طرف پھول کھلنے لگتے ہیں اور ہر شے اپنی اصلیت پر یعنی اپنے شباب پر ہوتی ہے اور اس شباب میں حجاب نہیں ہوتا۔ مرد حضرات بہار کی راگنی گاتے ہیں اور ان کی حس لطافت بہک کر حسن کثافت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس سمے کو دیکھ کر پرندے بھی دم بخود رہ جاتے ہیں۔"[۸۵]

عشق و محبت، پیار و چاہت، فطرت پرستی اور خواب و خیال رومانویت کے موضوعات ہیں۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر کی شخصیت رومانوی تو نہیں ہے مگر ان کی تحریروں میں رمانوی موضوعات کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔

رومانوی موضوعات پر ڈاکٹر شہزاد قیصر کی گرفت پنجابی ادب میں زیادہ مضبوط ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو ادب اور ان کے انشائیوں میں رومانوی رنگ کم پایا جاتا ہے۔ رومانویت ایک فطری جذبہ ہے اور یہ ہر انسان کے اندر اللہ تعالی کی پیدا کردہ ایک عظیم تخلیق ہے۔ اس تحفے کے بے شمار نمونے ان کی تحریروں میں بے جا مل جاتے ہیں جو ان کی تحریروں میں رومانوی ادب کا عنصر چھوڑ جاتا ہے۔

۱۰۔ ارشد میر کے انشائیوں کا رومانوی جائزہ:

ارشد میر کے موضوعات میں رومانویت کا عنصر کثرت سے پایا جاتا ہے وہ ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک سفر کرتے ہوئے جاتے ہیں۔ چھلانگ لگا کر جانا ان کی فطرت میں شامل نہیں ہے۔ وہ اپنے خیالات کو فطرت کے ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک لے جانے کی ایک کڑی کی شکل اختیار کرتے ہیں جس پہ ان کو کافی مہارت حاصل ہے۔ وہ افعال و اعمال کی طرح کسی بھی کیفیت کو نظر انداز نہیں کرتے بلکہ ان کو عقلی اور شعوری سطح پر لے جاتے ہیں۔ ان کا انشائیہ "موڈ" اسی تخلیقی عمل سے گزرتا ہے۔ ان کے اس انشائیہ میں جامد کی جگہ حرکات کو ترجیح دی گئی ہے اس لیے ان کے موضوعات میں چاشنی اور دلکشی کافی حد تک نمایاں نظر اتی ہے۔ اس حوالے سے ان کے انشائیہ کا نمونہ ملاحظہ کریں:

> "موڈ جامد نہیں ہے حرکت میں برکت کے جوہر سے مزین ہے اس کے تیور اور انداز تاثر ہر لمحہ بدلتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ جو چند سیکنڈ بیشتر خوشگوار موڈ میں ہشاش بشاش نظر آتے ہیں ناگہاں کسی غیر معمولی واقعہ سے متاثر ہو کر ناگوار موڈ کے ہاتھوں حزن و یاس کا پیکر دکھائی دیتے ہیں جس سے یہ نتیجہ باآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ موڈ وقتی سطح پر لمحاتی کیفیت کا نام ہے۔"[۸۶]

ارشد میر کے موضوعات فطرت کے گرد گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فطرت نگاری سے تعلق رکھنے والی اشیاء کو موضوع بنانا ان کی فطرت میں شامل ہے۔

ہ۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا نفسیاتی تقابل:

۱۔ وزیر آغا کے انشائیوں کا نفسیاتی جائزہ:

نفسیات کا ادب سے گہرا تعلق ہے نفسیات میں انسان کی سوچ، فکر اور رویوں کا سائنسی مطالعہ کیا جاتا ہے نفسیات میں انسان کے جذبات، خیالات اور احساسات کا لاشعوری اور شعوری طور پر جائزہ لیا جاتا ہے اس طرح

انسان کی ہر بات سے اس کی نفسیات عیاں ہوتی ہے چونکہ انشائیہ ادیب کی ذاتی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے تو اس سے اس کی نفسیات بھی نمایاں ہوتی ہے نفسیات میں انسان کا داخلی وخارجی جائزہ لیا جاتا ہے اور انسان کے پوشیدہ گوشے ظاہر ہوتے ہیں اور نفسیات انسان کی خواہشات اور اس کے اندر ہونے والے تغیرات کو بھی پرکھتی ہے۔ تاہم وزیر آغا انشائیوں میں بھی نفسیاتی عناصر دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے موضوعات اور اسلوب نگارش دلکش اور جاذب ہوتے ہیں۔ زندگی کی انوکھی اور تازہ کیفیات کا احساس دلانے کے لیے انشائیہ نگار مختلف طریقے اختیار کرتا ہے۔ یہ احساس اور جذباتی رویے انکشاف ذات اور مشاہدات و تجربات کی روشنی میں تحریر کیے جاتے ہیں۔ انشائیہ نگار نفسیاتی جہت میں جدت سے کام لیتا ہے۔ انشائیہ نگار انسانی جبلت اور خصلت کے مطابق داخلی اور خارجی جذبات کو پروان چڑھانے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ داخلی جذبے کی منازل طے کرتے ہوئے خارجی جذبے کی طرف سفر کو احسن انداز میں مختصراً بیان کرنے کا فن وزیر آغا کے پاس ہے۔ نفسیاتی مطالعہ اور نفسیاتی جہت کے موضوعات پر ان کا قلم خصوصی گرفت رکھتا ہے۔ انسانی جبلت میں یہ خاصیت ہے کہ وہ مستقل مزاجی پر قائم نہیں رہتے ہیں۔ مستقل مزاج ہونے کی بجائے بدلتی ہوئی کیفیت کو پسند کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے اس حوالے سے اپنے انشائیے ”ریلوے ٹائم ٹیبل“ میں لکھتے ہیں:

> ”بہت دراصل یہ ہے کہ انسانی فطرت قید و بند کی متحمل نہیں سکتی۔ اس میں شعلے کی سی بے قراری اور ہوا کی سی آوارہ خرامی ہے اور یہ زیادہ دیر تک ایک سی صورتحال کو برداشت نہیں کر سکتی۔ شاید اس کے علاوہ سفر کی طرف انسان کے مائل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد و تہذیب، قانون اور گھر کے بندوں کو قبول کرنے سے پہلے مکمل آزاد تھے۔“[۸۷]

وزیر آغا نے انسانی فطرت کے ان پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے کہ انسان میں روز اول سے ہی مستقل مزاجی کا عنصر مغلوب ہے جبکہ تبدیلی اور سفر کا عنصر غالب ہے۔ انسانی نفسیات میں شامل ہے کہ وہ نئی معلومات اور مسکن کا طالب ہے۔ ایک ہی عنصر سے بیزاری محسوس کرتا ہے اور تبدیلی کی خواہش کرتا ہے۔ انسان نفسیاتی طور پر ماضی کی بجائے مستقبل کا متلاشی ہے اور اس کی تلاش میں سفر پر گامزن رہتا ہے۔

وزیر آغا انشائیہ ”معافی مانگنا“ میں معافی مانگنے کی نفسیات کے بارے میں بتاتے ہیں کہ جب کوئی شخص معافی مانگنے کی خواہش کرتا ہے تو اس طرح وہ اپنی ذات کی کسی پوشیدہ طاقت کو ظاہر کرتا ہے یعنی وہ کسی شخص کے پتھر دل میں سے مخفی چشمے کو نکلنے کا رستہ فراہم کرتا ہے۔ اس طرح مصنف موسموں کے انسان پر اثرات کو بھی نمایا

ں کرتے ہیں کہ موسم انسان کی نفسیات پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ موسم بہار میں انسان کے جذبات اکثر مثبت ہوتے ہیں اور خزاں کے موسم میں یہی جذبات منفی ہو جاتے ہیں اور انسان کو تھکا دیتے ہیں اور جب بسنت کا موسم آتا ہے تو انسان کا تخیلی جذبہ بھی بلند ہو جاتا ہے تاہم مصنف مختلف جذبات جیسے کہ خوف اور تنہائی کی نفسیات کو بھی انشائیہ "اکلاپا اور تنہائی" میں بیان کرتے ہیں۔ اکثر جب انسان تنہا ہوتا ہے تو یہ محسوس کرتا ہے کہ انسان کے اپنے اور دشمن، غم اور خوشی سب اسے چھوڑ گئے ہیں اور وہ شخص بالکل اکیلا رہ گیا ہے اور ہر شخص اس سے کترانا شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح انشائیہ واپسی میں بھی مصنف واپسی کے سفر کی نفسیاتی کیفیت کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں علاوہ ازیں مصنف ایک ناصح کی نفسیاتی کیفیت کو بھی بیان کرتے ہیں کہ جب ناصح کسی کو نصیحت کرتا ہے تو اس کو یہ مولوم ہوتا ہے کہ اس کی نصیحت کسی پر اثر نہیں کرے گی اور یہ ایک سعی لاحاصل کام ہے پھر بھی وہ نصیحت کرنے سے باز نہیں آتا وزیر آغا انشائیہ لکھتے وقت گہرے تجربے اور مشاہدے سے کام لیتے ہیں اور وہ انسان کے رویوں کی نفسیات کو بہت عمدگی سے صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں۔

انشائیہ "بس اتنی سی بات" میں بھی مصنف عورت کی نفسیات کو بیان کرتے ہیں کہ عورت مرد سے پہلے عرفان کی منزل تک پہنچ جاتی ہے جبکہ مرد زیادہ تر جذبات میں بہہ جاتا ہے جبکہ عورت گہرے جذبات میں بھی خود شناسی سے سرفراز ہو جاتی ہے اور ہر آنے والی نئی چیز کو جلد سمجھ جاتی ہے۔

وزیر آغا نے انسانی حسیات پر اپنے خیالات و نظریات کو قلمبند کیا۔ حسیات انکشاف ذات کی ترجمانی کرتے ہوئے سماج اور معاشرے پر محیط ہے۔ یہ احساسات و جذبات انسان کی زندگی ہیں۔ یہ جذبے اور احساس نہ ہو تو زندگی ایک بے جان پتھر کی طرح ہو جاتی ہے۔ خواہشات انہی حسیات کی شاخیں ہیں۔ اس حوالے سے وزیر آغا اپنے انشائیہ "نروان" میں لکھتے ہیں:

> "خواہشات تو حسیات کی کونپلیں ہیں اور حسیات وہ لمبے دھاگے ہیں جنہوں نے مجھے پوری کائنات سے پیوست کر رکھا ہے۔ اگر خواہشات کا پھوٹنا بند ہو جائے تو حسیات کے دھاگے جگہ جگہ سے ٹوٹ جائیں گے اور حسیات کا معطل ہونا ملک کے مترادف ہو گا۔"[۸۸]

وزیر آغا کی تحریروں میں نفسیاتی جہت کے پہلو احساس، جذبے، رویے، داخلی و خارجی کیفیت کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ احساسات زندہ رہنے کے لیے بہت ضروری ہیں۔ ان کے بغیر زندگی موت کے مترادف ہے۔ انسان انہی جذبوں اور رویوں کے بل بوتے زندگی سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔ خوشی و غمی میں یہیں داخلی

خارجی کیفیتیں انسان کے چہرے پر عیاں ہوتی ہیں۔ انسان کی نفسیات میں شامل ہے کہ وہ ان کے بغیر زندہ رہنا گوارا نہیں کرتا ہے۔ یہ ایک کائناتی حقیقت ہے۔ یہی کائناتی حقیقت وزیر آغا کو دوسرے انشائیہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔

۲۔غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کا نفسیاتی جائزہ:

غلام جیلانی اصغر کی تحریروں میں انکشاف ذات، تجربات و مشاہدات، سچائی اور حقیقتیں کثرت سے ملتی ہیں۔ سماج و معاشرے کے سچ بڑے مہذب اور دلکش انداز سے تحریر کیے گئے ہیں۔ جس طرح انکشاف ذات سے افراد کے ساتھ ہونے والے انہونی سے موضوعات تلاش کر لیتے ہیں۔ اسی طرح سماج کی نفسیات سے بخوبی آگاہ رہتے ہیں۔ اس لیے موضوعات کو ایسا رنگ دیتے ہیں کہ اسلوب و انداز تحریر نفسیاتی رویے کے مترادف محسوس ہو۔ سماج کے افراد اور اپنے انشائیوں کے کرداروں کے ذہنی کشمکش کو اپنی گرفت میں رکھتے ہوئے تحریر کرنے کا فن بخوبی جانتے ہیں۔ اس سے وہ انشائیہ کے مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ نفسیاتی موضوعات میں ذہنی کشمکش اور جذباتی رویے کے ساتھ داخلی و خارجی کیفیت پر خصوصی دھیان بھی دیتے ہیں۔ انشائیہ کے کردار میں اکثر انکشاف ذات ہی ہوتا ہے۔ اس لیے اپنی داخلی کیفیت کو جاذب اور دل آفرینی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے ایک انشائیہ ''عادت'' میں نمونہ ملاحظہ ہو:

> ''لیکن کچھ دنوں کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں کچھ زیادہ سوچنے لگا ہوں۔ ابتدا میں تو صرف بیداری کے لمحات میں سوچتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ جونہی آنکھ بند ہوتی، میری سوچ بے لگام ہو جاتی۔ بس یوں لگتا جیسے میرے ذہن کے میدان میں گھوڑے دوڑ رہے ہیں۔ ایک سوچ دوسری سوچ کو یوں کاٹ دیتی جیسے پولوں میں ایک گھوڑا دوسرے گھوڑے کا راستہ کاٹ دیتا ہے۔''[۸۹]

غلام جیلانی اصغر کے نفسیاتی جہت میں ذہنی کشمکش اور داخلی کیفیت زیادہ نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ شاید انکشاف ذات ہے۔ غلام جیلانی مہذب شخصیت کے مالک ہیں تو دوسروں کے کرداروں کی نفسیاتی کیفیت کو عیاں کرنے کی بجائے انکشاف ذات کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں یونان کے فلاسفروں کی طرح فلسفیانہ اور مفکرانہ سوچ کے علاوہ نفسیاتی پہلو کے رنگ ملتے ہیں۔ اس طرح انشائیہ بلڈ گروپ میں مصنف ذہن کی نفسیاتی کیفیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ انسان کا ذہن اکثر اوقات ایک ہی بات پر اٹک جاتا ہے انشائیہ ''گالی دینا'' میں مصنف گالی دینے کے پیچھے کی داخلی کیفیت کو بیاں کرتے ہیں۔

"گالی بکنے والے لوگ عموماً داخلیت یا نرگسیت کے مریض ہوتے ہیں۔ایسے لوگ قسم قسم کے منصوبے بناتے ہیں۔محلاتی سازشوں میں شریک ہوتے ہیں۔سیاسی جوڑ توڑ کرتے ہیں۔ان کی گالی کمزوری ہوتی ہے لیکن شور زیادہ ہوتا ہے۔"[۹۰]

اس کے علاوہ مصنف "ریٹائرمنٹ کے بعد" ناسٹلجک کیفیت کو عمدہ طریقے سے بیان کرتے ہیں ریٹائرمنٹ کے بعد وقت رُک جاتا ہے اور انسان کو اپنے اردگرد جھٹپٹے کا منظر ہی نظر آتا ہے اور وہ کہیں ماضی کی یادوں میں کھو کر رہ جاتا ہے۔تاہم انشائیہ نگار کی نفسیاتی سوچ اپنے موضوعات کے گرد گھومتی ہے۔وہ اس کے لیے ایسے الفاظ کی تلاش کرتا ہے کہ اس کی افادیت و اہمیت اجاگر ہو سکے جو وہ اپنی تحریر میں مدع بیان کرنا چاہتا ہے۔اس کے لیے وہ نفسیاتی پہلوؤں کا سہارا لیتا ہے۔غلام جیلانی اصغر بھی اپنی تحریر کو انکشاف ذات کے ذریعے کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"جونہی آپ کوئی لفظ نوک زبان یا نوک قلم سے ادا کرتے ہیں۔تو اس کا ایک مرئی ہیولیٰ آپ کے ذہن کے کینوس پر نمودار ہوتا ہے۔یہ ہیولیٰ یا پیکر لفظ کا اصلی مفہوم ہوتا ہے۔باقی جو مفاہیم غیاث اللغات قسم کی گراں ڈیل کتابوں میں درج ہیں وہ تو محض ایک مفروضہ ہیں، یا لفظ کو سمجھنے کی ایک کوشش رائیگاں۔"[۹۱]

غلام جیلانی اصغر نے ذہنی کشمکش اور داخلی کیفیت کو اپنی تحریروں میں زیادہ ترجیح دی ہے بلکہ ان کی اولین ترجیح ہے۔نفسیات کے متعلق موضوعات کو چننا اور اس پر نوک قلم سے تحریر کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔جو انہوں نے بڑے احسن انداز میں سرانجام دیا ہے۔یہ ان کی اعلیٰ بصیرت، لازوال فکری سوچ اور مفکرانہ انداز بیان کا کمال ہے۔

۳۔مشتاق قمر کے انشائیوں کا نفسیاتی جائزہ:

مشتاق قمر کے انشائیوں میں نفسیاتی کشمکش کے ذہنی و جذباتی رویے ملتے ہیں۔انسان سائنسی ترقی کی وجہ سے ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔اس رفتار سے اس کے ذہنی و جذباتی کشمکش میں اضطراب بڑھ رہا ہے اور اس رجحان میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔اس کیفیت کو شاعر و ادیب نے بھی محسوس کیا ہے۔اس لیے ادب میں نفسیاتی جہت کو کثرت سے دیکھا جا سکتا ہے۔اس میں ذہنی اور جذباتی رویوں میں تبدیلی کے علاوہ داخلی و خارجی کیفیت میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔اہل بصیرت اس نفسیاتی الجھن کا حل اللہ تعالیٰ کے ذکر و افکار کو قرار دیتے ہیں جب کہ ادیب اس نفسیاتی کشمکش میں فطرت پرستی اور سکون کو ترجیح دیتے ہیں۔

مشتاق قمر کے انشائیوں میں انسان کی ذہنی کشمکش کو نفسیات سے منسلک کیا گیا ہے۔یہ معاشرہ نفسیاتی امراض میں مبتلا ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔امراض اور بیماریوں کے لیے علاج کے لیے آج کے

سائنس دانوں نے ادویات ایجاد کی ہیں۔ جبکہ ہماری نفسیات میں "دم" اور "عملیات" کو آج بھی ترجیح حاصل ہے۔ ان کے ایک انشائیہ میں اس ذہنی نفسیات کا تذکرہ کچھ یوں ملتا ہے:

> "سر درد سے لے کر سرطان جیسے موضوع مرض تک سائنس دانوں نے کیسی کیسی جادو اثر ادویات ایجاد کر رکھی ہیں۔ لیکن ان ادویات کے بارے میں ہمارا رویہ کچھ زیادہ قابل قدر نہیں ہوتا۔ ان کی بجائے اکثر ان پر اٹھ جانے والی رقوم بھی موضوع سخن بنی رہتی ہے۔ اس کے برعکس "عملیات" کے ذریعے سر درد جیسے معمولی مرض کو دور کر دینے کا مرض دعویٰ کر دینے سے ہی گھر گھر آپ کا چرچہ ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ سکہ رائج الوقت کے سب سے چھوٹے "ٹکڑوں" کے عوض سر درد کی مجزب حاصل کی جاسکتی ہے۔ تو ظاہر یہ متضاد ردعمل حیران کن ہے۔"[۹۲]

سماج و معاشرے میں نفسیات کو خاص مقام حاصل ہے۔ انسان کا ذہن جہاں قائل ہو گا وہ وہیں پر قائم رہتا ہے۔ بے شک اس کے خلاف پختہ دلیلیں بھی ہو مگر بے سود۔ مشتاق قمر نے ایسے ہی نفسیاتی کشمکش کو بیان کیا ہے۔ آج کا انسان نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہے کوئی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے تو کوئی جذباتی رویوں کے لیے نفسیات کا شکار ہے۔ مشتاق قمر انشائیہ "بال کٹوانا" میں انسان کی دوہری شخصیت پر قلم اٹھاتے ہیں کہ ہر انسان کے اندر دو شخصیتیں موجود ہوتی ہیں انسان کا ذہن کبھی ماضی کی یاد میں کھویا رہتا اور کبھی انسان کا ذہن مستقبل کے بارے میں بڑے بڑے منصوبے بناتا ہے گویا انسان اپنے اندر دو شخصیتیں رکھتا ہے۔

> "ہر انسان کے اندر بیک وقت دو شخصیتیں موجود ہوتی ہیں۔ ایک شخصیت ماضی کی نمائندہ ہے۔ اور دوسری کی حیثیت ایک ایسے نڈر ملاح کی سی ہے جو پُر آشوب وقت کے دھارے پر اپنی کشتی آگے ہی آگے بڑھائے چلے جاتا ہے۔"[۹۳]

اس طرح مصنف بڑھاپے پر بھی قلم اٹھاتے ہیں کہ بڑھاپے کی بھی دو اقسام ہیں اس میں سے ایک داخلی ہے اور دوسرا خارجی۔ مشتاق قمر معاشرے کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں اور انسان کے چھپے ہوئے گوشوں کو عیاں کرتے ہیں اور اکثر احساسات کی بھی ترجمانی کی گئی ہے۔ انسان اکثر اوقات زندگی میں بہت مشکلات کا سامنا کرتا ہے مگر وہ اس وقت کو اس وجہ سے گزار پاتا ہے کہ وہ ہنستا مسکراتا لمحہ یاد رکھتا ہے اور وہ اپنے پُر سکون وقت کو یاد کر کے اس سنگلاخ حقائق کو بھی ہنسی خوشی قبول کرلیتا ہے تاہم انسان کی ہر بات کے پیچھے اس کی نفسیات پوشیدہ ہوتی ہے۔

مشتاق قمر کے تمام انشائیوں میں نفسیاتی جہت کا مختلف انداز میں ذکر ملتا ہے۔ داخلی و خارجی کیفیت کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ انسان کی داخلی کیفیت خارجی کیفیت سے زیادہ ہے۔ انسان کی نفسیاتی اضطراب پر حیرانگی اور ان کی اصلاح اور حل کے لیے بھی مفید مشورے اور سبق آموز نصیحتیں بھی ملتی ہیں۔ اصل میں یہ نفسیاتی پہلو ادب کا ایک جزو بن چکا ہے۔ اس کے بغیر اب ادب ادھورا ہے۔

۴۔ جمیل آزر کے انشائیوں کا نفسیاتی جائزہ:

جمیل آزر کے انشائیوں کا مطالعہ کریں تو ان کی تحریروں میں نفسیاتی پہلو بھی ملتا ہے انسان کی داخلی و خارجی کیفیات زندگی کا اہم جز ہیں اور یہ زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے انشائیہ "نیم پلیٹ" میں داخلی کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے اس انشائیے کا موضوع ہی نفسیاتی پہلو کی عکاسی کرتا ہے۔ نیم پلیٹ سے شخصیت کا اندازہ لگانا کمال مہارت ہے۔ کسی ملازم کی وردی سے لے کر مکان کے باہر نیم پلیٹ آویزاں کرنے کا سفر انسان کے نفسیاتی پہلوؤں کو عیاں کرتا ہے جو اس کے ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرتی ہے۔ انشائیہ نگار اپنی تحریر کو مدلل دلائل سے پر اثر بنانے کی پوری کوشش کرتا ہے کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہ ہی درست ہے یہی ذہنی و داخلی کیفیت اور نفسیاتی جہت ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

> "کسی نے یہ بات بالکل غلط کہی ہے کہ چہرہ شخصیت کا ائینہ ہوتا ہے میں کہتا ہوں نیم پلیٹ شخصیت کا ائینہ ہے۔ اگر فرائیڈ زندہ ہوتا تو وہ میری رائے سے ضرور متفق ہوتا کیونکہ تحت الشعور کی لہروں کو دریافت کا سہرا اس کے سر ہے۔ آپ کسی کی ظاہری شکل و صورت سے دھوکہ کھا سکتے ہیں جیسا کہ محاورہ عام ہیں لیکن نیم پلیٹ تو ایک منہ بولتی تصویر ہے نامرد سخن نگفتہ، باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشند کے مطابق نیم پلیٹ کے یہ حروف آپ کی سرگوشی کے انداز میں کچھ کہتے ہیں۔"[۹۴]

مندرجہ بالا اقتباس میں فارسی محاورہ سے اپنی دلیل کو موثر بنانے کی کوشش نفسیاتی اور داخلی کیفیت کی عکاسی کی ایک عمدہ مثال ہے۔ پروفیسر جمیل آزر نے بھی دوسرے انشائیہ نگاروں کی طرح انکشاف ذات اور ذاتی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں انشائیے تحریر کیے ہیں۔ انسانی خصلت ہے کہ انسان اپنی بات اور دلائل کو ثابت کرنے کے لیے دوسروں کے دلائل کو رد کرتا ہے اور ایسی مثالیں تلاش کرتا ہے جو اس کے موقف کو مضبوط اور پختہ بنانے میں معاون و مددگار ثابت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر جمیل آزر بھی انسانی خصلت سے مجبور ہیں اور اس ہی رنگ میں رنگ دیے گئے ہیں۔

انشائیہ "ہوم سویٹ ہوم" میں مصنف بیرون ملک مقیم شخص کی نفسیات پر بھی بات کرتے ہیں کہ ایسا شخص برسوں بیرون ملک رہ کر اپنے وطن کی محبت اور اس کی روایات سے ہی جڑا رہتا ہے اور یہ انسان کی نفسیاتی کیفیت ہے کہ جہاں انسان نے اپنا بچپن گزارا ہو اور وہ اپنے ماضی کو نہیں بھول سکتا۔ اس طرح مصنف ناہیلزم، بے معنویت کے شکار لوگ اور باغی لوگوں پر بھی قلم اٹھاتے ہیں کہ ایسے لوگ اکثر کافی اور شراب کو پسند کرتے ہیں

تا کہ وہ مایوسی اور بے معنی زندگی کو ان مشروبات میں غرق کر سکیں۔ انشائیہ "نشہ" میں بھی مصنف نشہ کرنے والی کی ذہنی کیفیت کو بیان کرتے ہیں کہ نشے کی حالت میں انسان اکثر اپنی تحت الشعور میں چھپی خواہشات کا کھلم کھلا اظہار کرتا ہے اور بعض اقتدار کے نشے میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ ان کی دماغی کی حالت ہی خراب ہو جاتی ہے۔

مصنف انشائیہ "سنہری شاخ" میں بھی انسان کے اندر موجود خواہشات، تمناؤں اور آرزوؤں جیسے وحشی درندے پر قلم اٹھاتے ہیں جو انسان کے داخل پر پنجے گاڑے بیٹھا ہے۔

> "ہمارے اندر ایک بہت بڑا تاریک جنگل ہے خواہشوں، تمناؤں اور آرزوؤں کا ازل سے ابد تک پھیلا ہوا لامتناہی جنگل جس میں ہوس و حرص کے خونخوار وحشی درندے دندناتے پھرتے ہیں۔ ہم جب اپنی فکری اور روحانی قوتوں کے ذریعہ ان کا قلع قمع کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہم انسانیت کے عظیم مرتبہ پر سرفراز ہو جاتے ہیں لیکن جونہی ہماری گرفت ہوس کے ان وحشی درندوں پر سے ڈھیلی پڑتی ہے تو یہ بے قابو ہو کر اپنی حاکمیت کا اعلان کرتے ہیں۔"[۹۵]

اس کے علاوہ انشائیہ "بالک ہٹ" میں بچوں کے بارے میں فرائیڈ کی نفسیات کو بھی قلمبند کیا گیا ہے کہ بچے جب کسی چیز کو پانے کی شدید خواہش کرتے ہیں اور اگر اس بچے کے پاس اختیار ہو تو وہ پوری دنیا کو تہس نہس کر دیں اس کے علاوہ مصنف بچوں کی نفسیات کے بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ بچوں کی نفسیات میں شامل ہوتا ہے کہ وہ سب کی توجہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور بچوں میں کمال کی سُپر ایغو ہوتی ہے بچے ہمیشہ چاہتے ہیں کہ ان کے احساسات اور خیالات کا خصوصی خیال رکھا جائے۔ انشائیہ آرٹس سٹوڈنٹس میں سائنس کے سٹوڈنٹس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جب سائنس سٹوڈنٹس فوبیا کا شکار رہتے ہیں اور کسی بھی انجنیئرنگ اور میڈیکل کالج میں داخلہ لینے کو وہ زندگی موت کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور اکثر عدم تحفظ کا شکار رہتے ہیں۔

پروفیسر جمیل آزر نے بنیادی طور پر انسانی ذہن کے خیالات و احساسات اور اس سے سرزد ہونے والے افعال کو بیان کیا ہے یہی نفسیات ہے۔ کسی بھی انسان کی ہر بات، ہر تحریر، ہر فعل اور ہر نگاہ زاویہ اس کے ذہنی اور جذباتی رویے کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ گفتگو سے عیاں ہو یا خاموشی سے، مگر انسان کی ظاہری حالت کو بیان کرتا ہے۔ یہ نفسیاتی جہت کے تمام پہلو اس کی ذہنی اور فطری تسکین کا سبب بنتے ہیں۔ جمیل آزر نے اپنے انشائیوں میں اس روش کو اختیار کیا ہے۔ انہوں نے ذہنی اور فطری تسکین حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو بطور مثال پیش کیا ہے جبکہ یہ معاشرے کی ترجمانی ہوتی ہے۔

۵۔اکبر حمیدی کے انشائیوں کا نفسیاتی جائزہ:

اکبر حمیدی انشائیہ نگاری میں ایک بڑا نام ہے اور ان کا شمار ان انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے جو انشائیہ کی شعریات اور ان کی فن و تکنیکی کی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔اس طرح اپنے انشائیوں میں سماج اور معاشرے کے تمام موضوعات کی عکاسی کرتے ہیں۔ نفسیاتی جہت کے حوالے سے ان کی تحریروں میں داخلی و خارجی کیفیت اور ذہنی و جذباتی رویے کے نمونے کثرت سے ملتے ہیں۔ انسان کی کیفیت اور رویے اس کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لیے اکبر حمیدی کی تحریروں میں ان نفسیاتی پہلوؤں کا ذکر معاشرے اور سماج کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ان کے انشائیوں میں نفسیاتی جہت کے حوالے سے تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جذبوں اور رویوں کے بدلتے مزاج کو بہترین اسلوب سے دلکش بنایا ہے۔اپنے انشائیے"کورا کاغذ"میں نفسیات کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> "ہمارے علمائے نفسیات نے صدیوں کے بعد۔۔۔۔۔۔بڑی کاوشوں سے انسانوں میں نظریہ جبلت یا جینز دریافت کیا ہے۔ حالانکہ ہمارے دیہاتوں میں آسان زبان میں ہمیشہ سے اسے موروثی اثرات کہا جاتا ہے۔۔۔۔۔ اور میں نے تو ہمیشہ سے زیادہ عرصے سے اسے کاغذ کے کورے نہ ہونے کا اعلان کر رکھا ہے۔"[۹۶]

انسانی رویے پر علمائے نفسیات کی رائے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔انسان کی نفسیات میں یہ خصلت پائی جاتی ہے کہ وہ عرصہ دراز سے چلنے والی روایت کو یک دم یا فوراً ماننے سے انکاری ہوتا ہے۔ اس لیے وقت کے ساتھ ساتھ اس روایت کو حقائق کے ساتھ تسلیم کرتی ہے۔اکبر حمیدی نے اس نفسیاتی رویوں کا ذکر کثرت سے کیا ہے۔

اس طرح مصنف خواہش کرنے کی نفسیات پر بھی لکھتے ہیں جہاں خواہشات ہوتی ہیں وہاں خوشیاں بھی ہوتی ہیں اور خوشیاں یہاں ہی پروان چڑھتی ہیں اور اس سے ہی یہ دنیا گلزار بنتی ہے مصنف بڑھتی ہوئی عمر پر بھی لکھتے ہیں کہ جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے انسان پر ذمے داریاں بڑھتی جاتی ہیں اور انسان سنجیدہ ہو جاتا ہے۔اس طرح مصنف درمیانے طبقے کے بارے میں بھی لکھتے ہیں کہ درمیانے طبقے کے لوگ اکثر اوپر اور نیچے طبقے کی طرح کمپلیکس کا شکار رہتے ہیں کیونکہ اونچے طبقے کے لوگوں کے پاس خوراک کی زیادتی ہوتی ہے جو انہیں مشکل سے ہضم ہوتی ہے اور نچلے طبقے کے پاس خوراک کی کمی ہوتی ہے جس سے وہ بھوکے مرتے ہیں اس وجہ سے یہ دونوں طبقے کمپلیکس کا شکار رہتے ہیں جبکہ درمیانے طبقے کے لوگ بہت کم کمپلیکس کا شکار ہوتے ہیں۔ انشائیہ "درمیانی منزل"میں مصنف لکھتے ہیں:

"کامپلیکس چونکہ باہر سے حملہ آور ہوتا ہے اس لیے اس کی زد میں آیا ہوا ذہن اس سرزمین کی طرح ہے جس پر کسی خارجی طاقت نے قبضہ جما لیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت حال میں کنٹرول دوسرے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے اور اس سرزمین کے رہنے والے خود مختاری کی بجائے غلامی کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ درمیانی منزل کے رہنے والے ان دو انتہاؤں سے محفوظ ہوتے ہیں۔"[۹۷]

اس طرح انشائیہ "گالی دینے والے کی حمایت میں" مصنف گالی دینے کی نفسیات کے بارے میں لکھتے ہیں گالی دینے والا کا دل اکثر بغض و عناد سے پاک ہوتا ہے اور اس کے جذبات صاف سُتھرے ہوتے ہیں اور گالی نکالنے کی وجہ تزکیہ نفس بھی ہوتا ہے۔ اس طرح عادت کے بارے میں بھی مصنف لکھتے ہیں کہ عادی ہونے کی وجہ عادت کا غلام ہو جانا ہے اور جب کسی چیز کی عادت ہو جائے تو اسے روز کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے اور جسے کسی چیز کی عادت ہو جائے اس کا عادت کے بغیر ایک دن گزارنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

اس طرح بڑا آدمی بننے کے بعد کی نفسیات بھی مصنف بہت خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں کہ جوں جوں آدمی ترقی کرتا جاتا ہے اتنا ہی وہ لطف اندوز نہیں ہوتا اس کی حسیات کم ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ مصنف انشائیہ "یہ تو ندیں" میں خواب کے بارے میں کہتے ہیں۔ خواب ہمیشہ انسان کے تحت الشعور کی خواہشات کی عکاسی کرتے ہیں انسان کی جو خواہشات پوشیدہ ہوتی ہیں وہی انسان خواب میں بھی دیکھتا ہے اور بعض دفعہ تو انسان خواب سے اذیت محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے۔

اس کے علاوہ انشائیہ "دہشت گرد" میں مصنف والدین کا اپنے بچوں پر دباؤ کو بیان کرتے ہیں اگر بچے پر ان کی مرضی کے خلاف کچھ بننے کی خواہش کو اکسایا جائے تو ایسے بچے زیادہ تر دہشت گرد ہی بنتے ہیں اس لیے بچوں کی نفسیات کو سمجھا جائے اور اُن کی مرضی کے مطابق اس پر عمل کیا جائے۔

اس طرح انسانی خصلت میں شامل ہے کہ وہ بہت سے لوگوں سے مشورہ کرنے کے بعد اپنی مرضی کے مطابق ہی فیصلہ کرتا ہے۔ اسی حوالے سے بعض انسانی رویے دوسروں کے مشورے پر عمل درامد کرتے ہیں اور بعض اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے انشائیے "مشورہ" میں لکھتے ہیں کہ: "مشورہ کر لینا اچھی بات ہی سہی مگر اس میں قباحتیں زیادہ ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ اگر کوئی باقاعدہ مشورہ کرنا شروع کر دے اور یہ سمجھے کہ مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرنا چاہیے تو کچھ عرصے کے بعد وہ کوئی کام مشورے کے بغیر کر ہی نہیں سکتا اور یوں مشورہ دینے والوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن جاتا ہے۔"[۹۸]

انسانی نفسیات، خصلت اور رویے پر اکبر حمیدی کے خیالات و افکار بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے انکشاف ذات اور تجربات و مشاہدات کی روشنی میں نفسیاتی جہت کے موضوعات پر فن پارے اعلیٰ نمونے ہیں۔ یہ چیز اکبر حمیدی کو دوسرے انشائیہ نگاروں سے ممتاز اور منفرد کرتی ہیں۔

۶۔ مشکور حسین یاد کے انشائیوں کا نفسیاتی جائزہ:

مشکور حسین یاد کی تحریروں میں نفسیاتی جہت کا عنصر بہت نمایاں ہے کیونکہ انہوں نے ایم اے نفسیات کی سند حاصل کر رکھی تھی۔ ان کو نفسیاتی پہلوؤں پر گہری گرفت حاصل ہے اور نفسیاتی مطالعہ وسیع اور جامع ہے۔ اس لیے ذہنی کشمکش اور داخلی و خارجی کیفیتوں کو احسن انداز میں بیان کرنے میں کمال کی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں جہاں ذاتی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے تو اس میں انکشاف ذات میں وہی داخلی کیفیت پنہاں ہے، جو ان کو سچائی اور حقیقت لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ ان کا کمال ہے کہ انکشاف ذات میں زندگی کے خوبصورت اور دلکش واقعات کو بیان کرتے ہیں۔ انہی واقعات کو اسی طرح نفسیاتی رنگ دیا ہے کہ نفسیاتی مسائل اور ذہنی کشمکش حل ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں یہ نفسیاتی مسائل کو اجاگر کر کے ذہنی کشمکش کو بڑھانے کی بجائے فلسفیانہ انداز میں ان مسائل کا حل بتانے کی ایک کوشش کی ہے۔

مشکور حسین یاد کے انشائیہ مجموعہ "جوہر اندیشہ" کے ایک انشائیہ "تنہائی" میں تنہائی میں ذہنی کشمکش اور داخلی کیفیت کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں: "تنہائی ان لوگوں کو محرومیوں اور ناکامیوں کا احساس دلاتی ہے جو اس سے گریز کرتے ہیں۔ تنہائی سے پیار کے سلے میں خود اعتمادی حاصل ہوا کرتی ہے۔"[۹۹]

داخلی کیفیت میں جب ابہام پیدا ہو اور اس کے ساتھ ذہنی کشمکش میں بھی اضافہ ہو رہا ہو تو اس کے خاتمے کے بعد اپنے اندر اور داخلی کیفیت میں خود اعتمادی کی فضا بیدار ہونے لگتی ہے۔ تنہائی ایک ایسا جذبہ اور رویہ ہے جس کی کیفیت ہر کسی کے لیے مختلف ہے۔ دونوں صورتوں میں خود اعتمادی ہی اس کا نفسیاتی حل ہے۔

انشائیہ "نادانی کا شعور" میں مصنف انسانی نفسیات کو بیان کرتے ہیں اگر انسان اپنے آپ کو نادان تصور کرے تو پھر ہی علم حاصل کر سکتا ہے اور اس سے آگہی کا سفر دلچسپ بنتا ہے نیز انسانی نفسیات ہے کہ علم اور نادانی یکجا محسوس کرنے سے عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے کیونکہ علم اور نادانی دونوں مخالف چیزیں ہیں ایک سے خوشی ملتی ہے جبکہ دوسری اس پر ضرب لگانے سے بھی نہیں چونکتی۔

تاہم بنی نوع انسان کی کچھ جبلی صفات ہوتی ہیں جس سے وہ پیچھا نہیں چھڑا سکتا اور وہ صفات خیر و شر ،نیک و بد کی کشمکش ہے انسان کی نفسیات ہی ایسی ہے کہ انسان کا دماغ خیر و شر کی کشمکش میں کھو جاتا ہے گھبراہٹ اور بے چینی میں مبتلا رہتا ہے مشکور حسین یاد نے انسان کی اسی نفسیات کو انشائیہ ”انسانی معاشرہ و کردار“ میں بیان کیا ہے۔

اس طرح انشائیہ ”ہرجائی“ میں انسان کی نفسیات پر بحث کرتے ہیں کہ انسان کی خواہشات لامحدود ہیں اور اگر اس کی کوئی خواہش پوری نا ہو سکے تو انسان نفسیاتی طور پر اس سے نفرت کرنا شروع کر دیتا ہے انسان کی جتنی شدید خواہش ہو گی اتنی ہی لاحاصل چیز سے نفرت ہو گی اور وہ تضحیک و تحقیر کی نظر سے بھی اس چیز کو دیکھے گا۔

انسان زندگی میں بہت سے کارنامے سر انجام دیتا ہے اور وہ خواہش کرتا ہے کہ اس کے کارنامے کو معاشرے میں قدر و منزلت سے نوازا جائے اور اس کے کام کو سراہا جائے اور جب اس کی معاشرے میں قدر و منزلت کے حصول کی خواہش پوری نہیں ہوتی تو وہ نفسیاتی طور پر خوف و ہراس میں مبتلا ہو جاتا ہے اور زمانے سے شکوہ و شکایت کے راگ الاپتا رہتا ہے۔ تاہم مصنف انشائیہ ”اطمینان“ میں ذہنی کیفیت اطمینان پر بات کرتے ہیں کہ اطمینان ذہن کی ایسی کیفیت ہے جس کے بغیر انسان جمود کا شکار ہو جاتا ہے تاہم زندگی میں خضوش رہنے کے لیے اطمینان بہت ضروری ہے اور جب کوشش اور سعی لاحاصل سے اپنی منزل حاصل کر لیتا ہے تو یہ اس کے لیے ذہنی سکون کا باعث بنتا ہے اور یہ رویہ انسان کے ذہن پر مثبت اثرات چھوڑتا ہے۔

> ”اطمینان انسان کی اس ذہنی کیفیت کا نام ہے جس کے حصول کے بعد وہ زندگی کے ہر سرد و گرم سے مردانہ وار گزر جاتا ہے۔ اس کی اس کیفیت میں بے قراری بھی ہوتی ہے اور قرار بھی۔ ایک مطمئن انسان بے قرار اس لیے ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی ہر خوبی کو اپنے میں جذب کرنے کی آرزو رکھتا ہے پھر اس کی یہ آرزو اسے محض خیالی انسان ہی نہیں رہنے دیتی بلکہ مسلسل سعی و عمل کے لیے اکساتی رہتی ہے۔“[۱۰]

مشکور حسین یاد کے انشائی مجموعے ”وقت کا استعارہ“ کے ایک انشائیے "آشوب آگہی" میں نفسیاتی جہت کے موضوعات میں ان کے خیالات منفرد ہیں۔ انسان کا یہ ایک نفسیاتی پہلو ہے کہ وہ ہمیشہ خود کو سمجھدار اور عقلمند سمجھتا ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے اپنے انشائیہ میں اس صورتحال کو یوں بیان کیا ہے: ”آزاد سے آزاد انسان بھی اپنے کسی فعل کو ہر وقت جاری نہیں رکھ سکتا۔ لیکن وہ سمجھنے کے فعل میں ہر وقت مصروف رہتا ہے۔ انسان چونکہ بہت زیادہ سمجھتا ہے۔ اس لیے سمجھنے میں غلطیاں بھی بہت زیادہ کرتا ہے بلکہ جتنی غلطیاں انسان سمجھنے میں کی ہیں اتنی غلطیاں کسی دوسرے فعل میں اس نے روز اول سے لے کر آج تک نہیں کیں۔“[۱۱]

مشکور حسین یاد نے نفسیاتی پہلوؤں کو احسن انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے انسان کو مورد الزام بھی ٹھہرایا ہے۔ اس کی اصلاح بھی کی ہے۔ ان نفسیاتی مسائل کے حل کے لیے تجاویز بھی بیان کی ہیں۔ ذہنی کشمکش کے باہر نکلنے اور داخلی و خارجی کیفیتوں کے مثبت اثرات کو سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

۷۔ نظیر احمد صدیقی کے انشائیوں کا نفسیاتی جائزہ:

نظیر صدیقی ایک ایسے انشائیہ نگار ہیں جنہوں نے نفسیاتی عوامل کو اپنے انشائیہ میں بیان کیا ہے اور ان کے اس بیان کرنے کا انداز بہت قابل ستائش ہے۔ کسی ادیب کا کمال فن یہ ہے کہ وہ اپنی سوچ اور فکر کے علاوہ معاشرے میں موجود افراد کی سوچ کو الفاظ کی شکل دیتا ہے۔ مصنف افراد کی سوچ کو ایسے الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ وہ معاشرے کی مکمل عکاسی کرتا ہوا ظاہر ہو۔ نظیر صدیقی نے اپنے انشائیوں میں نفسیاتی عوامل کو بہت احسن اور منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ مذہبی پیروکاروں کے ذہن میں مذہب یا فرقے کا جو خاکہ آج کے معاشرے میں پایا جاتا ہے وہ انہوں نے اپنے اس انشائیہ "جہاں میں رہتا ہوں" میں اس طرح پیش کیا ہے کہ:

> "ہر مذہب کے پیرو اپنے مذہب کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ مذہب سے ان کی محبت کا یہ عالم ہے کہ مذہب کے نام پر ہمیشہ مرنے مارنے کو تیار رہا کرتے ہیں لیکن ہر فرقے کے مذہب میں جو اخلاقی نفسیات پائی جاتی ہیں ان پر عمل کوئی نہیں کرتا۔ غرض کے لوگ خدا کی عبادت تو ضرور کرتے ہیں لیکن اس کی اطاعت بالکل نہیں کرتے۔"[۱۰۲]

انسانی نفسیات یہی ہے کہ وہ اپنے معاشرے میں ان عناصر کو منتخب کرتا ہے جو معاشرے میں اس شخص کے لیے آسانیاں پیدا کرے اور جو عناصر اس شخص کو اپنے لیے موزوں لگیں۔ مذہبی رسومات کا چناؤ ہو یا سیاسی مفادات کا انسان اپنی فطرت کے مطابق ایسے لوگوں کا انتخاب کرتا ہے جو ایسی بات کریں جو انسان کی نفسیات کو متاثر کرے اور اس کو اپنے لیے آسان اور خوش آئند ہ لگے۔ نظیر صدیقی نے بھی مذہبی رسومات اور عبادت خدا کے بارے میں انسانی نفسیات کی بالکل درست عکاسی کی ہے کہ ایک انسان خدا کی عبادت تو کرتا ہے لیکن وہ زندگی گزارنے کے لیے جو بہترین اصول بیان کرتا ہے اس پر عمل پیرا نہیں ہوتا یعنی خدا کی اطاعت نہیں کرتا ہے۔ ایک مصنف خارجی کیفیات کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ جیسے کوئی شخص تخیل میں سوچ رہا ہو اور اس کی آواز سنائی دے اور نظیر صدیقی نے کسی بھی طرح کے عمل کو الفاظ میں ایسے ڈالا ہے کہ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی انسان کسی کی نہیں بلکہ اپنی ہی سوچ میں اونچی آواز میں بول رہا ہو۔ نظیر صدیقی انسانی جذبات کو بھی بہت خوبصورتی سے

پیش کرتے ہیں انسان اپنے جذبات کو بھی تسکین دینے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرتا ہے اس میں سے ایک جذبہ فخر کا جذبہ بھی ہے اس طرح مصنف انشائیہ "بیٹھے بٹھائے" میں انسان کی فطرت پر لکھتے ہیں:

"دراصل یہ انسان کی فطرت ہے جو کام انسان کے لیے جتنا ضروری قرار دیا جائے گا وہ اس سے اتنا ہی کترائے گا اسے جس سمت کے سفر سے جتنا روکا جائے گا وہ اس سمت کے سفر اتنا ہی مصر ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو احتراز سے زیادہ ارتکاب میں ،ثواب سے زیادہ گناہ میں، حلال سے زیادہ حرام میں اور منکوحہ سے زیادہ محبوبہ میں کشش محسوس ہوتی رہی ہے۔"[۱۰۳]

اس طرح انشائیہ "بیسویں صدی (چالیسویں صدی کے نقطہ نظر سے)" میں مصنف ماہریں نفسیات اور قانون کے تصادم کو زیر بحث لاتے ہیں ماہر نفسیات کے مطابق اگر کوئی مجرم جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ ریض ہے اس کو سزا دینے کی بجائے اس کا علاج کیا جائے جبکہ قانون کی نظر میں اگر کوئی شخص کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے سزا ضرور دی جائے۔

تاہم نظیر صدیقی نے انسانی نفسیات کو اس طرح اپنے انشائیوں میں پیش کیا ہے کہ قاری کو وہ معاشرے کا حصہ محسوس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے دفتر میں کام کرنے والے ایک شخص کی نفسیات کو یوں بیان کیا ہے کہ:

"اگر آپ شام کے وقت دفتر سے فارغ ہونے کے بعد اپنے دوستوں سے ملیں اور گفتگو میں دفتر کی باتیں دفتر کی اصطلاحات میں بیان کرنے لگیں تو آپ کے تمام دوست آپ کو متفقہ طور پر بور سمجھنے لگے لیکن اپ کو بور سمجھنے والوں میں اگر کوئی شخص خود اس عادت میں مبتلا ہو تو وہ ہرگز اپنے آپ کو بور نہ سمجھے گا۔"[۱۰۴]

نفسیات کو الفاظ کی شکل دینا ایک ایسا فن ہے جس سے مصنف کی اپنی شعوری طاقت کا اندازہ ہوتا ہے اور نظیر صدیقی نے اپنی شعوری طاقت کو بہت احسن انداز میں اپنے انشائیوں کا حصہ بنایا ہے۔

۸۔ صلاح الدین حیدر کے انشائیوں کا نفسیاتی جائزہ:

ہر ادیب کی طرح صلاح الدین حیدر کے انشائیوں میں بھی نفسیاتی پہلوؤں کا تذکرہ ملتا ہے۔ نفسیاتی جہت کے پہلوؤں کے ساتھ ذہنی و جذباتی رویے اور داخلی و خارجی کیفیت پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ انکشاف ذات دراصل داخلی و ذہنی کیفیت کا نام ہی ہے۔ ادب میں اکثریتی تحریریں انکشاف ذات کی وجہ سے تحریر کی جاتی ہیں۔ اس لیے یہ

کہنا بے جانہ ہو گا کہ انکشاف ذات میں نفسیاتی پہلوؤں کو بیان کیا جاتا ہے اور تقریباً ہر مضمون، انشائیہ، کالم، افسانہ اور ناول میں نفسیاتی موضوعات کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔

صلاح الدین حیدر کے انشائیوں میں اکثر مقامات پر انکشاف ذات کے پردے میں داخلی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کے انشائیہ "قصہ شرافت کا" کے آغاز میں نفسیات کا تذکرہ مل جاتا ہے:

> "میں ایک شریف آدمی ہوں اور شریف آدمی بے وقوف کی صحت مند صورت ہے۔ یوں تو خیر ہر شخص میں ایک بے وقوف چھپا ہوتا ہے اور زیادہ واضح اور نفسیاتی لفظوں میں یوں کہہ لیجئے۔ کے تحت الشعور میں ایک گدھا کار فرما ہوتا ہے۔ لیکن میں گدھی اور انسان کی بحث میں زیادہ اُلجھنا نہیں چاہتا۔ گدھے کا ایک اپنا الگ منصب اور مقام ہے اور میرے لیے یوں بھی قابل احترام ہے۔"[۱۰۵]

صلاح الدین حیدر کا مندرجہ بالا اقتباس میں طنز و مزاح کی شکل میں داخلی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ صلاح الدین حیدر کی نظر میں گدھا جس طرح کام کرتا ہے آج کا انسان بھی اس طرز پر عمل پیرا ہے اور آج کا انسان غور و فکر کرنے سے عاری ہے یہ نظریہ ان کے نفسیاتی سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔

انشائیہ "باتیں نیند اور خوابوں کی" میں مصنف خواب اور خواب کی نفسیات پر بات کرتے ہیں اگر انسان کو خواب آنا بند ہو جائیں تو انسان کی زندگی بہت مشکل سے گزرتی ہے اس طرح اگر لوگ اچھے خواب دیکھیں گے تو پوری دنیا میں ہونے والے واقعات بہت اعلیٰ ہوں گے اس لیے اچھے خواب دیکھنا بہت ضروری ہیں اور اکثر اوقات خواب آپ کی نا پوری ہونے والی خواہشات ہی کو ظاہر کرتے ہیں۔ تاہم نفسیات کا ایک اور موضوع جنس بھی ہے صلاح الدین حیدر انشائیہ "بیان منافقت کا" میں جنس پر بات کرتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں جنسی خواہشات کو کچل دیا جاتا ہے اور اس وجہ سے معاشرے میں بہت سی برائیاں جنم لیتی ہیں اور اگر طویل عرصے سے اس جنسی خواہش کو کچلا جائے تو اکثر لوگ فنکار بن جاتے ہیں اور کچھ پر تو جنون طاری ہو جاتا ہے اور اگر یہ سب بھی نہ ہوں تو واعظ ضرور بن جاتے ہیں اور فحاشی پر لمبی لمبی تقریریں جھاڑنے لگتے ہیں۔

صلاح الدین حیدر کی تحریروں میں "تحت الشعور" کا ذکر دوسرے انشائیہ نگاروں کی نسبت زیادہ ملتا ہے۔ وہ اپنی بات کو دلیل کے ساتھ بیان کرنے کے عادی ہیں۔ یہ نفسیاتی سوچ کہہ لیں یا فن کمال کا منہ بولتا ثبوت، الغرض ان کے انشائیوں میں نفسیاتی موضوعات کو منفرد اور جداگانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کے انشائیہ "جاگیر دار اور برخوردار" میں غریبی کو کچھ یوں بیان کیا گیا ہے:

"زندہ دلی تنخواہ کی کمی اور عقل کی زیادتی کی وجہ سے دب کر رہ جاتی ہیں۔ سفید پوش زندہ دلی کو اپنے تحت الشعور میں لے جاتے ہیں۔ زندگی کی لذتوں کو بشمول لذت گناہ تحت الشعور کے ساتویں ڈربے میں لے جاتے ہیں۔"[۱۰۶]

صلاح الدین حیدر نے اپنے انشائیوں میں داخلی و ذہنی کیفیت کو زیادہ ترجیح دی ہے۔ سماج کے افراد اور معاشرتی نفسیات کو بخوبی جانتے ہیں۔ اس لیے نفسیاتی پہلوؤں پر دوسرے انشائیہ نگاروں کی نسبت صلاح الدین حیدر کی گرفت مضبوط اور پائیدار رہی ہے۔ اس لیے انکشاف ذات کے رنگ میں نفسیاتی موضوعات پر گفتگو کرنا ان کے لیے معمولی سی بات ہے۔

۹۔ڈاکٹر قیصر شہزاد کے انشائیوں کا نفسیاتی جائزہ:

ڈاکٹر قیصر شہزاد کے انشائیے مجموعے "لطف آگہی" میں نفسیاتی موضوعات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ شہزاد قیصر کے مجموعہ انشائیہ "صاف چھپتے بھی نہیں" کہ انشائیہ کے موضوعات پر نظر ڈالی جائے تو فلسفیانہ سے نفسیاتی جہت کا سفر صاف نظر آتا ہے۔ نفسیاتی موضوعات اور پہلوؤں کا ذکر ان کی تحریروں میں جابجائے ملتا ہے۔ رشتے کی تلاش، آنکھ مچولی مہمان خصوصی، خط، نام اور بچوں کی نگہداشت جیسے انشائیہ کے موضوعات نفسیاتی جہات پر مبنی ہیں۔ انشائیہ "رشتے کی تلاش" میں سماج اور معاشرے کے رسم و رواج کی عکاسی کی گئی ہے۔ رشتے کی تلاش میں شیر خوارگی سے لے کر بڑھاپے تک رشتے کی تلاش کے مراحل کو نفسیاتی موضوعات میں پیش کیا گیا ہے۔ "مہمان خصوصی" انشائیہ میں طنز و مزاح کے رنگ میں نفسیاتی پہلو کا عنصر زیادہ ملتا ہے چونکہ یہ ایک منفرد موضوع ہے۔ اس کے بے شمار معنوں کے ساتھ بے شمار پہلو بھی ہیں۔ انشائیہ نگار نے صرف چند کا ذکر کیا ہے۔ انشائیہ "ماہر نفسیات" ہی نفسیات کے ماہرین پر لکھا گیا انشائیہ ہے۔ ماہرین نفسیات کی نظر میں بچوں کو ڈانٹنا ان کو قتل کرنے کے ہی برابر ہے اس سے بچوں میں احساس کمتری کا جنم ہوتا ہے۔ اس طرح انشائیہ "کہتے ہیں جس کو عشق" میں بچپن میں عشق کے عارضے میں مبتلا بچوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ انشائیہ "قرض کی پیتے تھے مے" میں مصنف مقروض کی نفسیاتی حالت اور مقروض کو دباؤ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"مقروض اکثر قرض خواہ سے اس طرح گفتگو کرتا ہے جیسے کوئی شرمیلا لڑکا کسی لڑکی کے باپ سے اپنے لیے رشتہ مانگ رہا ہو۔ ہر دفعہ اسے اسے ایک نئی تاریخ ملتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ کسی دیوانی عدالت میں مقدمہ بھگت رہا ہے۔"[۱۰۷]

اس طرح انشائیہ "بچوں کی نگہداشت" میں مصنف نفسیاتی پہلو کو بیان کرتے ہیں کہ اکثر والدین کی محرومیوں کے بچوں پر اثرات ہوتے ہیں والدین جن محرومیوں کا شکار ہوتے ہیں اکثر بچے بھی ان میں مبتلا ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ مصنف بہانے کے پیچھے نفسیات کو بھی بیان کرتے ہیں۔بہانہ لگانے والا اکثر خود کو مجبور سمجھتا ہے مگر وہ حقیقی طور پر آزاد ہوتا ہے کہ سچ کا سامنا کرے مگر سچائی کا انتخاب وہ خوف کی وجہ سے نہیں کر پاتا جو بہانہ لگانے والے پر اس وقت مسلط ہوتا ہے۔

انشائیہ بوریت میں بھی مصنف بور ہونے کے پیچھے بہت سی وجوہات اور بوریت کی نفسیات پر بات کرتے ہیں کہ زیادہ تر بور ہونے کی وجہ یکسانیت ہے اکثر اوقات ایک ہی کام کی عادت بن جاتی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی اور نہ ہی کوئی انوکھا پن پیدا ہوتا ہے اور اس وجہ سے ہی آدمی بوریت کا شکار ہو جاتا ہے اور بور ہونا بھی ایک نفسیاتی عمل ہے اور جو بور نہیں ہوتا اسے ماہر نفسیات سے رابطہ کرنا چاہیئے۔انشائیہ "مصوری" میں مصنف مصور کی مصوری کو نفسیاتی نکتہ نظر سے یوں بیان کرتے ہیں۔

> "نفسیاتی کیفیات کی تصویر کشی کرنا پرلے درجے کی تحلیل نفسی ہے۔کیا کسی کے جسمانی و ذہنی اُتار چڑھاؤ کو منعکس کرنا حقیقی آرٹ ہے؟اس سے تو فقط انسان کی ادنیٰ جبلتوں اور ہیجانی تصورات کا ہی اظہار ہوتا ہے۔"[۱۰۸]

اس کے علاوہ مصنف مختلف جذبات جیسے انا، شک اور عشق وغیرہ کی نفسیاتی کیفیات پر بھی قلم اٹھاتے ہیں تاہم مصنف داخلی و خارجی احساسات کی ترجمانی بھی کرتے ہیں کہ کس طرح انسان کے رویے میں اسکی انفرادیت جھلک رہی ہوتی ہے اور اس کے رویے لاشعور اور تحت الشعور کے پیچھے پوشیدہ خواہشات کی عکاسی کرتے ہیں۔ "پنشن خوار" میں بھی ایک سرکاری ملازم کو پینشن کے اصول کے لیے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ان پر اپنے طنزیہ کلماتِ کے ذریعے اصلاح کی پہلو اجاگر کیے ہیں۔سماج اور معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو نفسیاتی موضوعات پر تحریر کرنا ایک بہترین اور کامیاب انشائیہ نگار کی نشانی ہے۔اس میں زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو بیان کیا جاتا ہے۔سماج کی منفی سرگرمیوں کو نفسیاتی رنگ میں اجاگر کرنا معمولی بات نہیں ہے۔انشائیہ "پنشن خوار" سے ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

> "اگر کسی کے نصیب پر پتھر پڑے ہوں تو کھلے دفتر بھی بند ہی ملتے ہیں۔ایک دن خدا جانے کیا ہوا کہ وہ اہلکار انہیں اپنے افسر کی کرسی پر براجمان مل گیا۔اس نے آدھے گھنٹے کی بے نیازی کے بعد ان سے کاغذات لیے اور ان کی پرچول کرنے لگا۔چونکہ کاغذات مکمل تھے اس لیے وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا اور غضب ناک انداز میں کہنے لگا "میرے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم مرے نہیں اور ابھی تک زندہ ہو؟"[۱۰۹]

نفسیاتی موضوعات پر لکھنا غیر معمولی بات ہے اس کے لیے حوصلہ، جرت مندی اور بہادر ہونا اولین شرائط میں سے ایک ہے۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر نے نہ صرف نفسیاتی موضوعات پر لکھا بلکہ طنزیہ انداز میں اس کی اصلاح کی کوشش بھی کی ہے۔ غور و فکر اور فکر کی نئ جہتیں بھی ایجاد کی ہیں۔ نفسیاتی موضوعات میں رسم و رواج، گھریلو زندگی کے مسائل اور معاشی پہلوؤں جیسے موضوعات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ شہزاد قیصر کے انشائیہ مجموعے کے تیسرے حصے "آئینہ بنے ہے پیراہن" میں نفسیاتی موضوعات پر انشایئے لکھے گئے ہیں۔ جن میں لنڈا بازار، دوپٹہ، شک، دھاندلی، ہاتھ اور حافظ قابل ذکر ہے۔ ان کے سماجی اور فلسفیانہ موضوعات میں نفسیاتی موضوعات کی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ اس کے داخلی و خارجی پہلوؤں کے حوالے سے ڈاکٹر سید معین الرحمن لکھتے ہیں:

> ”خارج سے باطن کے اس سفر اور عرفان نے ان کے انشائیوں کو تہہ در تہہ، خیال انگیز اور رسدار بنادیا ہے۔ یہ انشایئے، ان کی فکری، پختگی، ان کے گیان دھیان اور معرفت کے مظہر ہیں۔ اگرچہ ایک زیریں لہر کے طور پر ان کی لطیف، فطری نرم روی، آہستگی، سادگی اور شائستگی کا مشاہدہ ان کے تازہ ترین انشائیوں میں بھی کیا جا سکتا ہے۔“[۱۰]

شہزاد قیصر کے موضوعات اور ان کی تحریروں کے موضوعاتی مطالعہ سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ ان میں سماجی، فلسفیانہ اور نفسیاتی موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے اور انشائیہ نگار کی ان موضوعات پر گرفت مضبوط اور پختہ ہے۔

۱۰۔ ارشد میر کے انشائیوں کا نفسیاتی جائزہ:

ارشد میر کے انشائیوں میں سماجی زندگی میں ہونے والے مختلف رجحانات کا نفسیاتی مطالعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی تناظر میں ان کے انشائیوں میں موضوع کے مختلف مراحل ہیں۔ ارشد میر نفسیاتی یا سماجی مطالعہ کو انشائیہ کے موضوع کی مدد سے ایک ایسی ڈگر پر ڈال دیتے ہیں جو امکانات اور معنویت کو مسلسل آگے کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اس راہ پر ارشد میر کا شگفتہ انداز بیان اور غور و خوص کا انداز ان کی فکری گہرائی سے روشناس کرواتا ہے۔ اس کی مثال ان کے انشایئے کڑھنا میں دیکھیئے: ”کڑھنے کی جولانگاہ ذہن کی پر فریب وادی ہے جہاں وہ کبھی ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتا ہے۔ تو کبھی کچھوے کی طرح رینگنے کے عمل کو دہراتا ہے۔ گاہے گاہے ترنگ میں آکر منہ کا ذائقہ بدلنے کی خاطر قلبی واردات کی نشاندہی بھی کر دیتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر اس کے اندر جھانک کر سربستہ راز تلاش کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔“[۱۱]

ارشد میر کے انشائیے "تولیہ"، "نعرہ" اور "دوپٹہ" کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے انشائیے میں گہرا مشاہدہ، تنقیدی بصیرت، اور شگفتگی کے حامل ہیں اور انشائیہ نگار نفسیاتی موضوعات اور افراد کی تمام تر سرگرمیوں اور حرکات و سکنات کے ساتھ پرکھنے اور منفرد انداز میں پیش کرنے پر قادر ہے۔ ان کے نفسیاتی موضوعات بھی نئے ہیں اور ان پر گہرائی کے ساتھ غور و فکر کے بعد مصنف نے جو نتائج بر آمد کئے ہیں انھیں انشائی انداز میں جزو تحریر بنایا ہے۔ ذاتی واردات کا فقدان ہونے کے باوجود ان کے تاثرات انشائیہ نگار کی ذات کے لمس آشنا ہیں۔

د۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا موضوعاتی تقابل:

اگر دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا نفسیاتی تقابل کیا جائے تو وزیر آغا انشائیوں میں بھی نفسیاتی عناصر دیکھے جاسکتے ہیں۔ وزیر آغا نے انسانی فطرت کے ان پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے کہ انسان میں روز اول سے ہی مستقل مزاجی کا عنصر مغلوب ہے جبکہ تبدیلی اور سفر کا عنصر غالب ہے۔ وزیر آغا انشائیہ "معافی مانگنا" میں معافی مانگنے کی نفسیات کے بارے میں بتاتے ہیں کہ جب کوئی شخص معافی مانگنے کی خواہش کرتا ہے تو اس طرح وہ اپنی ذات کی کسی پوشیدہ طاقت کو ظاہر کرتا ہے یعنی وہ کسی شخص کے پتھر دل میں سے مخفی چشمے کو نکلنے کا رستہ فراہم کرتا ہے۔ اس طرح مصنف موسموں کے انسان پر اثرات کو بھی نمایاں کرتے ہیں کہ موسم انسان کی نفسیات پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ موسم بہار میں انسان کے جذبات اکثر مثبت ہوتے ہیں اور خزاں کے موسم میں یہی جذبات منفی ہو جاتے ہیں اور انسان کو تھکا دیتے ہیں اور جب بسنت کا موسم آتا ہے تو انسان کا تخیلی جذبہ بھی بلند ہو جاتا ہے تاہم مصنف مختلف جذبات جیسے کہ خوف اور تنہائی کی نفسیات کو بھی انشائیہ "اکلاپا اور تنہائی" میں بیان کرتے ہیں۔ اکثر جب انسان تنہا ہوتا ہے تو یہ محسوس کرتا ہے کہ انسان کے اپنے اور دشمن، غم اور خوشی سب اسے چھوڑ گئے ہیں اور وہ شخص بالکل اکیلا رہ گیا ہے اور ہر شخص اس سے کترانا شروع کر دیتا ہے۔

اس طرح انشائیہ واپسی میں بھی مصنف واپسی کے سفر کی نفسیاتی کیفیت کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں علاوہ ازیں مصنف ایک ناصح کی نفسیاتی کیفیت کو بھی بیان کرتے ہیں کہ جب ناصح کسی کو نصیحت کرتا ہے تو اس کو یہ مولوم ہوتا ہے کہ اس کی نصیحت کسی پر اثر نہیں کرے گی اور یہ ایک سعی لاحاصل کام ہے پھر بھی وہ نصیحت کرنے سے باز نہیں آتا وزیر آغا انشائیہ لکھتے وقت گہرے تجربے اور مشاہدے سے کام لیتے ہیں اور وہ انسان کے رویوں کی نفسیات کو بہت عمدگی سے صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں۔ وزیر آغا کی تحریروں میں نفسیاتی جہت کے پہلو احساس، جذبے،

رویے، داخلی و خارجی کیفیت کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ احساسات زندہ رہنے کے لیے بہت ضروری ہیں۔ ان کے بغیر زندگی موت کے مترادف ہے۔ انسان انہی جذبوں اور رویوں کے بل بوتے زندگی سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔ خوشی و غمی میں یہیں داخلی خارجی کیفیتیں انسان کے چہرے پر عیاں ہوتی ہیں۔ انسان کی نفسیات میں شامل ہے کہ وہ ان کے بغیر زندہ رہنا گوارا نہیں کرتا ہے۔ یہ ایک کائناتی حقیقت ہے۔ یہی کائناتی حقیقت وزیر آغا کو دوسرے انشائیہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔

غلام جیلانی اصغر سماج کی نفسیات سے بخوبی آگاہ رہتے ہیں۔ اس لیے موضوعات کو ایسا رنگ دیتے ہیں کہ اسلوب و انداز تحریر نفسیاتی رویے کے مترادف محسوس ہو۔ سماج کے افراد اور اپنے انشائیوں کے کرداروں کے ذہنی کشمکش کو اپنی گرفت میں رکھتے ہوئے تحریر کرنے کا فن بخوبی جانتے ہیں۔ اس سے وہ انشائیہ کے مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ نفسیاتی موضوعات میں ذہنی کشمکش اور جذباتی رویے کے ساتھ داخلی و خارجی کیفیت پر خصوصی دھیان بھی دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں یونان کے فلاسفروں کی طرح فلسفیانہ اور مفکرانہ سوچ کے علاوہ نفسیاتی پہلو کے رنگ ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ مصنف "ریٹائرمنٹ کے بعد" ناسٹلجک کیفیت کو عمدہ طریقے سے بیان کرتے ہیں ریٹائرمنٹ کے بعد وقت رُک جاتا ہے اور انسان کو اپنے ارد گرد جھٹپٹے کا منظر ہی نظر آتا ہے اور وہ کہیں ماضی کی یادوں میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ تاہم انشائیہ نگار کی نفسیاتی سوچ اپنے موضوعات کے گرد گھومتی ہے۔ غلام جیلانی اصغر نے ذہنی کشمکش اور داخلی کیفیت کو اپنی تحریروں میں زیادہ ترجیح دی ہے بلکہ ان کی اولین ترجیح ہے۔

مشتاق قمر کے انشائیوں میں انسان کی ذہنی کشمکش کو نفسیات سے منسلک کیا گیا ہے۔ مشتاق قمر نے ایسے ہی نفسیاتی کشمکش کو بیان کیا ہے۔ مشتاق قمر انشائیہ "بال کٹوانا" میں انسان کی دوہری شخصیت پر قلم اٹھاتے ہیں کہ ہر انسان کے اندر دو شخصیتیں موجود ہوتی ہیں انسان کا ذہن کبھی ماضی کی یاد میں کھویا رہتا اور کبھی انسان کا ذہن مستقبل کے بارے میں بڑے بڑے منصوبے بناتا ہے گویا انسان اپنے اندر دو شخصیتیں رکھتا ہے۔ اس طرح مصنف بڑھاپے پر بھی قلم اٹھاتے ہیں کہ بڑھاپے کی بھی دو اقسام ہیں اس میں سے ایک داخلی ہے اور دوسرا خارجی۔ مشتاق قمر معاشرے کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں اور انسان کے چھپے ہوئے گوشوں کو عیاں کرتے ہیں اور اکثر احساسات کی بھی ترجمانی کی گئی ہے۔ مشتاق قمر کے تمام انشائیوں میں نفسیاتی جہت کا مختلف انداز میں ذکر ملتا ہے۔ داخلی و خارجی کیفیت کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ انسان کی داخلی کیفیت خارجی کیفیت سے زیادہ ہے۔ انسان کی نفسیاتی اضطراب

پر حیرانگی اور ان کی اصلاح اور حل کے لیے بھی مفید مشورے اور سبق آموز نصیحتیں بھی ملتی ہیں۔ اصل میں یہ نفسیاتی پہلو ادب کا ایک جزو بن چکا ہے۔ اس کے بغیر اب ادب ادھورا ہے۔

جمیل آزر کے انشائیوں کا مطالعہ کریں تو ان کی تحریروں میں نفسیاتی پہلو بھی ملتا ہے۔ ان کے انشائیہ "نیم پلیٹ "میں داخلی کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے اس انشائیے کا موضوع ہی نفسیاتی پہلو کی عکاسی کرتا ہے۔ نیم پلیٹ سے شخصیت کا اندازہ لگانا کمال مہارت ہے۔ کسی ملازم کی وردی سے لے کر مکان کے باہر نیم پلیٹ آویزاں کرنے کا سفر انسان کے نفسیاتی پہلوؤں کو عیاں کرتا ہے جو اس کے ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ انشائیہ "بالک ہٹ" میں بچوں کے بارے میں فرائیڈ کی نفسیات کو بھی قلمبند کیا گیا ہے کہ بچے جب کسی چیز کو پانے کی شدید خواہش کرتے ہیں اور اگر اس بچے کے پاس اختیار ہو تو وہ پوری دنیا کو تہس نہس کر دیں اس کے علاوہ مصنف بچوں کی نفسیات کے بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ بچوں کی نفسیات میں شامل ہوتا ہے کہ وہ سب کی توجہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور بچوں میں کمال کی سُپر ایغو ہوتی ہے۔ پروفیسر جمیل آزر نے بنیادی طور پر انسانی ذہن کے خیالات واحساسات اور اس سے سرزد ہونے والے افعال کو بیان کیا ہے یہی نفسیات ہے۔

نفسیاتی جہت کے حوالے سے اکبر حمیدی کی تحریروں میں داخلی وخارجی کیفیت اور ذہنی وجذباتی رویے کے نمونے کثرت سے ملتے ہیں۔ انسان کی کیفیت اور رویے اس کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لیے اکبر حمیدی کی تحریروں میں ان نفسیاتی پہلوؤں کا ذکر معاشرے اور سماج کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ ان کے انشائیوں میں نفسیاتی جہت کے حوالے سے تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جذبوں اور رویوں کے بدلتے مزاج کو بہترین اسلوب سے دلکش بنایا ہے۔ انسانی نفسیات، خصلت اور رویے پر اکبر حمیدی کے خیالات وافکار بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

مشکور حسین یاد کی تحریروں میں نفسیاتی جہت کا عنصر بہت نمایاں ہے کیونکہ انہوں نے ایم اے نفسیات کی سند حاصل کر رکھی تھی۔ ان کو نفسیاتی پہلوؤں پر گہری گرفت حاصل ہے اور نفسیاتی مطالعہ وسیع اور جامع ہے۔ اس لیے ذہنی کشمکش اور داخلی وخارجی کیفیتوں کو احسن انداز میں بیان کرنے میں کمال کی مہارت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں یہ نفسیاتی مسائل کو اجاگر کر کے ذہنی کشمکش کو بڑھانے کی بجائے فلسفیانہ انداز میں ان مسائل کا حل بتانے کی ایک کوشش کی ہے۔

تاہم نظیر صدیقی نے انسانی نفسیات کو اس طرح اپنے انشائیوں میں پیش کیا ہے کہ قاری کو وہ معاشرے کا حصہ محسوس ہوتا ہے۔ صلاح الدین حیدر نے اپنے انشائیوں میں داخلی وذہنی کیفیت کو زیادہ ترجیح دی ہے۔ سماج کے افراد اور معاشرتی نفسیات کو بخوبی جانتے ہیں۔ اس لیے نفسیاتی پہلوؤں پر دوسرے انشائیہ نگاروں کی نسبت صلاح

الدین حیدر کی گرفت مضبوط اور پائیدار ہے۔ اس لیے انکشاف ذات کے رنگ میں نفسیاتی موضوعات پر گفتگو کرنا ان کے لیے معمولی سی بات ہے۔

ڈاکٹر قیصر شہزاد کے انشائیے مجموعے "لطف آگہی" میں نفسیاتی موضوعات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ شہزاد قیصر کے مجموعہ انشائیہ "صاف چھپتے بھی نہیں" کہ انشائیہ کے موضوعات پر نظر ڈالی جائے تو فلسفیانہ سے نفسیاتی جہت کا سفر صاف نظر آتا ہے۔نفسیاتی موضوعات اور پہلوؤں کا ذکر ان کی تحریروں میں جابجائے ملتا ہے۔ رشتے کی تلاش، آنکھ مچولی مہمان خصوصی، خط، نام اور بچوں کی نگہداشت جیسے انشائیہ کے موضوعات نفسیاتی جہات پر مبنی ہیں۔ انشائیہ "رشتے کی تلاش" میں سماج اور معاشرے کے رسم ورواج کی عکاسی کی گئی ہے۔ رشتے کی تلاش میں شیر خوارگی سے لے کر بڑھاپے تک رشتے کی تلاش کے مراحل کو نفسیاتی موضوعات میں پیش کیا گیا ہے۔ "مہمان خصوصی" انشائیہ میں طنز ومزاح کے رنگ میں نفسیاتی پہلو کا عنصر زیادہ ملتا ہے چونکہ یہ ایک منفرد موضوع ہے۔ اس کے بے شمار معنوں کے ساتھ بے شمار پہلو بھی ہیں۔ انشائیہ نگار نے صرف چند کا ذکر کیا ہے۔ انشائیہ "ماہر نفسیات" ہی نفسیات کے ماہرین پر لکھا گیا انشائیہ ہے۔ماہرین نفسیات کی نظر میں بچوں کو ڈانٹنا ان کو قتل کرنے کے ہی برابر ہے اس سے بچوں میں احساس کمتری کا جنم ہوتا ہے۔ اس طرح انشائیہ "کہتے ہیں جس کو عشق" میں بچپن میں عشق کے عارضے میں مبتلا بچوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ انشائیہ "قرض کی پیتے تھے مے" میں مصنف مقروض کی نفسیاتی حالت اور مقروض کو دباؤ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مصنف مختلف جذبات جیسے انا، شک اور عشق وغیرہ کی نفسیاتی کیفیات پر بھی قلم اٹھاتے ہیں تاہم مصنف داخلی وخارجی احساسات کی ترجمانی بھی کرتے ہیں کہ کس طرح انسان کے رویے میں اسکی انفرادیت جھلک رہی ہوتی ہے اور اس کے رویے لاشعور اور تحت الشعور کے پیچھے پوشیدہ خواہشات کی عکاسی کرتے ہیں۔

ارشد میر کے انشائیوں میں سماجی زندگی میں ہونے والے مختلف رجحانات کا نفسیاتی مطالعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی تناظر میں ان کے انشائیوں میں موضوع کے مختلف مراحل ہیں۔ ارشد میر نفسیاتی یا سماجی مطالعہ کو انشائیہ کے موضوع کی مدد سے ایک ایسی ڈگر پر ڈال دیتے ہیں جو امکانات اور معنویت کو مسلسل آگے کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اگر دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کی رومانوی جہت کا تقابل کیا جائے تو وزیر آغا رومانوی جہت میں فطرت نگاری کی دلکش اور جاذب تصویریں کھینچنے میں کمال کی مہارت رکھتے ہیں۔ برف کے پگھلنے کے حسین نظارے، پہاڑوں میں سے ڈوبتا سورج، آبشاروں میں گرتا ہوا ٹھنڈا یخ پانی، ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے، اڑتے بادلوں کے دلکش منظر اور بل کھاتی ہوئی ٹھنڈے پانی کی ندیاں فطرت نگاری کے انمول نظارے

ہیں۔ یہ فطرت کے شاہکار نمونے ہیں۔ ڈوبتا سورج ان اعلی شاہکاروں میں سے ایک ہے۔ جس کی بہترین انداز میں فطرت نگاری وزیر آغا نے کی ہے۔ وزیر آغا عورت کے حسن و جمال سے متاثر بھی ہیں۔ عورت کے حسن و جمال کو مختلف انداز میں بیان کرتے رہتے ہیں۔ اس لڑی کی ایک جھلک ان کے انشائیے "کچھ خوبصورتی کے بارے میں" میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں میں رومانیت کی جھلک جابجا ملتی ہے۔ یہ رومانوی انداز تحریر طنزیہ بھی ہے اور مزاح سے بھرپور بھی۔ ان تحریروں میں سنجیدگی کی بجائے اصطلاح کا پہلو دیکھنے کو ملے گا۔ محبت و پیار ایک ایسا جذبہ ہے۔ جو انسان کے اندر بے شمار روپ میں بستا ہے۔ ادب سے محبت و عشق ان کا خاصہ ہے۔ مشتاق قمر کے انشائیوں کا جائزہ لیا جائے تو اس موضوعات میں سب سے زیادہ رومانویت کا عنصر ملتا ہے۔ ان کے انشائیے فطرت پرستی کی بہترین اور عمدہ مثالیں ہیں۔ اس میں ان کا بہترین انشائیہ "دھوپ کھانا" ہے۔ اس میں خوبصورتی کے دلکش نظاروں کو بڑی دلفریبی سے بیان کیا گیا ہے۔ فطرت پر ان کا انشائیہ "کوہ پیمائی" ان کی فنی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ فطرت پرستی کے علاوہ تفریحات، اجنبی دنیائیں، غور و فکر اور فکر کی نئی راہیں جیسے موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔ جمیل آزر کے انشائیوں میں رومانوی جہت کے ساتھ دیگر موضوعات کی جھلک بھی واضح نظر آتی ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ اس میں عورت کی حسن پرستی کی کشش موجود ہوتی ہے۔ بعض شاعر و ادیب اپنے فن سے الگ الگ انداز میں اس کو پیش کرتے ہیں۔

پروفیسر جمیل آزر بھی اس معاملے میں کمال کی مہارت رکھتے ہیں لیکن وہ فطرت نگاری اور حسن پرستی کے قائل ہیں اور اس کو خوبصورت اور دلکش انداز میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انشائیہ نگار رومانویت کے تمام مناظر کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ انہوں نے کائنات کے ان خوبصورت اور دلکش نظاروں کو جاذب انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے انشائیوں میں کائنات کی گہما گہمی وسعت اور شعری کیفیت کو خوبصورتی اور نہایت عمدگی سے رنگارنگی سے منسلک کیا گیا ہے جو قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے اور رومانویت سے متاثر کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔

اکبر حمیدی کے انشائیوں میں فطرت نگاری اور تفریحات رومانوی جہت کے موضوعات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ان پر اکبر حمیدی کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ ہلکے پھلکے اور دلکش انداز میں فطرت نگاری کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ قاری خود کو اس تفریحی مقام میں محسوس کرتا ہے۔ جس کے سحر میں خود کو گرفتار پاتا ہے۔ اکبر حمیدی کے

انشائیوں میں فطرت نگاری کے علاوہ حسن و عشق اور عورت کی اداؤں کے بے شمار نمونے ہیں مگر رومانوی جہت میں فطرت نگاری میں ان کی تحریریں زیادہ پرکشش ہیں۔

مشکور حسین یاد کے رومانوی موضوعات دوسرے انشائیہ نگاروں سے قدرے مختلف ہیں۔ اس کا نام "پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے" ہے۔ مگر اس موضوع یا عنوان کو دیکھا جائے تو عورت کے حسن و جمال اور اس کے پردے کے بارے میں فوراً ذہن میں آتا ہے۔ مشکور حسین یاد ازدواجی زندگی اور جنسی موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں۔ وہ طنزیہ انداز میں میاں بیوی کے تعلقات کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں کہ میاں بیوی کے تعلقات ہمیشہ بگڑے ہی رہتے ہیں وہ میاں بیوی کے تعلق کو اونٹ کی کل سے تشبیہ دیتے ہیں اور یہ کل کبھی سیدھی نہیں ہوتی نیز مشکور حسین میاں بیوی کے منشا کے خلاف تعلق کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور ایسے تعلق کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

نظیر صدیقی کے انشائیوں کا مجموعہ "شہرت کی خاطر" اپنی تحریروں میں رومانوی خصوصیت کے ساتھ انشائیہ کا ایک نیا رنگ و آہنگ پیش کرتا ہے۔ مصنف انشائیہ "شادی"، شادی کے نقصانات اور فوائد اور ازدواجی زندگی پر لکھتے ہیں۔ مانشائیہ "دوست اور دوستی" میں نظیر صدیقی دوستی کے رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے قربت سے زیادہ دوری کو ضروری قرار دیتے ہیں تاہم دوستی ایک نعمت ہے لیکن دوستی کی کوئی معیاد نہیں ہوتی بعض اوقات دوستی کسی عداوت و دشمنی کے بغیر ختم ہو جاتی ہے۔

صلاح الدین حیدر فطرت کی خوبصورتی پر بھی قلم اٹھاتے ہیں فطرت کی خوبصورتی انسان کے دل کو بھی معطر کر دیتی ہے وہ فطرت کی اس خوبصورتی کو محسوس کرتے ہیں اور اس سے رومانیت کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ فطرت کی خوبصورتی کو رومانوی الفاظ اور عبارت میں یوں بیان کرتے ہیں۔ صلاح الدین حیدر کے انشائیوں میں رومانیت کی زیادہ جھلک شادی کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ پس ہر انشائیہ نگار کی رومانیت کی جہت کا رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

ڈاکٹر شہزاد قیصر کی تحریروں میں عشق و محبت کی داستانوں کی جھلک تو نظر نہیں آتی مگر حسن و جمال اور فطرت پرستی کے نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ سرکاری آفیسر ہونے کی وجہ سے متعدد اضلاع میں تعینات رہے۔ جس سے انہوں نے وہاں کے خوبصورت نظاروں میں تحریروں کو قلم بند کر دیا۔ ان کی تحریروں میں عشق و محبت کے ذاتی تجربے و مشاہدے شامل نہیں ہیں مگر سماج و معاشرے میں اس جذبے کے تجربات کو لازمی تحریروں کا حصہ بناتے ہیں۔ اس لیے ان کے ایک انشائیہ "رقیب" میں اس کے بارے میں کچھ یوں بیان کیا گیا ہے کہ عشق و محبت، پیار و چاہت، فطرت پرستی اور خواب و خیال رومانویت کے موضوعات ہیں۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر کی شخصیت رومانوی تو نہیں ہے مگر ان کی تحریروں میں رمانوی موضوعات کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔

ارشد میر کے موضوعات میں رومانویت کا عنصر کثرت سے پایا جاتا ہے وہ ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک سفر کرتے ہوئے جاتے ہیں۔ چھلانگ لگا کر جانا ان کی فطرت میں شامل نہیں ہے۔ وہ اپنے خیالات کو فطرت کے ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک لے جانے کی ایک کڑی کی شکل اختیار کرتے ہیں جس پہ ان کو کافی مہارت حاصل ہے۔ وہ افعال و اعمال کی طرح کسی بھی کیفیت کو نظر انداز نہیں کرتے بلکہ ان کو عقلی اور شعوری سطح پر لے جاتے ہیں۔ ان کا انشائیہ "موڈ" اسی تخلیقی عمل سے گزرتا ہے۔ ارشد میر کے موضوعات فطرت کے گرد گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فطرت نگاری سے تعلق رکھنے والی اشیاء کو موضوع بنانا ان کی فطرت میں شامل ہے۔

اگر دبستان لاہور اور سرگودھا کے انشائیہ نگاروں میں موجود ادبی جہات کا تقابل کیا جائے تو وزیر آغا نے انشائیہ میں حسب ضرورت شعر، انگریزی اور فارسی الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ اردو کے ساتھ دوسرے ادب کے ساتھ موازنہ اور تقابل انشائیہ میں الگ ہی جان ڈالتا ہے۔ شعراء و ادباء کی مثالیں اور واقعات کو وقتاً فوقتاً بیان کرنے سے ادبی جہت کو فروغ ملتا ہے۔ شعراء کی شاعری کی خصوصیات اور خامیاں، ادیب کی صنف کا انداز بیاں اور اسلوب پر اپنا نظریہ پیش کرنے سے ادبی جہت کی پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ شعراء کے سوچنے کے انداز پر وزیر آغا کے خیالات ان کے انشائیہ "ڈبویا مجھ کو ہونے نے" میں بیان کرتے ہیں۔ وزیر آغا کے فن انشائیہ نگاری پر نظر ڈالی جائے تو نہ صرف شعراء و ادباء کے واقعات سامنے آتے ہیں بلکہ آغا صاحب کے تنقیدی اثرات ان کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ ادبی شخصیات کے ساتھ ادبی مباحث اور لسانی مباحث کے نمونے جابجا ملتے ہیں۔ جن میں وزیر آغا نے کمال مہارت سے ادبی مباحث کو بیان کیا ہے۔

غلام جیلانی اصغر نے ادب کو بااثر بنانے کے لیے وراثتی ادب کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں وہی ادب دیرپا اور دلکش ہو گا، جو ایک کڑی کی صورت میں نسل در نسل منتقل ہوتا ہے۔ غلام جیلانی اصغر ادبی جہت کے حوالے سے اپنا منفرد نظریہ رکھتے ہیں۔ اور ان کے پاس اس نظریے پر دلائل کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ ان انشائیوں میں انگریزی الفاظ کا استعمال جابجا ملتا ہے۔ شعری اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں وقت ضرورت ایک مصرا بھی استعمال کرتے ہیں۔ استعارات و تشبیہات سے تحریر کو پرکشش بنانے میں اپنی مثال آپ ہیں۔

مشتاق قمر نے انشائیوں میں بھی ادبی شخصیات کے ادبی فن اور خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک فن کی تخلیق میں ادب کن کن مراحل سے گزر کر ادب کی ایک شکل اختیار کرتا ہے۔ اس حوالے سے وہ اپنے انشائیہ "بیٹھنا" میں ذکر کرتے ہیں۔ مشتاق قمر کے انشائیوں میں ادبی شخصیات کے حوالے اور لسانی مباحث کے تذکرے ملتے ہیں۔ استعارات و تشبیہات کا استعمال کر کے اپنے دلائل کو پختگی عطا کی ہے۔ محاورات اور ضرب المثل کے استعمال سے

اپنے انشائیے کو خوبصورت بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسلوب سادہ اور آسان، انداز گفتگو میں اپنا پن اور تحریر پر کشش اور جاذب ہے۔ یہی خوبیاں مشتاق قمر کی ادبی جہت کو نمایاں کرتی ہیں۔

پروفیسر جمیل آذر کی تحریروں میں ادبی جہت میں اردو کے علاوہ فارسی ادب کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں ادبی موضوعات کو جگہ دینے کے علاوہ بلکہ عالمی سطح کے ادیبوں کے حوالے بھی اپنے انشائیوں میں بیان کیے ہیں۔ پروفیسر جمیل آزر نے تنقیدی مراحل اور شعری اصطلاحات کے علاوہ دوسرے ادب کے محاورے بھی استعمال کیے ہیں۔ جن میں فارسی اور انگریزی قابل ذکر ہیں۔ ان کے انشائیوں میں انگریزی ادب کا رنگ واضح نظر آتا ہے۔ اردو، فارسی، انگریزی اور پنجابی ادب میں خصوصی لگاؤ ہونے کی وجہ سے ادبی جہت پر پختگی کے وسیع دلائل موجود ہیں۔ اس کی ایک اہم وجہ پروفیسر صاحب کا وسیع مطالعہ ہے اور یہی ان کی خاص خوبی ہے۔

اکبر حمیدی کی تحریروں میں ادبی جہت کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ جس میں ادبی شخصیات اور ادبی مباحث کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ چونکہ اکبر حمیدی ایک منجھے ہوئے ادیب اور انشائیہ نگار ہیں تو اکثر نوجوان لکھاری اور مختلف نئی ادبی تنظیمیں اپنی ادبی تحریروں کی اصلاح کے لیے تشریف لاتے یا بذریعہ ڈاک بھیج دیتے تھے۔ ادبی جہت میں ادبی شخصیات، ادبی موضوعات اور لسانی مباحث کے علاوہ ادبی تنظیموں کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اکبر حمیدی نے ان تنظیموں کو مفید اور ناصحانہ مشورے دے کر ادب کی خدمت کے لیے تیار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے جہاں نئی ادبی تنظیموں اور نئے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کی ہے وہاں پر ادب میں نئی جہت پر بہت زور دیا ہے۔ مغربی ادب میں نت نئی ادبی جہتیں متعارف ہو رہی ہیں۔ اس لیے اردو ادبی جہت میں نیا رنگ آنا چاہیے۔ پرانے اور فرسودہ نظام سے باہر نکلنا ہو گا۔ ادب کے پرانے اور فرسودہ مدار کے بارے میں انشائیہ "پھولوں میں گھرا کانٹا" بھی لکھتے ہیں۔

مشکور حسین یاد کے اس مجموعے "وقت کا استعارہ" کے انشائیوں کے موضوعات پر سراسری جائزہ لیں تو ان میں ادبی رنگ نظر آتا ہے۔ جن میں "نزاکتوں کا مرقع"، عقیدہ، اسم کا جسم، بہشت میں پہلا قدم، تنہائی کا شور اور جنم جنم کا شمار قابل ذکر ہیں۔ جہاں ادبی موضوعات ہوں گے وہاں اخلاقیات اور اخلاقی اقدار کو موضوع بنایا جائے گا۔ اخلاقی اقدار کے موضوعات پر ادبی انشائیے کی تعداد کم ہے۔ مشکور حسین یاد جیسی شخصیت کا اخلاقی اقدار اور ادب پر خود کلامی، ذاتی مشاہدات اور انکشاف ذات کے ذریعے انشائیے کسی درس سے کم نہیں ہیں۔ انہوں نے

ایسے ماحول میں سماج کی اصلاح اور انسانیت کے دکھ درد کم کرنے کے لیے اپنے قلم کو استعمال کیا ہے۔ ادبی موضوعات میں اخلاقی اقدار پیدا کرنے کی ایک کوشش کا نام مشکور حسین یاد ہے۔

نظیر صدیقی نے اپنے انشائیوں میں ادبی مقولات کا اندراج اس طرح سے کیا ہے کہ کسی کہانی میں کہاوتوں سے اس کی مثال کی وضاحت بیان ہوتی ہے۔ انہوں نے ادب کو اپنے انشائیہ کا حصہ بنایا ہے کسی مشہور کہاوت کو بیان کر کے اس کو روزمرہ کی زندگی سے منسلک کرنا ایک اچھے انشائیہ نگار کی خوبی ہوتی ہے لہذا انہوں نے اس خوبی کو بہت احسن انداز میں اپنے انشائیوں کی خوبصورتی میں اضافے کے لیے پیوست کیا ہے۔ نظیر صدیقی نے ادب سے متعلق اپنے انشائیے " یہ انسان " میں خدا کے وجود کو شیکسپیئر کے ڈراموں سے منسلک کیا ہے۔ نظیر صدیقی ایک ایسے انشائیہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے انشائیوں میں ادبی اصطلاحات کو پیش کرنے کا ایک الگ انداز بیان کیا ہے اور یہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ ان کا ادبی لگاؤ کس قدر زیادہ ہے۔ صلاح الدین حیدر کے انشائیوں میں ادبی جہت کا جائزہ لیا جائے تو اس میں ادبی شخصیات و مباحث اور لسانیات کا ذکر جابجا ملتا ہے۔ کہیں اردو ادب کے ساتھ فارسی، پنجابی اور انگریزی ادب کی ممتاز شخصیات کا ذکر بھی کیا جاتا ہے تو کہیں اردو ادب میں ادبی و لسانی مباحث کا تقابل بھی پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر شہزاد قیصر ایک ایسی ادبی شخصیت کے مالک ہیں کہ ان کے ادبی سوچ بہت وسیع و بلیغ ہے شاید اس کی وجہ انگریزی ادب سے لگاؤ تھا۔ انگریزی الفاظ و محاورات کا استعمال ان کی اردو تحریروں میں بھی ملتا ہے بلکہ اکثر اوقات ان کا موازنہ بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ اقتباس ادبی جہت میں لسانی مباحث کی صحیح معنوں میں یہ ترجمانی کرتا ہے۔ ہر انشائیہ نگار اپنے ادبی جہت کو فروغ دینے کے لیے اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر نے انگریزی ادب سے اردو ادب کو بہت کچھ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں انگریزی الفاظ و محاورات کا استعمال، ادبی موزانہ اور لسانی مباحث کا تقابل ملتا ہے۔ ان کے ایک انشائیے "نقاد" میں ادبی جہت کے لیے نقاد کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں ڈاکٹر شہزاد قیصر کے انشائیوں میں ادبی جہت اور ادبی رنگ زیادہ واضح ملتا ہے۔ اس کے لیے موضوع تنقید ہو یا تخلیق، موازنہ ہو یا تقابل، جائزہ لینا ہو یا احاطہ کرنا، الغرض ادبی جہت کی جھلک بڑی واضح اور وسیع ہے۔

ارشد میر خود ادبی شخصیات میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کی ادبی تحریروں میں ادبی اصطلاحات کا استعمال کر کے انہوں نے اپنی تحریروں میں جان ڈال دی ہے۔ انشائیہ نگاروں کی انشائیہ نگاری کی مختلف اصناف کو مختلف ادبی نام دیکھ کر انہوں نے اپنی تحریروں کو جاندار بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں ادبی رنگ لسانی مباحث میں

نظر آتا ہے، تو کہیں ادبی شخصیت کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ ان کے ادبی موضوعات میں ادبی شخصیات اورادبی موضوعات کے درمیان موازنہ اور تقابل بھی کیا جاتا ہے۔

اگر دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا فلسفیانہ تقابل کیا جائے تو وزیر آغا کے موضوعات میں فلسفیانہ جہت کے عناصر موجود ہیں۔ زندگی بے شمار کیفیتوں کا نام ہے۔ ہر ادیب و شاعر نے اس کو مختلف اشیاء کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ فلسفیانہ سوچ، خیالات اور نظریات ہر کسی کے مختلف ہیں اور ان سے قارئین سبق حاصل کرتے ہیں۔ یہ فلاسفر لوگ اپنی فلسفیانہ باتوں سے قارئین کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ فلسفیانہ انداز سے حقیقت اور سچائی کو بیان کرتے ہیں۔ وزیر آغا نے ان فلاسفروں کو بھی اپنی تحریر کا حصہ بنایاہ۔ وزیر آغا نے نام نہاد فلاسفر بننے والوں کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ تاہم وزیر آغا زندگی میں ترتیب اور بے ترتیبی کے فلسفے کو بھی عیاں کرتے ہیں۔ ہمارے اردگرد ہر چیز میں بے ترتیبی ہے اور بے ترتیبی میں ہی خوبصورتی ہے اسی میں کشش اور خوبصورتی کی صفت موجود ہے۔ اس طرح مصنف غلامی کے فلسفے کو بھی عمدگی سے بیان کرتے ہیں اور اسے ایک کریہہ حقیقت کہتے ہیں اور اس میں انکساری، عاجزی، پیار اور شفقت کو ضروری گردانتے ہیں اور اس کے برعکس آزادی کو برق کا کوندا کہتے ہیں اور یہ بہت ہی پُرنور لمحہ ہوتا ہے اور اس کے اردگرد تاریکی ہی تاریکی ٹھاٹھیں مار رہی ہوتی ہے۔ اس طرح زندگی خدا کی دی گئی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے مصنف زندگی کو ایک زینے کی مانند قرار دیتے ہیں کہ انسان جب ایک زینے سے دوسرے زینے کی جانب جست بھرتا ہے تو یہ ہی زندگی ہے۔ تاہم مصنف زندگی، وقت اور معاشرے کی مختلف حقیقتوں کے فلسفے کو اپنے انشائیوں میں سمو دیتے ہیں۔

غلام جیلانی اصغر کے لیے انشائیہ کا موضوع اصل مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس موجود پر اسرار پہلوؤں کو تلاش کرنا ہے۔ قاری کے لیے ان پہلوؤں کا احاطہ کرنا اشد ضروری ہے۔ چنانچہ مصنف اپنے انشائیوں میں فلسفے کے ہر پہلو پر غور کرتے ہیں۔ اس طرح انشائیہ " بستر میں لیٹنا " میں مصنف فلاسفروں کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ جب سوچنا ہوتا تو اکثر بستر میں لیٹ کر سوچتے اور بڑے بڑے فلسفے اخذ کرتے ان میں سے اکثر علماء لمبے لمبے چوغے پہن کر بستر میں لیٹ کر طمانیت سے سوچتے۔ مشتاق قمر کے انشائیوں میں فلسفیانہ جہت جابجا ملتی ہے۔ انشائیہ "کوہ پیمائی" میں فلسفیانہ رنگ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اصل میں ان فلسفیانہ خیالات اور مفکرانہ سوچ سے اصلاح کے پہلوؤں کو تلاش کرتے ہیں۔ جن سے ادبی تحریریں عروج کی طرف رخت سفر باندھتی ہیں۔ مشتاق قمر کے ایک دوسرے انشائیہ "کچھ نیند کی مذمت میں" میں زندگی، فطرت، نیند اور موت کے درمیانی تعلق کو فلسفی انداز میں بھی بیان کرتے ہیں۔ موت کو نیند کی سوتیلی بہن سے تشبیہ دینا مشتاق قمر کے فن کی مہارت ہے کہ وہ فلسفیانہ انداز میں بات

کہنے کے عادی ہیں۔ فلسفیانہ انداز گفتگو، مفکرانہ سوچ، غور و فکر، فکر کی نئی راہیں اور کائناتی مسائل پر مشتاق قمر کی تحریریں لاجواب ہیں۔

جمیل آذر کے انشائیوں کے متعلق سے یہ بات منظر عام پر آتی ہے کہ ان کی تحریروں میں فلسفے کی نوعیت دوسرے انشائیہ نگاروں سے قدرے مختلف ہے۔ اس کی وجہ ان کا منفرد اسلوب نگارش اور تکنیک ہے۔ ان کے موضوعات میں بھی فلسفیانہ جھلک واضح نظر آتی ہے۔ اس لیے انہوں نے سماج اور معاشرے کے افراد میں فلسفیانہ سوچ اور خیالات کو موضوع بنایا ہے بلکہ انکشاف ذات کا استعمال ہی ان کے فلسفیانہ سوچ کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کے انشائیہ "بھوک ہڑتال" میں بھوک ہڑتال کرنے والوں کے بارے اپنے نظریات و خیالات کو قلمبند کیا ہے۔ یہ نظریات و خیالات ان کی فلسفیانہ سوچ کی مکمل ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں. مصنف وقت کے فلسفے کو بھی بہت عمدگی سے بیان کرتے ہیں کسی بھی کام کے کرنے کے لیے انسان کو وقت درکار ہوتا ہے اور وقت نے ہر چیز کو اپنی جکڑ میں لے رکھا ہے ہر کام کو کرنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ اس طرح انشائیہ "وقت اے وقت" میں مصنف شیلے کا وقت کے بارے میں فلسفے کو بھی بیان کرتے ہیں ان کے خیال میں وقت بہت سنگدل ہے اور سمندر انسان کے نمکین آنسوؤں سے بھرا ہوا ہے اور وقت ہی انسان کو تباہی کے دہانے پر لے آیا ہے یہ انسان کو دھوکا دیتا ہے اور چالیں چلتا ہے جمیل آزر وقت کو پُر اسرار بھی کہتے ہیں اور یہ بہت بے رحم ہے وقت کے ساتھ ساتھ پُرانی عمارتیں ختم ہو رہی ہیں اور ان کی جگہ نئی اونچی عمارتوں نے لے لی ہے۔

تاہم مصنف روسو، افلاطون، سقراط اور ان کے شاگرد کریٹو کا ذکر بھی کرتے ہیں اور ان کے زندگی کے بارے مین فلسفے کو بھی اپنے انشائیوں میں کہیں کہیں بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ مصنف وقت کے فلسفے کے ساتھ ساتھ زندگی کی حقیقت پر بھی قلم اٹھاتے ہیں۔ انسان اپنے آپ میں ایک چھوٹی سی کائنات ہے اور انسان قدرت کا شاہکار ہے اس طرح زندگی نام ہی دریافت کرنے کا ہے۔ جمیل آذر کے انشائیوں میں سچائی اور حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ انسان کو انکشاف ذات محسوس ہوتا ہے۔ ادبی، نفسیاتی، سماجی اور اخلاقی موضوعات سچائی اور حقیقت کے گرد گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح جمیل آذر کے فلسفیانہ نظریات میں بھی یہی عکس نظر آتا ہے۔

اکبر حمیدی کے انشائیوں میں فلسفیانہ موضوعات کی تصویر بڑی واضح ہے۔ وہ بڑی مہارت سے فلسفی انداز میں فلسفیانہ سوچ کو بیان کرتے ہیں۔ ان کے انشائیہ "رنگ دار شیشے" میں حقیقت پسندی کے بارے میں بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ نہایت مہارت سے کائناتی مسائل کو بیان کرتے ہیں اور فکر کی نئی راہیں تلاش کرنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ غور و فکر اور ناصحانہ عناصر ان کے انشائیوں میں جابجا نظر آتے ہیں۔ تاہم اکبر حمیدی کے ہاں گہری سوچ

اور زندگی کا فلسفہ موجود ہے وہ کائنات پر گہرا غور و فکر کرتے ہیں اور اپنی سوچ کو اپنے انشائیوں میں بکھیر دیتے ہیں۔ تاہم اکبر حمیدی نے فلسفیانہ موضوعات کو منفرد اور دلکش انداز میں قاری کے سامنے رکھ دیا ہے۔

مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں فلسفہ اور فلسفیانہ موضوعات کی بھرمار ہے۔ اس لیے ان کے موضوعات فلسفہ کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ کائنات مسائل پر غور و فکر اور مفکرانہ سوچ کو بیدار کرنا مشکور حسین یاد کا کمال ہے۔ ان کے انشائیہ "کسب زر" شکر گزاری اور اظہار تشکر پر فلسفیانہ سوچ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کے مجموعہ "جوہر اندیشہ" میں فلسفیانہ، سماجی اور اخلاقی موضوعات ملتے ہیں۔ مشکور حسین یاد کا انشائی مجموعہ "بات کی اونچی ذات" میں بہت سے ملے جلے موضوعات ملتے ہیں مگر فلسفیانہ موضوعات کی کثرت پائی جاتی ہے۔ ان کے انشائیہ "عالی ظرفی" کا عنوان یا موضوع ہی فلسفیانہ سوچ کی عکاسی ہے۔ مشکور حسین یاد نے سماجی موضوعات کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ معاشرے اور سماج میں مثبت پہلوؤں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ "عالی ظرفی" سماجی مثبت رویہ ہے۔ اس موضوع کی وسعتوں کو مکمل گہرائیوں کے ساتھ قاری کے سامنے رکھ دیا ہے۔ عالی ظرفی کاش شرافت کے علاوہ بغاوت اور انقلاب کے ساتھ موازنہ کر کے ایسے فلسفیانہ موضوعات کو سامنے لایا گیا ہے کہ جس سے سماجی رویوں میں پھلنے پھولنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

نظیر صدیقی نے اپنے انشائیوں میں فلسفیانہ انداز کو اپنا کر انشائیوں کو ادبی پہلو میں ایک الگ مقام بخشا ہے۔ نظیر صدیقی نے اپنے انشائیوں میں فلسفیانہ رنگ کو بہتر انداز میں پیش کیا ہے اور اس بات کی مثال ان کے ایک انشائیہ "یہ انسان" میں یوں ملتی ہے کہ کیسے انہوں نے خدا کو ماننے اور نہ ماننے والے انسانی فکر کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ خدا کو ماننے سے کیسے ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا ہے اور خدا کو نہ ماننے سے کیسے ابہام پیدا ہوتے ہیں۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں میں فلسفیانہ رنگ نمایاں پایا جاتا ہے انہوں نے اپنی تحریروں میں خدا اور انسانی فکر کا موازنہ کیا ہے کہ کیسے خدا کے ہونے کا احساس انسان کی زندگی اور اعمال کو متاثر کرتا ہے اور خدا کے ہونے کہ احساس زندگی گزارنے اور عبادات میں کیسے انسان ایک دائرے میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس خدا کو نہ ماننے والا ظاہری طور پر ازاد لیکن وہ فکری تناؤ کا شکار رہتا ہے۔

صلاح الدین حیدر کی تحریروں میں فلسفیانہ موضوعات کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ وہ معاشرے اور کائنات کی حقیقتوں کو فلسفی انداز میں بیان کرنے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔ ان کا انشائی مجموعہ "حماقتیں میرے مقدر کی" میں اس کا تسلسل ملتا ہے۔ انشایئے کا عنوان ہی فلسفیانہ محسوس ہوتا ہے۔ زندگی کی الجھنیں اور مشکلات انسان میں فلسفی سوچ کو بیدار کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ زندگی کی بے ترتیب اور تہہ در گھاٹیوں سے فرار ہونا ناممکن ہے۔ زندگی سے

موت کی طرف سفر اٹل حقیقت ہے اور زندگی حماقت کا ایک مسلسل سفر ہے۔ اس لیے اس پر شرمندہ ہونے کی بجائے اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ صلاح الدین حیدر نے بھی یہی فلسفیانہ سوچ کے ذریعے قارئین کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے سنجیدگی کے ساتھ طنز و مزاح رویہ بھی اختیار کیا گیا ہے۔ اپنے دوسرے مجموعے "ڈر اور ڈراما" کی تحریروں میں بھی یہی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے اس مجموعے کے انشائیہ "جاگیر دار اور برخودار" میں زندگی اور موت کا ذکر فلسفیانہ انداز میں پایا جاتا ہے۔ صلاح الدین حیدر کی تحریروں میں یہ فلسفی انداز انشائیہ میں جان ڈالتا ہے۔

ڈاکٹر شہزاد قیصر کی انشائیہ نگاری کا فن ان کی ابتداء سے ہی ارتقائی منازل کو طے کرتا ہوا سفر کرتا جا رہا ہے۔ ان کے انشائیوں میں سنجیدگی، تفکر اور نفسیاتی موضوعات کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ پہلو کی کثرت پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر کی شخصیت میں صوفیانہ عناصر ہونے کی وجہ سے فلسفیانہ رنگ واضح اور کثرت سے نظر آتا ہے۔ ان کی جبلت کے رگ و ریشے میں فلسفہ اور تصوف گندھا ہوا ہے اور یہ دونوں عناصر ان کی شاعری میں بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کا کمال یہ ہے کہ ادب اور فلسفہ کا یہ تال میل ان کے موضوعات پر کسی قسم کا پیچیدہ تاثر نہیں چھوڑتا بلکہ اس کی دلکشی اور دل نشینی کو مزید قائم و دائم رکھتا ہے۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر وقت کا فلسفہ بھی بہت عمدہ انداز سے پیش کرتے ہیں وقت مستقل رہنے والی چیز نہیں ہے اور نہ ہی دولت مستقل چیز ہے اور نہ کوئی ہمیشہ اونچے عہدے پر فائز رہتا ہے ماضی، حال اور مستقبل تینوں میں وقت کی حیثیت بدلتی رہتی ہے۔ مصنف کائنات کی جبریت پر بھی قلم اٹھاتے ہیں جیسے سورج دن کے وقت نکلتا ہے جب کہ روشنی کی ضرورت رات کے وقت بھی ہوتی ہے موسموں میں انسان کی فطرت کے خلاف تغیر بھی تو ہوتا رہتا ہے۔ تاہم وقت کی جبریت انسان کو کہاں سے کہا پہنچا دیتی ہے اور یہ انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اس طرح مصنف انشائیہ "مصور" میں بھی فلسفیانہ موضوع پر بات کرتے ہیں کہ مصور اپنی مصوری سے انسان کی شکل تو بنا سکتا ہے مگر اس کی حیثیت سوائے بت کے کچھ بھی نہیں ہے یہ صرف المصور کے ہاتھ میں ہے کہ وہ اس بت میں جان بھی ڈال دے اور انسان کو تخلیق کر کے اس کی صورت بنا دے۔ مصنف اپنے انشائیے "دانشور" میں بھی سقراط اور افلاطون پر قلم اٹھاتے ہیں اور ان کو محض گفتگو بناتے ہیں۔

ارشد میر نے اپنے انشائیوں میں انسانی رویوں اور جذبوں کی کھل کر فلسفیانہ انداز میں ترجمانی کی ہے۔ فلسفیانہ موضوع میں خیالات و افکار کے لیے الفاظ کی قلت ازل سے ہی رہی ہے مگر ارشد میر کے پاس ایسے موضوعات کے لیے الفاظ کی بھرمار کے ساتھ ساتھ واضح دلائل بھی موجود ہیں۔ ارشد میر کے انشائیہ کے فلسفیانہ

موضوعات سے جو کرنیں پھوٹ رہی ہیں، جو وہ اردو ادب کو سیر اب کر رہی ہے اور یہی ارشد میر کی اصل کامیابی ہے کہ ان کے فلسفی موضوعات میں مضبوطی اور پختہ پن موجود ہیں۔

اگر دبستان لاہور اور دبستان سر گودھا کے انشائیوں کا سماجی تقابل کیا جائے تو ان کے انشائیوں میں ہر موضوع کی طرح سماجی جہت کے موضوعات بھی ملتے ہیں۔ انہوں نے ان موضوعات کے ذریعے اردو ادب کو جدید میلانات اور رجحانات سے روشناس کروایا اور اہل ادب کی آبیاری کی۔ موجودہ دور میں جدیدیت کی وجہ سے سماجی موضوعات کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔ وزیر آغا نے جدیدیت کے سماجی موضوعات پر روشنی ڈالتے ہوئے قدیم سماجی موضوعات اور ضروریات کا حوالہ بھی دیا ہے۔ مختلف ادوار اور عہدوں کو تقسیم کر دیا ہے۔ اس حوالے سے ان کی انشائیے "چرواہا" میں حوالہ ملتا ہے۔ وزیر آغا کی سماج اور معاشرے پر گہری نظر ہے، اس لیے ان کے انشائیوں میں سماجی موضوعات کثرت سے ملتے ہیں۔ ان کے انشائیہ کے عنوانات بھی سماج کی عکاسی کرتے ہیں۔ مصنف معاشرے کی ایک اہم برائی چوری پر بھی اپنا قلم اٹھاتے ہیں اور چوری کے پیشے کی تاریخ بھی بتاتے ہیں اس طرح وزیر آغا معاشرے کے نچلے، اوسط اور اعلیٰ درجوں پر بھی قلم اٹھاتے ہیں۔ نچلے درجے کے لوگ بھی ڈر، خوف اور معاشرے کی الجھنوں سے بے نیاز ہوتے ہیں اور انہیں نیند کم ہی میسر ہوتی ہے اور نہ ہی وہ کسی قسم کا خواب ہی دیکھتے ہیں جبکہ درمیانے درجے کے لوگ اکثر خواب جیسی کیفیت میں ہی مبتلا رہتے ہیں۔ وہ کبھی میٹھے، کبھی ڈراؤنے اور کبھی بھیانک خواب دیکھتے ہیں درمیانے درجے کے لوگوں کی حالت قابل رحم ہوتی ہے۔ درمیانے درجے کے لوگ خود کو سمجھتے ہیں کہ وہ نچلے درجے کے لوگوں سے بہتر ہیں مگر یہ ان کی غلطی ہوتی ہے تاہم ڈاکٹر وزیر آغا معاشرے کے مختلف پہلوؤں، انسانی تہذیب اور تاریخ پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس طرح سماجی پہلو ان کے انشائیوں میں ہمیں جا بجا بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

دبستان سر گودھا کے نمایاں انشائیہ نگار غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کے مجموعہ "نرم دم گفتگو" کے موضوعات کا جائزہ لیا جائے تو اس میں سماجی، نفسیاتی، فلسفیانہ اور ادبی جہت کے موضوعات ملتے ہیں۔ سماج و معاشرے کے رسم و رواج، گھریلو مسائل کی لمبی داستانیں، غربت، سیاسی اثر و رسوخ، کرپشن اور تعلیم و صحت جیسے موضوعات پر اپنے خیالات و افکار بیان کیے ہیں۔ غلام جیلانی اصغر انشائیہ "ملاقات" میں ملاقات کے طور طریقوں کو زیر بحث لاتے ہیں اور ملاقات کے آداب پر بھی بات کرتے ہیں ملاقات کرنے سے قبل جگہ، گفتگو کا موضوع اور دوسرے کے موڈ کو جانچ لینا چاہیئے۔ اس طرح مصنف انشائیہ "ریٹائرمنٹ کے بعد" میں معاشرے کے ایک پہلو کی

طرف ہماری توجہ مبذول کرواتے ہیں کہ جس میں ریٹائرمنٹ اور ریٹائرمنٹ کے بعد کے حالات کو شگفتہ انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔

مشتاق قمر نے انشائیہ میں بے شمار موضوعات کی قندیلیں روشن کر دی ہیں، جن میں سماجی موضوعات سر فہرست ہیں۔ مشتاق قمر معاشرے میں پھیلی برائیوں پر بھی قلم اٹھاتے ہیں۔ انشائیہ ''اپالو ٹریجڈی'' میں مشتاق قمر توہم پرستی اور توہمات کے بارے میں لکھتے ہیں۔ مشتاق قمر انشائیے میں اپنے علاقے کے بارے میں بتاتے ہیں کہ وہاں لوگ شادی بیاہ گویا ہر موقعے پر برگد کے تنے پر لوگ دیا جلانا نہ بھولتے عام طور پر دیہاتی علاقوں میں توہم پرستی کا رجحان زیادہ ہوتا ہے قبرستان کی سب سے پرانی قبر پر دیا جلانا، کالی بلی کا راستہ کاٹنا، کوے کے بولنے پر مہمان کی آمد، زیتون کی شاخ امن کی علامت وغیرہ وغیرہ۔ توہمات اکثر سچی ثابت نہیں ہوتیں اور اگر یہ سچی ثابت ہو بھی جائیں تو اس کے پیچھے حادثات کا ہاتھ ہوتا ہے تاہم حادثات تو سائنسی ایجادات میں بھی حائل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح انشائیہ ''شہرت کی مخالفت میں'' میں مصنف معاشرے کی ایک اور تلخ حقیقت کی طرف ہمارا رُخ موڑتے ہیں کہ انسان اکثر اپنی پوری زندگی شہرت حاصل کرنے اور داد وصول کرنے میں صرف کر دیتا ہے۔

جمیل آذر نے اپنی تحریروں میں سماج اور معاشرے کے موضوعات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سماجی موضوعات اس معاشرے کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انکشاف ذات اور معاشرے کے افراد کو درپیش مسائل اور ان کے واقعات کو اپنے قلم سے بیان کرنا کا فن جمیل آذر کے پاس ہیں۔ ان کے انشائیہ "برساتی" کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ معاشرے کے کلرک کی بدحالی اور مالی حالات کے ساتھ معاشرے کی بے بسی کو کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان مسائل کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جمیل آذر نے سماج کی عکاسی کی ہے۔ یہ دنیا دھوکے باز، فریبی، مطلبی اور بے حس ہے، اس تلخ حقیقت کو سچائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ انسانیت کے مثبت واقعات کو احسن انداز میں بھی بیان کیا ہے۔ اپنے ایک انشائیہ ''نیم پلیٹ'' میں معاشرے کی ترجمانی یوں کرتے ہیں کہ سائن بورڈ کی طرف نیم پلیٹ ہر انسان کی شخصیت، کردار اور خامیوں وخوبیوں کو ظاہر کرتی ہے۔ خوبصورت سے خوبصورت ترین نیم پلیٹ انسان کی ذہنی سوچ کی عکاسی کرتی ہے۔ اس طرح انشائیہ ''وقت اے وقت'' میں گزرتے وقت کے ساتھ ترقی اور تبدیلی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز واقعات رونما ہو رہے ہیں وقت گزرنے کے ساتھ سائنس ترقی کر رہی ہے اور بوسیدہ سڑکوں اور شاہراہوں نے نئی اونچی و بالا عمارات نے لے لی ہے اور گھوڑا گاڑی کی جگہ اب گاڑیاں، رکشے اور ہوائی جہاز آگئے ہیں۔ مصنف انشائیہ دعوت ولیمہ، اشتہار زدہ دیواریں، بدل جاتے ہیں لوگ / شادی کے بعد!، کتابوں کو دوستوں سے بچاؤ، مہربان کیسے کیسے

بھیک مانگنے والے، تیرے جانثاروں کو سلام، واشنگ مشین، جنگ کرنا، کچھ فیشن پر، غیر معروف شہری، آرٹس سٹوڈنٹس، نشہ، ہائیڈ پارک، جن، مسٹر رائٹ مین، شمولیت، عظیم نشر گاہ وغیرہ میں وافر مقدار میں سماجی پہلو پر لکھتے ہیں۔

اکبر حمیدی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑھتے ہوئے گہری فکری اور فلسفیانہ موشگافیوں گوئی تک کرتے ہوئے سماج کے موضوعات پر اپنے خیالات قلمبند کرتے ہیں۔ سماجی موضوعات پر مشاہدات و تجربات کی روشنی میں تحریریں تحریر کرتے ہیں۔ سماج اور معاشرے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اکبر حمیدی نے ایک تہذیب پر دوسری تہذیب کے اثرات کو بیان کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض کے اثرات کم اور بعض کے زیادہ ہیں۔ یہی اثرات سماج کے بدلتے رنگ اور رویے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اکبر حمیدی نے اس معاشرے اور سماج میں منفی جذبوں اور رویوں کی نشاندہی کی ہے تو اس کی وجوہات کو تلاش کر کے اس کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ تاہم سماجی موضوعات پر ان کا قلم سماج کی سچائی اور حقیقت پر مبنی حقائق بیان کرتا ہے۔

مشکور حسین یاد کے انشائیہ مجموعہ "بات کی اونچی ذات" میں سماجی موضوعات کی بھرمار ہے۔ ان کے اس مجموعے میں سماجی موضوعات پر مبنی انشائیے "خوبصورت لوگ"، "انکسار کے آسمان"، "سچ کا ذائقہ"، "اچھا زمانہ"، "تخت سلطنت"، "بنی نوع آدم کا شرف"، "ایفائے عہد"، "خوف اور جائے پناہ" ہیں۔ جن میں سماجی موضوعات کے ساتھ فلسفیانہ اور نفسیاتی پہلوؤں کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ عالی ظرفی اور شرافت سماجی رویوں کے دو مثبت پہلو ہیں اور ان کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشکور حسین یاد کے موضوعات میں سماجی اور فلسفیانہ انداز زیادہ ہے۔ جہاں ہم عالی ظرفی کی بات کر رہے ہیں وہاں پر ان کے انشائیہ "خود غرضی" کا جائزہ لینا بھی اشد ضروری ہے۔ انشائیہ نگار نے اس خود غرضی کو ایمان کا اصل اصول قرار دیا ہے۔ اس طرح انشائیہ "اطمینان" میں ترقی یافتہ معاشرے کے بارے میں کہتے ہیں کہ ترقی یافتہ معاشرہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے اور مطمئن اور پُرسکون ہوتا ہے اور جو معاشرہ جمود کا شکار ہوتا ہے سستی اور کاہلہ ان کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے وہ ہمیشہ غربت اور معاشرے کی دوسری برائیاں چوری، ڈکیتی اور راہزنی وغیرہ کی مرتکب ہوتی ہیں۔ تاہم مشکور حسین کے ہاں جابجا سماجی رویے اور سماج کی برائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں وہ معاشرے میں پنپتی برائیوں کو اپنی تخلیقات سے مٹانا چاہتے ہیں اور معاشرے معاشرے کا گہرا جائزہ لیتے ہیں۔ کوئی بھی انشائیہ نگار اپنے فن میں عقل و شعور کی منزلوں کو ناسمجھی اور لاشعوری کے راستے سے طے کرتا ہے۔ انشائیہ میں عقل و فہم کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگاری کی حماقتوں کا تذکرہ بھی پایا جاتا ہے۔

نظیر صدیقی کے انشائیوں میں سماج، معاشرت اور رسومات کا تذکرہ عام ہے۔ انہوں نے اپنے طرز بیاں میں ملکی و غیر ملکی سماج کا تذکرہ بہت عمدہ انداز میں کیا ہے اور اس سماج میں پائے جانے والے کئی کردار بھی ایسے پائے جاتے ہیں کہ جن سے مصنف کا سماجی شعور سامنے آتا ہے۔ کوئی بھی فرد واحد جس معاشرے کا حصہ ہوتا ہے۔ اس معاشرے کے تمام افعال میں اس کی شمولیت کا موجود ہونا لازمی ہے اور ایک مصنف اپنے ماحول اور اپنے سماج میں ہونے والے تمام تاثرات کو اپنے فن کا حصہ بنالیتا ہے۔ نظیر صدیقی نے اپنے معاشرے میں پائے جانے والے تمام عناصر کو اپنے انشائیوں کا حصہ بنایا ہے اور اپنے سماج کے تمام تر مقاصد اور عوامل کو انشائیہ میں شامل کر کے انشائیے میں وسعت پیدا کی ہے۔ اس طرح انشائیہ "بور" میں بھی نظیر صدیقی لوگوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں جو خود بوریت کا شکار ہوتے ہیں لیکن اس کا الزام دوسرے پر دھرتے ہیں ہمارے معاشرے میں بوریت سے فائدہ بھی اٹھایا جاتا ہے اور اس کے لیے مختلف طریقے بھی اپنائے جاتے ہیں. اس طرح انشائیہ میں مصنف شادی کے نقصانات اور فوائد کو زیر بحث لاتے ہیں اور جہیز جیسی لعنت کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ انشائیہ "یہ انسان" میں انسان کو موضوع بحث بنایا گیا ہے کہ انسان آغاز سے ہی خود فریبی میں مبتلا رہا ہے اور خدا پرست واقع ہوا ہے انسان کی صفت اور کمزوری و کوتاہی یہ ہے کہ وہ خدا کے وجود اور عدم وجود کو ثابت نہیں کر سکا انسان کی آفاقی خوبی یہ ہے کہ انسان بڑھاپے میں پرہیز گار ہو جاتا ہے جوانی میں کھلنڈرا اور عیاشی کرتا ہے اگر انسان کی تاریخ کی طرف نظر داڑائیں تو انسان حماقت اور جراءت کی طرف مائل رہا ہے انسان کو ایسی فطرت ودیعت کی گئی ہے کہ وہ حق و باطل کے جھگڑوں میں جھگڑا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ "امتحان گاہ" میں مصنف ہمارے ملک کے طلباء سے لیے جانے والے امتحان اور اس دوران آنے والی مشکلات کو زیر بحث لاتے ہیں۔ وہ سماج میں پائے جانے والے تمام ان عناصر کو بھی بیان کرتے ہیں جو معاشرے میں ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتے۔

صلاح الدین حیدر سماج اور معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں ظلم و ستم پر مبنی اور یا پھر محبت کی داستانیں، مرد کی عورت پر ظلم وستم کی کہانی ہو یا امیر طبقے کی غریب عوام کے حقوق پر ڈاکہ کی داستان، الغرض سماج اور معاشرے میں ہونے والی سرگرمیوں کو محسوس کرتا ہے۔ صلاح الدین حیدر نے بھی سماجی جہد کے اکثر موضوعات کو بیان کیا ہے۔ صلاح الدین حیدر نے سماج کے منفی پہلوؤں پر تبادلہ خیال کیا ہے۔ منفی پہلوؤں پر اظہار خیال کرنا آسان مرحلہ ہے مگر اصلاحی انداز میں منفی پہلوؤں سے اس کی اصلاح کی کوشش ایک اچھے اور بہترین ادیب کی خوبی ہے۔ صلاح الدین حیدر نے سماجی پہلوؤں اور موضوعات کو اصلاحی انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں وہ کامیاب و کامران نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد قیصر کے انشائیوں میں وافر مقدار میں سماجی حوالے موجود ہیں۔ ان کے پہلے مجموعے "کلیرنس سیل" کے انشائیوں کے موضوعات کا جائزہ لیا جائے تو ان کے انشائیہ "قرض کی پیتے ہیں مے" میں سماجی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ واقعی قرض ایک معاشرتی حقیقت ہے جو ایک لعنت کی شکل اختیار کر چکی ہے جیسے شراب پی کر دوبارہ واپس نہیں آسکتی ہے۔ اسی طرح مقروض بھی قرض کی شراب پی کر بھول جاتا ہے کہ اس کو قرض واپس بھی کرنا ہے۔ ہمیں ایسی لعنت سے چھٹکارا کیسے مل سکتا ہے یا اس حقیقت کو مثبت معنوں کے مطابق استعمال کیسے کیا جاسکتا ہے؟ ایسے موضوعات پر قلم اٹھانا اور خیالات وافکار کو بیان کرنا ایک فن ہے اور شہزاد قیصر اس فن سے مالامال ہیں۔

ارشد میر کے موضوعات سماج اور معاشرے سے جنم لیتے ہیں۔ ان کے انشائیہ "دھوتی" میں سماجی مطالعے کی گہری جھلک دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے سماجی موضوعات جیسے دھوتی، دوپٹہ، تولیہ، ٹوپی، آنسو، گنا اور دروازہ پر انشائیہ لکھ کر سماج و معاشرے کی ترجمانی کی ہے۔ انہوں نے ایسے سادہ اور عام سے موضوعات پر مدبر اور پختہ دلائل کے ساتھ کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ مصنف معاشرے کی برائیوں پر بھی قلم اٹھاتے ہیں جھوٹ، بغض، منافقت اس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ ارشد میر کے سماجی موضوعات پر پختہ دلائل ان کے وسیع مطالعے کی پختہ دلیل ہے۔ سادہ اور عجیب و غریب موضوعات کو چن چن کر زیر بحث لانا، مدلل انداز گفتگو سے خیالات وہ افکار کے انبار کا ذخیرہ اور طنز و مزاح کو فروغ دینا ارشد میر کے فن کا ایسا منہ بولتا ثبوت ہے۔

دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے اکثر موضوعات ملتے جلتے ہیں اور اکثر ان کے موضوعات میں رنگا رنگی کے ساتھ یکسانیت بھی پائی جاتی ہے جیسا کہ اٹھنا، بیٹھنا اور لیٹنا جیسے موضوعات دبستان سرگودھا کے قریباً سب انشائیہ نگاروں کے ہاں موجود ہے۔ جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے موضوعات میں ایک جیسا رنگ دیکھنے کو نہیں ملتا ان کے موضوعات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے ہاں فطرت کے موضوعات کے ساتھ ساتھ معاشرے کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے ہاں معاشرے کی برائیوں اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں پر طنز و مزاح دیکھنے کو ملتا ہے۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے ہاں فلسفیانہ موضوعات کے ساتھ ساتھ خیالات کی رنگارنگی موجود ہے جبکہ مشکور حسین یاد کے ہاں سنجیدہ اور فلسفیانہ موضوعات کی بھرمار نظر آتی ہے جبکہ نظیر صدیقی کے ہاں طنز و مزاح کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ مشکور حسین یاد کے ہاں جنسی و رومانوی موضوعات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جبکہ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے ہاں رومانوی، جذبات سے بھرپور اور فطرت پر مبنی موضوعات پائے جاتے ہیں۔ دبستان سرگودھا

کے انشائیہ نگاروں کے ہاں مثبت انداز اور رجائیت سے بھرپور موضوعات پائے جاتے ہیں جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے ہاں مثبت لہجے کے ساتھ قنوطیت بھی پائی جاتی ہے اس قنوطی رنگ کے انشائیے زیادہ تر نظیر صدیقی کے ہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

المختصر دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں میں وزیر آغا، غلام جیلانی، مشتاق قمر، جمیل آزر اور اکبر حمیدی کے انشائیوں میں موضوعات میں اگر ایک الگ جہت پائی جاتی ہے اور ان انشائیہ نگاروں نے اپنے موضوعات میں کہیں فلسفہ اور کہیں فطرت کو ایسے انداز میں بیان کیا ہے کہ یہ سب قاری کے لیے باعث تسکین نظر آتے ہیں اور اس کے برعکس دبستانِ لاہور کے انشائیہ نگاروں میں مشکور حسین یاد، نظیر صدیقی، صلاح الدین، قیصر شہزاد اور ارشد میر نے بھی اپنے موضوعات کو ایک نیا پن اور نیا رنگ عطا کیا ہے اور قارئین کے لیے توجہ کا مرکز رہا ہے اور لاہور کے انشائیہ نگاروں کا انداز بیان اور ان کے موضوعات میں انفرادیت پائی جاتی ہے جو ان موضوعات کے ساتھ ساتھ انشائیوں کو حقیقت سے مترادف رکھتی ہے۔

ل۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا تکنیکی تقابل:

انگریزی ادب کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو دیکھنے میں آتا ہے کہ انگریزی ادب بہت وسیع ہے اس میں ادب کے علاوہ زندگی کے دوسرے معاملات پر بھی بہت وسعت نظر آتی ہے اس طرح اردو ادب بھی اپنی تخلیقی کاوشوں میں بہت وسعت رکھتا ہے اور اسی طرح ہم تخلیقی اصناف کی بات کریں تو اردو ادب کو ایک اکائی مان لیتے ہیں اور اسی طرح اردو کی بہت سی اصطلاحیں اور نثری و غیر افسانوی ادب پر بھی بہت بحث و مباحثہ دیکھنے کو ملتا ہے جیسے کہ انشائیہ کیا ہے؟ تکنیک کی اردو ادب میں کیا اہمیت ہے؟ ہئیت و اسلوب کیا ہوتا ہے؟ فن اور تکنیک کی حدود کہاں تک ہیں؟ اور جب کوئی تخلیق وجود میں آتی ہے اسی وقت اس کی تکنیک، ہئیت اور اسلوب وجود میں آجاتا ہے؟

اس طرح ہم غیر افسانوی ادب یعنی انشائیہ کی تکنیک کو پرکھنے سے پہلے ہم تکنیک کو زیر بحث لاتے ہیں کہ تکنیک کیا ہے اور یہ کیسے وجود میں آتی ہے اور اس کی حدود اور وسعت کہاں تک ہے آرٹ، فن اور تکنیک کو بھی زیر بحث لایا جاتا ہے تو ہم ان سب کو ایک دوسرے کے مترادف خیال کرتے ہیں اگرچہ ان میں بہت فرق ہے۔

درحقیقت فن تجربات،خیالات اور احساسات کو احسن طریقے سے پیش کرنے کا نام ہے جس کا بنیادی مقصد خوشی فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کو تبدیل کرنا بھی ہے اور زندگی کو خوبصورت ترین بنانا ہے اور یہ سب پیش کرتے وقت وہ ایک طریقے کو اپناتا ہے جو کہ تکنیک کہلاتی ہے جیسے کہ رنگوں کے ذریعے کسی چیز کو پیش کرنا مصوری ہے پتھر کو تراش کر بت تراشی کی جاتی ہے۔ جسم کو حرکت دے کر رقص کیا جاتا ہے یعنی آرٹ یا فن مختلف طریقوں سے پیش کیا جاتا ہے۔اس طرح غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ فن ایسی اصطلاح ہے جس میں بہت وسعت پائی جاتی ہے جبکہ تکنیک کی اصطلاح میں اتنی وسعت نہیں پائی جاتی جبکہ فن اور تکنیک باہم رشتے میں منسلک ہیں بلکہ یہ کہنا جائز ہے کہ فن یعنی آرٹ میں سے ہی تکنیک نے جنم لیا ہے۔ محمد احسن فاروقی اس بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں کہ:"یہ امر ہمیشہ مسلم ہے کہ فن کے لیے تکنیک ضروری ہے لیکن اگر وہ فن میں چھپ نہ سکے تو فن بناوٹی ہو جاتا ہے اور اپنے مقصد سے ہٹ جاتا ہے۔"[۱۱۲]

اس طرح تکنیک اور فن ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں اور نہ ہی انہیں ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے اور یہ ایک دوسرے سے اتنے جڑے ہوئے اور پیوست ہیں جیسے رنگوں سے بھرپور قوس قزح ہوں جس میں یہ تو نظر آتا ہے کہ کتنے رنگ اس میں شامل ہیں لیکن یہ دیکھنا انتہائی مشکل ہے کہ ایک رنگ کا آغاز کہاں سے ہو رہا ہے اور اختتام ڈھونڈنا بہت ہی مشکل ہے ارسطو تکنیک کے بارے میں کہتا ہے:

"تکنیک سے مراد ہے وہ طریقہ جس سے فنکار اپنے موضوع کو پیش کرتا ہے۔"[۱۱۳]

مختلف لغات کا جائزہ لیتے ہوئے تکنیک کا مفہوم و معنی کچھ اس طرح سے ہیں۔ قاموس الاصطلاحات میں تکنیک کی تعریف کچھ یوں ہے:"Technique:اسلوب فن، تکنیک، فنی پہلو۔"[۱۱۴]

انگریزی ڈکشنری میں تکنیک کچھ یوں ہے:

"**Technique:**A Method of manipulation in an art."[115]

آکسفورڈ ایڈوانس تکنیک کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہے۔

"Method of doing or performing something specially in the Arts of science. "[116]

اس طرح تکنیک کے بہت سے معنی سامنے آتے ہیں۔ تکنیک کے سب سے مناسب معنی یہ ہیں۔ طریقہ کار، طریقہ عمل۔ جیسا کہ ارسطو کی تعریف سے بھی واضح ہے کہ "وہ طریقہ جس سے فنکار اپنے موضوع کو پیش کرتا ہے" اس طرح تکنیک کی تعریف یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ انسانی دماغ میں موضوع اور خیالات سے لے کر کسی مواد

کی شکل پذیری تک جو عمل رو پذیر ہوتا ہے اس عمل کو تکنیک کا نام دیا جاتا ہے۔اگر ہم انشائیہ کے حوالے سے دیکھیں تو پہلے کوئی موضوع ذہن میں آتا ہے پھر اس کا طے کیا ہوا طریقہ ڈرامائی تکنیک، مکالمے کی تکنیک، شعور کی رو کی تکنیک یا واقعاتی یا بیانیہ طریقے میں اسے بیان کیا جاتا ہے اس طرح اس سے ایک ڈھانچہ تشکیل پا جاتا ہے اور پھر انشائیہ کے عناصر اس میں شامل کر دیے جاتے ہیں اور پھر انشائیہ کی رائج الوقت ہئیت کے مطابق انشائیہ ڈھل جاتا ہے اور اس میں ایسی تکنیک کا استعمال ہوتا ہے جو روایت کا حصہ ہوتی ہے اور اس روایت کو وہ تجربہ کی شکل میں ڈھال لیا جاتا ہے۔اگرچہ ہر ادبی صنف میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں آتی ہیں اور کسی بھی صنف کی ہئیت اور تکنیک میں بھی تبدیلیاں وقت کے ساتھ ساتھ آتی رہتی ہیں اگرچہ تکنیک جامد نہیں ہوتی بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی کے عمل سے گزرتی ہے۔ڈاکٹر عبادت بریلوی اس بارے میں کہتے ہیں:

> ”تکنیک اور ہئیت کا مسئلہ جمالیات کا مسئلہ ہے۔جمالیات حسن کا فلسفہ ہے۔وہ ہر زمانے میں حالات اور واقعات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بدلتا ہے جیسے جیسے زندگی میں تغیر آتا ہے،معیار اقدار بدلتے رہتے ہیں،افراد کے مزاج اور طبائع میں تبدیلیاں ہوتی ہیں،ویسے ویسے حسن کے تصوارات بھی بدلتے رہتے ہیں۔تکنیک کے اصول بھی اٹل نہیں۔ادب اور فن کے مختلف اصناف کی تکنیک ہر دور اور ہر زمانے میں تغیرات کے سانچے میں ڈھلتی رہتی ہے۔یہ تغیرات حالات و واقعات کی تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔جب حالات و واقعات میں انقلاب انگیز تبدیلیاں ہوتی ہیں۔۔۔۔۔۔تو یہ تبدیلیاں تکنیک اور فن میں نمایاں ہوتی ہیں۔“[۱۷]

اس طرح وقت کے ساتھ ادب کی ہر صنف میں تبدیلی کا آنا نمایاں ہے کیونکہ ہر صنف میں تجربے ہوتے رہتے ہیں۔دراصل تکنیک کا لفظ انگریزی سے آیا ہے اور انگریزی نے اسے یونان سے لیا ہے۔انگریزی میں اسے Technique کہتے ہیں اور یونان والے Technikos کہتے ہیں۔اگر مجموعی طور پر اس کے مفہوم و معنی کو دیکھا جائے تو اس کے معنی طریقہ کار کے ہیں۔چنانچہ ہر صنف کی اپنی ایک الگ تکنیک ہوتی ہے اور اس طرح انشائیہ کی تہذیب و ترتیب میں بھی تکنیک ایک اہم کردار ادا کرتی ہے اور اس طرح حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انشائیہ نگار کا منتہائے مقصود صرف تکنیک کو پیش کرنا نہیں ہوتا بلکہ تکنیک منزل تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔اس طرح بہترین تکنیک کسی بھی صنف کو موثر بناتی ہے مگر تاثر اصل میں نفس مضمون سے پیدا ہوتا ہے لیکن ایک عمدہ تکنیک ایک ذہین انشائیہ نگار کے ہاتھوں سے بہترین تخلیق کرواتی ہے گویا تکنیک کو اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے

کہ جب ایک مکان کی تکمیل کی جاتی ہے تو سب سے پہلے مکان کا خیال آتا ہے پھر نقشہ تیار کیا جاتا ہے پھر اس نقشے میں دروازے، کھڑکیاں، چھت، دیواریں اور پینٹ کو ترتیب دیا جاتا ہے پھر جب اس نقشے کے مطابق مکان تعمیر ہو جاتا ہے تو پھر یہ مکان گھر کی صورت میں ڈھل جاتا ہے اگر اس پورے عمل کو انشائیے پر تطبیق کریں تو پہلے موضوع ذہن میں آتا ہے پھر طریق عمل اور اگر اس عمل کو دیکھا جائے تو یہ پورا عمل اسلوب اور عمدہ تکنیک سے تیار ہوتا ہے۔اس طرح ضروری نہیں کہ ہر انشائیہ کی صرف ایک ہی تکنیک ہو بلکہ مصنف کے ذہن میں جب خیال آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کی تکنیک بھی ذہن میں آجاتی ہے۔ لیکن یہ ضروری بھی نہیں کہ ہر خیال اپنے ساتھ اس کی تکنیک بھی ذہن میں لائے مگر اتنا بھی ممکن ہے کہ ہر مصنف کو خیال کے دوران ہلکا پھلکا ڈھانچا ذہن میں آجائے اور جب وہ صفحہ قرطاس پر اُترتا ہے تو رائج الوقت کے طریقوں میں سے ہی ایک طریقہ ہوتا ہے۔انشائیے کی تکنیک پر اگر غور کیا جائے تو اس میں تسلسل خیال، غیر رسمی طریق، کفایت لفظی،عدم تکمیل وغیرہ موجود ہونا ضروری ہے۔ تاہم انشائیہ میں یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ انشائیہ سیال صورت میں ہوتا ہے اور یہ ہر صورت میں ڈھل جاتا ہے ڈاکٹر وزیر آغا اس بارے میں اپنی رائے دیتے ہیں:"انشائیہ کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں۔ حتیٰ کہ یہ بھی ضروری نہیں کہ اسے لازمی طور پر مضمون کے اسلوب میں ہی لکھا جائے۔"[۱۸]

اس طرح مسعود انور بھی انشائیہ کی تکنیک کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

"مسعود انور نے انشائیہ کی ہئیت کو ایک غبارے سے مشابہہ قرار دیا ہے جس کے اندر ہوا بھری ہو تو ٹھوس نظر آتا ہے لیکن جب ہاتھ لگائیں تو احساس ہوتا ہے کہ یہ ٹھوس نہیں لچکدار ہے۔"[۱۹]

تاہم اس کی کوئی خاص شکل یا وضع نہیں ہوتی مگر ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے ک اگر کسی نثر پارے کی باقاعدہ ہئیت یا وضع نہ ہو تو وہ انشائیہ ہے۔ کوئی بھی فن پارہ اپنی صنف کے لحاظ سے مختلف اجزاء کو منتخب کر کے ایک تکنیکی سانچے کی صورت میں ڈھالا جاتا ہے اور پھر یہ کُل کی شکل میں ترتیب دیا جاتا ہے۔ انشائیہ میں تمام اجزاء ایک مرکز سے جُڑے ہونے کے باوجود آزاد اور لچکدار ہوتے ہیں اس طرح انشائیہ نگاری کو پوری آزادی ہے کہ وہ صرف انشائیہ کو بیانیہ انداز میں ہی نہ لکھے اور اگر فن میں ضرورت ہو تو افسانے یا ڈرامے کی ہئیت میں بھی اسے لکھا جا سکتا ہے مکالمے اور ناول کی تکنیک کا بھی استعمال کیا جا سکتا ہے چاہے تو انشائیے میں سنجیدہ عناصر، فکری عناصر، مزاحیہ و فلسفیانہ عناصر شامل کیے جا سکتے ہیں مگر انشائیہ کا مقصد کہانی بیان کرنا یا ڈرامہ تخلیق کرنا نہیں ہوتا بلکہ افسانوی، ڈرامائی یا مکالماتی عناصر انشائیے کی تکنیک میں بہترین اجزاء کا کام دے کر اس میں نکھار پیدا کرتے ہیں مگر یہ اجزاء یا عناصر

انشائیہ کے فطری مزاج پر غلبہ نہیں پاسکتے۔ڈرامہ ،افسانہ اور ناول وغیرہ میں ایک طرح کی وسعت پائی جاتی ہے مگر انشائیے میں الفاظ کو عقلمندی سے استعمال کیا جیا تا ہے اس طرح مختلف مصنفین نے انشائیے کی ہئیت و تکنیک کے مختلف تجربات کیے ہیں انشائیے میں وزیر آغا نے انشائیے میں زیادہ تجربات کیے ہیں ان کا انشائیہ ''ٹھنڈا ہاتھ'' میں افسانے کی تکنیک استعمال کی گئی ہے لیکن انشائیہ پر افسانوی عناصر غلبہ پانے کی خوبی نہیں رکھتا بلکہ انشائیہ اپنی شکل میں ہی رہتا ہے اس طرح دبستان لاہور کے انشائیہ نگار اپنے انشائیوں میں خارجی عناصر رکھتے ہیں اور دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگار داخلی عناصر زیادہ رکھتے ہیں۔ دبستان لاہور اور مشکور حسین یاد کے مطابق انشائیہ کو کسی بھی شکل میں لکھا جاسکتا ہے مطلب یہ کہ انشائیہ کو ادب کی کسی بھی صنف میں ڈھالا جاسکتا ہے لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ صرف ظاہری ڈھانچا ہی قابل قبول ہو گا اور باطنی طور پر اس سے گریز کیا جائے گا۔

انشائیہ میں واقعہ نگاری کو کوئی جگہ نہیں دی جاتی مگر واقعہ سے کام لیا جاسکتا ہے انشائیے میں واقعات کے چھینٹے تو موجود ہوتے ہیں مگر انشائیے میں واقعات کے گھروندے قائم نہیں کیے جاسکتے ہر واقعہ چاہے وہ بہت چھوٹا کیوں نہ ہو اس میں ناہموار یا ہموار ٹکڑے ضرور موجود ہوتے ہیں یہ ٹکڑے فضول اور مہمل نہیں ہوتے بلکہ ان کا کوئی نہ کوئی کام ضرور ہوتا ہے اسے ہم اکثر لطیفوں اور چٹکلوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے مگر اسے ادبی زبان میں محاضرات کہا جاتا ہے اور انشائیہ میں ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور ان محاضرات سے انشائیہ میں شگفتگی و تازگی پیدا ہو جاتی ہے جس سے انشائیہ نکھر اُٹھتا ہے۔

انشائیے میں شخصیت نگاری یا خاکہ نگاری سے بھی کام نہیں لیا جاسکتا بلکہ انشائیہ میں شخصیت نگاری اور خاکہ نگاری کے کچھ نقوش تو بکھیرے جاسکتے ہیں مگر ان کو مرکزی جگہ نہیں دی جاسکتی بلکہ یہ ہمیشہ ذیلی ہی رہتے ہیں تاہم انشائیہ میں بنیادی یا مرکزی خیال نہیں پایا جاتا کیونکہ دبستان سرگودھا کے مطابق انشائیہ ذہن کی آزاد خیالی کا ہی نتیجہ ہے جبکہ مشکور حسین یاد کے مطابق انشائیہ آزاد خیالی کا نہیں بلکہ نظم وضبط کا پابند ہوتا ہے۔

انشائیہ لفظوں کے فالتو بوجھ کو اُٹھانے کا متحمل نہیں ہوتا انشائیے میں بے جا تفصیلات انشائیے کے لیے موثر نہیں ہیں انشائیے کے مزاج کے لیے کفایت لفظی اور اختصار ہی کارگر ہیں انشائیہ نہ اتنا پھیلا ہو اور نہ ہی اتنا گُتھا ہوا ہو کہ اس سے معنی کشید کرنا مشکل ہو۔ انشائیہ عام طور پر دو صفحات پر بھی مشتمل ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ انیس، بیس صفحات کا بھی ہو سکتا ہے۔ انشائیے میں انوکھے اور منفرد پہلوؤں اور موضوعات کو صفحہ قرطاس پر بکھیرا جاتا ہے اس لیے اس میں بہت کم اور چُنے ہوئے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں اس سے منفرد ا اور انوکھے موضوعات نمایاں

ہوتے ہیں۔اگر انشائیہ زیادہ مفصل ہو تو غیر ضروری تفصیلات انشایئے کی خوبصورتی کو کم کر دیتی ہیں تاہم انشایئے کے اختصار اور طوالت کے بارے میں باقاعدہ کوئی اُصول متعین نہیں کیا گیا۔

انشائیہ کی تکنیک کی ایک اور اہم صفت عدم تکمیل ہے انشائیہ میں انجام یا حرف آخر نہیں ہوتا اس میں کبھی بھی تکمیل کا عنصر موجود نہیں ہوتا بلکہ تشنگی ہمیشہ قائم رہتی ہے مقالہ اور مضمون میں تکمیل کا عنصر موجود ہوتا ہے جبکہ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگار اپنی انشائیہ نگاری میں عدم تکمیل کو ضروری جزو قرار دیتے ہیں اور وہ زندگی کے غیر مختتم کُل میں سے صرف ایک جزو کو منتخب کرتے ہیں اور اسے ایک چنگاری بنا دیتے ہیں جس سے زندگی کے بہت سے کونے روشنی کی لپیٹ میں آجاتے ہیں اور قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالیتے ہیں۔انشائیہ کا آغاز ماضی یا حال سے ہوتا ہے اور مستقبل کو اپنی گرفت میں کرنے کی بھرپور جدوجہد کرتا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق انشائیہ غزل سے مطابقت رکھتا ہے۔وزیر آغا اس بارے میں اپنی رائے یوں دیتے ہیں۔

> ”غزل کے شعر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی ایک نکتہ کو اُجاگر کیا جاتا ہے، لیکن اس کے تمام پہلوؤں کو ناظر کے فکر و ادراک کے لیے نامکمل صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔“[۱۲۰]

جس طرح غزل بھی نامکمل صورت حال کو بیان کرتی ہے اس طرح انشائیہ بھی صرف کچھ گوشوں پر ہی روشنی ڈالتا ہے اور اس کے بہت سے گوشے تشنہ ہی رہ جاتے ہیں اور یہ نامکمل گوشے ہی قاری کی سوچ و فکر پر مہمیز لگاتے ہیں اور سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔انشائیہ میں تسلسل خیال کا ہونا بھی بہت ضروری ہے ڈاکٹر جانسن اسے ذہن کی آزاد ترنگ کہتے ہیں اور ڈاکٹر وزیر آغا اسے غیر رسمی طریق کہتے ہیں ناول، افسانہ اور ڈرامہ اور داستان وغیرہ میں ذہن کو آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا وہ شروع میں ہی اختتام اور منزل کی نشاندہی کرلیتا ہے اور آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہو جاتا ہے تاہم انشایئے میں ایسے اصول نہیں ہیں۔یہ وہ واحد نثری صنف ہے کہ مصنف ادھر اُدھر تانک جھانک سکتا ہے اور اس کے انوکھے اور منفرد پہلوؤں سے مسرت کشید کرتا ہے انشائیہ نگار خیال کی رو کا بھی تعین نہیں کرتا۔دوسری اصناف میں منزل کا تعین پہلے کرلیا جاتا ہے اور اس کے لیے سیدھے راستے کا انتخاب کرلیا جاتا ہے جبکہ انشائیہ نگار پگڈنڈی پر گامزن رہتا ہے اور یہ پگڈنڈی کی راہ کبھی منزل بن جاتی ہے اور کبھی یہ پگڈنڈی مسافر کو راستے میں ہی گما دیتی ہے اس طرح یہ سفر مسافر کو راستے میں نئے تجربات سے روشناس کرواتا ہے اور اس کے خیالات پر بھی مہمیز لگاتا ہے اور اس پر نئے اسرار و رموز آشنا ہوتے ہیں۔ڈاکٹر انور سدید اس بارے میں بیان کرتے ہیں:

"عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انشائیہ میں خیال کی رو کسی ایک مخصوص جہت میں نہیں لپکتی بلکہ یہ انشائیہ نگار کے ذوق اور فطرت کے مطابق متعدد سمتوں میں سفر کرتی اور بہت سی اشیاء اور مظاہر کو مس کرتی ہے اور ہمیشہ بہجت اور مسرت کی ایک نئی کیفیت کو جنم دیتی ہے۔"[۱۲۱]

تسلسل خیال کی وجہ سے انشائیہ میں غیر رسمی طریق کار کی بھی خوبی در آئی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا غیر رسمی طریق کار کو کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ زندگی کی گہما گہمی، شور شرابے اور سنجیدگی کو نظر انداز کر کے غیر رسمی طریق کو اپنایا جائے اور اپنے شخصی رد عمل سے قاری کو بھی اپنے حلقے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ مشکور حسین یاد غیر رسمی انداز بیان کے بارے میں بیان کرتے ہیں:"دراصل غیر رسمی انداز بیان سے ایسا انداز بیان مراد ہے جو عام اسالیب بیان سے مختلف ہو، جس انداز بیان سے بیان کے نئے نئے راستے پیدا ہوتے نظر آئیں جس میں سنجیدگی ہو لیکن ایسی سنجیدگی جو دید و شنید کے اچھوتے پیمانے رکھتی ہو۔"[۱۲۲]

انشائیہ کی تکنیک و فن کے لیے انکشاف ذات بھی بہت ضروری ہے مشکور حسین یاد کے مطابق انشائیہ لکھنے کے لیے انکشاف ذات اس قسم کا ہو کہ انشائیہ نگار کی ذات کے مختلف پرت اٹھتے چلے جائیں اور اس میں ذاتی انکشاف کے ساتھ ساتھ غیر ذات کا انکشاف بھی ضروری ہے اور اسی خصوصیت کی وجہ سے انشائیہ دوسرے ادب پاروں سے مختلف ہے ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے میں اگر انشائیہ نگار اپنی ذاتی باتوں کا ذکر سیدھے سادے انداز میں کر دے تو یہ انشائیہ نگار کے لیے کافی ہے۔

انشائیے میں جہاں انکشاف ذات ہو وہاں واحد متکلم کا استعمال بھی ضرور کیا جاتا ہے گویا یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں تاہم بعض واحد متکلم کو چھپا کر بھی انکشاف ذات کرتے ہیں۔ مشکور حسین اس بارے میں اپنی رائے یوں دیتے ہیں:

"دنیا پر ہماری انفرادیت واحد متکلم کے استعمال ہی سے آشکارا ہو سکتی ہے اور چونکہ انشائیہ کا مقصد ہی لکھنے والے کی انفرادیت کو آشکارا کرنا ہوتا ہے اس لیے اس میں واحد متکلم کے استعمال کو لازمی قرار دینے کی وجہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔"[۱۲۳]

ن۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا تکنیکی تقابل:

ا۔ دبستان سرگودھا کے انشائیوں کا تکنیکی جائزہ:

i۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کا تکنیکی جائزہ:

ڈاکٹر وزیر آغا اپنے انشائیوں میں تکنیک کے بہت کم تجربے کرتے دکھائی دیتے ہیں ان کے زیادہ انشائیوں میں ہمیں کہانی لکھنے کا انداز ہی نظر آتا ہے جیسے وہ اپنے انشائیوں میں قاری کو کہانی سنا رہے ہوں اور تھوڑا بہت افسانوی انداز بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے انشائیوں میں تلازمہ خیال کی تکنیک بھی دیکھنے کو ملتی ہے ان کے

انشائیوں میں تمثیلی انداز بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ انشائیوں میں تشبیہ واستعارہ کو بھی برتتے ہیں۔ آپ انشائیوں میں علامت کا استعمال بھی بخوبی کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں کہیں کہیں مزاح دیکھنے کو تو ملتا ہے مگر اس میں تضحیک کی خوبی بالکل بھی موجود نہیں ہے۔ آپ زیرلب تبسم کو خوبی سے قاری کو آشنا کرتے ہیں۔ ان کا انشائیہ کہیں سے بھی شروع ہو کر کہیں پر بھی ختم ہو جاتا ہے ان کے انشائیوں میں ڈرامائی عناصر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں کو ایک خوبصورت موڑ سے نواز کر قاری کو متاثر کرتے ہیں اور نامکمل پہلوؤں اور زاویوں سے قاری کی سوچ کو متحرک کرتے ہیں۔ وہ قاری کو ایک نئے راستے سے آگاہ کر کے خود ایک طرف ہو جاتے ہیں جس سے تشنگی کا عنصر پیدا ہوتا ہے تاہم عدم تکمیل کا عنصر ان کے انشائیوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ تاہم انشائیہ کی کوئی خاص ہئیت یا تکنیک نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر وحید قریشی بیان کرتے ہیں: ”انشائیہ کی خارجی شکل کسی ایک تکنیکی سانچے پر مبنی نہیں۔“[۱۲۴]

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں میں داخلی و خارجی انداز کی تکنیک بھی موجود ہے مگر خارج سے زیادہ باطن کی خوبی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں اپنی ذات کے مختلف پرتو سے قاری کو آگاہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں اپنے تجربات ومشاہدات کا استعمال کرتے ہیں جو کہ لاشعوری طور پر ان کی تحریر کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اپنے انشائیوں میں تفصیل سے پرہیز کرتے دکھائی دیتے ہیں اور اختصار کا استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں غیر رسمی طریقہ کار کو اپناتے ہیں اور تازگی کا عنصر بھی ان کا انشائیوں میں دکھائی دیتا ہے۔

انشائیہ چوری سے یاری تک بیانیہ انشائیہ ہے انشائیے میں چوری کی تاریخ بھی رقم کی ہے کہ آریا قوم نے جب ہم پر حملہ کر کے ہمارے قلعوں کو برباد کیا تو انتقام کے طور پر رات کے وقت ہمارے لوگوں نے ان کے مویشی چوری کرنے شروع کر دیے اور نتیجے کے طور پر وہ ہمیں بددعائیں دینے لگ گئے مگر وقت کے ساتھ ہم نے اس پیشے کو اپنی پوری زندگی پر محیط کر لیا ہے۔ مصنف انشائیے میں فارسی محاورے کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ انشائیے میں صیغہ واحد غائب کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ چوری کا رومانوی پہلو بھی مصنف نے چابکدستی سے انشائیے کو آگے بڑھانے کے لیے بیان کیا ہے جس میں چوری چھپے کی محبت شامل ہے گویا مصنف چوری کے تمام پہلوؤں پر طنز بھی کرتے ہیں لیکن ان کے طنز میں تلخی موجود نہیں ہے۔ انشائیے کے آخر میں تشنگی کا عنصر موجود ہے جو کہ عدم تکمیل کی وجہ سے ہے نیز انشائیے میں اختصار کی خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ انشائیہ زیادہ خارجی پہلو رکھتا ہے اس میں داخلیت کا عنصر بہت کم پایا جاتا ہے۔ مصنف انشائیہ سیاح کا آغاز کہانی سنانے کی تکنیک سے کرتے ہیں۔ مصنف انشائیے میں انکشاف ذات اور اپنے ذاتی تجربے سے بھی کام لیتے ہیں اس وجہ سے انشائیے میں واحد متکلم کا استعمال کیا گیا ہے۔ انشائیے میں

مصنف مثال دے کر بھی چیزوں کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔ مصنف انشائیے میں اپنے کرداروں کا حلیہ بھی بیان کرتے ہیں:

"وہ دونوں نوجوان تھے۔ قیاس غالب ہے کہ اطالوی تھے اور سیاحت کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ لڑکی نے ایک تنگ سی بے حد خستہ حال پتلون اور بُوشرٹ پہن رکھی تھی۔ اُس کے سر کے بال اُلجھے ہوئے اور گرد آلود تھے۔ چہرہ میک اپ سے قطعاً نا آشنا تھا، البتہ آنکھیں بہت روشن تھیں۔ لڑکے کا لباس بھی اُس کے جسم کے ساتھ بُری طرح پیوست تھا۔ اس کی سنہری داڑھی جو جنگل کی طرح ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، گرد سے کچھ اور سنہری ہو گئی تھی۔"[۱۲۵]

انشائیے میں مصنف تقابل کی تکنیک بھی اپناتے ہیں جس میں مصنف مسافر اور سیاح کا تقابل کرتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح مصنف انشائیے میں دو اکھٹی تکنیکیں استعمال کرتے ہیں جس میں کہانی یا افسانوی طرز شامل ہے اور دوسرا تقابل کی تکنیک شامل ہے۔ انشائیہ طوطا پالنا بیانیہ انداز میں لکھا گیا انشائیہ ہے۔ جس میں صیغہ واحد غائب کے ساتھ واحد متکلم کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ تاہم طوطا پالنا ایک علامتی انشائیہ ہے۔ اس میں مصنف زندگی کے فلسفے کو بیان کر کے انشائیہ مکمل کرتے ہیں جس میں مصنف انسان کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں پہلے دور کو کبوتر پالنے کا دور کہتے ہیں اور یہ عہد طفلی کا دور کہلاتا ہے جس دور میں کبوتر اڑا کر بچے خوشی کا اظہار کرتے ہیں دوسرا دور وہ ہے جس میں آپ مرغ پالتے ہیں اور یہ دور جوانی کا دور کہلاتا ہے تیسرے دور کو طوطا پالنے کا دور کہا گیا ہے اور یہ دور بڑھاپے کا دور کہلاتا ہے۔ انشائیے میں داستانوی عناصر بھی دیکھے جاسکتے ہیں جس میں دیو کی جان طوطے میں ڈالنے کا ذکر کیا گیا ہے اور مصنف انشائیے کے اختتام میں واقعے کو بھی شامل کرتے ہیں جس سے عدم تکمیل کا عنصر دیکھنے کو ملتا ہے۔

انشائیہ جہاں کوئی نہ ہو بیانیہ انداز میں لکھا گیا انشائیہ ہے اس میں صیغہ واحد غائب کا استعمال ہوا ہے۔ کہیں کہیں جہاں مصنف انکشاف ذات کرتے ہیں وہاں واحد متکلم کا استعمال کیا گیا ہے۔ انشائیے میں گوتم بدھ کو علامتی انداز میں لکھا گیا ہے مصنف انشائیے میں شہری اور دیہی زندگی کا تقابل کرتے نظر آتے ہیں۔ انشائیے میں مصنف واقعے اور قصے کو بیان کر کے انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ انشائیے میں فطرت کو بہت خوبصورتی سے انشائیے میں سمویا گیا ہے۔ مصنف ادبی حوالے کو بہت خوبصورتی سے انشائیوں کو آگے بڑھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں مصنف غالب کا ذکر بہت عمدگی سے کرتے ہیں۔

انشائیہ بس اتنی سی بات ہے کو مصنف کہانی سنانے کے انداز میں لکھتے ہیں۔ انشائیے میں فلسفہ،نفسیات اور فکر کو بیان کر کے انشائیے کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ مثال دے کر انشائیے کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ انشائیے میں علامت کا استعمال کیا گیا ہے اس طرح انشائیہ فٹ پاتھ میں مصنف سڑک اور فٹ پاتھ کا تقابل کرتے نظر آتے ہیں تشبیہ اور استعارہ کا استعمال کر کے سڑک اور فٹ بال کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ انشائیہ کا آغاز کہانی سنانے کے انداز سے کیا گیا ہے اور انشائیے کا اختتام عدم تکمیل پر کیا گیا ہے جو کے قاری کو سوچ میں ڈال دیتا ہے۔

انشائیہ کچھ رشتے داروں کی شان کا آغاز بیانیہ انداز میں ہوتا ہے اور مصنف انشائیے کا آغاز ایک طنزیہ فقرے سے کرتے ہیں اور طنز میں میں چبھن موجود نہیں ہے بلکہ وزیر آغا کے انشائیوں میں میں زیر لب تبسم موجود ہے۔ انشائیے میں رشتے داروں کی اقسام تفصیل سے بتائیں گئیں ہیں۔ انشائیے میں فارسی فقرات "آفت رسیدہ دوست کو آفت زدہ"، "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند" وغیرہ کا بھی مصنف بہت خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔ انشائیے میں شعر کو بھی برتا گیا ہے۔

بہشت آنجا کہ "رشتے دارے" نباشد
کسے نا باکسے کارے نبا شد[۲۶]

انشائیے کا اختتام مصنف ایک نئے رشتے دار بھائی کے بارے میں تعارف کروا کر کرتے ہیں تاہم اس میں بھی عدم تکمیل کا عنصر موجود ہے: "میں نے ان کی بات فوراًمان لی ہے کیونکہ شاعر بھائی ہونے کی حیثیت سے وہ میرے تازہ ترین رشتے دار ہیں اور مجھے اپنے رشتے داروں بالخصوص تازہ ترین رشتے داروں سے بڑا ڈر لگتا ہے!"[۲۷]

مصنف انشائیے میں جہاں انکشاف ذات کرتے ہیں وہاں واحد متکلم کا استعمال کیا گیا ہے انشائیے میں زیادہ تر واحد غائب کا صیغہ برتا گیا ہے اور انشائیے میں نکتہ آفرینی کی صفت موجود ہے۔ انشائیہ یہ معصوم لوگ کہانی کے انداز میں لکھا گیا انشائیہ ہے اور مصنف انشائیے میں اپنے دوست کا نام صیغہ راز میں رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ بیتے ہوئے واقعے کو بیان کرتے ہیں۔ ان کا یہ انشائیہ ان کی فطرت سے محبت کا بھی ثبوت ہے گویا ان کے چاروں مجموعوں میں فطرت کا ذکر وافر مقدار میں موجود ہے جو کہ ان کی فطرت سے محبت کا ثبوت ہے۔

انشائیہ درمیانہ درجہ کہانی کے انداز میں لکھا گیا انشائیہ ہے اور یہ ایک استعاراتی انشائیہ ہے اس میں علامت کو بھی برتا گیا ہے۔ مصنف نے ریل گاڑی کو استعارے کے طور پر برتا ہے اونچا درجہ، درمیانہ درجہ اور نچلا درجہ ہے اونچے درجے کے مسافر ٹھنڈی، میٹھی، پُرسکون اور طمانیت سے بھرپور لمبی تانے سوتے ہیں۔ انہیں کسی قسم کا ڈر اور

خوف نہیں ہوتا، نچلے درجے کے مسافر بھی ڈر، خوف اور معاشرے کی الجھنوں سے بے نیاز ہوتے ہیں اور انہیں نیند کم ہی میسر ہوتی ہے جبکہ درمیانے درجے کے لوگ خواب جیسی کیفیت میں ہی مبتلا رہتے ہیں وہ کبھی میٹھے، کبھی ڈراؤنے اور کبھی بھیانک خواب دیکھتے ہیں درمنیانے درجے کے لوگوں کے لیے مصنف نے الہ دین چراغ کی علامت استعمال کی ہے کہ جس طرح الہ دین چراغ رگڑ کر عالی شان مکان بنانے کا خواب دیکھتا ہے اس طرح درمیانے درجے کے لوگ بھی خواب دیکھتے ہیں۔ اسطرح مصنف نے تیسرے درجے کے لوگوں کو چھلاوہ کے نام سے نوازا ہے کیونکہ ایسے لوگ ہمیشہ تشنہ آرزو ہوتے ہیں۔ گویا مصنف نے انشایئے میں استعارے کی تکنیک استعمال کی ہے۔

انشائیہ آگ تاپنا بیانیہ انداز میں لکھا گیا انشائیہ ہے انشائیہ کا آغاز میں آگ تاپنا کی اہمیت بیان کر کے اس کی انشائیہ کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ انشایئے میں آگ تاپنے کی کیفیت اور اس کے اجتماعی احساس کو بیان کیا گیا ہے انشایئے میں انکشاف ذات اور ذاتی احساسات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ انشائیہ کے آغاز میں مخاطب صیغہ غائب کو برتا گیا ہے جبکہ انکشاف کے لیے صیغہ واحد متکلم کو برتا گیا ہے۔

"انشائیہ کچھ خوبصورتی کے بارے میں کا آغاز کہانی سنانے کے انداز سے کیا گیا ہے۔ پچھلے اتوار کا ذکر ہے میں اپنے ایک دوست کے پاس قیام پذیر تھا۔ یہ دوست محکمہ زراعت میں خاصے بڑے افسر ہیں اور زرعی امور میں ان کی رائے حرف آخر سمجھی جاتی ہے۔"[۱۲۸]

آغاز میں واقعہ بیان کیا گیا ہے اور واقعے کے بعد واقعہ کو بیان کر کے خوبصورتی کے بارے میں رائے دی گئی ہے اور واحد متکلم کا استعمال کر کے انکشاف ذات کو سامنے لایا گیا ہے اور اختتام میں نچوڑ کو بیان کیا گیا ہے۔

"انشائیہ موڑ کا آغاز سوال پوچھتے ہوئے یعنی سوالیہ انداز سے کیا گیا ہے۔ کبھی آپ کسی موڑ پر لحظہ بھر کے لیے رکے ہیں؟ موڑ کی نوعیت کو چھوڑیے!!! بس کوئی سا موڑ ہو۔۔۔۔۔۔ سڑک کا موڑ! ندی کا موڑ یا پھر زندگی کا موڑ!"[۱۲۹]

انشائیہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے اس میں واقعہ بیان کر کے بھی انشایئے کو آگے بڑھایا گیا ہے چونکہ انشائیہ ایک ہی نکتے کے گرد گھومتا ہے اور اسی نکتے کی یا موضوع کی اہمیت بیان کرنے کے لیے ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ تاہم انشائیہ کا اختتام عدم تکمیل پر کیا گیا ہے یعنی سوچنے کی طرف مائل کیا گیا ہے جو کہ قاری کو سوچنے پر مجبور

کرتا ہے۔انشایئے میں بڑے خوبصورت انداز میں منظر نگاری کی گئی ہے۔انشائیہ سائیسی علم دریاؤ کو کہانی سنانے کے انداز میں لکھا گیا ہے انشایئے میں ڈرامے کی طرح مکالمے کا استعمال بھی ہوا ہے۔انشایئے میں مصنف شخصیت نگاری کو بھی عمدہ انداز سے بیان کرتے ہیں:

> "میں اس عجوبہ روزگار کو غور سے دیکھتا ہوں۔گول مٹول ہڈیوں اور گوشت کا بنا ہوا ایک گینداس کا سرِ پُر غرور کہلاتا ہے۔اس گیند میں چاروں طرف بال ہی بال ہیں۔فقط آنکھوں کے اوپر ایک چھگوٹی سی پیشانی اور آنکھوں کے نیچے دو اُبھرے ہوئے رُخسار بالوں کی یلغار سے محفوظ ہیں ورنہ ہر طرف جنگل ہی جنگل ہے۔پھر میں دیکھتا ہوں کہ اس گیند کو چار شاخوں والے ایک دھڑ پر گویا بٹھا دیا گیا ہے۔"[۳۰]

انشایئے میں علامت کا استعمال بھی کیا گیا ہے انشایئے کو مختصر لکھا گیا ہے۔انشائیہ کتابوں کی معیت میں کو کہانی سنانے کے انداز میں لکھا گیا ہے وزیر آغا انشایئے میں بہت سے مصنفین کی کتب اور شعراء کا ذکر بھی کرتے ہیں جس میں لورین ایزلے کی کتاب دی ایمنس جنری، نطشے کی دس سپیک زراتھسترا اوروہٹ مین کی کتاب لیوز آف گراس شامل ہیں مصنف رابندر ناتھ ٹیگور کے واقعے کو بھی اانشایئے میں شامل کرتے ہیں انشایئے میں نطشے کی نظم کو بھی اردو الفاظ میں بیان کیا گیا ہے نیز مصنف نطشے کی کتاب کے بارے میں مزید ذکر کرتے ہیں۔مزید مصنف والٹ وہٹ مین شاعر کا ذکر بھی کرتے ہیں اور ان کی نظم "گھاس کی پتیاں" کو بھی انشایئے میں بیان کیا گیا ہے اس نظم میں محبت کو بیک وقت فطرت اور خدا کے قانون بھی کہا گیا ہے اور پھر ستاروں سے آگے کے جہانوں کو خوبصورتی سے انشایئے میں بیان کیا گیا ہے۔تاہم مصنف والٹ ویٹ مین کے جذبہ سیاحت کے بارے میں عمدہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔مصنف انشایئے میں کتب اور مصنفین کے ناموں کو انگریزی میں بیان کرتے ہیں انشایئے میں نظموں کو بھی شامل کیا گیا ہے اور اس سے انشایئے کو آگے بڑھایا گیا ہے انشایئے میں مشہور مثل "ہر انگریز ایک جزیرہ ہے اور ہر امریکی ایک براعظم" کو بھی شامل کیا گیا ہے تاہم مصنف مختلف کتب، مصنفین اور شعراء کا ذکر کر کے انشایئے کی تکمیل کرتے ہیں۔

انشائیہ چرواہا بھی کہانی کے انداز سے شروع ہوتا ہے مصنف انشایئے کو اپنے پچھلے ہفتے کا تجربہ بتانے سے آغاز کرتے ہیں مصنف کے زیادہ انشائیوں کا آغاز اسی طرز سے ہوا ہے مصنف تہذیب کا بھی ذکر کرتے ہیں اور اسے

تین ادوار میں تقسیم بھی کرتے ہیں مصنف انشائیے میں چھڑی اور چرواہے کو علامت کے طور پر بھی برتتے ہیں مصنف انشائیے میں تاریخ کا بھی ذکر کرتے ہیں اور انشائیے میں داستان کے آثار بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔انشائیے میں مصنف چرواہے کی خصوصیات کو بھی اس طرز سے بیان کرتے ہیں کہ چرواہے کی خوبیاں ہم پر عیاں ہو جاتی ہیں۔

"میں تو صرف اُن چرواہوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو مویشیوں کا ریوڑ چراتے چراتے ایک روز انسانوں کے ریوڑ چرانے لگتے ہیں۔تب ان کی چھڑی عصا میں بدل جاتی ہے۔ہونٹوں پر اسم اعظم تھرکنے لگتا ہے۔وہ انسانی ریوڑوں کو پہاڑ کی چوٹی پر لاکر یا صحرا کے سینے میں اتار کر یا دریا کے کناروں میں بکھیر کر اس بات کا انتظار کرتے ہیں کہ یہ ریوڑ اپنی کہنگی اور یبوست کو گندی اون کی طرح اپنے جسموں سے اُتار پھینکیں۔پھر جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایسا ہو گیا ہے تو وہ انہیں واپس ان کے گھروں تک لے آتے ہیں۔اس کے بعد وہ خود تسبیح کے دانوں کی طرح پوری کائنات میں بکھر جاتے ہیں۔"[۱۳۱]

انشائیے میں وقت کی حدود لا محدود ہیں۔انشائیے میں خارجی و داخلی دونوں پہلو دیکھے جاسکتے ہیں نیز انشائیے میں منظر کشی بھی بہت عمدہ انداز سے کی گئی ہے جس میں چرواہے کا بکریاں چرانے کا پورا ماحول دیکھا جا سکتا ہے اور چرواہے کی کردار کشی بھی اعلیٰ انداز میں کی گئی ہے۔انشائیے کا اختتام عدم تکمیل پر کیا گیا ہے۔تاہم ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں میں اختصار کی صفت نمایاں ہے اور ان کے انشائیے زیادہ تر سادہ بیانیہ اور کہانی کے انداز سے لکھے گئے ہیں اور مصنف تکنیک کے مختلف تجربوں سے پرہیز کرتے نظر آتے ہیں اور وہ ذہن کی دنیا کی سیاحت کی متنوع تصویریں کھینچتے نظر آتے ہیں جس میں تلازم خیال اور تسلسل خیال کی تکنیک بھی شامل ہے۔

ii۔غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کا تکنیکی جائزہ:

غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کی زیادہ تر تکنیک کہانی لکھنے کے انداز میں ہے۔وہ انشائیہ لکھتے ہوئے اپنے موضوع میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ بہت دور تک نکل جاتے ہیں لیکن پھر اپنے موضوع کی جانب واپس پلٹ آتے ہیں ان کی سوچ کھلے میدانوں میں سفر کرتی ہے اور وہ قاری کو اپنے موضوع کے نتائج سے آگاہ کرتے ہیں تاہم وہ اپنے انشائیوں میں "مرکز" سے ہٹ کر علیحدہ سے ایک "مدار" ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں اختصار کی صفت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔وہ موضوع کے صرف ایک پہلو پر بات کرتے ہیں۔ان کے انشائیوں کی تکنیک

غیر رسمی ہے اور عدم تکمیل کی صفت سے ان کے انشائیے قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔وہ اپنے انشائیوں میں اپنی زندگی کے گہرے تجربات اور عمیق مشاہدات کو تکنیک کا حصہ بناتے ہیں۔انکشاف ذات ان کے انشائیوں میں نمایاں طور پر جھلکتی نظر آتی ہے۔انور سدید ”نرم دم گفتگو“ کے پیش لفظ میں بیان کرتے ہیں:

”زیر نظر کتاب ”نرم دم گفتگو“ ان کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ ہے، یہ ایک ایسے دوست کے خود کلامیے ہیں جن سے ہم نے گزشتہ چند سالوں کے دوران متعدد مرتبہ بے تکلف ملاقات کی ہے۔ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ان کے ساتھ چائے پی ہے اور اس لمحہ عافیت میں کھل کر گفتگو کی ہے۔جب زندگی کا بار گراں کندھوں میں ہٹا ہوا محسوس ہوتا ہے۔“[۱۳۲]

انشائیہ ”تسخیر کائنات“ کا آغاز مصنف کہانی سنانے کے انداز سے کرتے ہیں۔زیر نظر انشائیہ میں ہمیں ایک ہی کردار نظر آتا ہے۔اس میں اجتماعی احساس موجود نہیں ہے بلکہ مصنف اکیلے ہی تسخیر کائنات کے سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔انشائیہ داخلی ہے اس میں مصنف کے ذہنی تصورات موجود ہیں اور اپنی سوچ میں ہی کائنات کو تسخیر کرتے نظر آتے ہیں اس میں مصنف کی سوچ فلسفیانہ نظر آتی ہے۔اس میں وقت کی حدود چند ایک گھنٹوں تک ہی محدود ہے۔مصنف انشائیہ میں واحد متکلم کا ستعمال کرتے ہیں اور انشائیہ کے اختتام میں مصنف کائنات کو تسخیر کرتے نظر آتے ہیں اور انشائیہ کے نتائج اخذ کرتے ہیں۔

”چھوٹی چیزیں، چھوٹے شخص، چھوٹے واقعات جن سے انسان نے اپنی تاریخ مرتب کر رکھی ہے بے ہئیت اور بے چہرہ سے نظر آنے لگتے ہیں۔صرف بڑی بڑی خوشیاں، جیسے معصوم بچے کی مسکراہٹ، بڑی بچی کا روٹھنا، و۔آ۔ کی آنکھوں میں شرارت کا اشکارا۔کوئی ایسا شعر جو زندگی سے اس کی ساری مسخ شدہ تلخیاں لے کر ایک ان بوجھی سی بہجت کا احساس فراواں عطا کر دے ایسی ہی معصوم سی خوشیاں آدمی کو زمین کی کشش ثقل کی قید سے نکال کر ایک ایسی کھلی فضا میں لے جاتی ہیں جہاں ساری کائنات اپنی تمام وسعت کے باوجود آدمی کی ذات کے ایک گوشے میں سما جاتی ہیں۔میں نے تسخیر کائنات کی مہم سر کرلی ہے۔“[۱۳۳]

اس طرح انشائیہ ”مکان بنانا“ میں بھی مصنف نے کہانی سنانے کی تکنیک استعمال کی ہے۔مصنف انشائیہ میں اسلامی واقعہ بیان کرتے ہوئے انشائیہ کو آگے بڑھاتے ہیں اور ساتھ ہی تلمیح کو بھی بیان کرتے ہیں۔

”یہی وجہ ہے کہ جب اصحاب کہف زمین کے پیٹ سے باہر آئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ کئی صدیاں بے چاپ گزر گئی ہیں اور انہیں اس کا علم تک نہیں ہوا۔“[۱۳۴]

مصنف وقت کے فلسفے کو بیان کرتے ہوئے انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں اور انشائیہ کو جاذب نظر بنانے کے لیے شعر کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ انشائیہ میں واحد متکلم کا استعمال کیا گیا ہے۔ انشائیہ میں عدم تکمیل کی خوبی بھی دیکھنے کو ملتی ہے تاکہ تشنگی قائم رہے اور قاری کی توجہ حاصل کی جا سکے۔ انشائیہ داخلی ہے اور وقت کی حدود کچھ مہینوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں کرداروں کی تعداد متعین نہیں ہے مصنف انشائیہ لکھتے ہوئے اپنے خیالوں میں دور تک چلے جاتے ہیں لیکن پھر واپس موضوع کی طرف پلٹ آتے ہیں۔ انشائیہ "بچہ پالنا" بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ تاہم بیانیہ میں کہانی کی تکنیک سے اجتناب برتا جاتا ہے۔ عام طور پر بیانیہ ایک دن کا بھی ہو سکتا ہے کئی گھنٹوں کا بھی، کئی دنوں کا بھی، کچھ سالوں کا بھی اور کچھ عرصے پر بھی محیط ہو سکتا ہے۔ تاہم منظر کشی سے بیانیہ تکنیک مختلف ہوتی ہے۔ انشائیے میں تذکیر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اور انشائیے کے آخر میں شعر کو برتا گیا ہے۔ مصنف انشائیہ "بچہ پالنا" میں مصنف بچہ پالنے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے ہیں۔ اور پھر واپس اسی نکتے کی طرف لوٹ آتے ہیں گویا ان کے انشائیے میں نکتہ آفرینی کی خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ مصنف انشائیہ کا اختتام شعر پر کرتے ہیں۔ مصنف انشائیہ "چہرے" کا آغاز انکشاف ذات سے کرتے ہیں اور انشائیے میں واحد متکلم کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ مصنف بیان کرتے ہیں۔

> "لیکن میرے قریبی حلقے جانتے تھے کہ میرا شمار ان صحت مند افراد میں ہوتا ہے جو اس ڈر سے بیمار نہیں پڑتے کہ کہیں بے خبری میں قفس عنصری کی قید سے آزاد ط ہی نہ ہو جائیں یا ایسے افراد کو یہ خدشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ اگر ایک دفعہ بیمار پڑ جائیں تو پھر لطف مقرر کے لیے اکثر بیمار پڑنا ہو گا۔"[۱۳۵]

مصنف انشائیہ میں زیر لب تبسم کی تکنیک کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ انشائیہ میں کہاوت کو بھی برتا گیا ہے اور انشائیہ کا اختتام اقبال کے ایک شعر کے مصرعہ سے بھی ہوتا ہے۔ انشائیہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ انشائیہ "بلڈ گروپ" کا آغاز کہانی سنانے کے انداز سے کیا گیا ہے۔ مصنف انشائیہ میں مثال کو بیان کر کے بھی انشائیہ کو آگے بڑھاتے ہیں۔ مصنف انشائیہ کے موضوع کی تاریخ سے بھی انشائیہ آگے بڑھاتے ہیں۔ انشائیہ میں وقت کی حدیں کئی سالوں تک محیط ہیں۔ مصنف اپنی زندگی کے تجربات کو انشائیے میں بیان کرتے ہیں۔ انشائیے میں داخلی و خارجی دونوں صفات پائی جاتی ہیں۔ مصنف اپنے انشائیوں میں انگریزی الفاظ کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ انشائیے میں نکتہ آفرینی کا عنصر بھی موجود ہے مصنف موضوع کے مختلف پہلوؤں پر بات کر کے واپس اسی نکتے کی طرف لوٹ آتے ہیں۔

انشائیہ ''ملاقات'' کا آغاز بھی کہانی سنانے کے انداز سے ہوتا ہے۔ مصنف انشائیہ میں واحد متکلم کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ اور بیانیہ انداز سے انشائیہ کو بیان کرتے ہیں۔ انشائیہ میں فارسی فقرے کے ساتھ ساتھ انگریزی الفاظ کو بھی برتا گیا ہے۔ مصنف انشائیہ میں مختلف واقعات کو بیان کرتے ہوئے انشائیہ کو آگے بڑھاتے ہیں۔ مصنف شاعر کا ذکر کرتے ہوئے بھی انشائیہ کو آگے بڑھاتے ہیں تاہم انشائیہ میں نکتہ آفرینی کی صفت کے ساتھ عدم تکمیل کی بھی خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔

iii۔ مشتاق قمر کے انشائیوں کا تکنیکی جائزہ:

مشتاق قمر کے انشائیوں کی تکنیک زیادہ سادہ بیانیہ ہی ہے وہ بات سے بات بڑھانے میں ماہر ہیں۔ ان کے انشائیوں میں سوچ کی ہلکی سی لہر پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے تجربات و مشاہدات سے نئے مفاہیم اخذ کرتے ہیں۔ وہ معمولی سی چیز کو موضوع بنا کر اسے خوبصورت تکنیک سے نوازتے ہیں۔ وہ زندگی کے ایک پہلو کا انتخاب کر کے اسے شخصیت کا گداز لمس دیتے ہیں جس سے انکشاف ذات کی خوبی پیدا ہوتی ہے جو کہ ایک عمدہ انشائیے کے لیے ضروری ہے۔ ان کے انشائیے عدم تکمیل کے حامل انشائیے ہیں اس میں ایک قسم کی تشنگی باقی رہ جاتی ہے عام طور پر انشائیہ ماضی اور موجودہ وقت سے شروع ہوتا ہے مگر اس کا اختتام اور گرفت ہمیشہ مستقبل پر ہی ہوتی ہے۔ ان کے انشائیوں میں اختصار کی خوبی نہیں ہے بلکہ بے جا طوالت ان کے انشائیوں میں در آئی ہے۔ ان کا طریق غیر رسمی ہے یعنی دوستانہ فضا قائم کر کے انشائیہ لکھتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں دلائل اور منطق کی تکنیک کو نہیں اپناتے بلکہ سادہ بیانیہ انداز میں انشائیہ لکھتے ہیں۔ مشتاق قمر اپنے انشائیوں میں پرانی تشبیہات اور استعاروں کا سہارا لیتے ہیں وہ لفظوں کا ایک نایاب جال بُنتے ہیں جس سے موضوع خود بخود آگے بڑھتا ہے وہ اپنے انشائیوں میں ادھر اُدھر کی باتیں کر کے بھی انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں مرقع کشی کی خوبی بھی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کے انشائیوں میں تازگی اور شگفتگی در آئی ہے۔

انشائیہ ''بال کٹوانا'' کی تکنیک کئی صدیوں پر محیط ہے کیونکہ بال کٹوانا ایک تہذیبی عمل ہے اور بال کٹوانے کی تہذیب پرانی صدیوں سے موجودہ دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ مصنف انشائیے میں فارسی محاورے کا استعمال کرتے ہیں۔ مصنف پرانی تہذیب کو آغاز میں بیان کرتے ہیں اور بعد میں موجودہ تہذیب کو بھی بیان کرتے ہیں مصنف انشائیے میں مرقع کشی سے بھی کام لیتے ہیں کہ جس سے پوری تہذیب کی عکاسی ہو جاتی ہے۔ مصنف بال کٹوانے کے ہر پہلو کی عکاسی کرتے ہیں کہ بال کٹوانے کی ہر تہذیب ہمارے آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔ انشائیے میں اجتماعی احساس پایا جاتا ہے۔ انشائیہ خارجی ہونے کے ساتھ بہت وسیع احساس کا حامل ہے۔ کیونکہ اس میں گردو

پیش کی تصویر کشی دیکھنے کو ملتی ہے۔ گویا انشائیہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے اور انشائیے میں تذکیر کا صیغہ ہی برتا گیا ہے۔ انشائیہ آغاز میں ماضی اور پھر حال کی عکاسی کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور پھر مستقبل پر ہی انشائیے کی گرفت ٹھہرتی ہے۔ تاہم انشائیے کا اختتام عدم تکمیل پر ہی ہوتا ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

انشائیہ "مرزا غالب۔۔۔۔۔زندگی کی ساتویں جہت" میں مصنف انشائیے کا آغاز مثال دے کر کرتے ہیں جس سے انشائیہ قاری کی توجہ حاصل کر لیتا ہے مثال دینے کے بعد مشتاق قمر نے انشائیہ کو بیانیہ انداز میں لکھا ہے مشتاق قمر انشائیہ کے آغاز میں واحد غائب کا استعمال کرتے ہیں۔ مگر انشائیہ میں زیادہ تر صیغہ متکلم کو برتتے ہیں۔ تاہم انشائیہ علامتی انداز میں لکھا گیا ہے اور مرزا غالب کی زندگی کو علامتی انداز میں برتا گیا ہے۔ "میری اور آپ کی دنیا شش جہت سے عبارت ہے ہم اس شش جہتی حصار سے باہر نکلنے کے راستے سے آگاہ نہیں یا پھر ہم اس سے باہر نکلنے کی سنجیدہ کوشش ہی نہیں کرتے مرزا غالب تھے ہی ساتویں منزل کے مکیں وہ کبھی کبھی فقیروں کے بھیس میں تماشہ اہل کرم دیکھتے، اپنے اونچے سنگھاسن سے، اس شش جہتی حصار میں اُتر آتے تھے۔"[۳۶]

انشائیے میں علامت کے استعمال سے گہرے مفاہیم اور مخفی گوشوں میں جھانکنے کا رویہ ملتا ہے۔ انشائیہ "چھڑی" کا آغاز کہانی سنانے کے انداز سے ہوتا ہے انشائیہ رپورتاژ کی تکنیک میں لکھا گیا ہے رپورتاژ میں ان واقعات یا باتوں کا ذکر ہوتا ہے جو مصنف پر بیتی یا سامنے سے گزری یا کانوں سے سنی ہوں اور مصنف انہیں صیغہ متکلم میں خود ہی بیان کرتا ہے اس میں کرداروں اور مقاموں کے نام زیادہ تر اصلی ہی ہوتے ہیں مگر گزشتہ واقعات کی وجہ سے اس میں ماضی کا صیغہ ہی برتا جاتا ہے۔ مصنف انشائیے میں اکٹھی دو تکنیکیں استعمال کرتے ہیں تکنیک کا پہلا حصہ رپورتاژ کی شکل میں لکھا گیا ہے جبکہ دوسرے حصے میں چھڑی کی خصوصیات بیانیہ انداز میں لکھی گئی ہیں اور اس میں صیغہ واحد غائب کا استعمال کیا گیا ہے۔ مصنف چھوٹی سی چیز پر قلم اٹھا کر اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں اور چھپے ہوئے گوشوں کو عیاں کرتے ہیں جو کہ قاری کے لیے حیرت اور دلچسپی کا سبب ہے مصنف چھڑی کی تہذیب سے بھی قاری کو متعارف کرواتے ہیں۔ اس طرح انشائیہ "بیٹھنا"، "آئس کریم کھانا"، "تبدیلی نام"، اور "لونا نہم" میں بھی یہی تکنیک برتی گئی ہے۔ انشائیہ "دھوپ کھانا" سادہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے انشائیہ داخلی ہے اور وقتی تسلسل کے تحت لکھا گیا ہے۔ اس میں مصنف اپنے ذہنی تصورات کو بیان کرتے ہیں جو کہ فطرت سے متعلق ہیں۔ مصنف انشائیے کا آغاز میں واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرتے ہیں اور خوبصورت انداز میں مرقع کشی کرتے ہیں۔ انشائیے میں فارسی فقرات کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ مصنف دھوپ کھانے کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتے ہوئے انشائیہ آگے بڑھاتے ہیں۔

انشائیہ "کوہ پیمائی" سادہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے انشائیہ میں واحد غائب کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے مصنف کوہ پیما کی خصوصیات اور راستے میں آنے والی دشواریوں کو بتا کر انشائیہ آگے بڑھاتے ہیں۔ انشائیے کا اختتام عدم تکمیل پر ہوتا ہے جس سے ایک قسم کی تشنگی پیدا ہو جاتی ہے اور قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ انشائیہ "شہرت کی مخالفت میں" مصنف شہرت اور گمنام زندگی کا تقابل کرتے نظر آتے ہیں مگر مصنف گمنامی کی زندگی کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور مرزا غالب کی مثال دے کر بھی انشائیہ آگے بڑھاتے ہیں۔

> "اگر مرزا غالب میری طرح پیدائشی عقل مند ہوتے اور ان کی عقل و دانش دنیاوی تعلیمات کی مرہون منت نہ ہوتی تو انہیں شہرت کے بام عروج پر پہنچ کر چکے سے دریا میں بہہ جانے کا خیال دن رات نہ ستائے رکھتا۔"[۱۳۷]

مصنف انشائیے میں ضرب المثل اور محاورات کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ انشائیہ میں صیغہ حاضر غائب کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ انشائیہ میں طوالت پائی جاتی ہے انشائیہ نو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ انشائیہ "اپالو ٹریجڈی" کا آغاز کہانی سنانے کے انداز سے ہوتا ہے انشائیہ میں واقعہ نگاری کی تکنیک سے کام لیا گیا ہے۔ انشائیہ میں مثال دے کر بات کی وضاحت بھی کی گئی ہے اور انشائیہ کو آگے بڑھایا گیا ہے۔

> "شیر اور شاہین تیور اور شجاعت کی علامتیں ہیں ان کی شبیہ زیب تن کر لینے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ اب شیر اور شاہین کی طرح دشمن پر جھپٹنا آسان ہو جائے گا یا دشمن کے حملے کو بے اثر بنایا جا سکے گا توہمات کی اصل روح کے منافی ہو گا۔"[۱۳۸]

تاہم انشائیہ میں انکشاف ذات کا پہلو بھی دیکھا جا سکتا ہے نیز مشتاق قمر کے انشائیوں میں عدم تکمیل کی تکنیک بدرجہ اتم موجود ہے اس سے تشنگی قائم رہتی ہے جس سے قاری کو دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور قاری اس کے سحر میں کھوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

iv۔ جمیل آزر کے انشائیوں کا تکنیکی جائزہ:

جمیل آزر اپنے انشائیوں کو منطق کے ذریعے آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں کو کہانی لکھنے کے انداز سے بیان کرتے ہیں جیسے کہانی میں نیا موڑ آتا ہے ایسے ہی ان کے انشائیے ہمیں نئے موڑ سے واقف کرواتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ڈرامائی عناصر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں مکالمہ نگاری، کردار سازی اور منظر کشی بخوبی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جمیل آزر کے انشائیوں میں اختصار کی خوبی پائی جاتی ہے جو کہ قاری کو فوری تاثر دینے کے لیے کافی ہے۔ جمیل آزر اپنے انشائیوں میں اشعار کے مصروں سے پیوند لگاتے ہیں۔ وہ انشائیوں میں

فارسی اور اردو کی تراکیب کا بھی بہت عمدہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ انگریزی الفاظ و محاورات کو بھی بے دریغ برتتے ہیں۔ ان کے مختلف انشائیوں کا انداز رمزیہ اور علامتی بھی ہے وہ اپنے انشائیوں میں خاکہ کشی بھی بہت عمدہ انداز سے کرتے ہیں۔

"ابھی چند قدم ہی چلتا ہوں کہ میری ملاقات اس عیسائی خاتون سے ہو جاتی ہے جو کبھی صدر بازار کی ایک غیر ملکی لائبریری میں لائبریرین کے فرائض سر انجام دیتی تھی۔ اس وقت اس پر جوانی ٹوٹ کر گری تھی۔ اٹھتا ہوا بوٹا سا قد، سفید رنگ، متناسب ستواں ناک، آنکھوں پر سنہری باریک کمان کا چشمہ، لانبے لانبے ہلکے سنہری رنگ کے بال جو نیچے کمر تک سانپ کی طرح بل کھائے ہوئے لہراتے تھے۔۔۔۔۔ وہ واقعی خلاصہ حسن زن تھی۔"[۳۹]

جمیل آزر کے انشائیوں میں انکشاف ذات کی خوبی بہت نمایاں ہے وہ اپنے بعض انشائیوں میں خارج سے آغاز کر کے داخل میں قدم رکھتے ہیں تاہم ان کے انشائیوں میں نکتہ آفرینی کی خوبی بھی موجود ہے وہ اپنے انشائیوں میں مختلف باتیں بیان کرتے ہیں مگر اپنے موضوع سے بھی جُڑے رہتے ہیں۔ تاہم ان کا انشائیے کو بیان کرنے کا طریقہ غیر رسمی ہے۔ ان کے انشائیوں میں تازگی و شگفتگی کی صفات بھی موجود ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں اپنے مشاہدات و تجربات کو ہی ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔ انشائیہ "واشنگ مشین" میں علامت نگاری کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ جس میں ذہنی تصورات کے ساتھ ساتھ اردگرد کے ماحول کی بھی عکاسی کی گئی ہے تاہم یہ خارجی و باطنی خیالات و تجربات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں پورے معاشرے کے کردار کے ساتھ ساتھ مصنف اپنے گھر کے افراد کی بھی کردار نگاری کرتے ہیں۔ انشائیے میں وقت کی حدیں کچھ عرصے کے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہیں۔ مصنف انشائیہ میں انکشاف ذات بھی کرتے ہیں اور اپنے تجربات و خیالات کو کھل کر احاطہ تحریر میں لاتے ہیں۔ مصنف انشائیہ کا آغاز کہانی لکھنے کے انداز سے کرتے ہیں۔ مصنف علامت کی تکنیک کو یوں برتتے ہیں۔

"میں سوچتا ہوں کاش میرے گھر کے باہر کوئی ایسی واشنگ مشین نصب ہو جائے جس میں سے گزر کر معاشرے کے سارے غلیظ اور بدبودار پیراہن صاف سُتھرے اجلے اور سپید ہو جائیں۔ روحوں پر سے صدیوں کی جمی ہوئی میل اُتر جائے اور دلوں سے بغض اور کینہ اور منافقت کی بساند ڈھل جائے تاکہ عظیم انقلاب کی پھلجھڑیاں جو میں اپنے ننھے سے گھر کے اندر دیکھتا ہوں باہر بھی دیکھ سکوں۔"[۴۰]

مصنف انشائیہ میں واحد متکلم کا استعمال کرتے ہیں اور انشائیے کے ااختتام اپنے خیالات و تجربات کے نچوڑ کو بیان کرتے ہیں۔انشائیہ ’’مچھلی کا شکار‘‘ میں بھی مصنف علامت کی تکنیک کو ہی استعمال کرتے ہیں۔ مصنف انشائیہ ’’شاخ زیتون‘‘ کا آغاز کہانی سنانے کے انداز سے کرتے ہیں۔ اس انشائیے میں واحد متکلم کا استعمال کیا گیا ہے۔ مصنف انشائیے میں پارک اور ایک زراعتی فارم جہاں زیتون کے درختوں کے جھنڈ اُگے تھے ،ان کا تقابل کرتے ہیں۔انشائیہ ’’منی پلانٹ ‘‘کا آغاز مصنف بزرگوں کے ایک مقولے سے کرتے ہیں کہ بے وقوف دوست سے عقلمند دشمن زیادہ بہتر ہے۔ مصنف انشائیے میں واقعہ کو بھی بیان کر کے انشائیہ کو آگے بڑھاتے ہیں ۔مصنف موضوع کے تاریخی اور معاشرتی پہلوؤں کو بیان کر کے انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں اور واپس اسی نکتے کی طرف لوٹ آتے ہیں۔

انشائیہ ’’مارکوپولو‘‘ میں مصنف مکالمے کے انداز میں خود سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ مصنف اپنے اندر کے چھپے ہوئے مارکوپولو سے مخاطب ہوتے ہیں جسے سیاحت کا بہت شوق ہے۔

کون!

میں مارکوپولو

مگر آپ کو تو مرے ہوئے صدیاں بیت گئیں!

کون کہتا ہے کہ میں مر چکا ہوں

تاریخ دان!

وہ جھوٹ بولتے ہیں

اچھا تو فرمایئے کیسے زحمت فرمائی

بس یوں ہی سوچا کہ آپ کو سیر کروالاؤں۔

بہت خوب، بہت خوب حضرت بالکل تیار بیٹھا ہوں۔[۱۴]

مصنف مختلف چیزوں میں ایک ہی نکتے پر زندگی کے مختلف پہلولے کر بات کرتے ہیں ۔وہ موضوع کے ایک نکتے پر نفسیاتی، فلسفیانہ ،معاشرتی اور اقتصادی حوالے سے بات کرتے ہیں وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو بھی کشفی انداز سے بیان کرتے ہیں۔ مصنف انشائیوں میں اشعار کا بھی استعمال کرتے ہیں جس سے انشائیے کا تاثر بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔انشائیہ ’’سنہری شاخ‘‘ کا آغاز کہانی سنانے کے انداز سے ہوتا ہے۔انشائیے میں مکالماتی اور ڈرامائی عناصر پائے جاتے ہیں۔

انشائیہ ''وقت اے وقت'' کا آغاز ہزلٹ کے مقولے سے ہوتا ہے۔ مصنف انشائیے میں وقت کے بارے میں اپنے خیالات، تجربات اور فلاسفی کو بیان کرتے ہیں وہ واقعات کے ذریعے انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں مصنف وقت کے بارے میں ایلیٹ کے انگریزی اشعار کو بھی بیان کرتے ہیں اور انگریزی مصنفین کی وقت کے بارے میں آراء کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ مصنف انشائیہ کا اختتام وقت کی تلخی، سفاکی اور بے رحمی کے ذکر سے کرتے ہیں۔

انشائیہ ''ہوم سویٹ ہوم'' کا آغاز افتخار عارف کے شعر سے کیا گیا ہے انشائیے میں انگریزی الفاظ کا بے جا استعمال کیا گیا ہے۔ انشائیے کا آغاز کہانی لکھنے کے انداز سے کیا گیا ہے۔ انشائیے میں مکالمے کی تکنیک بھی برتی گئی ہے۔ مصنف انشائیے میں اپنے تجربسات و مشاہدات کو عمدہ پیرائے سے بیان کرتے ہیں۔ انشائیے میں واحد متکلم کا استعمال کیا گیا ہے۔ وقت کی حدود ان کے چند سالوں کے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہیں۔

انشائیہ ''چائے کی معیت میں'' ایک بیانیہ انشائیہ ہے جو کہ صیغہ واحد غائب میں لکھا گیا ہے۔ مصنف واقعات اور اپنے مشاہدات و تجربات کو بیان کر کے انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ انشائیے میں چائے کی تاریخ بتاتے ہوئے انشائیے کو آگے بڑھایا گیا ہے اور انشائیے کا اختتام لسی، دودھ اور چائے کے تقابل سے کیا گیا ہے جہاں مصنف چائے کو بالاتر قرار دیتے ہیں اور چائے کے فوائد سے قاری کو آگاہ کرتے ہیں۔

انشائیہ ''آپ کا کیا خیال ہے'' کا آغاز کہانی سنانے کے انداز سے ہوتا ہے مصنف صیغہ واحد متکلم کا استعمال کرتے ہیں مصنف اپنی زندگی کا تجربہ اور واقعات بیان کرتے ہوئے انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ انشائیے میں اشعار کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ زیر نظر انشائیے میں اجتماعی احساس موجود ہے انشائیے میں داخلی رنگ کے ساتھ ساتھ خارجی رنگ موجود ہے۔ انشائیے میں وقت کی حدود مصنف کی زندگی کے تجربے تک پھیلی ہوئیں ہیں اور اس میں بہت وسعت موجود ہے۔ انشائیے کے اختتام میں تشنگی کا احساس پایا جاتا ہے اور عدم تکمیل کا عنصر موجود ہے۔

> ''جس روز تیسری دنیا کے لوگوں کو فرد کی آزادی، اس کی رائے اور اس کی خود مختار حیثیت کو تسلیم کرنے اور برداشت کرنے کے کلچر کو فروغ دینے کا سلیقہ آگیا یہ لوگ بھی ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل ہو جائیں گے۔ آپ کا کیا خیال ہے!'' [۱۴۲]

انشائیہ ''سفر'' کا آغاز شعر سے ہوتا ہے انشائیہ کہانی سنانے کے انداز میں لکھا گیا ہے جس میں مصنف کے تجربات بیان کیے گئے ہیں انشائیہ میں سفر میں سحری سے افطاری تک کے سفر کو موضوع بنایا گیا ہے انشائیے میں رمضان کے مہینے میں پائی جانے والی ثقافت کے ہر پہلو پر بات کرتے ہیں۔ انشائیہ بیانیہ انداز میں بھی لکھا گیا ہے نیز انشائیے کے اختتام میں نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔

انشائیہ میں بروماں ئیڈ ہوں کا آغاز کہانی سنانے کے انداز سے کیا گیا ہے تاہم مصنف اظہار ذات اور انکشاف ذات کی کیفیت کو عمدہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔ مصنف انشائیے میں علامت کا استعمال کرتے ہیں مصنف صبح سیر کے دوران دائیں طرف کے فٹ پاتھ جو کہ باغ کی طرف جاتا ہے اسے چھوڑ کر دائیں طرف زرعی فارم کے راستے پگڈنڈی کی طرف چلے جاتے ہیں گویا اس میں علامت کو برتا گیا ہے کہ حال کو چھوڑ کر ماضی کی قدامت کی طرف داخل ہونے کا عمل ہے۔ بائیں طرف زندگی کا جدید رُخ ہے جس میں سہولتیں اور آسائشیں ہیں اور بائیں طرف دیہات، فطرت، لہلہاتے کھیت، ہرے بھرے درخت، پرندے، جانور اور ہریالی ہے۔ تاہم دائیں بائیں کے یہ مناظر انسان کے رویوں کی عکاسی کرتے ہیں کہ چیزوں کو قریب سے دیکھنا اور جدید کو چھوڑ کر قدیم سے وابستگی ان کے پختہ ذہن اور ان کے فطری رویے کی غماز ہے۔ دیہی ثقافت انسان کو اس کی اصل کی طرف لے کر آتی ہے اور فطرت انسان کو سچائیوں اور حقیقتوں سے روشناس کرواتی ہے تاہم فطرت سے تازگی، نیاپن اور شادمانی حاصل ہوتی ہے آہستہ آہستہ شہری ماحول دیہاتی ماحول پر پنجے گاڑھ رہا ہے جس سے فطرت کی خوبصورتی کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ انشائیہ کچے پکے آم کہانی بیان کرنے کے انداز میں لکھی گئی ہے مصنف انشائیے میں جدیدیت کو علامت کے طور پر برتتے ہیں مصنف واقعات کو بیان کر کے انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں مصنف انشائیے میں دو تین لائنیں مکالمے کے انداز میں بھی لکھتے ہیں۔

انشائیہ برساتی بھی کہانی لکھنے اور واقعہ بیانکرنے کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ انشائیے میں مصنف اپنی زندگی کے تجربے کو عمدہ انداز میں بیان کرتے ہیں انشائیے میں واحد متکلم کے انداز میں لکھا گیا ہے انشائیے میں شعر کا استعمال کیا گیا ہے۔ اور مکالمے کے ذریعے بھی انشائیے کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ انشائیے میں تین چار کردار بھی موجود ہیں انشائیہ تھوڑے وقت کے عرصے پر محیط ہے۔ انشائیہ خارجی زیادہ اور داخلی کم ہے تاہم انشائیہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے اور انشائیہ میں واقعات کی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ انشائیہ کتابوں کو دوستوں سے بچاؤ مختلف واقعات پر مبنی ہے لیکن موضوع ایک ہی ہے مختلف واقعات کو لکھ کر انشائیہ مکمل کیا گیا ہے۔ انشائیے میں واحد متکلم کا استعمال کیا گیا ہے انشائیے میں مختلف مکالمات کو بہت عمدگی سے پیوست کیا گیا ہے۔

> ”انشائیہ تیرے جانثاروں کو سلام کا آغاز کہانی سنانے کے انداز سے کیا گیا ہے یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب شہنشاہ ہند نورالدین جہانگیر خطہ کشمیر جنت نظیر میں جلوس شاہی کے ساتھ جلوہ افروز ہوا تھا اور اپنے سامنے جانفزا منظر کو دیکھ کر بے اختیار پکار اُٹھا تھا گر فردوس بر روئے زمیں است ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است یعنی اگر روئے زمین پر کوئی جنت ہے تو پھر یہی ہے، یہی ہے، یہی ہے۔“[۱۴۳]

انشایئے میں فارسی فقرات کو عمدہ انداز میں پیوست کیا گیا ہے۔انشایئے میں مصنف فطرت، تاریخ اور اخلاقیات کو بیان کر کے انشایئے کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ تاہم انشائیہ دعوت ولیمہ، اشتہار زدہ دیواریں، بدل جاتے ہیں لوگ۔شادی کے بعد، آکسفورڈ شوز، کتابوں کو دوستوں سے بچاؤ، مہربان کیسے کیسے۔بھیک مانگنے والے، تیرے جانثاروں کو سلام میں بھی یہی تکنیک بیان کی گئی ہے۔ جمیل آزر کے زیادہ تر انشایئے کسی قول، کسی کے اقوال زریں یا کسی معمولی واقعے سے شروع ہوتے ہیں۔اور چھوٹی سی بات سے زندگی کی کوئی بہت بڑی بات کو نکالتے ہیں۔وہ ذاتی تجربے، زندگی کے گہرے مشاہدے اور ہلکی سی فکر کی لہر کو پھیلا کر اسے پوری زندگی پر محیط کر دیتے ہیں اور پھر یہ محدود سے لا محدود ہو جاتی ہے۔انشائیہ رُت کے مہمان کا آغاز کہانی سنانے کے انداز سے ہوتا ہے مصنف انشایئے میں انگریزی مصنف کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

”اگر فطرت پرست شاعر ورڈزورتھ کہتا ہے کہ بچہ انسان کا باپ ہے تو پھر یقیناپرندہ انسان کا پہلا استاد ہے۔جب انسان نے اپنی بربریت کا ثبوت ہابیل کے قتل کی صورت میں دیا تھا تو قابیل نے مردہ لاش کو زمین میں دفنانے کا فن پرندے ہی سے سیکھا تھا۔“[۱۴۴]

تاہم مصنف اپنے انشائیوں میں کسی پابند تکنیک سے ہٹ کر لطیف باتوں اور موضوعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان کا نرول پن اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔مصنف انشائیوں میں زندگی کے نئے رُخ اور نئے زاویوں کو بیان کرتے ہیں مصنف انکشاف ذات کو اپنے انشائیوں میں خوب صورتی سے بیان کرتے ہیں۔انشائیہ بالک ہٹ سادہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے اور انشایئے میں بچوں کی نفسیات اوران کی فطرت کے ہر پہلو کو موضوع بنایا گیا ہے۔مصنف انشایئے میں انگریزی الفاظ کو بھی برتتے ہیں۔انشایئے میں صیغہ واحد غائب کا استعمال کیا گیا ہے۔

انشائیہ غیر معروف شہری کا آغاز مثال دے کر کیا گیا ہے اور انشائیہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے اور سیغہ واحد غائب کا استعمال کیا گیا ہے۔انشایئے میں شہر اور دیہات کا تقابل بھی کیا گیا ہے اور فارسی فقرے کا استعمال بھی کیا گیا ہے اور انشایئے کے معاشرتی، سیاسی اور نفسیاتی پہلو کو بھی بیان کیا گیا ہے۔انشائیہ آرٹس سٹوڈنٹس میں مصنف آرٹس سٹوڈنٹس کی صفات بیان کرتے ہوئے انشائیہ لکھتے ہیں انشائیہ سادااور سیسے ہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے اور صیغہ واحد غائب کا استعمال کیا گیا ہے۔انشائیہ داخلی سے زیادہ خارجی انداز میں لکھا گیا ہے۔مصنف آرٹس سٹوڈنٹس اور گردوپیش کے حالات کی منظر کشی بہت عمدہ انداز سے کرتے ہیں۔

انشائیہ ذکر ایک ملاقات کا آغاز کہانی کے انداز سے ہوتا ہے جہاں مصنف کی ملاقات ان کے ایک دوست سے ہوتی ہے اور ان کے درمیان گفتگو کا آغاز ہوتا ہے گویا انشایئے میں گفتگو اور مکالمے کی تکنیک بھی استعمال بھی کی

گئی ہے۔ انشائیے کو بڑھانے کے لیے مرزا غالب کی بھی مثال بھی دی گئی ہے اور شعر کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ اور انشائیے کے آخر میں نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ انشائیے کے ثقافتی، فلسفیانہ، سیاسی اور نفسیاتی پہلو کو بھی بیان کر کے انشائیے کو آگے بڑھایا گیا ہے انشائیے میں مری اور ارد گرد نثاروں اطراف کی منظر کشی بھی عمدہ انداز سے کی گئی ہے۔ انشائیے میں واحد متکلم کا استعمال کیا گیا ہے۔

مصنف کے انشائیوں کی یہ تکنیک ہے کہ مصنف ادب، فلسفہ، کھیلوں، اخلاقیات، سماج، سیاست اور ثقافت کا اور ذکر ایک ہی نکتے کے گرد بھتے ہوئے کرتے ہیں ایک ہی موضوع کا انتخاب کر کے اس کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔ مصنف انگریزی الفاظ کا بھی بے دریغ استعمال کرتے ہیں اور اشعار کو بھی موضوع کی مناسبت سے انشائیے میں پیوست کرتے ہیں تاہم ان کے زیادہ انشائیے کہانی لکھنے کے انداز میں لکھے گئے ہیں۔ مصنف مغربی مصنفین اور شعراء کا ذکر کرتے ہوئے بھی انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ جیسے انشائیہ مسٹر رائٹ میں میں یونانی ہیرو ایکیلس اور میری ساٹھویں سالگرہ میں ییٹس اور جارج رسل کی مثال دے کر انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ہائیڈ پارک، جن، ڈرائنگ روم میں گھوڑا، مُوڈ، مسٹر رائٹ مین، شمولیت، نیکی۔ دریا اور سمندر، عظیم نشر گاہ، ریلوے پلیٹ فارم، میرا گھر وغیرہ میں بھی مصنف انہی تکنیکوں کو برتتے ہیں۔

v۔ اکبر حمیدی کے انشائیوں کا تکنیکی جائزہ:

اکبر حمیدی کا شمار ان انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے جو انشائیے کی تکنیکی ضرورتوں کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں اختصار کی خوبی موجود ہے نیز انکشاف ذات کے ساتھ ساتھ منطقی ترتیب دیکھنے کو ملتی ہے ان کے انشائیوں میں داخلی و خارجی دونوں عناصر موجود ہیں وہ بات سے بات نکالتے ہوئے انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ خارج سے موضوعات کو منتخب کرتے ہیں اور اسے داخل میں لے آتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ انکشاف ذات کو نمایاں کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ اکبر حمیدی کے انشائیوں میں عدم تکمیل کی صفت پائی جاتی ہے مطلب یہ کہ مصنف کسی موضوع کو منتخب کر کے اس پر مختصر یا ہلکی پھلکی گفتگو کرتا ہے اور اس کی پوری تفصیل کو بیان نہیں کرتا مصنف ہلکے پھلکے انداز سے اپنے نکتے کو نمایاں کرتا ہے اور نتیجہ قاری پر چھوڑ دیتا ہے کہ ایک تشنگی سی قائم ہو جاتی ہے اور قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے تاہم اکبر حمیدی اپنے انشائیے کا اختتام کسی سوچ، سوال، فکر، فلسفے یا خیال پر کرتے ہیں ان کے انشائیوں کا اختتام ایک قسم کا تاثر پیدا کرتا ہے جس سے قاری کو تحریک ملتی ہے تاہم اکبر حمیدی کے بہت سے انشائیے افسانوی تکنیک رکھتے ہیں جیسے کہ انشائیہ "تتلی کے تعاقب میں" افسانوی تکنیک کا حامل انشائیہ ہے۔ اکبر حمیدی اپنے انشائیوں میں اشعار، مصروں اور اقوال زریں کا بھی استعمال کرتے

ہیں۔ان کے انشائیوں میں طنز و مزاح کی صفت بھی موجود ہے طنز کاٹ دار اور گہرا نہیں بلکہ ہلکا پھلکا ہے ان کے طنزیہ انشائیوں میں ذمہ داری، دوراندیشی اور کامیابی شامل ہیں بعض انشائیوں میں استعاراتی انداز بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے انشائیے غیر رسمی طریق کار کے حامل ہیں ان کے بعض انشائیے طوالت کا شکار ہوتے نظر آتے ہیں ان کے ایسے انشائیوں میں گھنٹہ گھر اور درمیانی منزل شامل ہیں۔ بعض جگہوں میں مصنف ناصح اور خطیب کے روپ میں بھی نظر آتے ہیں وہ اپنے انشائیوں میں خط اور فجائیہ علامت کو بخوبی برتتے ہیں وہ اپنے انشائیوں کو مختلف واقعات اور مثالوں سے آگے بڑھاتے ہیں۔ان کے انشائیوں کا انداز بیانیہ، استعاراتی، علامتی، تمثیلی، افسانوی اور بعض جگہ تو دوہری معنویت رکھتا ہے۔

انشائیہ جزیرے کا سفر میں مصنف علامت کا استعمال کرتے ہیں مصنف جزیرے کو انسان کے باطن اور اپنی ذات کے لیے استعمال کرتا ہے اور سمندر کو بھی دنیا کی علامت کے طور پر برتا گیا ہے۔ گویا جزیروں میں یعنی باطن میں رہنے والے لوگ باہر کی دنیا یعنی سمندر سے بے تعلق نہیں اور زندگی کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا ہے یعنی انسان کے تجربات اور مشاہدات جتنے وسیع ہوں گے اس کا باطن بھی اتنا وسیع ہو گا اس طرح یہ دنیا پوری کائنات میں جزیرے کی مانند ہے۔

انشائیہ گولڈن چانس بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے اس میں صیغہ واحد غائب کا استعمال کیا گیا ہے انشائیہ داخلی ہے انشائیے میں زندگی کے فلسفے کو بیان کر کے انشائیہ آگے بڑھایا گیا ہے مصنف انشائیے کو بڑھانے کے لیے مثالوں کا بھی استعمال کرتے ہیں اس طرح انشائیہ دوراندیشی میں بھی تشبیہات اور واقعات کو بیان کر کے انشائیے کو آگے بڑھایا گیا ہے۔

> "انشائیہ نیگٹیو پازیٹو کا آغاز افسانوی انداز میں کیا گیا ہے۔سنا ہے ایک انگریز شکاری نے افریقہ کے جنگلوں میں شکار کھیلتے ہوئے ایک افریقی کو دوست بنالیا۔ایک روز انگریز نے اپنے کیمرے سے افریقی دوست کی تصویر بنائی پھر پازیٹو اور نیگٹیو دونوں اپنے افریقی دوست کو پیش کئے تاکہ وہ اپنی پسند کے مطابق انتخاب کرلے۔انگریز شکاری کا کہنا ہے کہ افریقی دوست نیگٹیو پسند کیا اور پازیٹو حقارت کے ساتھ واپس کر دیا۔"[۱۴۵]

نیگٹیو پازیٹو میں علامت کا استعمال بہت چابکدستی سے کیا گیا ہے۔انشائیے کے اختتام میں ارسطو اور دیو جانس کلبی کے واقعے کو بیان کیا گیا ہے جس میں ان دونوں کے مکالمے کو بھی بیان کیا گیا ہے۔انشائیے میں انکشاف ذات بھی کیا گیا ہے جس وجہ سے واحد متکلم کا استعمال بھی دیکھا جا سکتا ہے۔انشائیہ کامیابی کے آغاز میں مصنف استعارے کو بھی عمدہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔

"کامیابی ایک ایسی ہفت رنگ تتلی ہے جس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے ہم اپنے گھروں، اپنی بستیوں اور اپنے پیاروں سے دور نکل جاتے ہیں اور اکثر اوقات تتلی کے بجائے اپنی مُٹھی میں تتلی کے پر لیے واپس آجاتے ہیں۔"[۱۴۶]

انشائیہ چڑیا گھر کا آغاز غالب کے قول سے ہوتا ہے۔ انشائیہ علامتی انشائیہ ہے مصنف نے چڑیا گھر کو علامت کے طور پر استعمال کیا ہے کہ ہر انسان کی کچھ خواہشات ہوتی ہیں جنہیں وہ پورا کرنا چاہتا ہے کچھ خواہشات، امنگیں اور آرزوئیں ادھوری رہ جاتی ہیں اور بعض اوقات پوری بھی ہو جاتی ہیں گویا مصنف نے چڑیا گھر کو علامتی طور پر خواہشات کے لیے برتا ہے۔ انشائیہ پہلی تالی کا آغاز استہفامیہ انداز میں کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد مصنف خود ہی جواب دیتے ہیں اور اس کے جواب میں بہت سے پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ اور بہت سی مثالیں اور واقعات کو بیان کر کے انشائیے کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ انشائیے میں تالی بجانے کے مختلف رُخ کو نمایاں کیا گیا ہے۔

انشائیہ باغی میں مصنف باغی کی خوبیوں اور صفات کو اُجاگر کرتے ہیں انشائیے میں مصنف انکشاف ذات کرتے ہیں۔ اور باغی ہونے کے ہر پہلو کو بیان کر کے انشائیے کی تکمیل کرتے ہیں۔ انشائیہ اشتہاروں بھری دیواریں میں مصنف اپنے مشاہدات اور تجربات کی عکاسی کرتے ہیں اور انشائیہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے۔

"انشائیہ اشتہاروں بھری دیواریں کا آغاز فارسی کے محاورے اور غالب کے مصرعے سے ہوتی ہے۔ فارسی میں کہتے ہیں "مفت راچہ گفت" یعنی مفت میں اگر کوئی چیز ملتی ہے۔ تو اس کے کیا ہی کہنے! غالب نہ بھی کہا تھا "مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے۔"[۱۴۷]

انشائیہ صیغہ واحد غائب میں لکھا گیا ہے اور انشائیہ بیانیہ ہے اس طرح انشائیہ کبھی ہم لا اُبالی تھے کا آغاز بھی مختلف انداز سے کیا گیا ہے۔

"یہ عنوان میں نے ایک شاعر کی مشہور نظم سے لیا ہے جس کا عنوان ہے ۔ کبھی ہم خوبصورت تھے اس نظم میں شاعر اپنے بچپن کے زمانے کو بڑی حسرت سے یاد کرتا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں وہ بہت خوبصورت تھا اور اس کے مشغلے بھی جگنوؤں اور تتلیوں جیسے خوبصورت اور ننھے ننھے رنگا رنگ پرندوں سے متعلق تھے۔"[۱۴۸]

اکبر حمیدی اپنے انشائیوں کا آغاز کبھی کسی سوال سے کرتے ہیں، کبھی آفاقی سچائی سے، کبھی کسی کے قول سے اور کبھی شعر سے وہ اپنے انشائیے کا آغاز کرتے ہیں۔ انشائیہ خوشیوں کی تلاش میں کا آغاز مثال دے کر کیا گیا ہے اور اس انشائیے کو آگے بڑھانے کے لیے مصنف فلسفیانہ پہلو اور نفسیاتی نکتے کو بیان کرتے ہیں انشائیے میں مصنف مثال دے کر بات آگے بڑھاتے ہیں اور زندگی کے اصول اور واقعے کو بھی بیان کرتے ہیں۔

انشائیہ خالی گیراج کو مصنف تمثیلی و علامتی انداز میں لکھتے ہیں۔ مصنف انشائیے کو افسانوی طرز سے رقم کرتے ہیں اور سارے انشائیے میں مصنف خود ہی سے گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ مصنف منظر کشی بھی بہت عمدہ انداز سے کرتے ہیں کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ انشائیہ خارجی زیادہ اور داخلی کم ہے۔ انشائیہ کچھ عرصے تک پھیلا ہوا ہے۔ مصنف خالی گیراج کے مختلف پہلوؤں پر بات کرتے ہیں ان میں ادبی، فلسفیانہ، اخلاقی اور معاشرتی نکتے شامل ہیں۔

انشائیہ ہمایوں کا ایک دن میں مصنف تاریخ کے واقعے کو موضوع بناتے ہیں ان طرح انشائیہ نظام سقہ میں بھی مصنف نظام سقہ کی ایک دن کی حکومت کو موضوع بنا کر صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں اور انشائیے کا اختتام عدم تکمیل پر کرتے ہیں کہ قاری سوچ میں مبتلا ہو جائے۔ انشائیہ پہاڑ مجھے بلاتا ہے کی بھی تکنیک علامت نگاری پر رکھی گئی ہے جس میں پہاڑ کو کامیابی، منزل مقصود اور خواہشات کو علامت کے طور پر برتا گیا ہے۔ انشائیہ کہانی یا افسانے کے انداز میں لکھا گیا ہے اس میں مصنف اپنے تجربے کو ہی کہانی کے انداز میں لکھتے ہیں۔ انشائیے میں صیغہ واحد متکلم کا استعمال کیا گیا ہے۔ انشائیے میں وقت کی حدود مصنف کی پوری زندگی پر محیط ہے اور انشائیے میں گاؤں اور اسلام آباد شہر کے پہاڑوں کی منظر کشی عمدہ انداز سے کی گئی ہے۔

انشائیہ دہشت گرد بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ مصنف انشائیے میں دہشت گردی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کر کے انشائیہ مکمل کرتے ہیں جس میں معاشرتی نکتہ نظر اور نفسیاتی قسم کی دہشت گردی شامل ہے۔ انشائیے میں کہاوت کو بھی برتا گیا ہے انشائیے کے اختتام میں مصنف طنز کی تکنیک بھی استعمال کرتے ہیں۔

> ”ہر سال نئے نئے ٹیکس لگتے ہیں اور ساتھ ہدایت ملتی ہے کہ قوم قربانیاں دے۔ اب قربانیاں دے دے کر قوم کی حالت عید قربان کے دنبے سی ہو چکی ہے میرے اپنے شعبے ادب میں یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ لوگ ادبی ذوق سے بے بہرہ ہو گئے ہیں۔“[۱۴۹]

انشائیہ جھاڑیاں اور جگنو میں بھی مصنف نے علامت کی تکنیک کا استعمال کیا ہے مصنف جھاڑیوں کو ماضی،، جگنو کو مستقبل اور خود کو حال کہتے ہیں انشائیہ کہانی کے انداز میں لکھا گیا ہے انشائیے میں مصنف زندگی کے فلسفے کو علامتی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ مصنف انشائیے میں منظر کشی بہت عمدہ انداز سے کرتے ہیں کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ انشائیہ کا اختتام بھی عدم تکمیل پر ہوا ہے۔

نئی پُرانی گاڑیاں، اونچی ناک اور قومی ترقی کہانی کے انداز میں لکھے گئے انشائیے ہیں جس میں علامت کا استعمال کیا گیا ہے۔ انشائیہ جامن کا پیڑ بھی کہانی کے انداز میں لکھا گیا انشائیہ ہے مصنف نے انشائیے میں بہت

خوبصورتی سے صحن میں اُگے جامن کے درخت اور ہر موسم میں جامن کے درخت کے فوائد کی منظر کشی بہت عمدہ انداز سے کی ہے۔ انشائیے میں فارسی کہاوت کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ جامن کے پیڑ کے فوائد بتاتے ہوئے مصنف نے فطرت حسن اور فلسفے کو بھی بیان کیا ہے جس سے انشائیے کی تکمیل کی گئی ہے۔ تاہم اکبر حمیدی نے کہانی ،افسانے اور بیانیہ انداز کی تکنیک اپنا کر اپنے انشائیوں کی تکمیل کی ہے۔ ان کے انشائیوں میں غیر رسمی تکنیک کو بھی عمدگی سے پیوست کیا گیا ہے۔ ان کے انشائیوں میں چند ایک مکالمے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں تاہم اکبر حمیدی انشائیے کی تکنیکی ضرورتوں کا پورا خیال رکھتے ہیں جس سے قاری ان کے انشائیے پڑھنے کی طرف راغب ہوتا ہے۔

۲۔ دبستان لاہور کے انشائیوں کا تکنیکی جائزہ:

i۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں کا تکنیکی جائزہ:

نظیر صدیقی کے انشائیوں کی تکنیک زیادہ تر براہ راست ہے ان کے انشائیوں میں طنز و مزاح کی لہر دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کے انشائیوں میں واحد متکلم کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے۔ نظیر صدیقی کچھ ان الفاظ میں اپنی رائے دیتے ہیں۔

> ”بعضوں کو اس بات کا شکوہ رہا ہے کہ میرے انشائیوں میں "میں" بہت نمایاں ہے نہ جانے اس قسم کی شکایت کرنے والے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ انشائیہ جیسی صنف ادب "میں" کے مظاہرے ہی کے لیے وجود میں آئی ہے۔ پھر یہ کہ اس "میں" کے پردے میں آپ بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ کی تصویر کے نیچے کسی اور کا نام لکھ دیا جائے تو کیا وہ تصویر کسی اور کی ہو جائے گی۔“[۱۵۰]

نظیر صدیقی انشائیہ ”دوست اور دوستی“ کا آغاز زندگی کی سچائی بیان کرنے سے کرتے ہیں۔

> ”بہت سی نعمتیں ایسی ہیں جن کے بغیر زندگی گزار لینا چنداں مشکل نہیں لیکن کچھ لعنتیں ایسی ہیں جن کے بغیر زندگی بسر کرنا یکسر محال ہے۔“[۱۵۱]

تکنیک میں انشائیے کے آغاز و انجام کو بڑا دخل ہے۔ ”دوست اور دوستی“ کے انشائیے کا آغاز ہی اتنا مکمل ہے کہ آغاز میں ہی انشائیے کا نچوڑ بیان کر دیا گیا ہے اگرچہ انشائیے کا آغاز ہی اتنا جاذب ہے کہ قاری کی توجہ فوری طور پر اس کی طرف کھنچ جاتی ہے۔ اگرچہ انشائیہ وقتی تسلسل اور نیچرل آرڈر کے تحت لکھا گیا ہے۔ نظیر صدیقی انشائیہ کا انجام اس طرح کرتے ہیں کہ اس سے سوچ پیدا ہو جاتی ہے اور یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے اور اس سے ہمیں سبق بھی ملتا ہے۔

تاہم ”دوست اور دوستی“ انشائیہ کا آغاز ہی بیانیہ انداز سے کیا گیا ہے اور اس میں ذاتی تجربے اور مشاہدے کو بیانیہ انداز میں بیان کیا گیا ہے نیز واحد متکلم کا استعمال کیا گیا ہے اور صیغہ متکلم استعمال کر کے جذباتی تاثر کو بڑھایا گیا ہے اور مصنف کی اپنی زبان سے بیان کرنے میں بات میں تاثر پیدا ہو گیا ہے۔ نظیر صدیقی بات سے بات پیدا کرتے ہوئے انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں اور اپنے تجربات اور مشاہدات بیان کرتے ہوئے انشائیہ آگے بڑھاتے ہیں۔ اگرچہ نظیر صدیقی دوستی کی مختلف زاویوں سے کئی تصویریں لیتے نظر آتے ہیں اور کئی زاویے عیاں ہونے پر اس چیز کے مکمل خدوخال اُبر آتے ہیں اور اس سے دوستی کے سارے پہلے عیاں ہو جاتے ہیں۔

وہ فارسی محاورات، ضرب المثل، اردو تراکیب، مقولے، اشعار اور انگریزی الفاظ کو بھی برتتے ہیں۔ انشائیہ ”بور“ کے آغاز میں مصنف اردو لغت میں بور کے معنی تلاش کرنے سے کرتے ہیں مگر اردو لغت میں انہیں بور کے معنی نہیں ملتے وہ انشائیے میں مشہور ادباء کے اقوال اور کہاوتیں بھی درج کرتے ہیں اور مختلف واقعات اور مثالیں دے کر وہ انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ مصنف انشائیے میں صیغہ واحد غائب کو استعمال کرتے ہیں۔ انشائیہ ”پدرم فقیر بود“ میں مصنف انشائیہ کا آغاز انکشاف ذات سے کرتے ہیں جس میں مصنف واحد متکلم کا استعمال کرتے ہیں۔ ”یہ بات میں اپنے بارے میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں اپنے بارے میں کہہ بھی نہیں سکتا کیونکہ میں تو خوش حال باپ کا بدحال بیٹا ہوں۔“[۱۵۲]

زیر نظر انشائیہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے انشائیے میں طنز کی کاٹ اور مزاح کی لہر ساتھ ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے۔ مصنف اپنے انشائیے کی تکنیک میں تاثر پیدا کرنے کے لیے شعر کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ مصنف موضوع کے مختلف زاویوں کو زیر بحث لاتے ہیں اور آخر میں اخلاقی سبق دیتے ہیں اور قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

> ”اگر ساری دنیا اس پر متفق ہوتی کہ انسانیت کو فائدہ پہنچانے والی چیزوں پر فخر کرنا چاہیے اور نقصان پہنچانے والی چیزوں پر شرمندہ ہونا چاہئیے تو مجھے یقین ہے کہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنانے والے اپنی اپنی ایجادوں پر شرمندہ ہوتے اور محسوس کرتے کہ ان ہلاکت آفریں ایجادوں پر فخر کرنا ایسا ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ: بیٹا! ہم تجھ سے کم حرامی نہیں ہیں۔“[۱۵۳]

اس طرح مصنف انشائیہ ”بیٹھے بٹھائے“ کا آغاز بھی شعر کے استعمال سے کرتے ہیں اور انشائیہ میں واقعات کی مدد سے انشائیہ کو آگے بڑھاتے ہیں اور انشائیہ کے اختتام میں اخلاقی مقصد کو خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ مصنف اپنے انشائیے آزادی اور شرافت کی تکنیک پر بات کرتے ہوئے اپنی رائے یوں دیتے ہیں۔

"اس مجموعے میں ایک انشائیہ آزادی اور شرافت ایسا ہے جو بظاہر مختصر افسانے سے مشابہہ ہے لیکن میں اسے انشائیہ کہنے پر مصر ہوں خصوصاً اس لیے کہ اگرچہ وہ مختصر افسانے سے مشابہہ ہے پھر بھی اس میں مختصر افسانے کا کوئی بنیادی جزو موجود نہیں نہ تو اس میں پلاٹ ہے نہ کردار نگاری، نہ عمل نہ نقطہ عروج، غرض کچھ بھی نہیں۔"[۱۵۴]

تاہم انشائیہ ایک کہانی یا افسانوی طرز سے لکھا گیا ہے اور آخر میں مصنف عدم تکمیل سے کام لیتے ہوئے قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ انشائیہ "مستقبل کا ادیب" میں مصنف انشائیہ کا آغاز واحد متکلم کے فقرے سے کرتے ہیں اور اپنا تعارف کرواتے ہیں کہ میں ایک ادیب ہوں مصنف انشائیے میں نکتہ آفرینی سے کام لیتے ہوئے انشائیہ کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں۔ مصنف انشائیے میں انگریزی مصنف ایڈیٹر فرینک ہیرس کا ذکر کرتے ہوئے بھی انشائیہ آگے بڑھاتے ہیں۔ مصنف واقعہ نگاری اور مختلف مثالوں سے بھی اپنا انشائیہ آگے بڑھاتے ہیں مصنف فارسی محاورات ،انگریزی الفاظ اور شعر کا بھی بخوبی استعمال کرتے ہیں۔ تاہم مصنف اپنے تجربات و مشاہدات کو بھی کشفی انداز میں اپنے انشائیے میں سمو دیتے ہیں۔

انشائیہ "اشتہار یا انکشاف" کا پہلا فقرہ میں مصنف اپنی الجھن بتا کر آغاز کرتے ہیں اور قاری کی توجہ حاصل کرنے کے لیے مصنف نے اسے جاذب اور پُرکشش لکھا ہے مصنف انشائیہ میں مختلف شعراء کا ذکر بھی کرتے ہیں جن میں میر ،اقبال ،غالب، فیض، فراق اور جوش شامل ہیں۔ انشائیہ میں مصنف کسی مصنف کی کتاب پڑھنے کی بجائے اشتہارات پر اکتفا کرنے والوں پر طنز کرتے ہیں گویا پورے انشائیے میں طنز کی لہر دوڑتی نظر آتی ہے۔ مصنف انشائیہ میں واقعات کے ذریعے بھی انشائیہ کو آگے بڑھاتے ہیں اور واقعے میں مکالمہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

اس طرح انشائیہ "شادی" کا آغاز استفہامیہ انداز سے کیا گیا ہے مصنف انشائیے میں شادی کے نقصانات اور فوائد لکھ کر انشائیہ آگے بڑھاتے ہیں گویا بات سے بات نکالتے ہیں۔ مصنف انشائیے میں طنز کا بھرپور استعمال کرتے ہیں اور جہیز کی پوری فہرست لکھ کر معاشرے پر طنز بھی کرتے ہیں اور اس ضمن میں مختلف محاورات کا بھی سہارا لیتے ہیں نیز انشائیہ سادہ بیانیہ طریقے سے لکھا گیا ہے۔ مصنف اس میں اپنے تجربات اور مشاہدات کا بھی بیان کرتے ہیں تاہم انشائیے کا اختتام سبق اخذ کرتے ہوئے کیا گیا ہے۔

انشائیہ "شہرت کی خاطر" میں مصنف دولت کی خاطر چوری کرنے والوں پر طنز کرنے سے کرتے ہیں آغاز میں مصنف واحد متکلم کا استعمال کرتے ہیں اکثر واحد متکلم کا استعمال جذبات ابھارنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ تاہم انشائیہ سادہ بیانیہ طریقے اور نیچرل آرڈر کے تحت لکھا گیا ہے اس انشائیے میں مصنف کی ذات کی کارفرمائی دیکھنے کو

ملتی ہے۔ مصنف انشایئے میں فارسی کے فقروں کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ انشایئے میں مصنف کا کہانی سنانے کا انداز اپناتے ہیں۔اور اس ضمن میں وہ مختلف واقعات نگاری کا بھی سہارا لیتے ہیں اور مکالمہ بھی لکھتے ہیں۔ آج کل مشاعرے کے سلسلے میں کیا کیا مصروفیتیں ہیں۔

> "مقامی مشاعروں کے نام دعوت نامے بھیجے جا رہے ہیں؟جواب میں وہ کہتے،ارے صاحب، مصروفیتوں کا حال نہ پوچھیئے۔ آدھے سے زیادہ کام باقی پڑے ہیں۔ مجلس عامہ نے ابھی یہ طے نہیں کیا کہ مقامی شاعروں میں کن لوگوں کو مدعو کرنا ہے۔"[۱۵۵]

مصنف حصول شہرت کے لیے مختلف نسخے بھی دیتے ہیں اور انشائیہ کا اختتام بھی شہرت کی خاطر ایک نسخے سے ہی ہوتا ہے۔ تاہم مصنف کے تمام انشائیوں کی تکنیک تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ملتی جلتی ہے۔ مصنف کے تمام انشائیوں میں طنز و مزاح کی آمیزش دیکھنے کو ملتی ہے اور قریباسب انشائیوں میں شعر دیکھنے کو ملتاہے ان کے انشائیوں میں مقولے، مثل اور محاورات کا استعمال بھی ہوا ہے واقعات،مثالوں اور مشاہدات و تجربات سے انشائیہ کو آگے بڑھاتے ہیں۔وہ اپنے انشائیوں میں موضوع کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیتے ہیں کہ ان زاویوں کے خدوخال قاری پر عیاں ہو جاتے ہیں اور قاری ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ii۔ مشکور حسین یاد کے انشائیوں کا تکنیکی جائزہ:

مشکور حسین یاد کے انشائیوں کے تین مجموعے ہیں جن میں "جوہر اندیشہ"،"بات کی اونچی ذات"اور" وقت کا استعارہ" شامل ہیں۔ مصنف کے انشایئے سادہ بیانیہ ،استعاراتی اور علامتی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ مشکور حسین یاد"وقت کا استعارہ"میں بیان کرتے ہیں۔

> "ہر ادیب کا اپنا ایک میدان ہوتا ہے یازیادہ سے زیادہ اس کے ایک یا دو میدان اور ہو سکتے ہیں لیکن انشائیہ نگار کے سامنے اس طرح کے کوئی ایک یا دو میدان نہیں ہوتے مثلا ایک ادیب افسانہ نگار ہے تو وہ صرف افسانہ نگاری کے امکانات کو زیادہ سے زیادہ روشن کر سکتا ہے۔ لیکن ایک انشائیہ نگار پر اس طرح کی کوئی پابندی نہیں۔ وہ افسانے کے رنگ میں بھی انشائیہ لکھ سکتا ہے اور ایک مقالے کی صورت میں بھی۔وہ شاعرانہ انداز کی نثر بھی ضبط تحریر میں لا سکتا ہے اور ایک فلسفیانہ انداز کا بھی انشائیہ لکھ سکتا ہے۔"[۱۵۶]

انشائیہ "چھوئی موئی" کے انشایئے کا آغاز سادہ بیانیہ فقرے سے ہوتا ہے انشائیہ کی تکنیک میں مثالیں اور واقعہ نگاری برتی گئی ہے صیغہ واحد غائب اور صیغہ متکلم کا اکھٹا استعمال کیا گیاہے اور انشائیہ کا اختتام ناصح کے طور پر مصنف نصیحت کرتے ہوئے کرتے ہیں۔ اس طرح انشائیہ "تجربہ اور ناتجربہ کاری "کا آغاز بھی سادہ فقرے سے ہوتا

ہے اور تجربے کے موضوع پر بحث کرتا ہوا سادہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ تاہم مشکور حسین یاد نے تجربات و مشاہدات کو بیانیہ انداز میں لکھا ہے تاہم بیانیہ ایک دن کا بھی ہو سکتا ہے کئی دن کا بھی اور کئی سالوں کا بھی۔ تاہم مصنف نے یہاں صیغہ غائب کا استعمال کیا اور انشائیے کا انجام انشائیے کے نچوڑ پر ہوتا ہے اور مصنف ناصح کے طور پر نصیحت کرتے ہیں اور انشائیہ اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

اس طرح مصنف انشائیہ "لے سانس بھی آہستہ" کا آغاز شعر سے کرتے ہیں اور شعر ہی پورے انشائیہ کا نچوڑ ہوتا ہے اور شعر کے ہی فلسفے کو پورے انشائیے میں بیانیہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے واحد متکلم کا استعمال کیا ہے اور بیانیہ انداز میں انشائیہ لکھا ہے اور بیانیہ انداز میں ایک ہی نکتے کو پورے انشائیے میں پھیلایا ہوا ہے۔ مصنف بیان کرتے ہیں۔ "ہم میں زمان و مکان کی نزاکت کا احساس جاگ اٹھے تو شاعر کا منشا پورا ہو جاتا ہے۔ اصوٗل نزاکت تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔"[۱۵۷]

تاہم مصنف واحد متکلم کے استعمال سے ہی انشائیہ لکھتے ہیں اور تسلسل خیال، سنجیدگی و غور و فکر اور زندگی کے فلسفے کو بیان کیا گیا ہے۔ صیغہ متکلم استعمال کرنے سے جذباتی اثر زیادہ ہوتا ہے تاہم انشائیے کا آغاز شعر سے کیا گیا ہے اور انجام میں اسی شعر کے فلسفے کو سیدھے سادے الفاظ میں نچوڑ کی صورت بیان کر دیا گیا ہے۔

اس طرح انشائیہ "نادانی کا شعور" میں مصنف نے Soliliqoy کی تکنیک استعمال کی ہے اور یہ ایسی تکنیک ہے جس میں آدمی اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے تاہم اس انشائیے میں ایک ہی چیز کی مختلف زاویوں سے تصویر لی جاتی ہے اور اس کے مختلف خدوخال اُبھر آتے ہیں تاہم اس کی فضا میں اشاریت و رمزیت پیش کرنے کا فلسفیانہ انداز بھی پایا جاتا ہے۔ انشائیے میں گہرے مفاہیم بیان کیے گئے ہیں تاہم انشائیے کا آغاز اتنا مکمل ہے کہ اس میں انشائیے کا نچوڑ نظر آتا ہے تاہم اس انشائیے کا آغاز و انجام دونوں ایک ہی طرز کے ہیں۔

انشائیہ "عقل کا استعمال" کا آغاز نصیحت کرنے والے انداز میں کیا گیا ہے اور وہ بات کو سمجھانے کے انداز سے انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں اور بیانیہ انداز میں صیغہ واحد متکلم کا استعمال کرتے ہیں اور مثال دے کر بات کو سمجھاتے ہیں اور انشائیہ آگے بڑھاتے ہیں۔ انشائیہ عقل کا استعمال میں مشکور حسین یاد نے تین مثالیں دے کر بات کو سمجھایا ہے اور انشائیے کو آگے بیانیہ انداز میں بڑھایا ہے اور انشائیہ کا اختتام ایک اخلاقی سبق یا نتیجے پر کیا گیا ہے اور مصنف پورا انشائیہ غیر جانبدرانہ انداز اور اخلاقی مقاصد کو پروان چڑھاتے ہوئے کرتے ہیں۔

مشکور حسین یاد وقتی تسلسل کی تکنیک کے تحت انشائیہ لکھتے ہیں اس طرح انشائیہ "ہبوط عالم" بھی وقتی تسلسل کے تحت لکھا گیا ہے انشائیے کا اختتام اخلاقی اقدار کی اہمیت بتاتے ہوئے کیا گیا ہے اور انشائیہ کا آخری فقرہ سوچ پیدا کرتا نظر آتا ہے اور سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

انشائیہ ''نزاکتوں کا مرقع ''کا آغاز کہانی لکھنے یا بتانے کے انداز سے کرتے ہیں کہانی میں علامت کا استعمال کیا جاتا ہے اور پتھر کو علامت کے طور پر برتا گیا ہے یہاں پتھر سے مراد قدیم دور میں پتھروں میں گھر بنانے والوں کی سادگی اور خلوص مراد ہے مشکور حسین یاد غالب کا شعر بھی انشائیے کے مفہوم کو سمجھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔''مشکور حسین یاد انشائیہ ''ناجائز تعلقات'' کا آغاز آفاقی سچائی کو بتاتے ہوئے کرتے ہیں۔زمان و مکان کی کوئی قید نہیں۔''[۱۵۸]

تاہم انشائیہ میں دو قسم کی تکنیک برتی گئی ہے انشائیہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے اور اس میں محاورات اور کہاوت کا بھی استعمال ہوا ہے تاکہ بات کو تشبیہ کے ذریعے زیادہ واضح کیا جاسکے اور مصنف انشائیہ میں طنز کی صورت پیدا کرتے ہیں۔انشائیہ میں بیانیہ کے فورا بعد واقعہ نگاری کی گئی ہے اور واقعے کے ذریعے قاری کو بات سمجھائی گئی ہے۔آخر میں مصنف نے ازدواجی تعلقات اور انشائیے کے نچوڑ کے طور پر اپنی رائے دی ہے۔''انسانی تعلقات کی بنیاد آزادی اور ایجاب و قبول پر ہے اگر ایسا نہیں تو انسان جانوروں سے بھی گئی گزری مخلوق ہے——جانوروں سے بھی گئی گزری مخلوق۔''[۱۵۹]

اس طرح انشائیہ ''دشمن بنایئے''کا آغاز بھی وقتی تسلسل کے تحت کیا گیا ہے یہ ایک علامتی انشائیہ ہے اور اس میں ضرب المثل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور پورا انشائیہ ضرب المثل کی وضاحت پر لکھا گیا ہے اور پھر انشائیے کا اختتام سبق آموز ہے اور اس انشائیے میں اخلاقی اقدار کے نظریے کو پیش کیا گیا ہے۔انشائیہ ''غالب خستہ حال''کا آغاز سادہ طریقے نیچرل آرڈر یعنی وقتی تسلسل کے تحت ہوتا ہے اور انشائیہ سادہ بیانیہ طریقے سے لکھا گیا ہے مگر دو جگہ اشعار کا استعمال بھی کیا گیا ہے اور یہ انشائیہ اسی اشعار کی تشریح نظر آتا ہے انشائیہ کا اختتام اخلاقی سبق یا انشائیہ سے حاصل کیا ہوا سبق پر ہوتی ہے۔انشائیہ ''عمر طبعی'' مکالمے کے انداز میں لکھا گیا ہے آغاز میں تجسس بڑھایا گیا ہے اور آخر میں طبعی عمر کا راز افشا کر دیا گیا ہے۔

''یقین کیجئیے میں بالکل گریز نہیں کر رہا ہوں۔
تو پھر بتاتے کیوں نہیں
مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ پوچھنے کے موڈ ہی میں نہیں ہیں۔
ضروری نہیں کہ پے در پے سوال کرنا سائل کے خلوص کو ظاہر کرتا ہو۔''
''کوئی مثال دے کر سمجھایئے''
اپنی ہی مثال لے لیجئیے۔۔۔۔۔۔۔۔میں آم کھلانا چاہتا ہوں اور آپ پیڑ گننے
پر اصرار کر رہے ہیں۔''[۱۶۰]

انشائیہ ”ہوس“ نولائنوں میں لکھا گیا انشائیہ ہے اس میں استعارہ کا استعمال بھی کیا گیا

ہے۔ ہوس کی ابتدائی آوازیں صور اسرافیل سے کم نہیں ہوتیں۔“[۱۶۱]

انشائیہ واحد حاضر میں لکھا گیا ہے اور بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ انشائیہ ”آزادی کے درد“ وقتی تسلسل کے تحت لکھا گیا انشائیہ ہے واحد متکلم اور واحد غائب کا استعمال کیا گیا ہے اور انشائیہ کا اختتام سوالیہ انداز میں سوال پوچھ کر کیا گیا ہے سوال پوچھ کر قاری کا تجسس بڑھایا گیا ہے اور جھنجھوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

انشائیہ ”منافق“ کا آغاز نہایت جاذب انداز سے کیا گیا ہے قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی گئی ہے انشائیے میں واحد متکلم یعنی میں اور ہم کا استعمال کیا گیا ہے۔ انشائیہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے اور بات کو سمجھانے کے لیے ایک، دو واقعات لکھے گئے ہیں تاہم انشائیے کے اختتام میں ہمیں اخلاقی سبق دینے کے لیے پُرکشش جملے لکھے گئے ہیں۔

مشکور حسین یاد انشائیے کا آغاز انشائیہ کے مرکزی نکتہ ”سطح“ کی اہمیت بیان کرنے سے کرتے ہیں تاہم انشائیہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے اور اس میں زندگی کے فلسفے کو بیان کیا گیا ہے گویا ایک ناصح کے طور پر نصیحت کرنے کے انداز میں انشائیہ بیان کیا گیا ہے اور انشائیہ کا انجام بھی کچھ اس طرز سے کیا گیا ہے کہ انشائیہ کے آخر میں ہمیں ایک سبق ملتا ہے کچھ نصیحتیں ملتی ہیں جو کہ اس کا نتیجہ ہے اور انشائیہ کو بیانیہ طریقے سے لکھا گیا ہے کہ انشائیہ کا جو اجتماعی احساس اور وسعت ہے اس میں انشائیہ کے موضوع کی اہمیت کو واضح کر دیا گیا ہے انشائیہ صرف تین صفحات پر پھیلا ہوا ہے نیز انشائیہ میں اختصار کا عنصر موجود ہے۔ انشائیہ ”کتاب“ کا آغاز طنزیہ اور موثر انداز سے کیا گیا ہے کہ قاری کی توجہ انشائیے کی طرف کھینچتی جاتی ہے اور انشائیہ طنزیہ انداز میں لکھا گیا ہے انشائیہ صیغہ واحد غائب میں لکھا گیا ہے اور مصنف غیر جانبدرانہ انداز میں انشائیہ لکھتا ہے انشائیے کا اختتام مفکرانہ اور فلسفیانہ طرز کے سوالات پر ہوتا ہے کہ قاری سوچ میں گم ہو جاتا ہے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور عدم تکمیل کا احساس ہوتا ہے۔ ”کتاب ایسی ہی حماقتوں سے معرض وجود میں آتی ہے اور لوگوں کے دلوں میں یقین کی شمعیں روشن ہو جاتی ہیں۔ علم کیا شے ہے؟ آگہی کسے کہتے ہیں؟ اس کی خبر لکھنے والے کو نہ کبھی ہوئی اور نہ کبھی ہو گی۔“[۱۶۲]

انشائیہ ”سر کے بل“ میں مشکور حسین یاد علامت کا بھرپور استعمال کرتے ہیں اور انشائیہ میں الٹا لٹکنا اور سر کے بل دو علامتوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ مشکور حسین یاد علامت کا یوں استعمال کرتے ہیں۔

”یہ حقیقت ہے کہ سر اور پاؤں کو دو الگ الگ چیزیں تسلیم کر لیا گیا ہے۔ جو چیزیں ساکن ہیں وہ پاؤں ہیں۔ جو چیزیں انہیں منشا کے مطابق ادھر اُدھر لے جاتی ہے، وہ سر ہے۔ بظاہر پاؤں چلتے نظر آتے ہیں، لیکن حقیقت میں سر چلتا ہے۔“[۱۶۳]

تاہم مشکور حسین یاد علامتی انداز میں اپنے خیایالات و نظریات کو بیان کرتے ہیں۔ انشائیہ ”انسانی کردار اور معاشرہ“ کا آغاز سوال پوچھ کر قارئین میں تجسس پیدا کر کے کیا گیا ہے اور اس سے قارئین کی توجہ فوراانشائیہ کی طرف کھچ جاتی ہے۔ انشائیہ سادہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے اور یہ ایک نفسیاتی کیفیات پر مشتمل انشائیہ ہے اور انشائیہ کا اختتام انشائیہ کا نچوڑ بیان کرتے ہوئے کیا گیا ہے۔

iii۔ صلاح الدین حیدر کے انشائیوں کا تکنیکی جائزہ:

صلاح الدین حیدر کے پہلے انشائی مجموعے ”حماقتیں میرے مقدر کی“ میں ان کے زیادہ تر انشائیے براہ راست ہیں جس میں انہوں نے درج ذیل تکنیک استعمال کی ہیں۔ تکنیک میں انشائیے کے آغاز اور انجام دونوں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ انشائیہ قصہ ”ایک عاشق کا“ انشائیے کا آغاز کہانی سنانے کے انداز سے کیا گیا ہے تاکہ قارئین کی توجہ فوراسے کھنچ جائے۔ انشائیہ میں صیغہ متکلم کا استعمال کیا گیا ہے صیغہ متکلم استعمال کرنے سے جذباتی اثر زیادہ ہوتا ہے۔

انشائیہ میں اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے اپنی زندگی کے مختلف تجربات اور واقعات کو بیان کیا گیا ہے اور واقعہ کے بعد واقعہ بیان کیا گیا ہے اور انشائیہ مکمل کرنے اور اپنی بات قارئین کو پہنچانے کے لیے چار پانچ واقعات بیان کیے گئے ہیں اور معاشرے پر بھی طنزیہ فقرات لکھے گئے ہیں گویا طنز طرازی سے کام لیا گیا ہے صلاح الدین حیدر کے انشائیوں کی ایک عمدہ تکنیک یہ ہے کہ شروع سے آخر تک طنز و مزاح کی ایک لہر چھائی ہوئی ہے اور بات سے بات نکالتے ہوئے اپنے انشائیوں کو مکمل کرتے ہیں گویا آپ بات سے بات نکالنے پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ انشائیے کا اختتام بھی طنز و مزاح سے بھرپور فقرے سے ہوتا ہے۔

اسی طرح ”ثقافت سے حماقت تک“ کے انشائیے کا آغاز اس طرز سے کیا گیا ہے جیسے کوئی واقعہ یا کہانی سنانے کا انداز ہو اور کہانی سنانے کے انداز میں صیغہ متکلم کا استعمال ہوتا ہے۔ انشائیہ میں رپورتاژ کی تکنیک برتی گئی ہے اور رپورتاژ میں عام طور پر واقعات اور باتوں کو لکھا جاتا ہے اور یہ باتیں اور واقعات مصنف پر گزری یا بیتی ہوتی ہیں اور بعض دفعہ باتیں مصنف کی سنی سنائی بھی ہوسکتی ہیں۔ کرداروں اور مقامات کے نام بعض دفعہ اصلی ہی ہوتے ہیں اور بعض دفعہ بدل بھی جاتے ہیں اور واقعات کو بیان کرتے ہوئے ماضی کا صیغہ برتا جاتا ہے واقعات کو بیان کرتے ہوئے مصنف اپنے تاثرات کو بیان کرتا ہے۔ صیغہ حال کا بھی استعمال کیا جاتا ہے تب یہ انتہائی جاذب اور پرکشش تکنیک دکھائی دیتی ہے اور صیغہ حال کو برتنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا ہے اور انشائیہ میں مسلسل تبصرہ دکھائی دیتا ہے تاہم اس میں شامل انشائیے سچے اور حقیقی بھی ہوسکتے ہیں اور تخیلی بھی۔

"انہی دنوں ہمارے گھر میں ایک مرحوم بزرگوار کے چہلم کی تقریب منعقد ہوئی اور اس تقریب میں حصہ لینے کے لیے بے شمار احباب اس طرح ہمارے گھر میں جمع ہو گئے جیسے چہلم نہیں کسان ریلی منعقد ہو رہی ہے مرحوم کو یاد کرتے ہوئے جب کہ ہم کچھ بزرگ احباب کے ساتھ پلاؤ کھا رہے تھے۔ نا معلوم وجوہات کی بنا پر ایک بحث چل نکلی۔ جس میں ایک بزرگوار نے بڑھتی اور پھیلتی ہوئی عریانی پر تشویش کا اظہار کر دیا۔ ہم پہلے ہی جھلائے بیٹھے تھے۔ تقریر شروع کر دی "قدیم سماج میں عورت کو غلام رکھا تھا اسے تہذیب و ثقافت کی ہوا نہ لگنے دی جاتی تھی۔ وہ منڈی میں بکنے والی ایک چیز تھی۔ وہ "ایک بزرگوار بھنا کر بولے "میاں صاحب زادے یہ کیا بک رہے ہو"؟""[164]

تاہم صلاح الدین حیدر مزاحیہ انداز میں انشائیے کا اختتام کرتے ہیں اس طرح انشائیہ "حب الوطنی سے بیمہ ایجنسی تک" انشائیہ کا آغاز نیچرل آرڈر کے تحت کیا گیا ہے اور اس کا آغاز سادہ بیانیہ انداز میں ہوتا ہے۔ انشائیہ صیغہ متکلم کے انداز میں لکھا گیا ہے کہانی سنانے یا کہانی بیان کرنے کے طریقے سے لکھا گیا ہے اس میں بیمہ ایجنسی کے کاروبار چھوڑنے تک کے پورے سفر کو لکھا گیا ہے اور انشائیہ کا اختتام بھی کہانی سنانے کے انداز سے کیا گیا ہے۔ انشائیہ "قصہ عظیم بننے کا" کا آغاز طنزیہ انداز کے فقرے سے ہوتا ہے اور اس کا آغاز ہی اتنا پائیدار اور مکمل ہے کہ اس میں پورے انشائیے کے نچوڑ کو پیش کر دیا گیا ہے۔ "صرف آدمی بننا تو خیر ہمارے لیے بڑا مشکل تھا (عظیم آدمیوں سے معذرت کے ساتھ) البتہ بڑا آدمی بننا آسان دکھائی دیتا ہے۔"[165]

زیر نظر انشائیہ عظیم بننے کی کوشش اور جستجو کو کہانی کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ انشائیہ "جذبہ خدمت خلق سے محکمہ شہری دفاع تک" میں انشائیے کا آغاز اور اختتام دونوں ایک ہی طرح کے ہیں آغاز میں بھی زندگی کے مقصد اور نصب العین مقرر کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاہم انشائیہ کا اختتام بھی اسی بات پر کیا گیا ہے کہ انسان کا اس دنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے؟ اسی طرح "قصہ جھگڑالو کا" میں انشائیے کا آغاز علامہ اقبال کے قول سے کیا گیا ہے اور قول سے انشائیہ میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "حکیم الامت علامہ اقبال نے تو فرمایا تھا کہ موسیقی روح کی غذا ہے۔ اس طرح انشائیہ کا اختتام کسی کہانی کا نتیجہ بتانے کے طرز پر کیا گیا ہے۔ پس انسان جھگڑے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اور کوئی مانے یا نہ مانے جب تک انسان پیدا ہوتے رہیں گے جھگڑے بھی ہوتے رہیں گے! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"[166]

صلاح الدین حیدر کے انشائیوں کا دوسرے مجموعے "ڈر اور ڈراما" کے زیادہ تر انشائیوں میں استعارہ کی تکنیک برتی گئی ہے جس سے ان کے انشائیے زیادہ تر موثر اور پُرکشش دکھائی دیتے ہیں ان کے انشائیوں کے عنوانات سے ایک بات عیاں ہوتی ہے کہ اساطیری، جنگجو اور ہیرو کے کارنامے ہمارے ذہن میں گھومنے لگتے ہیں۔ صلاح الدین حیدر مختلف شخصیات، شاعروں اور ادیبوں کے واقعات اور ان کی تحریروں کو بیان کرتے ہوئے

اپنے انشائیوں کی تکمیل کرتے ہیں۔ انہوں نے جابجا غالب اور دوسرے شعراء کے اشعار کو برتا ہے۔ فیض عابد عمیق اپنی رائے یوں دیتے ہیں۔

> ”یہاں ان مجاہدوں کی بات کی جارہی ہے۔ جو ہیں تو تاریخ کے ہیرو اصلی ہیرو یعنی عام فرد لیکن مضحکہ خیز نظر آتے ہیں۔ اس تکنیک سے صلاح الدین حیدر نے ایک خاص کام لیا ہے کہ ہماری یاد میں جن عظیم کرداروں کا دبدبہ اور رُعب تھا۔ اُسے اُلٹا مضحکہ خیز اور نقلی بنادیا ہے۔۔۔۔۔۔(SUBUERT) کے کرنے کی یہ تکنیک صلاح الدین حیدر نے اپنے انشائیے "ٹوپی" میں بھی بہت چابکدستی سے استعمال کی ہے۔“[۱۶۷]

اس طرح انشائیہ ”ٹوپی“ میں رازونیاز، حقیقت کوواضح کرنے میں کرنے میں رکاوٹ ہے مصنف اس اسرار ورموز کے اندر گہری نظر سے دیکھتے ہیں اس طرح اس استعاراتی تکنیک سے ہم معاشرتی علامتی اظہار کو ایک نئے انداز سے دیکھ سکتے ہیں۔ انشائیہ ”ڈر اور ڈراما“ کا آغاز میں زندگی کا فلسفہ بیان کر کے قاری کی توجہ انشائیے کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی گئی ہے انشائیہ استعاراتی انشائیہ ہے انشائیے کا آغاز بیانیہ انداز سے ہوتا ہے اس میں واحد متکلم کا بھی استعمال کیا گیا ہے اور مثالیں اور کشفی واقعات بیان کر کے بات کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ مصنف نے انشائیے میں ہیملٹ، پورن بھگت، جولیس سیزر اور سہراب کو معاشرے کے افسردہ لوگوں کے لیے علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔

iv۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر کے انشائیوں کا تکنیکی جائزہ:

ڈاکٹر شہزاد قیصر کے سب انشائیوں میں طنز و مزاح کا بھرپور استعمال ہوا ہے۔ شہزاد قیصر کے انشائیوں کی تکنیک دبستاں سرگودھا کے انشائیوں سے مختلف ہے ان کے انشائیے بے تکلفانہ انداز سے لکھے گئے ہیں نیز ان کے انشائیوں میں طنز و مزاح کی تازگی کی خوبی بھی پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر کا مزاح چٹکلے یا لطیفہ گوئی تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں خطیب اور مبلغ کے رُوپ میں بھی نظر آتے ہیں وہ اپنے انشائیوں میں خود پر بیتے ہوئے حالات کو بھی بہت عمدگی سے تحریر کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں نقطہ آفرینی کی تکنیک بھی موجود ہے۔

انشائیہ ”ہم سفر“ میں مصنف انشائیہ کا آغاز کہانی سنانے کے انداز سے کرتے ہیں اور اس دوران وہ ماضی کے کسی واقعے کو بھی یاد کرتے ہیں جس میں ہمیں ناسٹالجیا کی تکنیک بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اور اس تکنیک میں مصنف طنز و مزاح کا ہاتھ تھامے ہی نظر آتے ہیں۔ مصنف انشائیے میں ریلوے اسٹیشن کی عمدہ انداز میں تصویر کشی کرتے ہیں۔ اس میں پورے اسٹیشن کی گہما گہمی کو دکھایا گیا ہے۔ اس میں وقت کی حدیں دور تک نہیں پھیلی ہوئیں بلکہ وقتی تسلسل کے تحت انشائیہ لکھا گیا ہے جس کا انداز بیانیہ ہے۔ انشائیے میں مصنف مسافروں کے ساتھ مکالمہ کرتے نظر

آتے ہیں تاہم مصنف کے زیر نظر انشائیے میں ہمیں رپورتاژ کے آثار بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ تاہم رپورتاژ میں ان باتوں یا واقعات کو بیان کیا جاتا ہے جو مصنف پر گزری یا بیتی ہوں یا مصنف نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوں اس میں عام طور پر واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے اس میں کرداروں یا جگہوں کے نام اصلی ہی ہوتے ہیں مگر افسانے یا ناول میں یہ نام بدل دیے جاتے ہیں گزرے ہوئے واقعات کی وجہ سے ماضی کا صیغہ ہی برتا جاتا ہے مگر جب حال کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے تو یہ جاذب نظر تکنیک کی شکل میں ہمیں سامنے نظر آتا ہے۔ صیغہ حال استعمال کرنے سے سب واقعات آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں اور اس وجہ سے یہ ہمیں تبصرہ لگنے لگتا ہے۔ یہ واقعات حقیقی بھی ہو سکتے ہیں اور تخیلی بھی۔ مصنف یہاں صیغہ حال کو استعمال کرتے ہیں اس وجہ سے سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے گزرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

انشائیہ "گھر کی تلاش" کا آغاز مصنف اپنے تجربے کو بیان کرنے سے کرتے ہیں جو کہ ان کے انشائیے کا نچوڑ ہے۔ "زندگی میں غلطیاں کم کی ہیں لیکن خمیازہ بھگتا ہے"۔ (ص 33 گھر کی تلاش) انشائیہ رپورتاژ کی شکل میں لکھا گیا ہے۔ انشائیہ میں واقعات کو بیان کیا گیا ہے اور اس میں صیغہ ماضی کا استعمال کیا گیا ہے۔ جس میں مصنف کے تاثرات صاف دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم انشائیہ وقتی تسلسل کے تحت لکھا گیا ہے جس میں داخل کے ساتھ ساتھ خارج کے اثرات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اور اس میں تذکیر کا صیغہ برتا گیا ہے۔ مصنف اپنے ہر انشائیے میں اپنے زندگی کے تجربات اور مشاہدات ہی قلمبند کرتے ہیں۔

انشائیہ "شوہر، بیگم اور سسرال" کے پورے انشائیے میں طنز و مزاح کی لہر دوڑتی نظر آتی ہے۔ ان کا انشائیہ سادہ بیانیہ انداز میں لکھا ہوا ہے جیسا کہ بیانیہ میں کہانی نہیں ہوتی مگر ان کے انشائیے میں نقطہ آفرینی کی خوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ انشائیہ میں صیغہ واحد غائب کو استعمال کیا گیا ہے۔ وہ ایک ہی موضوع کی مختلف زاویوں سے تصویر کھینچتے ہیں۔ اس طرح انشائیہ "کلیرنس سیل" کی بھی یہی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔

انشائیہ "قرض کی پیتے تھے مے" کو بھی مصنف سادہ بیانیہ انداز میں لکھتے ہیں اس میں بھی صیغہ واحد غائب کو برتا گیا ہے انشائیہ طنز و مزاح کے انداز میں لکھا گیا ہے مصنف اس امر کے لیے اشعار کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ اور طنز سے بھرپور ایک پیراگراف بھی لکھتے ہیں جس میں مقروض، قرض خواہ کا جواب دیتا ہے۔

> "دیکھو میں نے قرض لوٹانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس راستے پر میں ایک کیکر اُگاؤں گا، اُس کے نیچے سے کپاس کے بھرے ہوئے ٹرک گزریں گے اور کچھ کپاس ان کانٹوں میں الجھ جائے گی۔ میں روزانہ اُس کپاس کو اکٹھا کروں گا اور کسی مناسب وقت پر اسے بیچ دوں گا اور پھر دوسرے دن قرض لوٹا دوں گا"۔ قرض خواہ یہ سن کر مسکرانے لگا۔ مقروض نے برجستہ کہا "اب تو تم ضرور مسکراؤ گے، تمہاری ڈوبی ہوئی رقم جو تیرنے لگی ہے۔"[۱۶۸]

مصنف کا انشائیے میں مزاح لطیفہ گوئی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ گویا مصنف اپنے انشائیے میں مشاہدات اور اپنے تجربات کو منطقی احساس کی صورت میں لکھ کر داد وصول کرنا چاہتا ہے تاہم انشائیہ میں مسکراہٹ مضحک صورتحال کی بجائے ژرف نگاہی اور مصنف کی باریک بینی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ انشائیہ ''بسنت'' کا آغاز تو سادہ بیانیہ انداز میں ہوا ہے۔ شہزاد قیصر میر تقی میر کا ذکر بھی انشائیے میں کرتے ہیں۔ مصنف انشائیے میں کہانی سنانے کے انداز میں خود پر بیتے ہوئے حالات کا ذکر کرتے ہیں۔ اسے وہ واقعہ کی صورت میں بیان کرتے ہیں اور درمیان میں وہ کچھ واقعات کو لطیفہ گوئی کی طرح بیان کرتے ہیں۔

> ''بسنت سے ہمیں کاٹ کرنے اور کاٹ ڈالنے کا علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی درس گاہ ہے جس کا کوئی بھی سبق عملی زندگی میں ناقابل عمل نہیں ہوتا۔ جب کوئی شخص کسی دوسرے کی پتنگ کاٹ دیتا ہے تو یکدم ایسا شور بلند ہوتا ہے کہ لگتا ہے اس کو کسی موذی جانور نے کاٹ کھایا ہے۔ ''[۱۶۹]

مصنف کے زیادہ تر انشائیے خود پر بیتے ہوئے حالات کا ذکر کرتے ہوئے یار پور تاژ کی صورت میں ہی بیان ہوئے ہیں اور چند ایک انشائیے بیانیہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ جن میں ایک ہی موضوع پر مختلف زاویوں سے تصویر لی گئی ہے۔ اور نکتہ آفرینی کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ انشائیہ ''آنکھ مچولی'' بھی سادہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے مصنف انشائیے میں پلے گراؤنڈ کو حکمت کے طور پر برتتے ہیں، مصنف انشائیے میں تاثر بڑھانے کے لیے اقوال اور اشعار کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ وہ علامت نگاری کو یوں برتتے ہیں۔ ''ہمارا معاشرہ ایک وسیع پلے گراؤنڈ کی حیثیت رکھتا ہے جس میں سال بھر مختلف اشخاص، طبقات اور محکمے اپنی اپنی ٹیموں کو نیٹ پر یکٹس کراتے ہیں۔ معاشرتی تہوار اصل میں ان ٹیموں کے عوام کے ساتھ پول میچ ہوتے ہیں۔ ''[۱۷۰]

انشائیہ ''پنشن خوار'' کا آغاز مصنف معاشرے پر طنز کرتے ہوئے کرتے ہیں اور مختلف واقعات کا ذکر کرتے ہوئے انشائیہ آگے بڑھاتے ہیں۔ تاہم ان کے انشائیے میں اجتماعی احساس دیکھنے کو ملتا ہے۔ انشائیہ خارجی ہے اس میں وقت کی حدیں متعین نہیں ہیں۔ وہ انشائیہ میں معاشرے پر گہرا طنز کرتے ہیں کہ ملازم پیشہ افراد کو ریٹائرمنٹ کے بعد بہت خوار ہونا پڑتا ہے وہ انشائیے میں معاشرے کے اس دوغلے پن اور منافقت پر گہرا طنز کرتے ہیں۔

انشائیہ ''ماتحتی'' کے آغاز میں ایک خط شامل کیا گیا ہے یہ بہت موثر تکنیک ہے۔ اور اس کے بعد مختلف آفیسر آپس میں ماتحتی کے اصولوں پر گفتگو کرتے ہیں۔ انشائیے میں دو تکنیکیں استعمال ہوئیں ہیں۔ تاہم انشائیے

میں مکالمے اور گفتگوئیں ہی ہیں اور اس طرح کبھی مکالمہ اور گفتگو کبھی چھوٹی ہوتی ہے اور کبھی طویل ہو جاتی ہے۔اور کبھی ایک آفیسر مختلف آفیسر ز کو مخاطب کر کے باتیں کرتا ہے۔

> "ایک صاحب نے ماتحتی کے مزید خدو خال بیان کیے۔ وہ فرمانے لگے:"میرے نزدیک اگر کوئی ماتحت اپنے حاکم کی رائے کے خلاف کوئی رائے دل میں رکھتا ہے اور بے شک اسے زبان پر نہیں لاتا تو یہ بات بھی نافرمانی کے دائرے میں آتی ہے۔۔۔۔۔"[۱۷۱]

خط میں صیغہ واحد متکلم کو استعمال کیا گیا ہے اور مکالمے میں صیغہ واحد حاضر کو برتا گیا ہے۔ انشائیے کو زیادہ پُر اثر بنانے کے لیے اس میں ایک شعر کو بھی شامل کیا گیا ہے۔اس طرح انشائیہ سفر نامہ میں بھی یہی تکنیک استعمال کی ہے انشائیے میں گفتگو اور مکالمے ہی ہیں۔

شہزاد قیصر اپنے انشائیوں میں اختصار کی خوبی کو اپناتے ہیں ان کے انشائیے خود پر بیتے حالات پر مشتمل ہیں جن میں ان کے خود پر بیتے ہوئے واقعات کو شامل کیا گیا ہے جس کی وجہ سے ان کے انشائیے رپور تاژ کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ کچھ انشائیے بیانیہ انداز میں ہیں جس میں ایک ہی موضوع پر مختلف زاویوں سے تصویریں لی گئیں ہیں دو انشائیے مکالمے اور گفتگوئیں کی ملی جلی تکنیکیں رکھتے ہیں۔ گویا ان کی تکنیکیں منفرد ہیں جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔

v۔ارشد میر کے انشائیوں کا تکنیکی جائزہ:

ارشد میر اپنے انشائیوں میں زیادہ تر سادہ بیانیہ تکنیک کا استعمال کرتے ہیں اور اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنے انشائیوں میں بیان کرتے ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا ان کی تکنیک پر بات کرتے ہیں۔"انشائیوں میں ان کا عام رویہ یہ ہے کہ ذہنی بشاشت سے مملو اسلوب میں موضوع کے جملوؤں کو الٹ پلٹ کر دیکھا جائے اور ایسا کرتے ہوئے جابجا ایسے نکتے ابھارے جائیں جو قاری کے لیے سوچ کی غذا مہیا کریں، اسے حیران کریں اور اس کے اندر یہ احساس پیدا کریں کہ وہ اس موضوع پر پہلی بار سوچ بچار کر رہا ہے۔"[۱۷۲]

انشائیہ" دھوتی "کا آغاز تہذیب میں دھوتی کی اہمیت بتانے سے کرتے ہیں۔ وہ انشائیے میں فارسی اور اردو محاورے بھی برتتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیے میں صیغہ واحد غائب اور واحد متکلم کو بخوبی برتتے ہیں وہ ایک بات کو مرکز بنا کر بات کے مختلف رُخ کو صفحہ قرطاس پر بکھیر دیتے ہیں۔ وہ دھوتی پہننے کے تاریخی، تہذیبی و ثقافتی پہلوؤں کے ساتھ حال اور مستقبل میں دھوتی کے مختلف رُخ کو پیش کرتے ہیں۔ وہ انشائیہ مختلف مثالیں دے کر بھی انشائیہ آگے بڑھاتے ہیں۔"دھوتی کی عظمت کا میں ہی معترف نہیں، اس کے پرستاروں میں کئی نامور شخصیات اور صف اول کے قائدین بھی شامل ہیں۔اس سلسلہ میں علامہ اقبال کی زریں مثال ہمارے سامنے ہے۔"[۱۷۳]

وہ انشائیہ سادہ بیانیہ انداز میں بیان کرتے ہیں اور انگریزی الفاظ کو بھی اپنے انشائیے میں برتتے ہیں۔ وہ انشائیہ کا اختتام میں قاری میں ایک نئی سوچ پیدا کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں تاہم انشائیہ کا خاتمہ عدم تکمیل پر کرتے ہیں۔ انشائیہ ''دوپٹہ'' کا آغاز دوپٹہ کی اہمیت بتاتے ہوئے کی گئی ہے انشائیہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ وہ موضوع کے جملوں کے الٹ پھیر سے کئی نکتے پیدا کرتے چلے جاتے ہیں جو کو قاری کو نئی اور منفرد سوچ مہیا کرتے ہیں۔ وہ دوپٹہ کی معاشرتی صورتحال کے ساتھ اس کی اہمیت بیان کرتے ہیں وہ دوپٹہ کی ارتقائی اور تہذیبی صورتحال بیان کر کے انشائیہ کو آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ انشائیہ میں اشعار کا استعمال بھی کرتے ہیں ان کا انشائیہ آٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ انشائیہ میں صیغہ واحد غائب اور واحد متکلم کو بھی برتا گیا ہے۔ ارشد میر کے زیادہ انشائیوں کی تکنیک اسی قسم کی ہے۔ ان کے انشائیوں میں نکتہ آفرینی اور بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر بخوبی موجود ہے۔ اس وجہ سے ان کے انشائیے یکسانیت سے دور ہیں اور قاری کی دلچسپی انشائیے کے ختم ہونے تک موجود رہتی ہے۔ تاہم ان کے سب انشائیوں میں طنز کی کاٹ اور مزاح کی لہر موجود ہے ان کے انشائیوں میں مضمون نویسی، خاکہ نویسی اور طنز و مزاح کی حدیں ملی ہوئی ہیں۔

انشائیہ ''آنسو'' کا آغاز بھی آفاقی سچائی سے کیا گیا ہے کہ آنسو عطیہ خداوندی ہیں مصنف آنسو کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لیے شعر کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ انشائیہ سادہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے مصنف آنسو کے مختلف رخ اور پہلوؤں کا ذکر کر کے انشائیہ تحریر میں لاتے ہیں۔ مگر نکتہ آفرینی کے پہلو کو نہیں چھوڑتے اور بات سے نئی بات پیدا کر لیتے ہیں۔ انشائیہ صیغہ واحد غائب میں لکھا گیا ہے انشائیے میں مصنف کے وسیع تجربات و مشاہدات کو کشفی انداز میں بیان کرنے کی تکنیک بھی ملتی ہے۔

انشائیہ ''مُوڈ'' بھی سادہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے مصنف تہذیب سے بہت سی مثالیں لے کر انشائیہ آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ تاریخ کی مختلف شخصیات کا ذکر کر کے انشائیہ آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ ادبی شخصیات کا ذکر بھی کرتے ہیں جن میں غالب، عبدالرحمٰن بجنوری اور حافظ شیرازی وغیرہ شامل ہیں۔ مصنف انشائیہ کا اختتام ان الفاظ میں کرتے ہیں جس سے قاری کو ایک نئی سوچ ملتی ہے۔ اور انشائیہ کا اختتام سبق آموز بھی ہے۔

> ''اس لیے حضور مُوڈ کی نوک پلک درست رکھیے۔ اس سے کام لینے میں بُخل سے کام نہ لیجئیے۔ کیونکہ اس میں آپ ہی کی نہیں، پوری زندگی کی بقا کا راز مضمر ہے۔ یوں بھی یہ سارا عالم رنگ و بُو ایک مُوڈ ہی کی تو تخلیق ہے!'' [۱۷۸]

انشائیے کا آغاز اور اختتام انشائیہ میں بہت اہمیت رکھتا ہے مصنف اپنے انشائیوں میں چھوٹتے ہی موضوع کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں بعض دفعہ انشائیے کے آغاز یا انجام میں انشائیے کا مکمل نچوڑ پیش کر دیا جاتا ہے۔اس طرح مصنف کے سب انشائیوں کی تکنیک تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ملتی جلتی ہے اور قاری پر ایسا سحر طاری کرتی ہے کہ قاری فوراہی انشائیہ پڑھنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

vi۔دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا تکنیکی تقابل:

دراصل تکنیک کا لفظ انگریزی سے آیا ہے اور انگریزی نے اسے یونان سے لیا ہے۔انگریزی میں اسے Technique کہتے ہیں اور یونان والے Technikos کہتے ہیں۔اگر مجموعی طور پر اس کے مفہوم و معنی کو دیکھا جائے تو اس کے معنی طریقہ کار کے ہیں۔چنانچہ ہر صنف کی اپنی ایک الگ تکنیک ہوتی ہے اور اس طرح انشائیہ کی تہذیب و ترتیب میں بھی تکنیک ایک اہم کردار ادا کرتی ہے اور اس طرح حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انشائیہ نگار کا منتہائے مقصود صرف تکنیک کو پیش کرنا نہیں ہوتا بلکہ تکنیک منزل تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔اس طرح بہترین تکنیک کسی بھی صنف کو موثر بناتی ہے۔اس طرح ضروری نہیں کہ ہر انشائیہ کی صرف ایک ہی تکنیک ہو بلکہ مصنف کے ذہن میں جب خیال آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کی تکنیک بھی ذہن میں آجاتی ہے۔لیکن یہ ضروری بھی نہیں کہ ہر خیال اپنے ساتھ اس کی تکنیک بھی ذہن میں لائے مگر اتنا بھی ممکن ہے کہ ہر مصنف کو خیال کے دوران ہلکا پھلکا ڈھانچا ذہن میں آجائے اور جب وہ صفحہ قرطاس پر اُترتا ہے تو رائج الوقت کے طریقوں میں سے ہی ایک طریقہ ہوتا ہے۔انشائیے کی تکنیک پر اگر غور کیا جائے تو اس میں تسلسل خیال، غیر رسمی طریق، کفایت لفظی، عدم تکمیل وغیرہ موجود ہونا ضروری ہے۔تاہم انشائیہ میں یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ انشائیہ سیال صورت میں ہوتا ہے اور یہ ہر صورت میں ڈھل جاتا ہے ڈاکٹر وزیر آغا اس بارے میں اپنی رائے دیتے ہیں۔"انشائیہ کی کوئی مخصوص ہئیت نہیں۔حتیٰ کہ یہ بھی ضروری نہیں کہ اسے لازمی طور پر مضمون کے اسلوب میں ہی لکھا جائے۔"[۱۷۵]

تاہم اس کی کوئی خاص شکل یا وضع نہیں ہوتی مگر ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اگر کسی نثر پارے کی باقاعدہ ہئیت یا وضع نہ ہو تو وہ انشائیہ ہے۔کوئی بھی فن پارہ اپنی صنف کے لحاظ سے مختلف اجزاء کو منتخب کر کے ایک تکنیکی سانچے کی صورت میں ڈھالا جاتا ہے اور پھر یہ کُل کی شکل میں ترتیب دیا جاتا ہے۔انشائیہ میں تمام اجزاء ایک مرکز سے جُڑے ہونے کے باوجود آزاد اور لچکدار ہوتے ہیں اس طرح انشائیہ نگاری کو پوری آزادی ہے کہ وہ صرف انشائیہ کو بیانیہ انداز میں ہی نہ لکھے اور اگر فن میں ضرورت ہو تو افسانے یا ڈرامے کی ہئیت میں بھی اسے لکھا جا سکتا

ہے مکالمے اور ناول کی تکنیک کا بھی استعمال کیا جاسکتا ہے چاہے تو انشایئے میں سنجیدہ عناصر، فکری عناصر، مزاحیہ و فلسفیانہ عناصر شامل کیے جاسکتے ہیں مگر انشائیہ کا مقصد کہانی بیان کرنا یا ڈرامہ تخلیق کرنا نہیں ہوتا بلکہ افسانوی، ڈرامائی یا مکالماتی عناصر انشایئے کی تکنیک میں بہترین اجزاء کا کام دے کر اس میں نکھار پیدا کرتے ہیں مگر یہ اجزاء یا عناصر انشائیہ کے فطری مزاج پر غلبہ نہیں پاسکتے۔

ڈرامہ، افسانہ اور ناول وغیرہ میں ایک طرح کی وسعت پائی جاتی ہے مگر انشایئے میں الفاظ کو عقلمندی سے استعمال کیا جاتا ہے اس طرح مختلف مصنفین نے انشایئے کی ہئیت و تکنیک کے مختلف تجربات کیے ہیں انشایئے میں وزیر آغا نے انشایئے میں زیادہ تجربات کیے ہیں ان کا انشائیہ "ٹھنڈا ہاتھ" میں افسانے کی تکنیک استعمال کی گئی ہے لیکن انشائیہ پر افسانوی عناصر غلبہ پانے کی خوبی نہیں رکھتا بلکہ انشائیہ اپنی شکل میں ہی رہتا ہے اس طرح دبستان لاہور کے انشائیہ نگار اپنے انشائیوں میں خارجی عناصر رکھتے ہیں اور دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگار داخلی عناصر زیادہ رکھتے ہیں۔ دبستان لاہور اور مشکور حسین یاد کے مطابق انشائیہ کو کسی بھی شکل میں لکھا جاسکتا ہے مطلب یہ کہ انشائیہ کو ادب کی کسی بھی صنف میں ڈھالا جاسکتا ہے لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ صرف ظاہری ڈھانچا ہی قابل قبول ہوگا اور باطنی طور پر اس سے گریز کیا جائے گا۔ مشکور حسین یاد "ممکنات انشائیہ" میں لکھتے ہیں۔

> "ابھی تک میرے انشائیوں کے دو مجموعے چھپے ہیں۔ ایک "دشنام کے آئینے" اور دوسرا "جوہر اندیشہ"۔ میں نے ہئیت اور اسلوب انشائیہ کے ضمن میں مختلف تجربے کئے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی طرح ایک اسلوب یعنی کہانی کہنے پر اکتفا نہیں کیا۔ مکالمے کے انداز میں بھی انشایئے لکھے اور کہانی کہنے کے انداز میں بھی۔ ویسے جو اسلوب مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ جوہر اندیشہ کے بیشتر انشائیوں کا اسلوب ہے۔"[۱۷۶]

انشائیہ کی تکنیک و فن کے لیے انکشاف ذات بھی بہت ضروری ہے مشکور حسین یاد کے مطابق انشائیہ لکھنے کے لیے انکشاف ذات اس قسم کا ہو کہ انشائیہ نگار کی ذات کے مختلف پرت اٹھتے چلے جائیں اور اس میں ذاتی انکشاف کے ساتھ ساتھ غیر ذات کا انکشاف بھی ضروری ہے اور اسی خصوصیت کی وجہ سے انشائیہ دوسرے ادب پاروں سے مختلف ہے ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے میں اگر انشائیہ نگار اپنی ذاتی باتوں کا ذکر سیدھے سادے انداز میں کر دے تو یہ انشائیہ نگار کے لیے کافی ہے۔ انشایئے میں جہاں انکشاف ذات ہو وہاں واحد متکلم کا استعمال بھی ضرور کیا جاتا ہے گویا یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں تاہم بعض واحد متکلم کو چھپا کر بھی انکشاف ذات کرتے ہیں۔ انشایئے میں شخصیت نگاری یا خاکہ نگاری سے بھی کام نہیں لیا جاسکتا بلکہ انشائیہ میں شخصیت نگاری اور خاکہ نگاری کے کچھ نقوش تو بکھیرے جا

سکتے ہیں مگر ان کو مرکزی جگہ نہیں دی جا سکتی بلکہ یہ ہمیشہ ذیلی ہی رہتے ہیں تاہم انشائیہ میں بنیادی یا مرکزی خیال نہیں پایا جاتا کیونکہ دبستان سرگودھا کے مطابق انشائیہ ذہن کی آزاد خیالی کا ہی نتیجہ ہے جبکہ مشکور حسین یاد کے مطابق انشائیہ آزاد خیالی کا نہیں بلکہ نظم وضبط کا پابند ہوتا ہے۔

انشائیہ کی تکنیک کی ایک اور اہم صفت عدم تکمیل ہے دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے مطابق انشائیہ میں انجام یا حرف آخر نہیں ہوتا اس میں کبھی بھی تکمیل کا عنصر موجود نہیں ہوتا بلکہ تشنگی ہمیشہ قائم رہتی ہے مقالہ اور مضمون میں تکمیل کا عنصر موجود ہوتا ہے جبکہ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگار اپنی انشائیہ نگاری میں عدم تکمیل کو ضروری جزو قرار دیتے ہیں اور وہ زندگی کے غیر مختتم کُل میں سے صرف ایک جزو کو منتخب کرتے ہیں اور اسے ایک چنگاری بنا دیتے ہیں جس سے زندگی کے بہت سے کونے روشنی کی لپیٹ میں آجاتے ہیں اور قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کروا لیتے ہیں۔ تسلسل خیال کی وجہ سے انشائیہ میں غیر رسمی طریق کار کی بھی خوبی در آئی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا غیر رسمی طریق کار کو کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ زندگی کی گہما گہمی، شور شرابے اور سنجیدگی کو نظر انداز کر کے غیر رسمی طریق کو اپنایا جائے اور اپنے شخصی رد عمل سے قاری کو بھی اپنے حلقے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ مشکور حسین یاد غیر رسمی انداز بیان کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔

> "دراصل غیر رسمی انداز بیان سے ایسا انداز بیان مراد ہے جو عام اسالیب بیان سے مختلف ہو، جس انداز بیان سے بیان کے نئے نئے راستے پیدا ہوتے نظر آئیں جس میں سنجیدگی ہو لیکن ایسی سنجیدگی جو دید و شنید کے اچھوتے پیمانے رکھتی ہو۔"[۱۷۷]

انشایئے میں شخصیت نگاری یا خاکہ نگاری سے بھی کام نہیں لیا جا سکتا بلکہ انشائیہ میں شخصیت نگاری اور خاکہ نگاری کے کچھ نقوش تو بکھیرے جا سکتے ہیں مگر ان کو مرکزی جگہ نہیں دی جا سکتی بلکہ یہ ہمیشہ ذیلی ہی رہتے ہیں تاہم انشائیہ میں بنیادی یا مرکزی خیال نہیں پایا جاتا کیونکہ دبستان سرگودھا کے مطابق انشائیہ ذہن کی آزاد خیالی کا ہی نتیجہ ہے جبکہ مشکور حسین یاد کے مطابق انشائیہ آزاد خیالی کا نہیں بلکہ نظم وضبط کا پابند ہوتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اپنے انشائیوں میں تکنیک کے بہت کم تجربے کرتے دکھائی دیتے ہیں ان کے زیادہ انشائیوں میں ہمیں کہانی لکھنے کا انداز ہی نظر آتا ہے جیسے وہ اپنے انشائیوں میں قاری کو کہانی سنا رہے ہوں اور تھوڑا بہت افسانوی انداز بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے انشائیوں میں تلازمہ خیال اور تسلسل خیال کی تکنیک بھی دیکھنے کو ملتی ہے ان کے انشائیوں میں تمثیلی انداز بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ انشائیوں میں تشبیہ و استعارہ کو بھی برتتے ہیں۔ آپ انشائیوں میں علامت کا استعمال بھی بخوبی کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں کہیں کہیں مزاح دیکھنے کو تو ملتا ہے

مگر اس میں تضحیک کی خوبی بالکل بھی موجود نہیں ہے۔ آپ زیر لب تبسم کی خوبی سے قاری کو آشنا کرتے ہیں۔ ان کا انشائیہ کہیں سے بھی شروع ہو کر کہیں پر بھی ختم ہو جاتا ہے ان کے انشائیوں میں ڈرامائی عناصر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کی زیادہ تر تکنیک کہانی لکھنے کے انداز میں ہے۔ وہ انشائیہ لکھتے ہوئے اپنے موضوع میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ بہت دور تک نکل جاتے ہیں لیکن پھر اپنے موضوع کی جانب واپس پلٹ آتے ہیں ان کی سوچ کھلے میدانوں میں سفر کرتی ہے اور وہ قاری کو اپنے موضوع کے نتائج سے آگاہ کرتے ہیں تاہم وہ اپنے انشائیوں میں "مرکز" سے ہٹ کر علیحدہ سے ایک "مدار" ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔

مشتاق قمر کے انشائیوں کی تکنیک زیادہ سادہ بیانیہ ہی ہے وہ بات سے بات بڑھانے میں ماہر ہیں۔ ان کے انشائیوں میں سوچ کی ہلکی سی لہر پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے تجربات و مشاہدات سے نئے مفاہیم اخذ کرتے ہیں۔ وہ معمولی سی چیز کو موضوع بنا کر اسے خوبصورت تکنیک سے نوازتے ہیں۔ وہ زندگی کے ایک پہلو کا انتخاب کر کے اسے شخصیت کا گداز لمس دیتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں دلائل اور منطق کی تکنیک کو نہیں اپناتے بلکہ سادہ بیانیہ انداز میں انشائیہ لکھتے ہیں۔ مشتاق قمر اپنے انشائیوں میں پرانی تشبیہات اور استعاروں کا سہارا لیتے ہیں وہ لفظوں کا ایک نایاب جال بُنتے ہیں جس سے موضوع خود بخود آگے بڑھتا ہے وہ اپنے انشائیوں میں ادھر اُدھر کی باتیں کر کے بھی انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں مرقع کشی کی خوبی بھی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کے انشائیوں میں تازگی اور شگفتگی در آئی ہے۔

جمیل آزر اپنے انشائیوں کو منطق کے ذریعے آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں کو کہانی لکھنے کے انداز سے بیان کرتے ہیں جیسے کہانی میں نیا موڑ آتا ہے ایسے ہی ان کے انشائیے ہمیں نئے موڑ سے واقف کرواتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ڈرامائی عناصر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں مکالمہ نگاری، کردار سازی اور منظر کشی بخوبی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے مختلف انشائیوں کا انداز رمزیہ اور علامتی بھی ہے وہ اپنے انشائیوں میں خاکہ کشی بھی بہت عمدہ انداز سے کرتے ہیں۔ اکبر حمیدی کا شمار ان انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے جو انشائیے کی تکنیکی ضرورتوں کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ نیز انکشاف ذات کے ساتھ ساتھ منطقی ترتیب دیکھنے کو ملتی ہے ان کے انشائیوں میں داخلی و خارجی دونوں عناصر موجود ہیں وہ بات سے بات نکالتے ہوئے انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اکبر حمیدی. انشائیوں میں اشعار، مصروں اور اقوال زریں کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے بعض انشائیوں میں استعاراتی اور افسانوی انداز بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ اپنے انشائیوں کو مختلف واقعات اور مثالوں سے آگے بڑھاتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کا انداز بیانیہ، استعاراتی، علامتی، تمثیلی، افسانوی اور بعض جگہ تو دوہری معنویت رکھتا ہے۔

نظیر صدیقی کے انشائیوں کی تکنیک زیادہ تر براہ راست ہے ان کے انشائیوں میں طنز و مزاح کی لہر دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ان کے انشائیے زیادہ تر بیانیہ انداز میں لکھے گئے ہیں اور انشائیہ میں واقعات کی مدد سے آگے بڑھاتے ہیں۔ان کے کچھ انشائیے کہانی یا افسانوی انداز میں لکھے گئے ہیں۔مشکور حسین یاد کے مطابق انشائیہ کسی بھی شکل میں لکھا جا سکتا ہے مطلب یہ کہ انشائیہ کو ادب کی کسی بھی صنف میں ڈھالا جا سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ صرف ظاہری ڈھانچہ ہی قابل قبول ہو گا اور باطنی طور پر اس سے گریز کیا جائے گا۔

صلاح الدین حیدر کے پہلے انشائی مجموعے "حماقتیں میرے مقدر کی"میں ان کے زیادہ تر انشائیے براہ راست ہیں۔انشائیہ "قصہ ایک عاشق کا"انشائیے کا آغاز کہانی سنانے کے انداز سے کیا گیا ہے انشائیہ میں اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے اپنی زندگی کے مختلف تجربات اور واقعات کو بیان کیا گیا ہے اور واقعہ کے بعد واقعہ بیان کیا گیا ہے اور انشائیہ مکمل کرنے اور اپنی بات قارئین کو پہنچانے کے لیے چار پانچ واقعات بیان کیے گئے ہیں اور معاشرے پر بھی طنزیہ فقرات لکھے گئے ہیں گویا طنز طرازی سے کام لیا گیا ہے صلاح الدین حیدر کے انشائیوں کی ایک عمدہ تکنیک یہ ہے کہ شروع سے آخر تک طنز و مزاح کی ایک لہر چھائی ہوئی ہے اور بات سے بات نکالتے ہوئے اپنے انشائیوں کو مکمل کرتے ہیں گویا آپ بات سے بات نکالنے پر پورا عبور رکھتے ہیں۔اسی طرح "ثقافت سے حماقت تک"کے انشائیے کا آغاز اس طرز سے کیا گیا ہے جیسے کوئی واقعہ یا کہانی سنانے کا انداز ہو انشائیہ میں رپورتاژ کی تکنیک برتی گئی ہے۔صلاح الدین حیدر کے انشائیوں کا دوسرے مجموعے "ڈر اور ڈراما"کے زیادہ تر انشائیوں میں استعارہ کی تکنیک برتی گئی ہے جس سے ان کے انشائیے زیادہ تر موثر اور پُرکشش دکھائی دیتے ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد قیصر کے سب انشائیوں میں طنز و مزاح کا بھرپور استعمال ہوا ہے۔شہزاد قیصر کے انشائیوں کی تکنیک دبستاں سرگودھا کے انشائیوں سے مختلف ہے ان کے انشائیے بے تکلفانہ انداز سے لکھے گئے ہیں نیز ان کے انشائیوں میں طنز و مزاح کی تازگی کی خوبی بھی پائی جاتی ہے۔ڈاکٹر شہزاد قیصر کا مزاح چٹکلے یا لطیفہ گوئی تک پہنچ جاتا ہے۔وہ اپنے انشائیوں میں خطیب اور مبلغ کے رُوپ میں بھی نظر آتے ہیں وہ اپنے انشائیوں میں خود پر بیتے ہوئے حالات کو بھی بہت عمدگی سے تحریر کرتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں نقطہ آفرینی کی تکنیک بھی موجود ہے۔ان کے زیادہ تر انشائیے سادہ بیانیہ اور کہانی لکھنے کے انداز لکھے گئے ہیں۔انشائیہ "ہم سفر"میں مصنف انشائیہ کا آغاز کہانی سنانے کے انداز سے کرتے ہیں اور اس دوران وہ ماضی کے کسی واقعے کو بھی یاد کرتے ہیں جس میں ہمیں ناسٹالجیا کی تکنیک بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔اور اس تکنیک میں مصنف طنز و مزاح کا ہاتھ تھامے ہی نظر آتے ہیں۔مصنف انشائیے میں ریلوے اسٹیشن کی عمدہ انداز میں تصویر کشی کرتے ہیں۔اس میں پورے اسٹیشن کی گہما گہمی کو دکھایا گیا ہے۔اس میں وقت کی حدیں دور تک نہیں پھیلی ہوئیں بلکہ وقتی تسلسل کے تحت انشائیہ لکھا گیا ہے جس کا انداز بیانیہ ہے۔

ارشد میر اپنے انشائیوں میں زیادہ تر سادہ بیانیہ تکنیک کا استعمال کرتے ہیں اور اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنے انشائیوں میں بیان کرتے ہیں۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے ہاں زیادہ تر بیانیہ انداز اور کہانی سنانے کا انداز یا افسانوی تکنیک زیادہ دکھائی دیتی ہے جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے ہاں تکنیک کے مختلف تجربات دکھائی دیتے ہیں۔

دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے ہاں داخلی تکنیک زیادہ دکھائی دیتی ہے جبکہ دبستان لاہور کے ہاں خارج کی کتھا زیادہ ہے۔ دبستان لاہور اور دبستان سرگودھا کے ہاں ایک افتراق یہ بھی ہے کہ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگار عدم تکمیل کے عنصر کا استعمال کرتے ہیں اور دبستان لاہور کے انشائیہ نگار انشائیے کا نتیجہ، اختتام اور سبق پیش کرتے ہیں اور عدم تکمیل کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ دبستان لاہور اور دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے اشتراکات کی بات کی جائے ان دونوں کے ہاں صیغہ واحد متکلم اور صیغہ واحد غائب کو برتا گیا ہے نیز نکتہ آفرینی کی صفت دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں بخوبی موجود ہے۔

دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں میں زیرِلب تبسم کی خوبی ملتی ہے اور مزاح کی ہلکی سی لہر دیکھنے کو ملتی ہے جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے ہاں معاشرے پر گہرا طنز و مزاح پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں میں داخلی و خارجی انداز کی تکنیک بھی موجود ہے مگر خارج سے زیادہ باطن کی خوبی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں اپنی ذات کے مختلف پرتو سے قاری کو آگاہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں اپنے تجربات و مشاہدات کا استعمال کرتے ہیں جو کہ لاشعوری طور پر ان کی تحریر کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اپنے انشائیوں میں تفصیل سے پرہیز کرتے دکھائی دیتے ہیں اور اختصار کا استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں غیر رسمی طریقہ کار کو اپناتے ہیں اور تازگی کا عنصر بھی ان کا انشائیوں میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں فارسی محاورات، انگریزی الفاظ اور اشعار کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں زیادہ تر صیغہ واحد غائب اور واحد متکلم کا استعمال ہوتا ہے۔ انشائیہ "چرواہا" بھی کہانی کے انداز سے شروع ہوتا ہے مصنف انشائیے کو اپنے پچھلے ہفتے کا تجربہ بتانے سے آغاز کرتے ہیں مصنف کے زیادہ انشائیوں کا آغاز اسی طرز سے ہوا ہے۔ ان کے کچھ انشائیوں میں وقت کی حدود محدود اور کچھ انشائیوں میں لامحدود ہیں۔

غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں میں اختصار کی صفت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ وہ موضوع کے صرف ایک پہلو پر بات کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کی تکنیک غیر رسمی ہے اور عدم تکمیل کی صفت سے ان کے انشائیے قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں اپنی زندگی کے گہرے تجربات اور عمیق مشاہدات کو تکنیک کا

حصہ بناتے ہیں۔ انکشاف ذات ان کے انشائیوں میں نمایاں طور پر جھلکتی نظر آتی ہے۔ ان کے کچھ انشائیوں میں وقت کی حدود کچھ مہینوں اور کچھ ہفتوں تک پھیلی ہوئی ہیں اور کچھ انشائیوں میں وقت کی حدود لا محدود ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں اشعار، کہاوت، مثل اور انگریزی الفاظ کو بھی برتتے ہیں۔

مشتاق قمر زندگی کے ایک پہلو کا انتخاب کر کے اسے شخصیت کا گداز لمس دیتے ہیں جس سے انکشاف ذات کی خوبی پیدا ہوتی ہے جو کہ ایک عمدہ انشائیے کے لیے ضروری ہے۔ ان کے انشائیے عدم تکمیل کے حامل انشائیے ہیں اس میں ایک قسم کی تشنگی باقی رہ جاتی ہے عام طور پر انشائیہ ماضی اور موجودہ وقت سے شروع ہوتا ہے مگر اس کا اختتام اور گرفت ہمیشہ مستقبل پر ہی ہوتی ہے۔ ان کے انشائیوں میں اختصار کی خوبی نہیں ہے بلکہ بے جا طوالت ان کے انشائیوں میں در آئی ہے۔ ان کا طریق غیر رسمی ہے یعنی دوستانہ فضا قائم کر کے انشائیہ لکھتے ہیں۔ مشتاق قمر اپنے انشائیوں میں پرانی تشبیہات اور استعاروں کا سہارا لیتے ہیں وہ لفظوں کا ایک نایاب جال بُنتے ہیں جس سے موضوع خود بخود آگے بڑھتا ہے وہ اپنے انشائیوں میں ادھر اُدھر کی باتیں کر کے بھی انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں مرقع کشی کی خوبی بھی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کے انشائیوں میں تازگی اور شگفتگی در آئی ہے۔ وہ فارسی محاورات، ضرب المثل، اردو تراکیب, مقولے، اشعار اور انگریزی الفاظ کو بھی برتتے ہیں۔

جمیل آزر کے انشائیوں میں اختصار کی خوبی پائی جاتی ہے جو کہ قاری کو فوری تاثر دینے کے لیے کافی ہے۔ جمیل آزر اپنے انشائیوں میں اشعار کے مصروں سے پیوند لگاتے ہیں۔ وہ انشائیوں میں فارسی اور اردو کی تراکیب کا بھی بہت عمدہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ انگریزی الفاظ و محاورات کو بھی بے دریغ برتتے ہیں۔ ان کے مختلف انشائیوں کا انداز رمزیہ اور علامتی بھی ہے وہ اپنے انشائیوں میں خاکہ کشی بھی بہت عمدہ انداز سے کرتے ہیں۔ اکبر حمیدی اپنے انشائیوں کا آغاز استہفامیہ انداز میں کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد مصنف خود ہی جواب دیتے ہیں اور اس کے جواب میں بہت سے پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ اور بہت سی مثالیں اور واقعات کو بیان کر کے انشائیے کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ انشائیے میں تالی بجانے کے مختلف رُخ کو نمایاں کیا گیا ہے۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں میں طنز کی کاٹ اور مزاح کی لہر ساتھ ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے۔ مصنف اپنے انشائیے کی تکنیک میں تاثر پیدا کرنے کے لیے شعر کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ مصنف موضوع کے مختلف زاویوں کو زیر بحث لاتے ہیں اور آخر میں اخلاقی سبق دیتے ہیں اور قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

انشائیہ "اشتہار یا انکشاف" کا پہلا فقرہ میں مصنف اپنی الجھن بتا کر آغاز کرتے ہیں اور قاری کی توجہ حاصل کرنے کے لیے مصنف نے اسے جاذب اور پُر کشش لکھا ہے مصنف انشائیہ میں مختلف شعراء کا ذکر بھی کرتے ہیں

جن میں میر ،اقبال ،غالب، فیض، فراق اور جوش شامل ہیں۔ انشائیہ میں مصنف کسی مصنف کی کتاب پڑھنے کی بجائے اشتہارات پر اکتفا کرنے والوں پر طنز کرتے ہیں گویا پورے انشائیے میں طنز کی لہر دوڑتی نظر آتی ہے۔ مصنف انشائیہ میں واقعات کے ذریعے بھی انشائیہ کو آگے بڑھاتے ہیں اور واقعے میں مکالمہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ اپنے بعض انشائیوں کا آغاز استہفامیہ انداز سے کرتے ہیں۔

مصنف حصول شہرت کے لیے مختلف نسخے بھی دیتے ہیں اور انشائیہ کا اختتام بھی شہرت کی خاطر ایک نسخے سے ہی ہوتا ہے۔ تاہم مصنف کے تمام انشائیوں کی تکنیک تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ملتی جلتی ہے۔ مصنف کے تمام انشائیوں میں طنز و مزاح کی آمیزش دیکھنے کو ملتی ہے اور قریباسب انشائیوں میں شعر دیکھنے کو ملتاہے ان کے انشائیوں میں مقولے، مثل اور محاورات کا استعمال بھی ہوا ہے واقعات، مثالوں اور مشاہدات و تجربات سے انشائیہ کو آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں موضوع کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیتے ہیں کہ ان زاویوں کے خدوخال قاری پر عیاں ہو جاتے ہیں اور قاری ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مشکور حسین یاد کے کچھ انشائیے وقتی تسلسل کے تحت لکھے گئے ہیں اور وہ انشائیوں میں اشعار کا بھی استعمال کرتے ہیں انشائیہ ''آزادی کے درد'' وقتی تسلسل کے تحت لکھا گیا انشائیہ ہے واحد متکلم اور واحد غائب کا استعمال کیا گیا ہے اور انشائیہ کا اختتام سوالیہ انداز میں سوال پوچھ کر کیا گیا ہے سوال پوچھ کر قاری کا تجسس بڑھایا گیا ہے اور جھنجھوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

صلاح الدین حیدر انشائیہ میں اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے اپنی زندگی کے مختلف تجربات اور واقعات کو بیان کرتے ہیں اور واقعہ کے بعد واقعہ بیان کرتے ہیں اور انشائیہ مکمل کرنے اور اپنی بات قارئین کو پہنچانے کے لیے چار پانچ واقعات بیان کرتے ہیں اور معاشرے پر بھی طنزیہ فقرات بھی لکھتے ہیں گویا طنز طرازی سے کام لیتے ہیں ۔صلاح الدین حیدر کے انشائیوں کی ایک عمدہ تکنیک یہ ہے کہ شروع سے آخر تک طنز و مزاح کی ایک لہر چھائی ہوئی ہے اور بات سے بات نکالتے ہوئے اپنے انشائیوں کو مکمل کرتے ہیں گویا آپ بات سے بات نکالنے پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ انشائیے کا اختتام بھی طنز و مزاح سے بھرپور فقرے سے ہوتا ہے۔ انشائیہ ''ڈر اور ڈراما'' کا آغاز میں زندگی کا فلسفہ بیان کر کے قاری کی توجہ انشائیے کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی گئی ہے انشائیہ استعاراتی انشائیہ ہے انشائیے کا آغاز بیانیہ انداز سے ہوتا ہے اس میں واحد متکلم کا بھی استعمال کیا گیا ہے اور مثالیں اور کشفی واقعات بیان کر کے بات کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ مصنف نے انشائیے میں ہیملٹ، پورن بھگت، جولیس سیزر اور سہراب کو معاشرے کے افسردہ لوگوں کے لیے علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر شہزاد قیصر کے انشائیوں میں طنز و مزاح کی تازگی کی خوبی بھی پائی جاتی ہے۔ڈاکٹر شہزاد قیصر کا مزاح چٹکلے یا لطیفہ گوئی تک پہنچ جاتا ہے۔وہ اپنے انشائیوں میں خطیب اور مبلغ کے رُوپ میں بھی نظر آتے ہیں وہ اپنے انشائیوں میں خود پر بیتے ہوئے حالات کو بھی بہت عمدگی سے تحریر کرتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں نقطہ آفرینی کی تکنیک بھی موجود ہے۔شہزاد قیصر اپنے انشائیوں میں اختصار کی خوبی کو اپناتے ہیں ان کے انشائیے خود پر بیتے حالات پر مشتمل ہیں جن میں ان کے خود پر بیتے ہوئے واقعات کو شامل کیا گیا ہے جس کی وجہ سے ان کے انشائیے رپورتاژ کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔کچھ انشائیے بیانیہ انداز میں ہیں جس میں ایک ہی موضوع پر مختلف زاویوں سے تصویریں لی گئیں ہیں دو انشائیے مکالمے اور گفتگوئیں کی ملی جلی تکنیکیں رکھتے ہیں۔گویا ان کی تکنیکیں منفرد ہیں جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔

ارشد میر انشائیے میں فارسی اور اردو محاورے بھی برتتے ہیں۔وہ اپنے انشائیے میں صیغہ واحد غائب اور واحد متکلم کو بخوبی برتتے ہیں وہ ایک بات کو مرکز بنا کر بات کے مختلف رُخ کو صفحہ قرطاس پر بکھیر دیتے ہیں۔وہ انشائیہ مختلف مثالیں دے کر بھی انشائیہ آگے بڑھاتے ہیں۔وہ انشائیوں میں انگریزی الفاظ اور اشعار کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں نکتہ آفرینی اور بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر بخوبی موجود ہے۔اس وجہ سے ان کے انشائیے یکسانیت سے دور ہیں اور قاری کی دلچسپی انشائیے کے ختم ہونے تک موجود رہتی ہے۔تاہم ان کے سب انشائیوں میں طنز کی کاٹ اور مزاح کی لہر موجود ہے ان کے انشائیوں میں مضمون نویسی، خاکہ نویسی اور طنز و مزاح کی حدیں ملی ہوئی ہیں۔انشائیہ "مُوڈ" بھی سادہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے مصنف تہذیب سے بہت سی مثالیں لے کر انشائیہ آگے بڑھاتے ہیں۔وہ تاریخ کی مختلف شخصیات کا ذکر کر کے انشائیہ آگے بڑھاتے ہیں۔وہ ادبی شخصیات کا ذکر بھی کرتے ہیں جن میں غالب، عبدالرحمٰن بجنوری اور حافظ شیرازی وغیرہ شامل ہیں۔مصنف انشائیہ کا اختتام ان الفاظ میں کرتے ہیں جس سے قاری کو ایک نئی سوچ ملتی ہے۔اور انشائیہ کا اختتام سبق آموز بھی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اسم اور فعل، دوسرا کنارہ، مکتبہ اردو زبان سر گودھا،۱۹۸۹ء، ص ۱۱۲

۲۔ ایضاً، واپسی، چوری سے یاری تک، موڈرن پبلشنگ ہاوس دہلی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۷

۳۔ ایضاً، بے ترتیبی مشمولہ خیال پارے، مکتبہ اردازبان سر گودھا،۱۹۶۱ء، ص ۵۱

۴۔ ایضاً، سست روی، خیال پارے، ص ۱۰۴

۵۔ ایضاً، اکلاپا اور تنہائی، دوسرا کنارہ، ص ۱۰۱

۶۔ غلام جیلانی اصغر، سردی، نرم دم گفتگو، بُک لینڈ پبلشرز لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۸۵

۷۔ ایضاً، تسخیر کائنات، نرم دم گفتگو، ص ۲۶

۸۔ سائرہ بتول، پاکستانی انشائیہ نگاروں کے اسالیب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز اسلام آباد، ص ۱۵۶

۹۔ مشتاق قمر، کوہ پیما، ہم ہیں مشتاق، مکتبہ اردو زبان سر گودھا،۱۹۷۰ء، ص ۹۲

۱۰۔ ایضاً، کچھ نیند کی مذمت میں، ہم ہیں مشتاق، ص ۱۴۴

۱۱۔ جمیل آذر، بھوک ہڑ تال، شاخ زیتون، مکتبہ اردو زبان سر گودھا،۱۹۸۱ء، ص ۸۴

۱۲۔ ایضاً، رُت کے مہمان، ریلوے پلیٹ فارم، مکتبہ فکر و خیال لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۱۴

۱۳۔ ایضاً، وقت اے وقت مشمولہ وقت اے وقت، مقبول اکیڈمی اُردو بازار لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۶

۱۴۔ ایضاً، وقت اے وقت، ص ۶۸

۱۵۔ ایضاً، سفر، وقت اے وقت، ص ۵۵

۱۶۔ اکبر حمیدی، رنگ دار شیشے، تتلی کے تعاقب میں، بٹر پبلشرز، اسلام آباد،۲۰۰۳ء، ص ۱۶

۱۷۔ ایضاً، گھنٹہ گھر، جزیرے کا سفر، مکتبہ فکر و خیال، لاہور،۱۹۸۵ء، ص ۱۰۴

۱۸۔ ایضاً، اشتہاروں بھری دیواریں مشمولہ اشتہاروں بھری دیواریں، بٹر پبلشرز، اسلام آباد،۲۰۰۷ء، ص ۱۰۴

۱۹۔ مشکور حسین یاد، کسب زر مشمولہ جوہر اندیشہ، مکتبہ اردو ڈائجسٹ، لاہور ۱۹۷۵ء، ص ۳۸

۲۰۔ ایضاً، عالی ظرفی، بات کی اونچی ذات، اظہار سنز، لاہور،۱۹۸۸ء، ص ۳۰

۲۱۔ نظیر صدیقی، یہ انسان، شہرت کی خاطر، پاک کتاب گھر، ڈھاکہ اول،۱۹۶۱ء، ص ۱۲۲-۱۲۳

۲۲۔ ایضاً، بور، شہرت کی خاطر، ص ۱۰۰

۲۳۔ صلاح الدین حیدر، حماقتیں میرے مقدر کی، مشمولہ حماقتیں میرے مقدر کی، کاروان ادب ملتان،۱۹۷۸ء، ص ۳۶

۲۴۔ ایضاً، جاگیر دار اور بر خو دار مشمولہ ڈر اور ڈراما، کاروان ادب، ملتان،۱۹۸۷ء، ص۴۶

۲۵۔ شہزاد قیصر ،ڈاکٹر، بوریت، آئینہ بنے ہے پیر ہن، لطف آگہی، مکتبہ جمال لاہور، ۲۰۱۴، ص ۱۶۳

۲۶۔ کلیر نس سیل، وقت ناوقت، لطف آگہی عبارات، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۲۴۔ ۲۵

۲۷۔ آئینہ بنے ہے پیر ہن، دھیان، لطف آگہی، ص ۱۸۵

۲۸۔ شہزاد قیصر ،ڈاکٹر، لطف آگہی مشمولہ لطف آگہی، ص ۲۰۵

۲۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، موڑ (ارشد میر)، موڑ، ادارہ فروغ اردو، لاہور ۱۹۸۹ء، ص ۱۲

۳۰۔ ایضاً، چرواہا، سمندر اگر میرے اندر گرے، مکتبہ اردو زبان سر گودھا،۱۹۸۹ء، ص ۲۶

۳۱۔ چوری سے یاری تک مشمولہ چوری سے یاری تک، ص ۱۱

۳۲۔ محمد اسد اللہ، انشائیہ کی روایت مشرق اور مغرب کے تناظر میں، ماڈرن پرنٹ ناگپور، ۲۰۱۵، ص ۲۳۱

۳۳۔ غلام جیلانی اصغر، غیر ذمہ داری، نرم دم گفتگو، ص ۶۶

۳۴۔ جمیل آذر، انشائیہ اور انفرادی سوچ، نقش گر پبلیکیشنز راولپنڈی، ۲۰۰۴، ص ۴۷

۳۵۔ ایضاً، اپالو ٹریجڈی، ہم ہیں مشتاق، ص ۱۳۱

۳۶۔ ایضاً، بر ساتی مشمولہ وقت اے وقت، ص ۷۷

۳۷۔ ایضاً، نیم پلیٹ مشمولہ شاخ زیتون، ص ۵۶

۳۸۔ ایضاً، شاید میں بر ومائیڈ ہوں، وقت اے وقت، ص ۶۱

۳۹۔ اکبر حمیدی، پھولوں میں گرا کانٹا مشمولہ اشتہاروں بھری دیواریں، ص ۸۷

۴۰۔ ایضاً، گالی دینے والے کی حمایت میں، جزیرے کا سفر، مکتبہ فکر وخیال لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۶۲

۴۱۔ مشکور حسین یاد، خود غرضی، بات کی اونچی ذات، اظہار سنز، ۱۹۸۲ء، ص ۹۸

۴۲۔ ایضاً، منافق، جوہر اندیشہ، مکتبہ اُردو ڈائجسٹ لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۷۵

۴۳۔ ایضاً، فتح وشکست، بات کی اُنچی ذات، ص ۶۴

۴۴۔ نظیر صدیقی، جہاں میں رہتا ہوں مشمولہ شہرت کی خاطر، پاک گھر کتاب، ڈھاکہ، اول، ۱۹۶۱ء، ص ۵۴

۴۵۔ ایضاً، مستقبل کا ادیب، شہرت کی خاطر، ص ۱۵۹

۴۶۔ صلاح الدین حیدر ، نشئی، ڈر اور ڈراما، ص ۵۳

۴۷۔ ایضاً، بیان منافقت کا، حماقتیں میرے مقدر کی، کاروان ادب ملتان، ۱۹۷۸ء، ص ۴۷

۴۸۔ قیصر شہزاد، ڈاکٹر، قرض کی پیتے ہیں مے، لطف آگہی، ص ۴۳

۴۹۔ ارشد میر، دھوتی، موڈ، ص ۴۵

۵۰۔ ایضاً، آنسو، موڈ، ص ۱۰۷

۵۱۔ وزیر آغا، ڈبویا مجھ کو ہونے نے، خیال پارے، ص ۶۷

۵۲۔ غلام جیلانی اصغر، وراثت، نرم دم گفتگو، ص ۱۵۷

۵۳۔ ایضاً، وراثت، ص ۱۵۸

۵۴۔ مشتاق قمر، بیٹھنا، ہم ہیں مشتاق، ص ۳۶

۵۵۔ جمیل آزر، ہائیڈ پارک، رت کے مہمان، مقبول اکیڈمی، ص ۵۹

۵۶۔ ایضاً، شاخ زیتون، ص ۵۲

۵۷۔ اکبر حمیدی، خالی گیراج، پہاڑ مجھے بلاتا ہے، ص ۱۲

۵۸۔ ایضاً، پھولوں میں گھرا کانٹا، اشتہاروں بھری دیواریں، ص ۸۷

۵۹۔ مشکور حسین یاد، خوشی، جوہر اندیشہ، ص ۶۵

۶۰۔ نظیر صدیقی، یہ انسان، شہرت کی خاطر، ص ۱۲۳-۱۲۴

۶۱۔ ایضاً، غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد، شہرت کی خاطر، ص ۱۹۲-۱۹۳

۶۲۔ صلاح الدین حیدر، جاگیر دار اور برخودار، ڈر اور ڈراما، ص ۴۸

۶۳۔ ایضاً، تذکرہ جنوں کا، حماقتیں میرے مقدر کی، ص ۹۷

۶۴۔ قیصر شہزاد، ڈاکٹر، زبان، کلیئرنس سیل، لطف آگہی، ص ۵۰

۶۵۔ ایضاً، نقاد، صاف چھپتے بھی نہیں، لطف آگہی، ص ۱۱۲

۶۶۔ وزیر آغا، ٹھنڈا ابر ف ہات، دوسرا کنارہ، ص ۶۳

۶۷۔ ایضاً، کچھ خوبصورتی کے بارے میں، خیال پارے، ص ۱۰۱

۶۸۔ غلام جیلانی اصغر، نرم دم گفتگو، تسخیر کائنات، ص ۲۵

۶۹۔ ایضاً، غیر ذمہ دار، نرم دم گفتگو، ص ۶۷

۷۰۔ مشتاق قمر، کوہ پیمائی، ہم ہیں مشتاق، ص ۸۹

۷۱۔ ایضاً، بھول جانا، ہم ہیں مشتاق، ص ۱۱۲

۷۲۔ جمیل آزر، شاخ زیتون مشمولہ شاخ زیتون، مقبول اکیڈمی لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۳۷

۷۳۔ ایضاً، وقت اے وقت مشمولہ وقت اے وقت مقبول اکیڈمی لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۲۵

۷۴۔ اکبر حمیدی، خزاں، جزیرے کا سفر، ص ۵۷

۷۵۔ ایضاً، مچھلیوں بھرے تالاب، پہاڑ مجھے بلاتا ہے، ص ۶۳

۷۶۔ مشکور حسین یاد، پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے، وقت کا استعارہ، ص ۱۸۶

۷۷۔ ایضاً، ہرجائی، جوہر اندیشہ، ص ۱۲۲

۷۸۔ ایضاً، ناجائز تعلقات، جوہر اندیشی، ص ۹۸

۷۹۔ نظیر صدیقی، دوست اور دوستی، شہرت کی خاطر، ص ۸۵، ۸۴

۸۰۔ ایضاً، شہرت کی خاطر، ص ۱۲

۸۱۔ صلاح الدین حیدر، قصہ انقلابی شوہر کا، حماقتیں میرے مقدر کی، ص ۹۳

۸۲۔ باتیں نیند اور خوابوں کی، حماقتیں میرے مقدر کی، ص ۳۳

۸۳۔ صلاح الدین حیدر، انقلابی والد بزرگوار، ڈر اور ڈراما، ص ۱۱۴

۸۴۔ قیصر شہزاد، ڈاکٹر، رقیب، آئینہ بنے ہے پیرہن، لطف آگہی، ص ۱۵۷

۸۵۔ ایضاً، موسم، لطف آگہی، ص ۱۱۵

۸۶۔ ارشد میر، موڈ، مشمولہ موڈ، ص ۵۶

۸۷۔ وزیر آغا، ریلوے ٹائم ٹیبل، خیال پارے، مکتبہ اردو زبان لاہور، ۱۹۸۴، ص ۴۵

۸۸۔ ایضاً، نروان، سمندر اگر میرے اندر گرے، مکتبہ فکر و خیال لاہور، ۱۹۸۹، ص ۸۳

۸۹۔ غلام جیلانی اصغر، عادت، نرم دم گفتگو، ص ۱۴۶

۹۰۔ ایضاً، گالی دینا، نرم دم گفتگو، ص ۱۶۵

۹۱۔ ایضاً، سردی، نرم دم گفتگو، ص ۸۷

۹۲۔ مشتاق قمر، ہم ہیں مشتاق، ص ۱۱۵

۹۳۔ ایضاً، بال کٹوانا، ہم ہیں مشتاق، ص ۳۹

۹۴۔ جمیل آزر، شاخ زیتون، مقبول اکیڈمی لاہور، ۲۰۱۵، ص ۵۶

۹۵۔ ایضاً، سنہری شاخ، شاخ زیتون، ص ۱۰۸

۹۶۔ اکبر حمیدی، کورا کاغذ، اشتہار بھری دیواریں، ص ۶۱

۹۷۔ ایضاً، درمیانی منزل، جزیرے کا سفر، ص ۴۴

۹۸۔ ایضاً، مشورہ، تتلی کے تعاقب میں، ص ۶۵

۹۹۔ مشکور حسین یاد، تنہائی، جوہر اندیشہ، ص ۵۱

۱۰۰۔ مشکور حسین یاد، اطمینان، جوہر اندیشہ، ص ۱۴۶

۱۰۱۔ ایضاً، آشوب آگہی، وقت کا استعارہ، ص ۴۵

۱۰۲۔ نظیر صدیقی، جہاں میں رہتا ہوں، شہرت کی خاطر، ص ۵۶

۱۰۳۔ شہرت کی خاطر، بیٹھے بٹھائے شہرت کی خاطر، ص ۱۴۴

۱۰۴۔ نظیر صدیقی، بور، شہرت کی خاطر، ص ۹۳

۱۰۵۔ صلاح الدین حیدر، قصہ شرافت کا، حماقتیں میرے مقدر کی، ص ۵۶

۱۰۶۔ ایضاً جاگیر دار اور برخودار، حماقتیں میرے مقدر کی، ص ۷۷

۱۰۷۔ شہزاد قیصر، ڈاکٹر، قرض کی پیتے تھے ے، کلیرنس سیل، لطف آگہی، ص ۷۵

۱۰۸۔ ایضاً، ڈاکٹر، مصوری، آئینہ بنے ہے پیرہن، لطف آگہی، ص ۱۶۴

۱۰۹۔ قیصر شہزاد، ڈاکٹر، پنشن خوار، لطف آگہی، ص ۱۲۳

۱۱۰۔ معین الرحمٰن، سید، ڈاکٹر، حرفے چند، قیصر شہزاد، ڈاکٹر، لطف آگہی، ص ۲۲

۱۱۱۔ ارشد میر، کڑھنا، موڈ، ص ۲۳

۱۱۲۔ احسن فاروقی، محمد، "فکشن اور تکنیک" مشمولہ سیپ، کراچی، شمارہ ۲۹،۱۹۶۳ء، ص ۱۹۳

۱۱۳۔ ارسطو بوطیقا (ترجمہ) عزیز احمد۔ درد اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۵، ص ۴۷

۱۱۴۔ قاموس الاصطلاحات، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، طبع دوم، ۱۹۸۲، ص ۸۵۷

۱۱۵۔ English dictionary,No.1 Publishing Co.united,London page 415

۱۱۶۔ Oxford Advancedlearner,s dictionary of current English",A.S hon by Oxford University press,1991,4th edition.Page 1319.

۱۱۷۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، ناولٹ کی تکنیک مشمولہ نقوش، کراچی شمارہ ۲۰۰، ۱۹ اپریل ۱۹۵۲، ص ۳۶

۱۱۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، دوسرا کنارہ ص ۸۴

۱۱۹۔ مسعود انور، انشائیہ کی تکنیک مشمولہ اُردو زبان، انشائیہ نمبر، ۱۹۸۳، ص ۶۴

۱۲۰۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، خیال پارے، ص ۱۳

۱۲۱۔ انشائیہ اردو ادب میں، انور سدید، ڈاکٹر، مکتبہ فکر و خیال لاہور، ص ۸۸

۱۲۲۔ ممکنات انشائیہ مشکور حسین یاد، مکتبہ جدید پریس لاہور، ص ۱۴۲

۱۲۳۔ ایضاً، ص ۸۰

۱۲۴۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، بحوالہ، اختلاف، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، ۱۹۷۵ء، ص ۹۶

۱۲۵۔ سیاح، ۲۱ چوری سے یاری تک، ص ۲، ۲۲

۱۲۶۔ کچھ رشتے داروں کی شان میں، چوری سے یاری تک، ص ۹۷

۱۲۷۔ ایضاً، ص ۹۸

۱۲۸۔ کچھ خوبصورتی کے بارے میں، خیال پارے، ص ۹۷

۱۲۹۔ موڑ، خیال پارے، ص ۱۰۹

۱۳۰۔ سائیسی علم دریاؤ، دوسرا کنارہ، ص ۱۲۳

۱۳۱۔ چرواہا، سمندر اگر میرے اندر گرے، ص ۳۱

۱۳۲۔ انور سدید، پیش لفظ، نرم دم گفتگو، بک لینڈ پبلیشرز بک سیلرز، لاہور، ۱۹۹۶، ص ۱۶

۱۳۳۔ غلام جیلانی اصغر، تسخیر کائنات مشمولہ نرم دم گفتگو، بک لینڈ پبلشرز و بک سیلرز، لاہور، ۱۹۹۶، ص ۲۹

۱۳۴۔ ایضاً، مکان بنانا، نرم دم گفتگو، ص ۳۱

۱۳۵۔ ایضاً، چہرے، نرم دم گفتگو، ص ۵۲

۱۳۶۔ ایضاً، مرزا غالب----زندگی کی ساتویں جہت، ص ۱۵۷

۱۳۷۔ ایضاً، شہرت کی مخالفت میں، ص ۱۵۰

۱۳۸۔ ایضاً، اپالو ٹریجڈی، ص ۱۳۱

۱۳۹۔ جمیل آزر، رت کے مہمان مشمولہ رُت کے مہمان، ص ۲۶

۱۴۰۔ ایضاً، واشنگ مشین، شاخ زیتون، ص ۲۷

۱۴۱۔ ایضاً، مار کو پولو، شاخ زیتون، ص ۴۹

۱۴۲۔ ایضاً، آپ کا کیا خیال ہے، وقت اے وقت، ص ۵۲

۱۴۳۔ ایضاً، تیرے جانثاروں کو سلام، وقت اے وقت، ص ۱۲۲

۱۴۴۔ ایضاً، رُت کے مہمان مشمولہ رُت کے مہمان، ص ۴۱

۱۴۵۔ اکبر حمیدی، نیگٹیو پازیٹو، جزیرے کا سفر، ص ۳۷

۱۴۶۔ ایضاً، کامیابی، جزیرے کا سفر، ص ۱۲۵

۱۴۷۔ ایضاً، اشتہاروں بھری دیواریں، ص ۱۰۳

۱۴۸۔ ایضاً، کبھی ہم لااُبالی تھے، اشتہاروں بھری دیواریں، ص۴۹

۱۴۹۔ ایضاً، دہشت گردی، پہاڑ مجھے بلاتا ہے، ص۳۰

۱۵۰۔ نظیر صدیقی، شہرت کی خاطر، ص۲۵

۱۵۱۔ ایضاً، دوست اور دوستی، شہرت کی خاطر، ص۷۵

۱۵۲۔ ایضاً، پدرم فقیر بود، شہرت کی خاطر، ص۱۰۲

۱۵۳۔ ایضاً، فقیر پدرم بود، شہرت کی خاطر، ص۱۰۸

۱۵۴۔ ایضاً، بیٹھے بٹھائے، شہرت کی خاطر، ص۲۴

۱۵۵۔ ایضاً، شہرت کی خاطر، ص۲۶۹

۱۵۶۔ مشکور حسین یاد، راز کی بات، وقت کا استعارہ، ص۱۷

۱۵۷۔ ایضاً، لے سانس بھی آہستہ، جوہر اندیشہ، ص۱۱۴

۱۵۸۔ ایضاً، ناجائز تعلقات، جوہر اندیشہ، ص۹۴

۱۵۹۔ ایضاً، ناجائز تعلقات، جوہر اندیشہ، ص۹۸

۱۶۰۔ ایضاً، عمر طبعی،، جوہر اندیشہ، ص۱۳۴

۱۶۱۔ ایضاً، ہوس، جوہر اندیشہ، ص۱۳۹

۱۶۲۔ ایضاً، کتاب، جوہر اندیشہ، ص۱۵

۱۶۳۔ ایضاً، سر کے بل، جوہر اندیشہ، ص۷۹

۱۶۴۔ صلاح الدین حیدر، ثقافت سے حماقت تک، حماقتیں میرے مقدر کی، ص۱۳۸

۱۶۵۔ ایضاً، قصہ عظیم بننے کا، حماقتیں میرے مقدر کی، ص۱۲۰

۱۶۶۔ ایضاً، قصہ جھگڑالو کا، حماقتیں میرے مقدر کی، ص،۱۰۵

۱۶۷۔ فیض عابد عمیق، طرفداریاں (دیباچہ) ڈر اور ڈراما، کاروان ادب، ملتان ۱۹۸۷، ص۱۱

۱۶۸۔ شہزاد قیصر، ڈاکٹر، گھر کی تلاش، کلیرنس سیل، لطف آگہی، ص۳۳

۱۶۹۔ ایضاً، بسنت، صاف چھپتے بھی نہیں، لطف آگہی، ص۹۴

۱۷۰۔ ایضاً، آنکھ مچولی، صاف چھپتے بھی نہیں، لطف آگہی، ص۱۲۳

۱۷۱۔ ایضاً، ماتحتی، لطف آگہی، ص۲۱۸۔۲۱۹

۱۷۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، موڑ، ۱۳، ۱۲

۱۷۳۔ ارشد میر، دھوتی، موڑ، ص ۱۸

۱۷۴۔ ایضاً، مُوڑ مشمولہ موڑ ص ۳۷

۱۷۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، دوسرا کنارہ ص ۸۴

۱۷۶۔ مشکور حسین یاد، ممکنات انشائیہ، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۵

۱۷۷۔ ایضاً، ممکنات انشائیہ، ص ۱۴۲

باب پنجم:

مجموعی جائزہ، نتائج، سفارشات

الف۔ مجموعی جائزہ:

انشائیہ اُردو ادب کی اہم نثری صنف ہے۔ اس کا شمار اُردو ادب کی نوخیز صنف میں ہوتا ہے۔ اگر ہم قدیم اردو ادب کا جائزہ لیں تو اس صنف کے کچھ ابتدائی نقوش قدیم اردو نثر میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ مگر اُس وقت بھی انشائیہ کی طرف سنجیدگی سے کوئی پیش قدمی نہیں کی گئی۔ سر سید سے قبل ہمیں اردو نثر میں جو انشائیہ کے نقوش دیکھنے کو ملتے ہیں وہ اتفاقی اور غیر شعوری طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ عہد سر سید میں مختلف ادباء انگریزی ادب کی طرف راغب ہوئے اور اس طرح اردو میں بھی انگریزی طرز کے مضامین لکھے جانے لگے۔ جس کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں ہوا بایں ہمہ یہ صنف مغرب کی ہی پیداوار ہے۔ اور مغرب کی پیروی کے بعد اس کے تصورات مشرق میں بھی واضح ہوئے ہیں اس وجہ سے مشکور حسین یاد نے اسے امکانی صنف اور ام الاصناف کہا ہے اور بعض محققین انشائیہ کی صنف کا آغاز ملا وجہی کی نثری صنف سب رس سے جوڑتے ہیں۔

انشائیہ کا لفظ انشاء سے نکلا ہے۔ اور انشاء کے لغوی معنی "پیدا کرنے" کے ہیں۔ انشاء عربی زبان کا لفظ ہے۔ اور اس کے معنی تحریر، دل سے بات پیدا کرنا، طرز تحریر، صنائع بدائع، انداز بیان کے ہیں۔ انگریزی میں انشائیہ کو Essay کہا جاتا ہے اور Essay کا لفظ فرانسیسی زبان کے لفظ Essai سے نکلا ہے تاہم سعی اور انشاء دونوں ہی عربی زبان کے الفاظ ہیں سعی کے معنی "کوشش کرنے" کے ہیں تاہم Essai کا لفظ فرانسیسی کا لفظ نہیں بلکہ یونانی سے فرانسیسی میں آیا ہے اگر اس بات پر تحقیق کی جائے تو جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جنوبی فرانس پر عرب والوں کی تہذیب و ثقافت اور زبان نے نمایاں اثر کیا اور اس وجہ سے فرانسیسی زبان میں اس کے واضح اثرات ملتے ہیں۔ تاہم انشاء کا لفظ (نشا) سے نکلا ہے۔ جس کے معنی "پیدا کرنے" کے ہیں اور جب فارسی زبان رائج ہوئی تو عربی زبان کا یہ لفظ زبان زد عام ہو گیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر انشائیہ کو ذہن کی تخلیق کہتے ہیں اور اسے مکمل طور پر دماغ کی تخلیقی سرگرمی کہتے ہیں۔ مقالے کے پہلے باب میں انشائیہ کے متعلقات، انشائیہ کے اسلوب اور تکنیک کو زیر بحث لایا گیا ہے نیز تقابل کے اصول اور دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کا مختصر تعارف بیان کیا گیا ہے اگرچہ دونوں دبستانوں کے انشائیہ نگاروں کا موضوعات، تکنیک اور اسلوب میں اشتراکات کے ساتھ ساتھ واضح فرق بھی موجود ہے اور انشائیہ نگار انشائیہ کی تعریف بھی اپنے انداز سے کرتے ہیں۔

اس طرح غلام جیلانی اصغر انشائیہ کے بارے میں رقمطراز کرتے ہیں:

"انشائیہ ایک ایسی نثری صنف ہے جو اتنی ہی بے ربط ہے جتنی کہ زندگی خود اور جس طرح زندگی کے آخر میں حیاتیاتی وحدت وجود میں آتی ہے اسی طرح انشائیہ کے منتشر اجزاء میں دیکھتے ہی دیکھتے ایک وحدت تاثر پیدا ہو جاتی ہے۔زندگی خود کئی اجزاء سے عبارت ہے۔انشائیہ کی یہی خوبی اور خصوصیت ہے یہ اجزائے فکری بھی ہوتے ہیں اور جذباتی بھی یعنی انشائیہ سوچنے پر بھی مجبور کرتا ہے اور محسوسات کے وسیع امکانات بھی چھوڑ جاتا ہے۔جب آپ انشائیہ ختم کر لیتے ہیں تو آپ کی سوچ کو ایک نیا اور غیر رسمی سازاویہ مل جاتا ہے۔"[1]

اگر ہم انشائیہ کے بارے میں سب مصنفین کی تعریفوں کا جائزہ لیں تو ان میں مغربی ادباء و ناقدین کے خیالات کی ہی ترجمانی ملتی ہے۔اردو انشائیہ میں اختلاف کبھی کھل کر سامنے نہیں آیا اور یہ اختلاف ہمیں جزئیات کا اختلاف لگتا ہے۔انشائیہ میں اختلاف کے بہت سے اسباب ہیں۔ اس میں انشائیہ کو الگ صنف کے طور پر ماننا، اس کے فن و اسلوب میں اختلاف اور حدود اربعہ کا اختلاف شامل ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر اور ان کے پیرو کاروں سے ان کا نکتہ نظر واضح نظر آتا ہے۔تاہم مشکور حسین یاد کی تعریف مختلف ہے اور انشائیہ کو وہ ام الاصناف کہتے ہیں۔اور ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے یہ ہے کہ انشائیہ کی تمام نثری اصناف میں جہاں جہاں انشائی عناصر ملتے ہیں اسے انشائیہ کہتے ہیں۔ نظیر صدیقی طنز و مزاح اور سنجیدگی جیسے تضاد عناصر میں توازن رکھنے کے حق میں ہیں۔[11]انشائیہ نگاروں کے اسی اختلافات کے باعث دو گروہ ابھرے جس گروہ نے وزیر آغا کے انشائیوں کے مقتضیات کی پیروی کی اسے دبستان سرگودھا کہا جاتا ہے اور جس گروہ نے ڈاکٹر سلیم اختر، مشکور حسین اور نظیر صدیقی کے انشائیوں کے بنائے ہوئے اصولوں کی پیروی کی یہ گروہ دبستان لاہور کہلاتا ہے۔دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں میں درج ذیل انشائیہ نگار شامل ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، مشتاق قمر، جمیل آزر، اکبر حمیدی، حنیف باوا، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، شفیع ہمدم، منور عثمانی، خالد اقبال، حیدر قریشی، ناصر عباس نیر، بشیر سیفی، جان کاشمیری، حامد برگی، امجد طفیل، انور سدید، ڈاکٹر محمد اسد اللہ، اے غفار پاشا، اندر جیت لال، جاوید وششٹ، جوگندر پال، اظہر ادیب، شاہد شیدائی، محمد یونس بٹ، پروین طارق، خیر الدین انصاری، انجم انصار، تقی حسین خسرو، جاوید حیدر جوئیہ، راحت بھٹی، محمد اقبال انجم، قمر اقبال، عامر عبداللہ، رعنا تقی، سعشہ خان، عطیہ خان، انجم نیازی، ایس ایم معین قریشی، مشتاق احمد، منیزہ جمال، خادم حسین مجاہد، اظہر حسن صدیقی، قاضی اعجاز محور، افتخار قیصر، طارق جامی، خالد پرویز صدیقی، کے ایم اشرف، عاصی کرنالی، جاوید انور، زہرہ جبیں، راجہ ریاض الدین، رب نواز مائل، محمود شام، کامل قادری، مختار پارس اور میاں مقبول احمد وغیرہ شامل ہیں۔

دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں درج ذیل انشائیہ نگار شامل ہیں۔ مشکور حسین یاد، نظیر صدیقی، جسٹس رستم کیانی، احمد جمال پاشا، رام لعل نابھوی، صلاح الدین حیدر، ڈاکٹر شہزاد قیصر، ارشد میر، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر محمد سلیم ملک، سلیمان بٹ، حسرت کاسگنجوی، شکیلہ رفیق، محمد بصیر رضا، یوسف ناظم، معین اعجاز، محمد حسن، رشید احمد گوریچہ اور اقبال ساغر صدیقی وغیرہ شامل ہیں۔

زیر نظر تحقیقی مقالے میں دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کا تقابل کیا گیا ہے اس لیے تقابل کے اصولوں کی پیروی بھی کی گئی ہے۔ تقابل کو انگریزی میں comparative کہتے ہیں اور تقابلی مطالعہ کو انگریزی میں comparative studies کہتے ہیں جس میں ہم دو علوم یا دو اشیاء میں سے اشتراکات یا افتراقات کو ڈھونڈ کر اس کا باقاعدہ معیار مقرر کرتے ہیں۔ سوزن بیسنیٹ تقابل کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

> "تقابلی ادب مختلف ثقافتوں کے متون کا مطالعہ ہے۔ ایک کثیر العلمی مضمون ہے۔ جس کا تعلق زمان اور مکان کے بُعد میں پیدا ہونے والے ادب کے درمیان رشتوں کے نقوش کے متعلق ہے۔"[۲۰]

تاہم تقابلی مطالعہ میں ایسی ادبی تحریروں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ جس میں دو مختلف تہذیبوں کے اشتراکات و اختلافات کا جائزہ لیا جاتا ہے اور اس میں زبان، لوگوں کا مزاج اور رویے وغیرہ شامل ہیں۔ اگر تقابل کے طریقہ کار پر بات کی جائے تو تقابل کا کوئی خاص طریقہ کار نہیں ہوتا تاہم مقالے میں دونوں دبستانوں کے انشائیہ نگاروں کے اشتراقات و افتراقات کو واضح کرنے کے لیے بیانیہ تقابل اور تعین قدر کے طریقے کو آزمایا گیا ہے۔ اس ضمن میں تجزیاتی، دستاویزی اور تقابلی طریقہ کار زیادہ معاون ثابت ہوا ہے۔ اگرچہ مقالے میں اردو انشائیے کے دو دبستانوں کے انشائیہ نگاروں کے فکری، اسلوبیاتی، موضوعاتی اور تکنیکی زاویوں کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ مقالے کے دوسرے باب میں دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا فکری تقابل کیا گیا ہے تاہم اگر دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا فکری تقابل کیا جائے تو دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کی انشائیہ نگاری میں داخلی کیفیات کو شامل کیا گیا ہے اور وہ اپنی ذات کے کشفی پہلوؤں کو انشائیہ میں بڑی چابکدستی سے سمو دیتے ہیں تاہم انکشاف ذات دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کی بنیادی خوبی ہے۔ اس کے برعکس دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں نے اپنی خارجی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کو بھی اپنے انشائیوں میں سمو دیا ہے۔

دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے ہاں فطرت کے عناصر پائے جاتے ہیں سرگودھا کے مصنفین فطرت سے گہرا ربط رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا فطرت کے ساتھ دھیرے دھیرے چہل قدمی کرتے ہیں۔ وہ فطرت

کا گھونگٹ یکدم نہیں اٹھاتے بلکہ آہستہ آہستہ دلدوز انداز میں چاک کرتے ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا فطرت کے ساتھ گویا من اور تو کا سا تعلق رکھتے ہیں۔وہ اپنی آنکھوں سے فطرت کو دیکھتے ہیں تاہم وہ فطرت سے روحانی سا تعلق رکھتے ہیں۔وہ ان مناظر سے تعلق جوڑ کر پیغامات بھی حاصل کرتے ہیں اور اپنے باطن میں اُتارتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس سے معنی کا نیا جہان سامنے آتا ہے۔ تاہم دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں نے اپنے انشائیوں میں فطرت کے موضوع کو زیر بحث نہیں بنایا بلکہ زندگی کے تلخ حقائق کے طنزیہ و مزاحیہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

دبستان سرگودھا کے انشائیے مثبت انداز میں لکھے گئے ہیں اور زندگی کے روشن پہلوؤں کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے غمگین، دکھ اور سنجیدہ پہلوؤں میں امید کی کرن سے ہمیں روشناس کرواتے ہیں اور ان کا لہجہ رجائیت سے بھرپور ہے۔ جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں سے نظیر صدیقی اور مشکور حسین کے انشائیوں میں قنوطیت اور ناامیدی پائی جاتی ہے۔ تاہم نظیر صدیقی خود اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے انشائیوں کا اصل محرک غم و غصہ ہے اور زمانے کی ناقدری کا احساس ان کی تحریروں میں در آیا ہے اسطرح اداسیاں، زمانے کی سرد مہریاں اور محرومیاں مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں ان کے انشائیوں میں موجود ہیں اور اس کی وجہ معاشرے اور دنیا کا ان سے برتاؤ ہے۔ تاہم مشکور حسین یاد معاشرے کے المناک حادثات اور برائیوں سے آگاہ ہیں اس لیے وہ سماج سے خوفزدہ دکھائی دیتے ہیں اور بعض جگہوں پر ان کا لہجہ ناامیدی، کلبیت اور قنوطیت سے بھرپور نظر آتا ہے۔ صلاح الدین حیدر کی ابتدائی تحریریں تلخی اور کڑواہٹ سے بھرپور ہیں اور ان کو دیکھ کر ہجر گوئی کا احساس ہوتا ہے مگر ان کے بعد کے انشائیے پڑھنے سے روحانی خوشی محسوس ہوتی ہے اور قاری اس سے ذہنی تشفی بھی محسوس کرتا ہے جبکہ شہزاد قیصر کا رویہ رجائیت سے بھرپور ہے حتّٰی کے بعض جگہوں پر ہمیں مزاح حد سے بڑھا ہوا بھی دکھائی دیتا ہے تاہم ارشد میر کے انشائیوں کا انداز بھی مثبت اور رجائی ہے۔

اس طرح نظیر صدیقی ایسے ادیب ہیں جو کہ کسی ادبی تحریک میں کبھی شامل نہ ہوئے اور نہ ہی کسی تحریک کے نظریات پر عمل پیرا ہوئے آغاز میں آپ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے مگر وہ اس کے حصار میں کبھی نہیں آئے بلکہ آپ جدیدیت اور ترقی پسندوں کے ناقد تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا بھی ابتداء میں ترقی پسند تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں اور ان کی ابتدائی تحریروں اور نظموں میں اس کے نقوش دیکھے بھی جاسکتے ہیں۔اس طرح صلاح الدین حیدر بھی ترقی پسند تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔

دبستان سرگودھا کے انشائیے کے موضوعات میں بہت تنوع اور رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں میں بھی تنوع کی خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ عام زندگی سے اپنے انشائیوں کے موضوعات کو منتخب کرتے

ہیں۔وزیر آغا قدیم داستانوی ادب اور قدیم اردو ادب سے بھی متاثر ہو کر اپنے انشائیوں کے عنوانات منتخب کرتے ہیں وہ اپنے بعض انشائیوں میں صوفی اور ویدانتی روپ میں بھی نظر آتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں تہذیبی اور تاریخی شعور کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔اس طرح انہوں نے ہر قسم کے موضوعات پر قلم اٹھایا ان کے کچھ انشائیوں میں کیفیات پائی جاتی ہیں۔کچھ خاص اور عام چیزوں کے عنوانات سے اخذ کیے گئے ہیں۔کچھ فعل مصدر کی صورت میں ہیں۔کچھ انشائیے افسانوی طرز کے ہیں اور کچھ عنوانات مظاہر فطرت کی عکاسی کرتے ہیں۔وہ فطرت کی عکاسی کرتے ہوئے دیہات کو بھی موضوع بناتے ہیں۔وہ زندگی کی تلخ اور کڑوی حقیقتوں کے مرقعے خوش باش طریقے سے کھینچتے ہیں۔وہ اپنی سوچ، فکر اور نظریات کا انخلاء کرتے ہیں۔وزیر آغا کے انشائیوں میں تقابل کی خوبی کثرت سے ملتی ہے اور اسکی مثال انشائیہ "حقہ پینا" ہے۔تاہم مصنف ذاتی و شخصی تجربے کے ساتھ اجتماعی مشاہدات و تجربات کو بھی اپنے انشائیوں میں شامل کرتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں پاکستانیت عمدہ انداز سے بیان کی گئی ہے۔ان کے انشائیوں میں مقصدیت اور فلسفہ موجود نہیں ہے۔وزیر آغا کے انشائیوں میں قدیم داستانوں کے اثرات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ان کے کچھ انشائیوں کے مضامین صوفیانہ مضامین اور ویدانت پر بھی ہیں۔آپ نے معاشرتی اور تہذیبی مسائل پر بھی قلم اٹھایا۔انہوں نے زندگی کے ہر پہلو سے اپنے مضامین کا انتخاب کیا ہے۔وہ قدیم داستانوی ادب سے بھی اپنے انشائیوں کو آراستہ کرتے ہیں۔ان کے انشائیے گہری فکر اور سوچوں سے لبریز ہیں۔ان کے ہاں فلسفیانہ موضوعات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کے موضوعات غیر معمولی ہیں انہوں نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا جن پر پہلے قلم نہیں اٹھایا گیا ان کے انشائیوں کے موضوعات غیر روایتی ہیں اور ان کی اپنی ایک انفرادیت ہے اور وہ ہمیشہ منفرد اور نیا موضوع تلاش کر کے اس پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ غلام جیلانی اصغر کے انشائیے پڑھنے سے فکر کا کوئی نیا پہلو اجاگر ہوتا ہے اس طرح ان کے انشائیوں میں سوچ و فکر کی گہرائی موجود ہے۔انشائیہ "تسخیر کائنات" میں مصنف خود کو کائنات سے تعبیر کر کے انکشاف ذات کے ایک انوکھے پہلو کو پیش کیا ہے۔ان کے انشائیوں میں فکر کی رو کناروں کے اندر سفر کرنے کی بجائے کھلے میدان میں سفر کرتی ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔ان کے انشائیوں میں سوچنے کا انداز ایک ہلکی سی لکیر کی مانند ہے ان کے ہاں زندگی کا گہرا فلسفہ موجود نہیں ہے۔وہ اپنے انشائیوں میں دلائل دینے کی بجائے سادہ انداز سے اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہیں۔وہ زندگی کے اُتار چڑھاؤ اور تضادات و مشترکات سے مواد اخذ کرتے ہیں۔

مشتاق قمر عام زندگی اور معاشرے سے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں وہ معمولی موضوعات کے اندر داخل ہو کر نئے معنی دریافت کرتے ہیں انہوں نے عام موضوعات پر قلم اٹھایا مگر وہ عام ہونے کے باوجود خاص ہوگئے۔ مشتاق قمر نے تہذیب کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ انسان اور مظاہر فطرت کو بھی موضوع بنایا ہے۔مشتاق قمر کے انشائیوں میں گہری سوچ اور فکر کی گہرائی پائی جاتی ہے ان میں سستا پن نہیں جھلکتاوہ اپنے انشائیوں میں دوستانہ انداز سے زندگی کے تجربات بیان کرتے ہیں۔ان کے انشائیوں کے مضامین عام معاشرے سے اخذ کیے ہوئے ہیں۔

جمیل آزر نے زندگی کے عام موضوعات پر قلم اٹھایا ان کے ہاں موضوعات کی رنگارنگی ہے انہوں نے معاشرے کے چھوٹے چھوٹے موضوعات پر لکھا تاہم ان کے کچھ موضوعات میں ہمیں منفرد اور انوکھی باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ان کے انشائیوں کے عنوانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی نفسیات و رویے،مشاہدات و تجربات،ان کی زیر استعمال مختلف چیزیں،ان کی ذاتی پسند و ناپسند کس طرح انہیں سوچنے اور فکر کرنے پر مائل کرتی ہیں۔ تاہم ان کے انشائیوں میں جدید و قدیم کا تقابل بھی پایا جاتا ہے۔ جمیل آزر نے معاشرے کے چھوٹے چھوٹے مسائل پر لکھا۔وہ زندگی اور کائنات کے بارے میں گہری فلسفیانہ باتوں سے آگاہی فراہم کرتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں زندگی کے آئینوں کے نئے زاویہ ہائے فکر سے ہم روشناس ہوتے ہیں۔وہ گہری سوچ اور فلسفیانہ سوچ کو نہایت سادہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔ جمیل آزر کے انشائیوں میں تہذیبی و ثقافتی،سیاسی،مذہبی و روحانی اور معاشرتی عناصر ملے جُلے انداز میں نظر آتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں جدید و قدیم کا تقابل بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔آپ مذہب سے بھی گہرا لگاؤ رکھتے ہیں ایسے انشائیوں میں "لکشمن ریکھا"، "نیکی،دریا اور سمندر" شامل ہیں۔

اکبر حمیدی چھوٹی سے چھوٹی اور اعلیٰ سے اعلیٰ چیز کو بھی موضوع بناتے ہیں ایسی چیز جس پر انسان اتنا غور نہیں کرتا ان کے نادیدہ پہلوؤں سے ہمیں روشناس کرواتے ہیں۔ اکبر حمیدی اپنے انشائیوں میں مختلف جزیروں کی سیر کروا کر انسان کے مختلف رویوں سے ہمیں آشنا کرواتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں ایک قسم کی مشترک پائی جانے والی چیز انسان ہے۔اور وہ ہر طرح سے ان کے انشائیوں میں موجود ہے کہیں انسان کو جزیرے کہا گیا ہے کہیں منفی،مثبت صورت میں بیان کیا گیا ہے، کہیں وہ تسخیر کائنات کرتا ہے اور کہیں فاختہ کی صورت میں نظر آتا ہے اور کہیں عقاب پر جھپٹتا ہے اور کہیں درویش کی صورت میں نظر آتا ہے اور کبھی بڑے آدمی کی صورت میں نظر آتا ہے اور کبھی چھوٹے آدمی کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔لہٰذا اکبر حمیدی اپنے انشائیوں کے مختلف موضوعات کا موضوع انسان کو ہی بناتے ہیں کہ اس کائنات کا مرکزی نقطہ بنی نوع انسان کو ہی بنایا گیا ہے۔ان کے بعض انشائیے گہری فکر

اور سوچ میں غوطہ زنی کرتے نظر آتے ہیں۔ تاہم ان کے نو انشائیے شخصی انشائیے ہیں۔ تاہم اگر ہم دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے موضوعات کا آپس میں تقابل کریں تو ان سب انشائیہ نگاروں کے موضوعات ملتے جُلتے ہیں۔ مشکور حسین یاد "ممکنات انشائیہ" میں رقمطراز کرتے ہیں۔

> "انشائیہ کے موضوعات کے ساتھ ان حضرات نے ستم ظریفی یہ کی ہے کہ انشائیہ کو ایک ورزش نامہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اٹھنا، بیٹھنا، لیٹنا، چیخنا، بھاگنا وغیرہ۔ یہ ہیں وہ دل پسند عنوانات جن پر یہ صاحبان اکثر و بیشتر خامہ فرسائی فرماتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان موضوعات پر عمدہ انشائیہ نہیں لکھا جا سکتا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر اٹھنا بیٹھنا کا مطلب اٹھنا بیٹھنا ہی ہے تو کیا انشائیہ لکھنے پڑھنے سے بہتر یہ نہ ہو گا کہ انسان خود اٹھ کر یا بیٹھ کر دیکھ لے۔ یقیناً اس فعل میں ان انشائیوں سے زیادہ تازگی اور شگفتگی ہو گی۔"[۳]

جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے موضوعات کی بات کی جائے تو مشکور حسین یاد انشائیے کے موضوع کو ذات کا حصہ نہیں بناتے اور نہ ہی منفرد اور انوکھے موضوعات کو احاطہ تحریر میں لاتے ہیں بلکہ ان کے انشائیے ان کے تجربات و مشاہدات سے آراستہ ہیں ان کے زیادہ تر موضوعات معاشرے سے اخذ کیے ہوئے ہیں انہوں نے معمولی چیزوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کے انشائیوں کے موضوعات اخلاقی اقدار، جنسیات، احساس اور ذاتی زندگی کے تجربات ہیں۔ مشکور حسین یاد کے ہاں خارج کی کتھا زیادہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ آپ نے طنز و فکر اور فلسفیانہ مضامین کے ذریعے اخلاقی مقاصد کی ترویج بھی کی۔ مشکور حسین یاد کے انشائیے میں دو انداز دیکھنے کو ملتے ہیں جس میں سنجیدگی، خشک فلسفہ اور دوسرا طنز و مزاح شامل ہے۔ ان کے انشائیے جذبات سے بھرپور، گہری فکر سے لبریز، گہرائی اور جستجو کی صفات رکھتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ان کے تجربات و مشاہدات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کے مضامین اخلاقی اقدار، جنسیات، احساس اور ذاتی زندگی کے تجربات ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ان کا عہد بولتا نظر آتا ہے وہ زندگی کے گھمبیر مسائل کے حل تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں وقت اور زمانے کو موضوع بناتے ہیں۔

نظیر صدیقی کے انشائیوں کے موضوعات معاشرے سے اخذ کیے ہوئے اور ان کے ذاتی تجربات سے لبریز ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں زندگی کے تلخ اور کڑوے حقائق کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں میں فکر کا تعمق، وسعت اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ ان کے انشائیے بہتے ہوئے دریا کی مانند ہیں جس کے دو دھارے ہیں ایک دھارا فکر کی وسعت و گہرائی سے بھرپور ہے اور دوسرا دھارا طنز و مزاح کی کاٹ سے نمایاں ہے۔ وہ معاشرے

کے تلخ و کڑوے حقائق بڑی بے باکی سے بیان کرتے ہیں وہ سچ بولنے سے گریز نہیں کرتے۔ تاہم ان کے انشائیوں میں فریاد کرنے کا عنصر موجود ہے اور یہ فریاد مردم بیزاری کے وقت بہت تلخ محسوس ہوتی ہے تاہم ان کے انشائیوں میں غم و غصہ کی لہر تو ساتھ ساتھ دوڑتی ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں اپنی ذات کی خوبیوں اور اپنی زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو بھی بیان کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں مذہب کو اخلاقیات سے آزاد کروانے کا پختہ ارادہ اور کوشش بھی موجود ہے۔ وہ نماز پڑھنے والوں کی گنتی کے اضافے کی اہمیت کو تسلیم کرنے کی بجائے برائی اور شر پیشہ افراد میں کمی کو تسلیم کرتے ہیں تاہم ان کے انشائیوں میں کئی طرز کی فکری لہریں دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

صلاح الدین حیدر کے موضوعات انتہائی سنجیدہ ہیں۔ وہ روایتی موضوع کو انتہائی منفرد انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کے موضوعات معاشرتی، تاریخی اور اساطیری حوالوں سے ہیں۔ صلاح الدین حیدر اپنے انشائیوں میں معاشرتی پہلوؤں کے ساتھ طنز و مزاح اور انکشاف ذات کو یکجا کر کے پیش کرتے ہیں۔ وہ سنجیدہ صورتحال میں مضحک اور مضحک صورتحال میں سنجیدگی کا پہلو پیدا کرتے ہیں۔ ان کے انشائیے مزاح کی چاشنی سے بھرپور نظر آتے ہیں اور طنز کی لہر شروع سے لے کر آخر تک موجود ہے۔ وہ اپنے ذاتی تجربات اور معاشرتی تجربات و مشاہدات کو استعاراتی اور علامتی طرز سے پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد قیصر نے معاشرتی اور زندگی سے متعلقہ موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ تاہم ان کے انشائیوں میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کے موضوعات منفرد قسم کے ہیں۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر اپنے انشائیوں کو معاشرے کے فاسد مادے، دوغلے پن، معاشرے کی ناہمواریت، معاشرے کی برائیوں اور منافقت کا سدباب کرنے کا ذریعہ بھی بناتے ہیں۔ ان کا اپنے انشائیوں میں لہجہ مزاحیہ اور خطیبانہ ہے۔ بعض جگہوں پر ان کا مزاح حد سے بڑھ جاتا ہے حتیٰ کہ لطیفہ گوئی تک پہنچ جاتا ہے۔ ارشد میر معاشرے معمولی اور چھوٹی چھوٹی چیزوں پر قلم اٹھاتے ہیں۔ تاہم وہ معمولی چیز پر قلم اٹھا کر اسے غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔ ان کے انشائیے ارد گرد ماحول اور معاشرے سے اخذ کیے ہوئے ہیں۔ وہ زندگی کے عام موضوع کا انتخاب کر کے اس میں رنگ بھر دیتے ہیں۔ ارشد میر معاشرے کی معمولی اور چھوٹی چھوٹی چیزوں پر قلم اٹھاتے ہیں۔ جیسے انشائیہ "دھوتی" اور "تولیہ" وغیرہ۔ وہ اپنے انشائیوں میں انسانی کیفیات، احساسات اور جذبات کو بھی عمدہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔ تاہم دبستان لاہور کے انشائیہ نگار اپنے انشائیے طنز و مزاح کے انداز میں معاشرے پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں اس کے برعکس دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے انشائیوں میں گہرا طنز اور مزاحیہ انداز نہیں پایا جاتا بلکہ زیر لب تبسم کی صفت موجود ہے اور بعض دفعہ طنز کی ہلکی سی لہر دیکھنے کو ملتی ہے۔

مقالے کے تیسرے باب میں دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کا اسلوبیاتی تقابل کیا گیا ہے۔ تاہم اسلوب کسی ادب میں مصنف کی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے جو اس کی تحریر اور اس کے انداز بیان کو دوسروں سے منفرد کرتا ہے۔ اسلوب کسی بھی ادب کے لیے پرکشش اور انفرادیت کا حامل ہوتا ہے جو مصنف کی شخصیت کو اس کی تحریروں میں آویزاں کرتا ہے۔ ہر ادیب کا اسلوب اس کے افکار کو بیان کرتا ہے اور اس اسلوب کی بنا پر ہی اس کی تحریروں میں چاشنی اور انفرادیت رونما ہوتی ہے۔ کسی بھی انشائیہ نگار کے اسلوب کی رنگینی اس کے الفاظ اور لہجے کے انتخاب سے ہوتی ہے۔ اگر کوئی انشائیہ نگار اپنے انشائیوں میں سادہ اور عام فہم الفاظ استعمال کرتا ہے تو وہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ دبستان سرگودھا کے انشائیاں نگاروں میں ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں میں مزاج کی عمدگی اور نفاست کا عنصر بہترین انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے انشائیوں میں ملتے جلتے اسلوب نظر آتے ہیں۔ بعض جگہوں پر انہوں نے آسان اور سادہ الفاظ کے استعمال سے اپنے اسلوب کو پرکشش اور قابل توجہ بنایا ہے جس سے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ قاری کسی سحر انگیز منظر میں خود کو مرکوز کر رہا ہے۔ تاہم ڈاکٹر وزیر آغا دبستان سرگودھا کی ایسی پہچان ہیں کہ ان کے انشائیے اپنی منفرد اور جداگانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ دبستان سرگودھا کے انشائیوں میں اسلوب میں شگفتگی، اختصار، انکشاف ذات، غیر رسمی انداز گفتگو اور تنوع نظر آتا ہے۔ الفاظ میں شگفتگی نظر آتی ہے تو اختصار سے بھی دامن خالی نہیں ہے۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں نے معاشرتی عناصر کو لطیف اور نرم زبان کے استعمال سے واضح کیا ہے۔ انہوں نے معاشرتی منظر کشی کو نہایت بے تکلفانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں مشکور حسین یاد کا نام اپنی الگ اہمیت رکھتا ہے۔ مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں ذات کے انکشاف کا مسئلہ ایک نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انکشاف ذات کے بغیر کوئی بھی ادیب یا شاعر ایک حرف بھی لکھنے سے قاصر ہوگا۔ ان کی اسی بات کا اثر ان کے انشائیوں میں نہ ہونے کے برابر ہے، اگر ان کے انشائیوں کا تجزیہ کیا جائے تو اس بات کا احاطہ کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ ان کے اپنے انشائیوں میں انکشاف ذات کا عنصر بہت کم پایا جاتا ہے۔ ان کے ان انشائیوں میں داخلی کیفیت کا اثر بہت کم اور اس کے برعکس خارجی پہلو زیادہ پایا جاتا ہے۔ مشکور حسین یاد کے ہاں جو اسلوب استعمال ہوتا ہے وہ ایک الگ میعار رکھتا ہے۔

دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں نظیر صدیقی کے معیار اور اسلوب بیان میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ نظیر صدیقی نے اپنے غصے کا اظہار کرنے کے لیے انشائیہ کا انتخاب کیا ہے۔ جس میں انہوں نے طنز کے ذریعے اپنے

غصے کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے اپنے موضوعات میں طنز کو ایک الگ انداز میں پیش کیا ہے اور ان کے موضوعات میں اخلاقی اقدار، روحانیت، سماجی شعور، فلسفیانہ سوچ اور روحانیت کے ساتھ اس کا انداز تحریر اور اسلوب سادہ اور سلیس ہے۔

دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے انشائیوں کے اسلوب میں لطافت، شگفتگی، رمز و ایماء، غیر رسمی انداز اور حس لطیف اہم عناصر ہیں۔ انشائیہ میں ایک خاص قسم کی ابتداء اور انتہا ہوتی ہے اور اس سے ایک وحدت جنم لیتی ہے۔ تاہم باقی لکھنے والے کی بصیرت پر منحصر ہے انشائیہ کے اتنے ہی اسلوب ہوں گے جتنے انشائیہ نگار کے۔ تاہم انشائیہ میں اسلوب کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے کیونکہ انشائیہ نگار اپنے انشائیے کو نہ کہانی کی صورت میں لکھ سکتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کے دلائل و منطق کو استعمال کر سکتا ہے اور نہ ہی اس میں کردار سازی ممکن ہے بلکہ اس میں اس انداز سے بات کی جاتی ہے کہ جیسے اس نے کوئی بات بیان نہیں کی بلکہ انشائیہ نگار اپنا سارا زور اسلوب پر لگاتا ہے انشائیہ نگار چھوٹے سے چھوٹے موضوع کو منفرد طرز سے بیان کرتا ہے اور بہت ہی دیدہ و بینا سے کام لے کر اس کے لیے منفرد طرز کے اسلوب کا انتخاب کرتا ہے تاہم انشائیہ کو بعض دفعہ مضمون کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے جو کہ سرے سے ہی غلط ہے تاہم اسے بعض دفعہ تاثراتی قسم کی کوئی چیز سمجھ لیا جاتا ہے اور نہ ہی یہ طنزیہ و مزاحیہ مضمون کی مانند کوئی چیز ہے مزاح نگار تفنن طبع کی تخلیق کرتا ہے اور اسی وجہ سے اس کے اسلوب میں شگفتہ پن پیدا ہوتا ہے اس کے مزاح میں معاشرے پر طنز ہوتا ہے اس سے تحقیر کا پہلو نہیں نکلتا۔ انشائیہ کے علاوہ دوسری اصناف میں مصنف نامعلوم سے معلوم تک کا سفر کرتا ہے جبکہ انشائیہ میں مصنف معلوم کے کسی نئے پہلو کو تلاش کرتا ہے۔ انشائیہ میں تخلیقی تازگی اور نئی سوچ انشائیہ کے اسلوب کو بہت متاثر کرتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے میں انشائیہ کیتھارسس سے سراسر محروم ہے کیونکہ یہ انشائیہ کے دائرہ کار میں شامل ہی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اوراق کے بہت سے انشائیہ نگار استعارہ کو انشائیے میں برتنے کو ناپسند کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ڈاکٹر سلیم اختر ایسے اسلوب کو اسپاٹ اسلوب کا نام دیتے ہیں اور ڈاکٹر وزیر آغا ایسے اسلوب کو لطیف نثر کا نام دیتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے میں انشائیہ کی زبان تازہ و شگفتہ، بے تکلف اور ارفع تر ہوتی ہے اور انشائیہ کے عناصر میں شوخی و سنجیدگی، اختصار، فلسفیانہ انداز، تفکر، کفایت لفظی اور تازگی وغیرہ شامل ہیں تاہم انشائیہ کا اسلوب شعری ہوتا ہے اور اس میں مخفی مفاہیم کو منفرد انداز سے بیان کیا جاتا ہے۔ انشائیے کا آغاز اور انجام کہانی کی مانند نہیں ہونا چاہیئے انشائیہ اس قسم کے رویے سے بری ذمہ ہے انشائیے میں کسی تازہ، منفرد اور نئے رویے کو بیان کیا جاتا ہے مگر اسے فلسفے کا روپ نہیں دھارنا چاہیئے ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ نگار اور مزاح نگار کے فرق کو ایک مثال سے

بھی بیان کرتے ہیں کہ جب بہت سے لوگ سمندر کا گہرا جائزہ اور مشاہدہ کرتے ہیں تو اس میں ہر شخص کا اپنا نقطہ نظر ہوتا ہے شاعر کی نظر میں سمندر انسانی زندگی سے بہت وسیع اور پھیلا ہوا ہے اور بزنزمین کی نظر سمندر کی موجوں کی بجائے آمد ورفت پر ہوگی اور ایک انشائیہ نگار اسے اپنی منفرد نظر سے دیکھے گا وہ سمندر کی طرف پیٹھ کر کے اپنی ٹانگوں میں سے جھانک کر سمندر کو دیکھے گا اور اس کا معائنہ کرے گا جبکہ ایک مزاح نگار سمندر میں جھانکنے کی بجائے اپنی ٹانگوں کی طرف بھی نظر رکھتا ہے تاہم اس مثال سے ڈاکٹر وزیر آغا مزاح نگار اور انشائیہ نگار کے فرق کو بھی واضح کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں کہ ایک شخص جب اپنے آفس سے کام ختم کر کے گھر واپس آتا ہے اور اپنا تنگ لباس اُتار کر ڈھیلا ڈھالا لباس پہنتا ہے اور ایک نرم موڑھے پر دراز ہو کر حقے کی نے سے کش لگاتا ہے اور اپنے دوستوں سے گپ شپ کرتا ہے تو تب انشائیہ تخلیق ہوتا ہے۔

دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگار وزیر آغا انشائیہ کے لیے پرسنل ایسے کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور اس کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ جبکہ مشکور حسین یاد انشائیہ کو انگریزی ایسے کے مترادف قرار دیتے ہیں اور انشائیہ کو پرسنل ایسے کہنا انشائیہ کے صنف کے ساتھ زیادتی قرار دیتے ہیں۔ تاہم رسالہ "اوراق" کے مصنف مشکور حسین یاد اور دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کو انشائیہ نگار تسلیم ہی نہیں کرتے۔ جبکہ ڈاکٹر سلیم اختر دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے حق میں بولتے ہیں دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے انشائیوں میں طنز و مزاح پایا جاتا ہے اور وہ اس طنز و مزاح سے اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ دبستان لاہور کے کچھ انشائیہ نگاروں کے انشائیوں میں کلبیت، ناامیدی اور قنوطیت پائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ان کے انشائیوں میں گہرے فلسفیانہ عناصر اور سنجیدگی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ اپنے انشائیوں کو ذات کا حصہ نہیں بناتے بلکہ ان کے انشائیوں میں انکشاف ذات کی کمی دیکھنے کو ملتی ہے اس کے علاوہ ان کے انشائیوں میں خارجی پہلو کی بھرپور عکاسی دیکھی جا سکتی ہے۔ تاہم نکتہ آفرینی کا عنصر ان کے ہاں بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں زیادہ تجربات و مشاہدات کو بیان کرتے ہیں۔ جبکہ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے ہاں طنز و مزاح کی بجائے زیر لب تبسم کی خوبی پائی جاتی ہے ان کے بوجھل سنجیدگی کی بجائے ہلکا پھلکا انداز اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں نکتہ آفرینی پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں کلبیت کی بجائے مثبت رویہ پایا جاتا ہے۔ وہ موضوع کو ذات کا حصہ بنانے سے گریز نہیں کرتے علاوہ ازیں ان کے انشائیوں میں انکشاف ذات موجود ہے۔ وہ انشائیوں میں مصلح یا خطیب کا روپ نہیں دھارتے۔ ان کے انشائیوں میں داخلیت بخوبی پائی جاتی

ہے۔ان کے انشائیوں میں اسلوب کی تازہ کاری بھی پائی جاتی ہے۔ان کے ہاں مخفی گوشوں کو نمایاں کرنے کی خوبی بھی موجود ہے۔

دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں الفاظ کی شگفتگی ان کی سادگی کی بجائے الفاظ کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ ان کی گہرائی کو سمجھا جا سکے۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں نے فطرت اور تہذیب و ثقافت کو اپنی تحریروں کا خاص مرکز رکھا ہے جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں نے وقت اور اپنے عہد کے عناصر کو اپنی تحریروں کا حصہ بنا رکھا ہے۔ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں نے داخلی اور خارجی کیفیات کو ایک دوسرے کے برعکس پیش کرنے کی کوشش کی ہے جبکہ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں نے داخلی اور خارجی کیفیات کو ایک ساتھ لے کر چلنے کا ہنر پیش کیا ہے۔دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے اسلوب میں اختلافات کے باوجود چند مشترک نکات بھی موجود ہیں ان کے اشتراکات میں انکشاف ذات، آزاد ترنگ، اثبات حیات، تازگی فکر، مسرت کا سامان مہیا کرنا اور شگفتگی شامل ہیں تاہم ان عناصر نے بعد میں آنے والے انشائیہ نگاروں کو متاثر کیا۔

مقالے کے چوتھے باب میں دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کا موضوعاتی اور تکنیکی تقابل کیا گیا ہے اور موضوعاتی تقابل میں نفسیاتی، فلسفیانہ ،سماجی، رومانوی اور ادبی تقابل شامل ہیں۔تاہم دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا نفسیاتی تقابل بھی کیا گیا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں میں بھی نفسیاتی عناصر دیکھے جا سکتے ہیں۔وزیر آغا نے انسانی فطرت کے ان پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ وزیر آغا انشائیہ ”معافی مانگنا“ میں معافی مانگنے کی نفسیات کے بارے میں بتاتے ہیں تاہم مصنف مختلف جذبات جیسے کہ خوف اور تنہائی کی نفسیات کو بھی انشائیہ ”اکلاپا اور تنہائی“ میں بیان کرتے ہیں۔وزیر آغا کی تحریروں میں نفسیاتی جہت کے پہلو احساس، جذبے، رویے، داخلی و خارجی کیفیت کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ غلام جیلانی اصغر سماج کی نفسیات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ان کی تحریروں میں یونان کے فلاسفروں کی طرح فلسفیانہ اور مفکرانہ سوچ کے علاوہ نفسیاتی پہلو کے رنگ ملتے ہیں۔اس کے علاوہ مصنف ”ریٹائرمنٹ کے بعد“ ناسٹلجک کیفیت کو عمدہ طریقے سے بیان کرتے ہیں تاہم غلام جیلانی اصغر نے ذہنی کشمکش اور داخلی کیفیت کو اپنی تحریروں میں زیادہ ترجیح دی ہے بلکہ یہ ان کی اولین ترجیح ہے۔مشتاق قمر کے انشائیوں میں انسان کی ذہنی کشمکش کو نفسیات سے منسلک کیا گیا ہے۔ مشتاق قمر انشائیہ ”بال کٹوانا“ میں انسان کی دوہری شخصیت پر قلم اٹھاتے ہیں کہ ہر انسان کے اندر دو شخصیتیں موجود ہوتی ہیں انسان کا ذہن کبھی ماضی کی یاد میں کھویا رہتا اور کبھی انسان کا ذہن مستقبل کے بارے میں بڑے بڑے منصوبے بناتا ہے اس طرح مصنف بڑھاپے پر بھی قلم اٹھاتے ہیں کہ بڑھاپے کی بھی دو اقسام ہیں اس میں سے ایک داخلی ہے اور دوسرا

خارجی۔ مشتاق قمر معاشرے کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں اور انسان کے چھپے ہوئے گوشوں کو عیاں کرتے ہیں تاہم مشتاق قمر کے تمام انشائیوں میں نفسیاتی جہت کا مختلف انداز میں ذکر ملتا ہے۔

جمیل آزر کے انشائیوں کا مطالعہ کریں تو ان کی تحریروں میں نفسیاتی پہلو بھی ملتا ہے۔ ان کے انشائیہ ”نیم پلیٹ“ میں داخلی کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے اس انشایئے کا موضوع ہی نفسیاتی پہلو کی عکاسی کرتا ہے اس کے علاوہ انشائیہ ”بالک ہٹ“ میں بچوں کے بارے میں فرائیڈ کی نفسیات کو بھی قلمبند کیا گیا ہے نفسیاتی جہت کے حوالے سے اکبر حمیدی کی تحریروں میں داخلی وخارجی کیفیت اور ذہنی وجذباتی رویے کے نمونے کثرت سے ملتے ہیں۔ انسان کی کیفیت اور رویے اس کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے ہاں بھی نفسیاتی جہت کے نمونے موجود ہیں۔ مشکور حسین یاد کی تحریروں میں نفسیاتی جہت کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ ان کو نفسیاتی پہلوؤں پر گہری گرفت حاصل ہے اور نفسیاتی مطالعہ وسیع اور جامع ہے۔ اس لیے ذہنی کشمکش اور داخلی وخارجی کیفیتوں کو احسن انداز میں بیان کرنے میں کمال کی مہارت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں یہ نفسیاتی مسائل کو اجاگر کر کے ذہنی کشمکش کو بڑھانے کی بجائے فلسفیانہ انداز میں ان مسائل کا حل بتانے کی ایک کوشش کی ہے۔ تاہم نظیر صدیقی نے انسانی نفسیات کو اس طرح اپنے انشائیوں میں پیش کیا ہے کہ قاری کو وہ معاشرے کا حصہ محسوس ہوتا ہے۔ صلاح الدین حیدر نے اپنے انشائیوں میں داخلی و ذہنی کیفیت کو زیادہ ترجیح دی ہے۔ سماج کے افراد اور معاشرتی نفسیات کو بخوبی جانتے ہیں۔

ڈاکٹر قیصر شہزاد کے انشائی مجموعے ”لطف آگہی“ میں نفسیاتی موضوعات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ نفسیاتی موضوعات اور پہلوؤں کا ذکر ان کی تحریروں میں جا بجائے ملتا ہے۔ رشتے کی تلاش، آنکھ مچولی مہمان خصوصی، خط، نام اور بچوں کی نگہداشت جیسے انشائیوں کے موضوعات نفسیاتی جہات پر مبنی ہیں۔ انشائیہ ”رشتے کی تلاش“ میں سماج اور معاشرے کے رسم و رواج کی عکاسی کی گئی ہے۔ رشتے کی تلاش میں شیر خوارگی سے لے کر بڑھاپے تک رشتے کی تلاش کے مراحل کو نفسیاتی موضوعات میں پیش کیا گیا ہے۔ "مہمان خصوصی" انشائیہ میں طنز ومزاح کے رنگ میں نفسیاتی پہلو کا عنصر زیادہ ملتا ہے چونکہ یہ ایک منفرد موضوع ہے۔ انشائیہ ”ماہر نفسیات“ ہی نفسیات کے ماہرین پر لکھا گیا انشائیہ ہے۔ اس کے علاوہ مصنف مختلف جذبات جیسے انا، شک اور عشق وغیرہ کی نفسیاتی کیفیات پر بھی قلم اٹھاتے ہیں تاہم مصنف داخلی وخارجی احساسات کی ترجمانی بھی کرتے ہیں کہ کس طرح انسان کے رویے میں اسکی انفرادیت جھلک رہی ہوتی ہے اور اس کے رویے لاشعور اور تحت الشعور کے پیچھے پوشیدہ خواہشات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ارشد میر کے انشائیوں میں سماجی زندگی میں ہونے والے مختلف رجحانات کا نفسیاتی

مطالعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ارشد میر نفسیاتی مطالعہ کو انشائیہ کے موضوع کی مدد سے ایک ایسی ڈگر پر ڈال دیتے ہیں جو امکانات اور معنویت کو مسلسل آگے کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کی رومانوی جہت کا تقابل بھی شامل کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا رومانوی جہت میں فطرت نگاری کی دلکش اور جاذب تصویریں کھینچنے میں کمال کی مہارت رکھتے ہیں۔ عورت کے حسن و جمال کو مختلف انداز میں بیان کرتے رہتے ہیں۔ اس لڑی کی ایک جھلک ان کے انشائیے "کچھ خوبصورتی کے بارے میں" میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں میں رومانیت کی جھلک جا بجا ملتی ہے۔ یہ رومانوی انداز طنزیہ بھی ہے اور مزاح سے بھرپور بھی۔ مشتاق قمر کے انشائیوں کا جائزہ لیا جائے تو ان کے موضوعات میں سب سے زیادہ رومانویت کا عنصر ملتا ہے۔ ان کے انشائیے فطرت پرستی کی بہترین اور عمدہ مثالیں ہیں۔ اس میں ان کا بہترین انشائیہ "دھوپ کھانا" ہے۔ فطرت پرستی کے علاوہ تفریحات، اجنبی دنیائیں، غور و فکر اور فکر کی نئی راہیں جیسے موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔ جمیل آزر کے ہاں بھی رومانوی جہت کے حوالے بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اکبر حمیدی کے انشائیوں میں فطرت نگاری اور تفریحات رومانوی جہت کے موضوعات ہیں۔ ان پر اکبر حمیدی کی گرفت بہت مضبوط ہے۔

دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے ہاں بھی رومانویت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ مشکور حسین یاد ازدواجی زندگی اور جنسی موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں۔ وہ طنزیہ انداز میں میاں بیوی کے تعلقات کو طنز کا نشانہ ہیں۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں کا مجموعہ "شہرت کی خاطر" اپنی تحریروں میں رومانوی خصوصیت کے ساتھ انشائیہ کا ایک نیا رنگ و آہنگ پیش کرتا ہے۔ مصنف انشائیہ "شادی"، شادی کے نقصانات اور فوائد اور ازدواجی زندگی پر لکھتے ہیں۔ انشائیہ "دوست اور دوستی" میں نظیر صدیقی دوستی کے رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے قربت سے زیادہ دوری کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

صلاح الدین حیدر فطرت کی خوبصورتی پر بھی قلم اٹھاتے ہیں فطرت کی خوبصورتی انسان کے دل کو بھی معطر کر دیتی ہے صلاح الدین حیدر کے انشائیوں میں رومانیت کی زیادہ جھلک شادی کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر کی تحریروں میں عشق و محبت کی داستانوں کی جھلک تو نظر نہیں آتی مگر حسن و جمال اور فطرت پرستی کے نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ سرکاری آفیسر ہونے کی وجہ سے متعدد اضلاع میں تعینات رہے۔ جس سے انہوں نے وہاں کے خوبصورت نظاروں میں تحریروں کو قلم بند کر دیا۔ ان کی تحریروں میں عشق و محبت کے ذاتی تجربے و مشاہدے شامل نہیں ہیں مگر سماج و معاشرے میں اس جذبے کے تجربات کو لازمی تحریروں کا حصہ بناتے

ہیں۔ ارشد میر کے موضوعات میں رومانویت کا عنصر کثرت سے پایا جاتا ہے وہ اپنے خیالات کو فطرت کے ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک لے جانے کی ایک کڑی کی شکل اختیار کرتے ہیں ۔

دبستان لاہور اور دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کی ادبی جہت کا تقابل بھی کیا گیا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ میں حسب ضرورت شعر، انگریزی اور فارسی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ شعراء و ادباء کی مثالیں اور واقعات کو وقتاً فوقتاً بیان کرنے سے ادبی جہت کو فروغ ملتا ہے۔ شعراء کے سوچنے کے انداز پر وزیر آغا کے خیالات ان کے انشائیہ "ڈبویا مجھ کو ہونے نے" میں بیان کرتے ہیں۔ادبی شخصیات کے ساتھ ادبی مباحث اور لسانی مباحث کے نمونے جابجا ملتے ہیں۔ غلام جیلانی اصغر ادب کو باثر بنانے کے لیے وراثتی ادب کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں وہی ادب دیرپا اور دلکش ہو گا، جو ایک کڑی کی صورت میں نسل در نسل منتقل ہوتا ہے۔ ان کے انشائیوں میں انگریزی الفاظ کا استعمال جابجا ملتا ہے۔ شعری اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں وقت ضرورت ایک شعر کا مصرا بھی استعمال کرتے ہیں۔ استعارات و تشبیہات سے تحریر کو پرکشش بنانے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ مشتاق قمر نے اپنے انشائیوں میں بھی ادبی شخصیات کے ادبی فن اور خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ایک فن کی تخلیق میں ادب کن کن مراحل سے گزر کر ادب کی ایک شکل اختیار کرتا ہے۔اس حوالے سے وہ اپنے انشائیہ ”بیٹھنا“ میں ذکر کرتے ہیں۔ مشتاق قمر کے انشائیوں میں ادبی شخصیات کے حوالے اور لسانی مباحث کے تذکرے ملتے ہیں۔ استعارات و تشبیہات کا استعمال کر کے اپنے دلائل کو پختگی عطا کی ہے۔ محاورات اور ضرب المثل کے استعمال سے اپنے انشائیے کو خوبصورت بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر جمیل آذر کی ادبی جہت میں اردو کے علاوہ فارسی ادب کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں ادبی موضوعات کو جگہ دینے کے علاوہ عالمی سطح کے ادیبوں کے حوالے بھی اپنے انشائیوں میں بیان کیے ہیں۔ پروفیسر جمیل آزر نے تنقیدی مراحل اور شعری اصطلاحات کے علاوہ دوسرے ادب کے محاورے بھی استعمال کیے ہیں۔ جن میں فارسی اور انگریزی قابل ذکر ہیں۔ ان کے انشائیوں میں انگریزی ادب کا رنگ واضح نظر آتا ہے۔

اکبر حمیدی کی تحریروں میں ادبی جہت کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ جس میں ادبی شخصیات اور ادبی مباحث کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ ادبی جہت میں ادبی شخصیات، ادبی موضوعات اور لسانی مباحث کے علاوہ ادبی تنظیموں کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے جہاں نئی ادبی تنظیموں اور نئے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کی ہے وہاں پر ادب میں نئی جہت پر بہت زور دیا ہے۔ ادب کے پرانے اور فرسودہ نظام کے بارے میں انشائیہ "پھولوں میں گھرا کانٹا" بھی لکھتے ہیں۔

دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں بھی ادبی جہت کے عناصر موجود ہیں۔ مشکور حسین یاد کے اس مجموعے "وقت کا استعارہ" کے انشائیوں کے موضوعات کا سر اسری جائزہ لیں تو ان میں ادبی رنگ نظر آتا ہے۔ جن میں "نزاکتوں کا مرقع"، عقیدہ، اسم کا جسم، بہشت میں پہلا قدم، تنہائی کا شور اور جنم جنم کا شمار قابل ذکر ہیں۔ نظیر صدیقی ایک ایسے انشائیہ نگار ہیں جنہوں نے اپنے انشائیوں میں ادبی اصطلاحات کو پیش کرنے کا ایک الگ انداز بیان کیا ہے۔ ان کے انشائیوں میں ادبی شخصیات اور ادبی مباحث بخوبی موجود ہیں۔ صلاح الدین حیدر کے انشائیوں میں ادبی جہت کا جائزہ لیا جائے تو اس میں ادبی شخصیات، مباحث اور لسانیات کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ کہیں اردو ادب کے ساتھ فارسی، پنجابی اور انگریزی ادب کی ممتاز شخصیات کا ذکر بھی کیا جاتا ہے تو کہیں اردو ادب میں ادبی و لسانی مباحث کا تقابل بھی پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر شہزاد قیصر ایک ایسی ادبی شخصیت کے مالک ہیں کہ ان کی ادبی سوچ بہت وسیع و بلیغ ہے شاید اس کی وجہ انگریزی ادب سے لگاؤ تھا۔ انگریزی الفاظ و محاورات کا استعمال ان کی اردو تحریروں میں بھی ملتا ہے بلکہ اکثر اوقات ان کا موازنہ بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں انگریزی الفاظ و محاورات کا استعمال، ادبی موزانہ اور لسانی مباحث کا تقابل ملتا ہے۔ ان کے ایک انشائیے "نقاد" میں ادبی جہت کے لیے نقاد کی خوبیاں بھی بیان کی گئی ہیں ارشد میر خود ادبی شخصیات میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں ادبی رنگ لسانی مباحث میں نظر آتا ہے، تو کہیں ادبی شخصیت کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیوں کا فلسفیانہ تقابل بھی کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے موضوعات میں بہت سے فلسفیانہ عناصر موجود ہیں۔ زندگی بے شمار کیفیتوں کا نام ہے۔ وزیر آغا نے نام نہاد فلاسفر بننے والوں کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ تاہم وزیر آغا زندگی میں ترتیب اور بے ترتیبی کے فلسفے کو بھی عیاں کرتے ہیں۔ اس طرح مصنف غلامی کے فلسفے کو بھی عمدگی سے بیان کرتے ہیں اور اسے ایک کریہہ حقیقت کہتے ہیں اور اس کے برعکس آزادی کو برق کا کوندا کہتے ہیں اور یہ بہت ہی پُر نور لمحہ ہوتا ہے اور اس کے اردگرد تاریکی ہی تاریکی ٹھاٹھیں مار رہی ہوتی ہے۔ اس طرح زندگی خدا کی دی گئی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے مصنف زندگی کو ایک زینے کی مانند قرار دیتے ہیں کہ انسان جب ایک زینے سے دوسرے زینے کی جانب جست بھرتا ہے تو یہ ہی زندگی ہے۔ تاہم مصنف زندگی، وقت اور معاشرے کی مختلف حقیقتوں کے فلسفے کو اپنے انشائیوں میں سمو دیتے ہیں۔ غلام جیلانی اصغر اپنے انشائیوں میں فلسفے کے ہر پہلو پر غور کرتے ہیں۔ اس طرح انشائیہ "بستر میں لیٹنا" میں مصنف فلاسفروں

کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ فلاسفر جب سوچتے تو اکثر بستر میں لیٹ کر سوچتے اور بڑے بڑے فلسفے اخذ کرتے ان میں سے اکثر علماء لمبے لمبے چوغے پہن کر بستر میں لیٹ کر طمانیت سے سوچتے۔

مشتاق قمر کے انشائیوں میں فلسفیانہ جہت جا بجا ملتی ہے۔ انشائیہ ''کوہ پیمائی''میں فلسفیانہ رنگ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اصل میں مصنف ان فلسفیانہ خیالات اور مفکرانہ سوچ سے اصلاح کے پہلوؤں کو تلاش کرتے ہیں مشتاق قمر کے ایک دوسرے انشائیہ "کچھ نیند کی مذمت میں" میں زندگی، فطرت، نیند اور موت کے درمیانی تعلق کو فلسفیانہ انداز میں بھی بیان کرتے ہیں۔ فلسفیانہ انداز گفتگو، مفکرانہ سوچ، غور و فکر، فکر کی نئی راہیں اور کائناتی مسائل پر مشتاق قمر کی تحریریں لاجواب ہیں۔ جمیل آذر کے انشائیوں کے متعلق سے یہ بات منظر عام پر آتی ہے کہ ان کی تحریروں میں فلسفے کی نوعیت دوسرے انشائیہ نگاروں سے قدرے مختلف ہے۔ ان کے انشائیہ "بھوک ہڑتال" میں بھوک ہڑتال کرنے والوں کے بارے اپنے نظریات وخیالات کو قلمبند کیا ہے۔ مصنف وقت کے فلسفے کو بھی بہت عمدگی سے بیان کرتے ہیں کسی بھی کام کے کرنے کے لیے انسان کو وقت درکار ہوتا ہے اور وقت نے ہر چیز کو اپنی جکڑ میں لے رکھا ہے ہر کام کو کرنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ اس طرح انشائیہ ''وقت اے وقت ''میں مصنف شیلے کا وقت کے بارے میں فلسفے کو بھی بیان کرتے ہیں ان کے خیال میں وقت بہت سنگدل ہے اور سمندر انسان کے نمکین آنسوؤں سے بھرا ہوا ہے اور وقت ہی انسان کو تباہی کے دہانے پر لے آیا ہے یہ انسان کو دھوکا دیتا ہے اور چالیں چلتا ہے جمیل آزر وقت کو پُراسرار بھی کہتے ہیں اور یہ بہت بے رحم ہے وقت کے ساتھ ساتھ پُرانی عمارتیں ختم ہو رہی ہیں اور ان کی جگہ نئی اونچی عمارتوں نے لے لی ہے۔ تاہم مصنف روسو، افلاطون، سقراط اور ان کے شاگرد دکریٹو کا ذکر بھی کرتے ہیں اور ان کے زندگی کے بارے میں فلسفے کو بھی اپنے انشائیوں میں کہیں کہیں بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ مصنف وقت کے فلسفے کے ساتھ ساتھ زندگی کی حقیقت پر بھی قلم اٹھاتے ہیں۔

اکبر حمیدی کے انشائیوں میں فلسفیانہ موضوعات کی تصویر بڑی واضح ہے۔ ان کے انشائیہ ''رنگ دار شیشے''میں حقیقت پسندی کے بارے میں بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ نہایت مہارت سے کائناتی مسائل کو بیان کرتے ہیں اور فکر کی نئی راہیں تلاش کرنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔

دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے ہاں بھی فلسفیانہ عناصر پائے جاتے ہیں۔ مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں فلسفہ اور فلسفیانہ موضوعات کی بھرمار ہے۔ اس لیے ان کے موضوعات فلسفہ کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ کائنات مسائل پر غور و فکر اور مفکرانہ سوچ کو بیدار کرنا مشکور حسین یاد کا کمال ہے۔ ان کے مجموعہ ''جوہر اندیشہ''میں فلسفیانہ، سماجی اور اخلاقی موضوعات ملتے ہیں۔ مشکور حسین یاد کا انشائی مجموعہ "بات کی اونچی ذات" میں بہت سے

ملے جلے موضوعات ملتے ہیں مگر فلسفیانہ موضوعات کی کثرت پائی جاتی ہے۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں میں فلسفیانہ رنگ نمایاں پایا جاتا ہے انہوں نے اپنے انشائیے میں خدا اور انسانی فکر کا موازنہ کیا ہے کہ کیسے خدا کے ہونے کا احساس انسان کی زندگی اور اعمال کو متاثر کرتا ہے اس کے برعکس خدا کو نہ ماننے والا ظاہری طور پر آزاد لیکن وہ فکری تناؤ کا شکار رہتا ہے۔

صلاح الدین حیدر کی تحریروں میں فلسفیانہ موضوعات کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ وہ معاشرے اور کائنات کی حقیقتوں کو فلسفی انداز میں بیان کرنے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔ ان کا انشائی مجموعہ "حماقتیں میرے مقدر کی" میں اس کا تسلسل ملتا ہے۔ زندگی کی بے ترتیبی اور تہہ در گھاٹیوں سے فرار ہونا ناممکن ہے۔ زندگی سے موت کی طرف سفر اٹل حقیقت ہے اور زندگی حماقت کا ایک مسلسل سفر ہے۔ اس لیے اس پر شرمندہ ہونے کی بجائے اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ صلاح الدین حیدر نے بھی یہی فلسفیانہ سوچ کے ذریعے قارئین کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے دوسرے مجموعے "ڈر اور ڈراما" کی تحریروں میں بھی یہی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے اس مجموعے کے انشائیہ "جاگیر دار اور برخودار" میں زندگی اور موت کا ذکر فلسفیانہ انداز میں پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر شہزاد قیصر وقت کا فلسفہ بھی بہت عمدہ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ وقت مستقل رہنے والی چیز نہیں ہے اور نہ ہی دولت مستقل چیز ہے اور نہ کوئی ہمیشہ اونچے عہدے پر فائز رہتا ہے ماضی، حال اور مستقبل تینوں میں وقت کی حیثیت بدلتی رہتی ہے۔ مصنف کائنات کی جبریت پر بھی قلم اٹھاتے ہیں جیسے سورج دن کے وقت نکلتا ہے جب کہ روشنی کی ضرورت رات کے وقت بھی ہوتی ہے موسموں میں انسان کی فطرت کے خلاف تغیر بھی تو ہوتا رہتا ہے۔ تاہم وقت کی جبریت انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے اور یہ انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اس طرح مصنف انشائیہ "مصور" میں بھی فلسفیانہ موضوع پر بات کرتے ہیں کہ مصور اپنی مصوری سے انسان کی شکل تو بنا سکتا ہے مگر اس کی حیثیت سوائے بت کے کچھ بھی نہیں ہے یہ صرف المصور کے ہاتھ میں ہے کہ وہ اس بت میں جان بھی ڈال دے اور انسان کو تخلیق کر کے اس کی صورت بنا دے۔ مصنف اپنے انشائیے "دانشور" میں بھی سقراط اور افلاطون پر قلم اٹھاتے ہیں اور ان کو محض گفتگو بناتے ہیں۔ ارشد میر نے اپنے انشائیوں میں انسانی رویوں اور جذبوں کی کھل کر فلسفیانہ انداز میں ترجمانی کی ہے۔ ارشد میر کے انشائیوں کے فلسفیانہ موضوعات سے جو کرنیں پھوٹ رہی ہیں، جو وہ اردو ادب کو سیراب کر رہی ہے۔

دبستان لاہور اور دبستان سرگودھا کے انشائیوں کا سماجی تقابل بھی کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی سماج اور معاشرے پر گہری نظر ہے، اس لیے ان کے انشائیوں میں سماجی موضوعات کثرت سے ملتے ہیں۔ ان کے انشائیے

کے عنوانات بھی سماج کی عکاسی کرتے ہیں۔ تاہم ڈاکٹر وزیر آغا معاشرے کے مختلف پہلوؤں ،انسانی تہذیب اور تاریخ پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس طرح سماجی پہلوان کے انشائیوں میں ہمیں جابجا بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

دبستان سرگودھا کے نمایاں انشائیہ نگار غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کا مجموعہ "نرم دم گفتگو" کے موضوعات کا جائزہ لیا جائے تو اس میں سماجی جہت کے موضوعات کثرت سے ملتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں سماج و معاشرے کے رسم ورواج، گھریلو مسائل کی لمبی داستانیں، غربت، سیاسی اثر ورسوخ، کرپشن اور تعلیم وصحت جیسے موضوعات پر اپنے خیالات و افکار بیان کیے گئے ہیں۔ غلام جیلانی اصغر انشائیہ ”ملاقات“ میں ملاقات کے طور طریقوں کو زیر بحث لاتے ہیں اور ملاقات کے آداب پر بھی بات کرتے ہیں۔ اس طرح مصنف انشائیہ ”ریٹائرمنٹ کے بعد“ میں معاشرے کے ایک پہلو کی طرف ہماری توجہ مبذول کرواتے ہیں کہ جس میں ریٹائرمنٹ کے وقت حالات اور ریٹائرمنٹ کے بعد کے حالات کو شگفتہ انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔

مشتاق قمر نے انشائیہ میں بے شمار موضوعات کی قندیلیں روشن کر دی ہیں، جن میں سماجی موضوعات سرفہرست ہیں۔ مشتاق قمر معاشرے میں پھیلی برائیوں پر بھی قلم اٹھاتے ہیں۔ انشائیہ ”اپالو ٹریجڈی“ توہم پرستی کے بارے میں گیا لکھا ہے۔ مشتاق قمر انشائیے میں اپنے علاقے کے بارے میں بتاتے ہیں کہ وہاں لوگ شادی بیاہ گویا ہر موقعے پر برگد کے تنے پر لوگ دیا جلانا نہ بھولتے ،عام طور پر دیہاتی علاقوں میں توہم پرستی کا رجحان زیادہ ہوتا ہے قبرستان کی سب سے پرانی قبر پر دیا جلانا، کالی بلی کا راستہ کاٹنا، کوے کے بولنے پر مہمان کی آمد، زیتون کی شاخ امن کی علامت وغیرہ وغیرہ۔ توہمات اکثر سچی ثابت نہیں ہوتیں اور اگر یہ سچی ثابت ہو بھی جائیں تو اس کے پیچھے حادثات کا ہاتھ ہوتا ہے تاہم حادثات تو سائنسی ایجادات میں بھی حائل ہو سکتے ہیں۔

جمیل آذر نے اپنی تحریروں میں سماج اور معاشرے کے موضوعات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سماجی موضوعات اس معاشرے کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے انشائیہ "برساتی" کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ معاشرے کے کلرک کی بدحالی اور مالی حالات کے ساتھ معاشرے کی بے بسی کو کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان مسائل کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح انشائیہ ”وقت اے وقت“ میں گزرتے وقت کے ساتھ ترقی اور تبدیلی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ مصنف انشائیہ دعوت ولیمہ، اشتہار زدہ دیواریں، بدل جاتے ہیں لوگ / شادی کے بعد!، کتابوں کو دوستوں سے بچاؤ، مہربان کیسے کیسے بھیک مانگنے والے، تیرے جانثاروں کو سلام، واشنگ مشین، جنگ کرنا ،کچھ فیشن پر، غیر معروف شہری، آرٹس سٹوڈنٹس، نشہ، ہائیڈ پارک ، جن، مسٹر رائٹ مین، شمولیت اور عظیم نشر گاہ وغیرہ میں وافر مقدار میں سماجی پہلو پر لکھتے ہیں۔

اکبر حمیدی سماجی موضوعات پر مشاہدات و تجربات کی روشنی میں تحریریں قلمبند کرتے ہیں۔ سماج اور معاشرے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اکبر حمیدی نے ایک تہذیب پر دوسری تہذیب کے اثرات کو بیان کیا ہے۔ یہی اثرات سماج کے بدلتے رنگ اور رویے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اکبر حمیدی نے اس معاشرے اور سماج میں منفی جذبوں اور رویوں کی نشاندہی کی ہے تاہم سماجی موضوعات پر ان کا قلم سماج کی سچائی اور حقیقت پر مبنی حقائق بیان کرتا ہے۔

دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے ہاں بھی سماجی جہت کے حوالے موجود ہیں۔ مشکور حسین یاد کے انشائی مجموعے "بات کی اونچی ذات" میں سماجی موضوعات کی بھرمار ہے۔ ان کے اس مجموعے میں سماجی موضوعات پر مبنی انشایئے "خوبصورت لوگ، انکسار کے آسمان، سچ کا ذائقہ، اچھا زمانہ، تخت سلطنت، بنی نوع آدم کا شرف، ایفائے عہد، خوف اور جائے پناہ ہیں۔ جن میں سماجی موضوعات کے ساتھ فلسفیانہ اور نفسیاتی پہلوؤں کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ انشائیہ "اطمینان" میں ترقی یافتہ معاشرے کے بارے میں کہتے ہیں کہ ترقی یافتہ معاشرہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے، ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے اور مطمئن و پُر سکون ہوتا ہے تاہم جو معاشرہ جمود کا شکار ہوتا ہے سستی اور کاہلی ان کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے وہ ہمیشہ غربت اور معاشرے کی دوسری برائیاں چوری، ڈکیتی اور راہزنی وغیرہ کا مرتکب ہوتی ہیں۔ تاہم مشکور حسین کے ہاں جابجا سماجی رویے اور سماج کی برائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں وہ معاشرے میں پنپتی برائیوں کو مٹانا چاہتے ہیں اور معاشرے کا گہرا جائزہ لیتے ہیں۔

نظیر صدیقی کے انشائیوں میں سماج، معاشرت اور رسومات کا تذکرہ عام ہے۔ انہوں نے اپنے طرز بیاں میں ملکی و غیر ملکی سماج کا تذکرہ بہت عمدہ انداز میں کیا ہے۔ اس طرح انشائیہ "بور" میں بھی نظیر صدیقی لوگوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس طرح انشائیہ "بور" میں مصنف شادی کے نقصانات اور فوائد کو زیر بحث لاتے ہیں اور جہیز جیسی لعنت کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ انشائیہ "یہ انسان" میں انسان کو موضوع بحث بنایا گیا ہے کہ انسان آغاز سے ہی خود فریبی میں مبتلا رہا ہے اور خدا پرست واقع ہوا ہے انسان کی صفت اور کمزوری و کوتاہی یہ ہے کہ وہ خدا کے وجود اور عدم وجود کو ثابت نہیں کر سکا اس کے علاوہ انشائیہ "امتحان گاہ" میں مصنف ہمارے ملک کے طلباء سے لیے جانے والے امتحان اور اس دوران آنے والی مشکلات کو زیر بحث لاتے ہیں۔ وہ سماج میں پائے جانے والے تمام ان عناصر کو بھی بیان کرتے ہیں جو معاشرے میں ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

صلاح الدین حیدر سماج اور معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں ظلم و ستم پر مبنی ہوں یا پھر محبت کی داستانیں، مرد کی عورت پر ظلم و ستم کی کہانی ہو یا امیر طبقے کی غریب عوام کے حقوق پر ڈاکہ کی داستان، الغرض آپ سماج اور معاشرے میں ہونے والی سرگرمیوں کو محسوس کرتے ہیں۔ صلاح الدین

حیدر نے سماجی پہلوؤں اور موضوعات کو اصلاحی انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اگرچہ اس میں وہ کامیاب و کامران بھی نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد قیصر کے انشائیوں میں وافر مقدار میں سماجی حوالے موجود ہیں۔ ان کے پہلے مجموعے "کلیرنس سیل" کے انشائیوں کے موضوعات کا جائزہ لیا جائے تو ان کے انشائیہ "قرض کی پیتے ہیں مے" میں سماجی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ تاہم قرض ایک معاشرتی حقیقت ہے جو ایک لعنت کی شکل اختیار کر چکی ہے جیسے شراب پی کر دوبارہ واپس نہیں آسکتی ہے۔ اسی طرح مقروض بھی قرض کی شراب پی کر بھول جاتا ہے کہ اس کو قرض واپس بھی کرنا ہے۔ ہمیں ایسی لعنت سے چھٹکارا کیسے مل سکتا ہے یا اس حقیقت کو مثبت معنوں کے مطابق استعمال کیسے کیا جا سکتا ہے؟ ایسے موضوعات پر قلم اٹھانا اور خیالات و افکار کو بیان کرنا ایک فن ہے اور شہزاد قیصر اس فن سے مالا مال ہیں۔

ارشد میر کے موضوعات سماج اور معاشرے سے جنم لیتے ہیں۔ ان کے انشائیہ "دھوتی" میں سماجی مطالعے کی گہری جھلک دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے سماجی موضوعات جیسے دھوتی، دوپٹہ، تولیہ، ٹوپی، آنسو، گنا اور دروازہ پر انشائیہ لکھ کر سماج و معاشرے کی ترجمانی کی ہے۔ انہوں نے ایسے سادہ اور عام سے موضوعات پر مدبر اور پختہ دلائل کے ساتھ کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ مصنف معاشرے کی برائیوں پر بھی قلم اٹھاتے ہیں۔

دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے اکثر موضوعات ملتے جلتے ہیں اور اکثر ان کے موضوعات میں رنگا رنگی کے ساتھ یکسانیت بھی پائی جاتی ہے جیسا کہ اٹھنا، بیٹھنا اور لیٹنا جیسے موضوعات دبستان سرگودھا کے قریباً سب انشائیہ نگاروں کے ہاں موجود ہے۔ جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے موضوعات میں ایک جیسا رنگ دیکھنے کو نہیں ملتا ان کے موضوعات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے ہاں فطرت کے موضوعات کے ساتھ ساتھ معاشرے کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے ہاں معاشرے کی برائیوں اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں پر طنز و مزاح دیکھنے کو ملتا ہے۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے ہاں فلسفیانہ موضوعات کے ساتھ ساتھ خیالات کی رنگارنگی موجود ہے جبکہ مشکور حسین یاد کے ہاں سنجیدہ اور فلسفیانہ موضوعات کی بھرمار نظر آتی ہے جبکہ نظیر صدیقی کے ہاں طنز و مزاح کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ مشکور حسین یاد کے ہاں جنسی و رومانوی موضوعات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جبکہ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے ہاں رومانوی، جذبات سے بھرپور اور فطرت پر مبنی موضوعات پائے جاتے ہیں۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے ہاں مثبت انداز اور رجائیت سے بھرپور موضوعات پائے جاتے ہیں جبکہ دبستان لاہور کے

انشائیہ نگاروں کے ہاں مثبت لہجے کے ساتھ قنوطیت بھی پائی جاتی ہے اس قنوطی رنگ کے انشائیے زیادہ تر نظیر صدیقی کے ہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مقالے کے چوتھے باب میں میں دبستان سرگودھا اور لاہور کے انشائیہ نگاروں کا تکنیکی تقابل بھی کیا گیا ہے۔ دراصل تکنیک کا لفظ انگریزی سے آیا ہے اور انگریزی نے اسے یونان سے لیا ہے۔انگریزی میں اسے Technique کہتے ہیں اور یونان والے Technikos کہتے ہیں۔اگر مجموعی طور پر اس کے مفہوم و معنی کو دیکھا جائے تو اس کے معنی طریقہ کار کے ہیں۔ چنانچہ ہر صنف کی اپنی ایک الگ تکنیک ہوتی ہے اور اس طرح انشائیہ کی تہذیب و ترتیب میں بھی تکنیک ایک اہم کردار ادا کرتی ہے تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انشائیہ نگار کا منتہائے مقصود صرف تکنیک کو پیش کرنا نہیں ہوتا بلکہ تکنیک منزل تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔اس طرح بہترین تکنیک کسی بھی صنف کو موثر بناتی ہے۔

اس طرح ضروری نہیں کہ ہر انشائیہ کی صرف ایک ہی تکنیک ہو بلکہ مصنف کے ذہن میں جب خیال آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کی تکنیک بھی ذہن میں آجاتی ہے۔ لیکن یہ ضروری بھی نہیں کہ ہر خیال اپنے ساتھ اس کی تکنیک بھی ذہن میں لائے مگر یہ بھی ممکن ہے کہ ہر مصنف کو خیال کے دوران ہلکا پھلکا ڈھانچا ذہن میں آجائے اور جب وہ صفحہ قرطاس پر اُترتا ہے تو یہ رائج الوقت طریقوں میں سے ہی ایک طریقہ ہوتا ہے۔انشائیے کی تکنیک پر اگر غور کیا جائے تو اس میں تسلسل خیال، غیر رسمی طریق، کفایت لفظی،عدم تکمیل وغیرہ موجود ہونا ضروری ہے۔ تاہم انشائیہ میں یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ انشائیہ سیال صورت میں ہوتا ہے اور یہ ہر صورت میں ڈھل جاتا ہے ڈاکٹر وزیر آغا اس بارے میں اپنی رائے دیتے ہیں: ”انشائیہ کی کوئی مخصوص ہئیت نہیں۔ حتیٰ کہ یہ بھی ضروری نہیں کہ اسے لازمی طور پر مضمون کے اسلوب میں ہی لکھا جائے۔“[۳]

تاہم اس کی کوئی خاص شکل یا وضع نہیں ہوتی مگر ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اگر کسی نثر پارے کی باقاعدہ ہئیت یا وضع نہ ہو تو وہ انشائیہ ہے۔ کوئی بھی فن پارہ اپنی صنف کے لحاظ سے مختلف اجزاء کو منتخب کر کے ایک تکنیکی سانچے کی صورت میں ڈھالا جاتا ہے اور پھر یہ کُل کی شکل میں ترتیب دیا جاتا ہے۔ انشائیہ میں تمام اجزاء ایک مرکز سے جُڑے ہونے کے باوجود آزاد اور لچکدار ہوتے ہیں اس طرح انشائیہ نگاری کو پوری آزادی ہے کہ وہ صرف انشائیہ کو بیانیہ انداز میں ہی نہ لکھے اور اگر فن میں ضرورت ہو تو افسانے یا ڈرامے کی ہئیت میں بھی اسے لکھا جا سکتا ہے مکالمے اور ناول کی تکنیک کا بھی استعمال کیا جا سکتا ہے چاہے تو انشائیے میں سنجیدہ عناصر، فکری عناصر، مزاحیہ و فلسفیانہ عناصر شامل کیے جا سکتے ہیں مگر انشائیہ کا مقصد کہانی بیان کرنا یا ڈرامہ تخلیق کرنا نہیں ہوتا بلکہ افسانوی، ڈرامائی

یا مکالماتی عناصر انشایئے کی تکنیک میں بہترین اجزاء کا کام دے کر اس میں نکھار پیدا کرتے ہیں مگر یہ اجزاء یا عناصر انشائیہ کے فطری مزاج پر غلبہ نہیں پا سکتے۔ڈرامہ،افسانہ اور ناول وغیرہ میں ایک طرح کی وسعت پائی جاتی ہے مگر انشایئے میں الفاظ کو عقلمندی سے استعمال کیا جاتا ہے اس طرح مختلف مصنفین نے انشایئے کی ہیئت و تکنیک کے مختلف تجربات کیے ہیں اس طرح ڈاکٹر وزیر آغان کا انشائیہ "ٹھنڈا ہاتھ" میں افسانے کی تکنیک استعمال کی گئی ہے لیکن انشایئے پر افسانوی عناصر غلبہ پانے کی خوبی نہیں رکھتے بلکہ انشائیہ اپنی شکل میں ہی رہتا ہے۔ دبستان لاہور اور مشکور حسین یاد کے مطابق انشائیہ کو کسی بھی شکل میں لکھا جاسکتا ہے مطلب یہ کہ انشائیہ کو ادب کی کسی بھی صنف میں ڈھالا جاسکتا ہے لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ صرف ظاہری ڈھانچا ہی قابل قبول ہو گا اور باطنی طور پر اس سے گریز کیا جائے گا۔

مشکور حسین یاد "ممکنات انشائیہ" میں لکھتے ہیں:

> "ابھی تک میرے انشائیوں کے دو مجموعے چھپے ہیں۔ایک "دشام کے آئینے" اور دوسرا "جوہر اندیشہ"۔ میں نے ہیئت اور اسلوب انشائیہ کے ضمن میں مختلف تجربے کئے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی طرح ایک اسلوب یعنی کہانی کہنے پر اکتفا نہیں کیا۔ مکالمے کے انداز میں بھی انشایئے لکھے اور کہانی کہنے کے انداز میں بھی۔ویسے جو اسلوب مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ جوہر اندیشہ کے بیشتر انشائیوں کا اسلوب ہے۔"[۵]

انشائیہ کی تکنیک و فن کے لیے انکشاف ذات بھی بہت ضروری ہے مشکور حسین یاد کے مطابق انشائیہ لکھنے کے لیے انکشاف ذات اس قسم کا ہو کہ انشائیہ نگار کی ذات کے مختلف پرت اٹھتے چلے جائیں اور اس میں ذاتی انکشاف کے ساتھ ساتھ غیر ذات کا انکشاف بھی ضروری ہے اور اسی خصوصیت کی وجہ سے انشائیہ دوسرے ادب پاروں سے مختلف ہے ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے میں اگر انشائیہ نگار اپنی ذاتی باتوں کا ذکر سیدھے سادے انداز میں کر دے تو یہ انشائیہ نگار کے لیے کافی ہے۔ انشایئے میں جہاں انکشاف ذات ہو وہاں واحد متکلم کا استعمال بھی ضرور کیا جاتا ہے گویا یہ دونوں لازم وملزوم ہیں تاہم بعض واحد متکلم کو چھپا کر بھی انکشاف ذات کرتے ہیں۔ انشایئے میں شخصیت نگاری یا خاکہ نگاری سے بھی کام نہیں لیا جاسکتا بلکہ انشائیہ میں شخصیت نگاری اور خاکہ نگاری کے کچھ نقوش تو بکھیرے جا سکتے ہیں مگر ان کو مرکزی جگہ نہیں دی جاسکتی بلکہ یہ ہمیشہ ذیلی ہی رہتے ہیں تاہم انشائیہ میں بنیادی یا مرکزی خیال نہیں پایا جاتا کیونکہ دبستان سرگودھا کے مطابق انشائیہ ذہن کی آزاد خیالی کا ہی نتیجہ ہے جبکہ مشکور حسین یاد کے مطابق انشائیہ آزاد خیالی کا نہیں بلکہ نظم وضبط کا پابند ہوتا ہے۔ انشائیہ کی تکنیک کی ایک اور اہم صفت عدم تکمیل ہے

دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے مطابق انشائیہ میں انجام یا حرف آخر نہیں ہوتا اس میں کبھی بھی تکمیل کا عنصر موجود نہیں ہوتا بلکہ تشنگی ہمیشہ قائم رہتی ہے مقالہ اور مضمون میں تکمیل کا عنصر موجود ہوتا ہے جبکہ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگار اپنی انشائیہ نگاری میں عدم تکمیل کو ضروری جزو قرار دیتے ہیں اور وہ زندگی کے غیر مختتم کُل میں سے صرف ایک جزو کو منتخب کرتے ہیں اور اسے ایک چنگاری بنا دیتے ہیں جس سے زندگی کے بہت سے کونے روشنی کی لپیٹ میں آجاتے ہیں اور قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالیتے ہیں۔

تسلسل خیال کی وجہ سے انشائیہ میں غیر رسمی طریق کار کی بھی خوبی در آئی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا غیر رسمی طریق کار کو کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ زندگی کی گہما گہمی، شور شرابے اور سنجیدگی کو نظر انداز کر کے غیر رسمی طریق کو اپنایا جائے اور اپنے شخصی رد عمل سے قاری کو بھی اپنے حلقے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ مشکور حسین یاد غیر رسمی انداز بیان کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

> "دراصل غیر رسمی انداز بیان سے ایسا انداز بیان مراد ہے جو عام اسالیب بیان سے مختلف ہو، جس انداز بیان سے بیان کے نئے نئے راستے پیدا ہوتے نظر آئیں جس میں سنجیدگی ہو لیکن ایسی سنجیدگی جو دید وشنید کے اچھوتے پیمانے رکھتی ہو۔"[۲۱]

ڈاکٹر وزیر آغا اپنے انشائیوں میں تکنیک کے بہت کم تجربے کرتے دکھائی دیتے ہیں ان کے زیادہ تر انشائیوں میں ہمیں کہانی لکھنے کا انداز ہی نظر آتا ہے جیسے وہ اپنے انشائیوں میں قاری کو کہانی سنا رہے ہوں اور تھوڑا بہت افسانوی انداز بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے انشائیوں میں تلازمہ خیال اور تسلسل خیال کی تکنیک بھی دیکھنے کو ملتی ہے ان کے انشائیوں میں تمثیلی انداز بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔وہ انشائیوں میں تشبیہ و استعارہ کو بھی برتتے ہیں۔ آپ انشائیوں میں علامت کا استعمال بھی بخوبی کرتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں کہیں کہیں مزاح دیکھنے کو تو ملتا ہے۔ مگر اس میں تضحیک کی خوبی بالکل بھی موجود نہیں ہے۔آپ زیر لب تبسم کی خوبی سے قاری کو آشنا کرتے ہیں۔ان کا انشائیہ کہیں سے بھی شروع ہو کر کہیں پر بھی ختم ہو جاتا ہے ان کے انشائیوں میں ڈرامائی عناصر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کی زیادہ تر تکنیک کہانی لکھنے کے انداز میں ہے۔وہ انشائیہ لکھتے ہوئے اپنے موضوع میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ بہت دور تک نکل جاتے ہیں لیکن پھر اپنے موضوع کی جانب واپس پلٹ آتے ہیں ان کی سوچ کھلے میدانوں میں سفر کرتی ہے اور وہ قاری کو اپنے موضوع کے نتائج سے آگاہ کرتے ہیں تاہم وہ اپنے انشائیوں میں "مرکز" سے ہٹ کر علیحدہ سے ایک "مدار" ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔

مشتاق قمر کے انشائیوں کی تکنیک زیادہ سادہ بیانیہ ہی ہے وہ بات سے بات بڑھانے میں ماہر ہیں۔وہ اپنے تجربات و مشاہدات سے نئے مفاہیم اخذ کرتے ہیں۔وہ معمولی سی چیز کو موضوع بنا کر اسے خوبصورت تکنیک سے نوازتے ہیں۔وہ زندگی کے ایک پہلو کا انتخاب کر کے اسے شخصیت کا گداز لمس دیتے ہیں۔وہ اپنے انشائیوں میں دلائل اور منطق کی تکنیک کو نہیں اپناتے بلکہ سادہ بیانیہ انداز میں انشائیہ لکھتے ہیں۔مشتاق قمر اپنے انشائیوں میں پرانی تشبیہات اور استعاروں کا سہارا لیتے ہیں وہ لفظوں کا ایک نایاب جال بُنتے ہیں جس سے موضوع خود بخود آگے بڑھتا ہے وہ اپنے انشائیوں میں ادھر اُدھر کی باتیں کر کے بھی انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں مرقع کشی کی خوبی بھی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کے انشائیوں میں تازگی اور شگفتگی در آئی ہے۔

جمیل آزر اپنے انشائیوں کو منطق کے ذریعے آگے بڑھاتے ہیں۔وہ اپنے انشائیوں کو کہانی لکھنے کے انداز سے بیان کرتے ہیں جیسے کہانی میں نیا موڑ آتا ہے ایسے ہی ان کے انشائیے ہمیں نئے موڑ سے واقف کرواتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں ڈرامائی عناصر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں مکالمہ نگاری، کردار سازی اور منظر کشی بخوبی دیکھنے کو ملتی ہے۔ان کے مختلف انشائیوں کا انداز رمزیہ اور علامتی بھی ہے وہ اپنے انشائیوں میں خاکہ کشی بھی بہت عمدہ انداز سے کرتے ہیں۔ اکبر حمیدی کا شمار ان انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے جو انشائیے کی تکنیکی ضرورتوں کا پورا خیال رکھتے ہیں۔نیز انکشاف ذات کے ساتھ ساتھ منطقی ترتیب دیکھنے کو ملتی ہے ان کے انشائیوں میں داخلی وخارجی دونوں عناصر موجود ہیں وہ بات سے بات نکالتے ہوئے انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں۔اکبر حمیدی مصروں اور اقوال زریں کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ان کے بعض انشائیوں میں استعاراتی اور افسانوی انداز بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ اپنے انشائیوں کو مختلف واقعات اور مثالوں سے آگے بڑھاتے ہیں۔ان کے انشائیوں کا انداز بیانیہ،استعاراتی،علامتی، تمثیلی،افسانوی اور بعض جگہ تو دوہری معنویت رکھتا ہے۔

نظیر صدیقی کے انشائیوں کی تکنیک زیادہ تر براہ راست ہے ان کے انشائیوں میں طنز و مزاح کی لہر دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ان کے انشائیے زیادہ تر بیانیہ انداز میں لکھے گئے ہیں اور انشائیہ میں واقعات کی مدد سے آگے بڑھاتے ہیں۔ان کے کچھ انشائیے کہانی یا افسانوی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ مشکور حسین یاد کے مطابق انشائیہ کسی بھی شکل میں لکھا جا سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ صرف ظاہری ڈھانچہ ہی قابل قبول ہو گا اور باطنی طور پر اس سے گریز کیا جائے گا۔

صلاح الدین حیدر کے پہلے انشائی مجموعے ”حماقتیں میرے مقدر کی “میں ان کے زیادہ تر انشائیے براہ راست لکھے گئے ہیں۔انشائیہ ”قصہ ایک عاشق کا“کا آغاز کہانی سنانے کے انداز سے کیا گیا ہے انشائیہ میں اپنی بات کو

واضح کرنے کے لیے اپنی زندگی کے مختلف تجربات اور واقعات کو بیان کیا گیا ہے اور واقعہ کے بعد واقعہ بیان کیا گیا ہے انشائیہ مکمل کرنے اور اپنی بات قارئین کو پہنچانے کے لیے چار پانچ واقعات بیان کیے گئے ہیں اور معاشرے پر بھی طنزیہ فقرات لکھے گئے ہیں گویا طنز طرازی سے کام لیا گیا ہے صلاح الدین حیدر کے انشائیوں کی ایک عمدہ تکنیک یہ ہے کہ شروع سے آخر تک طنز و مزاح کی ایک لہر چھائی ہوئی ہے اور بات سے بات نکالتے ہوئے اپنے انشائیوں کو مکمل کرتے ہیں گویا آپ بات سے بات نکالنے پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ اسی طرح "ثقافت سے حماقت تک" کے انشائیے کا آغاز اس طرز سے کیا گیا ہے جیسے کوئی واقعہ یا کہانی سنانے کا انداز ہو انشائیہ میں رپورتاژ کی تکنیک برتی گئی ہے۔ صلاح الدین حیدر کے انشائیوں کا دوسرے مجموعے "ڈر اور ڈراما" کے زیادہ تر انشائیوں میں استعارہ کی تکنیک برتی گئی ہے جس سے ان کے انشائیے زیادہ تر موثر اور پُر کشش دکھائی دیتے ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد قیصر کے سب انشائیوں میں طنز و مزاح کا بھرپور استعمال ہوا ہے۔ شہزاد قیصر کے انشائیوں کی تکنیک دبستاں سرگودھا کے انشائیوں سے مختلف ہے ان کے انشائیے بے تکلفانہ انداز سے لکھے گئے ہیں نیز ان کے انشائیوں میں طنز و مزاح کی تازگی کی خوبی بھی پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر کا مزاح چٹکلے یا لطیفہ گوئی تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں خطیب اور مبلغ کے رُوپ میں بھی نظر آتے ہیں وہ اپنے انشائیوں میں خود پر بیتے ہوئے حالات کو بھی بہت عمدگی سے تحریر کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں نقطہ آفرینی کی تکنیک بھی موجود ہے۔

ان کے زیادہ تر انشائیے سادہ بیانیہ اور کہانی لکھنے کے انداز لکھے گئے ہیں۔ انشائیہ "ہم سفر" میں مصنف انشائیہ کا آغاز کہانی سنانے کے انداز سے کرتے ہیں اور اس دوران وہ ماضی کے کسی واقعے کو بھی یاد کرتے ہیں جس میں ہمیں ناسٹالجیا کی تکنیک بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اور اس تکنیک میں مصنف طنز و مزاح کا ہاتھ تھامے ہی نظر آتے ہیں۔ مصنف انشائیے میں ریلوے اسٹیشن کی عمدہ انداز میں تصویر کشی کرتے ہیں۔ اس میں پورے اسٹیشن کی گہما گہمی کو دکھایا گیا ہے۔ اس میں وقت کی حدیں دور تک نہیں پھیلی ہوئیں بلکہ وقتی تسلسل کے تحت انشائیہ لکھا گیا ہے جس کا انداز بیانیہ ہے۔ ارشد میر اپنے انشائیوں میں زیادہ تر سادہ بیانیہ تکنیک کا استعمال کرتے ہیں اور اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنے انشائیوں میں بیان کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں میں داخلی و خارجی انداز کی تکنیک بھی موجود ہے مگر خارج سے زیادہ باطن کی خوبی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں اپنی ذات کے مختلف پرتو سے قاری کو آگاہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں اپنے تجربات و مشاہدات کا استعمال کرتے ہیں جو کہ لاشعوری طور پر ان کی تحریر کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اپنے انشائیوں میں تفصیل سے پرہیز کرتے دکھائی دیتے ہیں اور اختصار کا استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے

انشائیوں میں غیر رسمی طریقہ کار کو اپناتے ہیں اور تازگی کا عنصر بھی ان کا انشائیوں میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں فارسی محاورات، انگریزی الفاظ اور اشعار کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں زیادہ ترصیغہ واحد غائب اور واحد متکلم کا استعمال ہوتا ہے۔ انشائیہ "چرواہا" کا آغاز بھی کہانی کے انداز سے شروع ہوتا ہے مصنف انشائیے کو اپنے پچھلے ہفتے کا تجربہ بتانے سے آغاز کرتے ہیں مصنف کے زیادہ انشائیوں کا آغاز اسی طرز سے ہوا ہے ۔ان کے کچھ انشائیوں میں وقت کی حدود محدود اور کچھ انشائیوں میں لامحدود ہیں۔

غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں میں اختصار کی صفت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ وہ موضوع کے صرف ایک پہلو پر بات کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کی تکنیک غیر رسمی ہے اور عدم تکمیل کی صفت سے ان کے انشائیے قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں اپنی زندگی کے گہرے تجربات اور عمیق مشاہدات کو تکنیک کا حصہ بناتے ہیں۔ انکشاف ذات ان کے انشائیوں میں نمایاں طور پر جھلکتی نظر آتی ہے۔ ان کے کچھ انشائیوں میں وقت کی حدود کچھ مہینوں اور کچھ ہفتوں تک پھیلی ہوئی ہیں اور کچھ انشائیوں میں وقت کی حدود لامحدود ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں اشعار، کہاوت، مثل اور انگریزی الفاظ کو بھی برتتے ہیں۔

مشتاق قمر زندگی کے ایک پہلو کا انتخاب کر کے اسے شخصیت کا گداز لمس دیتے ہیں جس سے انکشاف ذات کی خوبی پیدا ہوتی ہے جو کہ ایک عمدہ انشائیے کے لیے ضروری ہے۔ ان کے انشائیے عدم تکمیل کے حامل انشائیے ہیں اس میں ایک قسم کی تشنگی باقی رہ جاتی ہے عام طور پر انشائیہ ماضی اور موجودہ وقت سے شروع ہوتا ہے مگر اس کا اختتام اور گرفت ہمیشہ مستقبل پر ہی ہوتی ہے۔ ان کے انشائیوں میں اختصار کی خوبی نہیں ہے بلکہ بے جا طوالت ان کے انشائیوں میں در آئی ہے۔ ان کا طریق غیر رسمی ہے یعنی دوستانہ فضا قائم کر کے انشائیہ لکھتے ہیں۔ مشتاق قمر اپنے انشائیوں میں پرانی تشبیہات اور استعاروں کا سہارا لیتے ہیں وہ لفظوں کا ایک نایاب جال بُنتے ہیں جس سے موضوع خود بخود آگے بڑھتا ہے وہ اپنے انشائیوں میں ادھر اُدھر کی باتیں کر کے بھی انشائیے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں مرقع کشی کی خوبی بھی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کے انشائیوں میں تازگی اور شگفتگی در آئی ہے۔ وہ فارسی محاورات، ضرب المثل، اردو تراکیب, مقولے، اشعار اور انگریزی الفاظ کو بھی برتتے ہیں۔

جمیل آزر کے انشائیوں میں اختصار کی خوبی پائی جاتی ہے جو کہ قاری کو فوری تاثر دینے کے لیے کافی ہے۔ جمیل آزر اپنے انشائیوں میں اشعار کے مصروں سے پیوند لگاتے ہیں۔ وہ انشائیوں میں فارسی اور اردو کی تراکیب کا بھی بہت عمدہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ انگریزی الفاظ و محاورات کو بھی بے دریغ برتتے ہیں۔ ان کے مختلف انشائیوں کا انداز رمزیہ اور علامتی بھی ہے وہ اپنے انشائیوں میں خاکہ کشی بھی بہت عمدہ انداز سے کرتے ہیں۔ اکبر

حمیدی اپنے انشائیوں کا آغاز استفہامیہ انداز میں کرتے ہیں اور اس کے جواب میں بہت سے پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ اور بہت سی مثالیں اور واقعات کو بیان کر کے انشائیے کو آگے بڑھایا گیا ہے۔

نظیر صدیقی کے انشائیوں میں طنز کی کاٹ اور مزاح کی لہر ساتھ ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے۔ مصنف اپنے انشائیے کی تکنیک میں تاثر پیدا کرنے کے لیے شعر کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ مصنف موضوع کے مختلف زاویوں کو زیر بحث لاتے ہیں اور آخر میں اخلاقی سبق دیتے ہیں اور قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مصنف کے تمام انشائیوں میں طنز و مزاح کی آمیزش دیکھنے کو ملتی ہے اور قریباً سب انشائیوں میں شعر دیکھنے کو ملتا ہے ان کے انشائیوں میں مقولے، مثل اور محاورات کا استعمال بھی ہوا ہے واقعات، مثالوں اور مشاہدات و تجربات سے انشائیہ کو آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں موضوع کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیتے ہیں کہ ان زاویوں کے خدوخال قاری پر عیاں ہو جاتے ہیں اور قاری ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مشکور حسین یاد کے کچھ انشائیے وقتی تسلسل کے تحت لکھے گئے ہیں اور وہ انشائیوں میں اشعار کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ "آزادی کے درد" وقتی تسلسل کے تحت لکھا گیا انشائیہ ہے اس میں واحد متکلم اور واحد غائب کا استعمال کیا گیا ہے اور انشائیے کا اختتام سوالیہ انداز میں سوال پوچھ کر کیا گیا ہے سوال پوچھ کر قاری کا تجسس بڑھایا گیا ہے اور جھنجھوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ڈاکٹر شہزاد قیصر کا مزاح چٹکلے یا لطیفہ گوئی تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں خطیب اور مبلغ کے رُوپ میں بھی نظر آتے ہیں وہ اپنے انشائیوں میں خود پر بیتے ہوئے حالات کو بھی بہت عمدگی سے تحریر کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں نقطہ آفرینی کی تکنیک بھی موجود ہے۔ شہزاد قیصر اپنے انشائیوں میں اختصار کی خوبی کو اپناتے ہیں ان کے انشائیے خود پر بیتے حالات پر مشتمل ہیں جن میں ان کے خود پر بیتے ہوئے واقعات کو شامل کیا گیا ہے جس کی وجہ سے ان کے انشائیے رپورتاژ کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ کچھ انشائیے بیانیہ انداز میں ہیں جس میں ایک ہی موضوع پر مختلف زاویوں سے تصویریں لی گئیں ہیں دو انشائیے مکالمے اور گفتگوئیں کی ملی جلی تکنیکیں رکھتے ہیں۔ گویا ان کی تکنیکیں منفرد ہیں جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔

ارشد میر انشائیے میں فارسی اور اردو محاورے بھی برتتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیے میں صیغہ واحد غائب اور واحد متکلم کو بخوبی برتتے ہیں وہ ایک بات کو مرکز بنا کر بات کے مختلف رُخ کو صفحہ قرطاس پر بکھیر دیتے ہیں۔ انشائیے میں مختلف مثالیں دے کر بھی انشائیہ آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ انشائیوں میں انگریزی الفاظ اور اشعار کو بھی استعمال

کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں نکتہ آفرینی اور بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر بخوبی موجود ہے۔ اس وجہ سے ان کے انشائیے یکسانیت سے دور ہیں اور قاری کی دلچسپی انشائیے کے ختم ہونے تک موجود رہتی ہے۔

دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے ہاں زیادہ تر بیانیہ انداز، کہانی سنانے کا انداز یا افسانوی تکنیک دکھائی دیتی ہے جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے ہاں تکنیک کے مختلف تجربات دکھائی دیتے ہیں۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے ہاں داخلی تکنیک زیادہ دکھائی دیتی ہے جبکہ دبستان لاہور کے ہاں خارج کی کتھا زیادہ ہے۔ دبستان لاہور اور دبستان سرگودھا کے ہاں ایک افتراق یہ بھی ہے کہ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگار عدم تکمیل کے عنصر کا استعمال کرتے ہیں اور دبستان لاہور کے انشائیہ نگار انشائیے کا نتیجہ، اختتام اور سبق پیش کرتے ہیں اور عدم تکمیل کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ دبستان لاہور اور دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے اشتراکات کی بات کی جائے ان دونوں کے ہاں صیغہ واحد متکلم اور صیغہ واحد غائب کو برتا گیا ہے نیز نکتہ آفرینی کی صفت دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں بخوبی موجود ہے۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں میں زیر لب تبسم کی خوبی ملتی ہے اور مزاح کی ہلکی سی لہر دیکھنے کو ملتی ہے جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے ہاں معاشرے پر گہرا طنز و مزاح پایا جاتا ہے اگرچہ ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر اختر اور بینوی بھی طنز و مزاح کو انشائیہ کا حصہ تسلیم کرتے ہیں۔ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی کتاب "انشائیہ کی بنیاد" میں انشائیہ کے خدوخال پر تنقید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "انشائیہ میں مزاح ہو، اس میں طنز ہو یا نہ ہو، اسے سنجیدہ ہونا چاہئیے یا غیر سنجیدہ، اس سے کسی نوع کی معلومات کا حصول ممکن ہے یا ناممکن، اس میں روح عصر کی ترجمانی کی صلاحیت ہو یا وہ اس سے عاری ہو، اس کا زندگی سے تعلق ہو یا نہ ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ اور اس نوع کے دوسرے فنی تقاضے جو دیگر اصناف ادب میں بالعموم طے شدہ سمجھے جاتے ہیں انشائیہ میں آج تک ان کے بارے میں قطعی فیصلہ نہ کیا جا سکے تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ انشائیہ نگار اس معاملے میں اتنے حساس ہیں کہ وہ دوسرے کے انداز کو درست تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔"

اگرچہ دبستان لاہور اور دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ دبستان سرگودھا کے مطابق انشائیے میں ہلکے طنز و مزاح کو ضرور شامل کیا جا سکتا ہے مگر لطیفہ گوئی، چٹکلے اور پھکڑ پن سے گریز کرنا چاہئیے۔ آغاز میں نظیر صدیقی کے انشائیوں میں طنز و مزاح پایا جاتا تھا اور مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں بے کیف سنجیدگی موجود تھی مگر بعد میں مشکور حسین یاد کی سنجیدگی پر طنز و مزاح نے غلبہ پا لیا اور دونوں انشائیہ

نگاری کا اُسلوب ایک جیسا دکھنے لگا اس طرح مشکور حسین یاد اور نظیر صدیقی کی انشائیہ نگاری کی دیکھا دیکھی دوسرے انشائیہ نگاروں نے بھی مزاح نگاری کو اپنے انشائیوں میں شامل کرنے لگے۔

تاہم دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کی انشائیہ نگاری میں اشتراکات کی نسبت اختلافات زیادہ موجود ہیں۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگار دبستان لاہور کے انشائیے کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں مگر دبستان لاہور کے انشائیوں میں پڑھے جانے کی پوری قوت موجود ہے ان کے بہت سے مخالفین ہونے کے باوجود ان کے انشائیوں کو بہت سراہا گیا ہے۔۱۹۶۱ء کے بعد جتنے بھی انشائیہ نگار منظر عام پر آئے ان میں سے کچھ انشائیہ نگارڈاکٹر وزیر آغا کے نقش قدم پر چلے اور کچھ کے نظریات میں اختلاف کا زاویہ نظر آتا ہے تاہم ڈاکٹر وزیر آغا سے ہی انشائیے کے دور زریں کا آغاز ہوتا ہے انہوں نے انشائیہ کے فن اور اسلوب میں نکھار پیدا کیا اور انشائیہ کے قواعد وضوابط مقرر کیے رسالہ اوراق ،ادبی دنیا جیسے کئی دوسرے رسائل نے انشائیے کی ترویج اور ترقی کے لیے بہت کوششیں کیں ۔دور زریں میں انشائیہ کو فعال تحریک بنا دیا گیا اس دور میں بہت سے ادباء کے انشائیے منظر عام پر آئے اور انشائیے کے مثبت اور منفی دونوں رُخ نمودار ہوئے اس دور میں وزیر آغا کے بنائے گئے اُصولوں پر منفی حربے استعمال کیے گئے اور انشائیہ کی لڑائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ انشائیہ کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ تاہم وزیر آغا نے انشائیے کے خدوخال مقرر کیے اور جدید انشائیے کی بنیاد رکھی اور انشائیے کے خدوخال کے لیے مضامین بھی لکھے رسالہ ادبی دنیا اور اوراق جیسے رسائل نے انشائیہ کو خاص منصب عطا کیا اور نئے انشائیہ نگاروں کی پوری کھیپ تیار کی۔ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کی باقاعدہ تعریف متعین کی اور اس کے متقضیات مقرر کیے اور دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے ہاں بھی اسلوب وفن کی بوقلمونی موجود ہے دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کی نسبت دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کی تعداد زیادہ ہے تاہم اس دور میں نئی نسل کے بہت سے لوگ سامنے آئے اس صنف میں بہت اعلیٰ پائے کا کام ہو چکا ہے اس صنف نے افسانے ڈرامے اور ناول پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے نا صرف پاکستان میں بلکہ بھارت میں بھی اس کے بہت سے انشائیہ نمبر شائع ہوئے بہت سی یونیورسٹیوں میں ایم اے،ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح کے مقالے لکھے گئے ہیں اور روز بروز اس کی ترقی میں اضافہ ہو رہا ہے اس سے صاف عیاں ہے کہ انشائیے کا مستقبل بہت روشن ہے۔

انشائیے میں پچاس سال تنقید کا سفر طے کرنے کے باوجود انشائیے کی ترقی وکامرانی جاری وساری ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کے اسلوب وفن میں مزید نکھار آرہا ہے اور اس کی وجہ پاکستانی انشائیہ نگاروں کی انشائیہ کے میدان میں لائق تحسین کوشش ہے۔

ب۔ نتائج:

موضوع ”دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کا انشائیہ فکری، اسلوبیاتی اور تکنیکی تقابل (منتخب انشائیہ نگاروں کے حوالے سے)“ تحقیقی کام کے درجہ ذیل نتائج سامنے آئے ہیں۔

ا۔ مقالے میں اردو انشائیے کے دو دبستانوں کے انشائیہ نگاروں کے فکری، اسلوبیاتی، موضوعاتی اور تکنیکی زاویوں کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔

۲۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے اسلوب میں اختلافات کے باوجود چند مشترک نکات بھی موجود ہیں ان کے اشتراکات میں انکشاف ذات، آزاد ترنگ، اثبات حیات، تازگی فکر، مسرت کا سامان مہیا کرنا اور شگفتگی شامل ہیں تاہم ان عناصر نے بعد میں آنے والے انشائیہ نگاروں کو متاثر کیا۔

۳۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں فکری اختلافات و اشتراکات بھی موجود ہیں۔ دبستان سرگودھا کے ہاں داخلی کیفیات موجود ہیں جبکہ دبستان لاہور کے ہاں داخلی پہلو کے ساتھ خارجی پہلو کثرت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں نے فطرت کو مختلف اور منفرد انداز سے بیان کیا ہے۔ جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے ہاں طنز و مزاح کی لہر دوڑتی نظر آتی ہے۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کا لہجہ مثبت اور رجائیت سے بھرپور ہے جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں میں سے نظیر صدیقی کے ہاں قنوطیت کا لہجہ جبکہ باقی انشائیہ نگاروں کے ہاں مثبت انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔ تاہم دونوں دبستانوں کے انشائیہ نگاروں کے ہاں گہری فکر اور فلسفہ موجود ہے مگر دونوں کے ہاں فلسفیانہ مسائل اور فکر کا انداز مختلف ہے۔

۴۔ دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کی تکنیک میں اشتراکات و اختلافات کے مختلف زاویے واضح ہیں۔ دبستان سرگودھا کے ہاں آزاد خیالی، انکشاف ذات، اختصار، کہانی سنانے کا انداز یا افسانوی طرز، تلازمہ خیال، تمثیلی انداز، عدم تکمیل اور زیر لب تبسم کی خوبی موجود ہے جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگارون کی تکنیک ان سے مختلف ہے۔ ان کے انشائیوں میں نظم و ضبط، انکشاف ذات، کہانی یا افسانوی انداز کے علاوہ مختلف تجربات، طنز و مزاح اور انشائیے کا سبق، نتیجہ یا اختتام موجود ہے۔ ان اختلافات کے علاوہ ان دونوں دبستانوں میں کچھ صفات بھی مشترک ہیں جن میں غیر رسمی طریقہ کار، نکتہ

آفرینی، انشائیوں میں اشعار کا استعمال، محاورات اور مقولے وغیرہ کا استعمال شامل ہیں اس کے علاوہ انشائیوں میں اپنے تجربات ومشاہدات کو بھی شامل کرنا مشترک صفات میں شامل ہے۔

۵۔ دبستان سرگودھا کے انشائیوں کے اکثر موضوعات میں تنوع اور رنگارنگی موجود ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کے انشائیوں میں یکسانیت بھی پائی جاتی ہے جیسا کہ اُٹھنا، بیٹھنا اور لیٹنا جیسے موضوعات دبستان سرگودھا کے قریبا سب انشائیہ نگاروں کے ہاں موجود ہے۔ جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے موضوعات میں ایک جیسا رنگ دیکھنے کو نہیں ملتا ان کے موضوعات ایک دوسرے سے مختلف ہیں دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے ہاں فطرت اور معاشرے کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ جبکہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کے ہاں معاشرے کی برائیوں اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کے ساتھ طنز و مزاح دیکھنے کو ملتا ہے۔

۶۔ مقالے میں دونوں دبستانوں کے انشائیہ نگاروں کے اشتراقات و افتراقات کو واضح کرنے کے لیے بیانیہ تقابل اور تعین قدر کے طریقے کو آزمایا گیا ہے۔ اس ضمن میں تجزیاتی، دستاویزی اور تقابلی طریقہ کار زیادہ معاون ثابت ہوا ہے۔

۷۔ دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگار دبستان لاہور کے انشائیے کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں مگر دبستان لاہور کے انشائیوں میں پڑھے جانے کی پوری قوت موجود ہے۔ ان کے بہت سے مخالفین ہونے کے باوجود ان کے انشائیوں کو سراہا گیا ہے۔

ج۔ سفارشات:

۱۔ پاکستان اور بھارت کے انشائیہ نگاروں کا تقابل کرنا چاہیئے علاوہ ازیں پاکستان اور مغربی ممالک کے انشائیہ نگاروں کا تقابل کرکے اس تحقیق کو وسعت دی جاسکتی ہے۔

۲۔ بعض مستند ناقدین نے انشائیہ کی صنف کو کیوں رد کیا اس بات پر بھی سنجیدگی سے تحقیق ہونی چاہیئے۔

۳۔ یہ بات بھی قابل تحقیق ہے کہ پاکستان کے علاوہ کون کون سے ممالک میں انشائیہ نگاری ہو رہی ہے نیز ان کی انشائیہ نگاری کا اسلوب و فکر ہمارے ہاں مروج انشائیہ نگاری سے کس حد تک منفرد و مماثل ہے۔

۴۔ زیر نظر تحقیق ممکنہ حد تک دبستان لاہور اور دبستان سرگودھا کے انشائیہ نگاروں کے تقابل کے حوالے سے کی گئی ہے۔ مستقبل میں اس تقابل کو مزید وسیع کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ دبستان لاہور کے انشائیہ نگاروں کا تقابل مغربی انشائیہ نگاروں سے کیا جانا چاہئیے تا کہ معلوم کیا جا سکے کہ دبستان لاہور کے انشائیہ نگار کس قدر مغربی انشائیہ نگاری کے زیر اثر رہے ہیں۔

٦۔ تقابل کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔اس سے ہم نہ صرف دو زبانوں،دو روایتوں،دو تہذیبوں،دو ثقافتوں،دو قوموں اور دو لوگوں سے ہی آگاہ نہیں ہوتے بلکہ ان کے ادبی نظریات سے بھی ہی واقف ہوتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ غلام جیلانی اصغر، انشائیہ کیا ہے؟ اوراق، انشائیہ و افسانہ نمبر مارچ تا اپریل ۱۹۷۲ء، ص ۲۳۰

۲۔ سوزن بیسنیٹ، ترجمہ توحید احمد، تقابلی ادب: ایک تنقیدی جائزہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۵

۳۔ مشکور حسین یاد ممکنات انشائیہ، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۵۱ تا ۱۵۲

۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر،، دوسرا کنارہ، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، ۱۹۸۹ء، ص ۸۴

۵۔ مشکور حسین یاد، ممکنات انشائیہ، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۵

۶۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ کی بنیاد، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۳ تا ۱۸۴

کتابیات

بنیادی ماخذ:

ارشد میر، موڑ، ادارہ فروغ اردو، لاہور ۱۹۸۹ء

اکبر حمیدی، اشتہاروں بھری دیواریں، بٹر پبلیشرز، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

اکبر حمیدی، پہاڑ مجھے بلاتا ہے، بٹر پبلیشرز، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء

اکبر حمیدی، تتلی کے تعاقب میں، بٹر پبلیشرز، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

اکبر حمیدی، جزیرے کا سفر، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۵ء

اکبر حمیدی، جھاڑیاں اور جگنو، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء

جمیل آزر، رت کے مہمان، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۹۴ء

جمیل آزر، شاخ زیتون، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۱ء

جمیل آزر، وقت اے وقت، مقبول اکیڈمی اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۷ء

شہزاد قیصر، لطف آگہی، عبارات، لاہور، ۱۹۹۹ء

شہزاد قیصر، کلیرنس سیل، مکتبہ جمال، لاہور، ۱۹۸۰ء

شہزاد قیصر، صاف چھپتے بھی نہیں، مکتبہ جمال، لاہور، ۱۹۸۲ء

شہزاد قیصر، آئینہ بنے ہے پیرہن، مکتبہ جمال، لاہور، ۱۹۸۹ء

غلام جیلانی اصغر، نرم دم گفتگو، بک لینڈ پبلیشرز، لاہور، ۱۹۹۲ء

صلاح الدین حیدر، حماقتیں میرے مقدر کی، کاروان ادب، ملتان، ۱۹۷۸ء

صلاح الدین حیدر، ڈر اور ڈراما، کاروان ادب، ملتان، ۱۹۸۷ء

مشتاق قمر، ہم ہیں مشتاق، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، ۱۹۷۰ء

مشکور حسین یاد، بات کی اونچی ذات، انشائیوں کا مجموعہ، اظہار سنز، ۱۹۸۲ء

مشکور حسین یاد، جوہر اندیشہ، مکتبہ اردو ڈائجسٹ، لاہور، ۱۹۷۵ء

نظیر صدیقی، شہرت کی خاطر، پاک کتاب گھر، ڈھاکہ، اول ۱۹۶۱ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، دوسرا کنارا، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۹ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، خیال پارے، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۶۱ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، چوری سے یاری تک، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۶۶ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، سمندر اگر میرے اندر گرے، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۹ء

ثانوی ماخذ:

آدم شیخ، ڈاکٹر، انشائیہ، بمبئی، ۱۹۴۵ء

احمد امتیاز، ڈاکٹر، مرتب: انشائیے کے فنی سروکار، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء

اکبر حمیدی، مرتب: جدید اردو انشائیہ، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء

اکبر حمیدی، اردو انشائیہ بعد میں، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، ۱۹۹۱ء

احمد جمال پاشا، انشائیہ کی اصلاح، دہلی کتاب نما، نومبر، ۱۹۸۳ء

ارسطو بوطیقا، ترجمہ: عزیز احمد۔ درد اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۵ء

اعجاز علی ارشد، اسلوب و معانی، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۸۹ء

بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، نذیر سنز پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۳ء

جاوید وشسٹ، ڈاکٹر، انشائیہ پچیسی، سلوحبہ پرکاشن، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء

جمیل آزر، پروفیسر، مرتب: اردو کے بہترین انشائیے، مکتبہ اردو زبان، طبع اول، ۱۹۷۶ء

جمیل آزر، پروفیسر، انشائیہ اور انفرادی سوچ، نقش گر پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۴ء

رشید امجد، ڈاکٹر، رویے اور شناختیں، مقبول اکیڈمی، راولپنڈی، ۱۹۸۸ء

رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء

رفیق سندیلوی، "ڈاکٹر وزیر آغا: شخصیت اور فن"، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، ۲۰۰۶ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ کی بنیاد، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء

سوزن بینیسٹ، ترجمہ توحید احمد، تقابلی ادب، ایک تنقیدی جائزہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

صفی مرتضیٰ، سید، اردو انشائیہ، نسیم بک ڈپو، لکھنو، ۱۹۶۱ء

ظہیر الدین مدنی، اردو ایسیز، دہلی، ۱۹۸۱ء

عابد علی عابد، سید، اسلوب، مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول دسمبر ۱۹۷۱ء۔

عبد الستار دلوی، ادبی و لسانی تحقیق اور تقابلی ادب (اصول اور طریق کار)، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی، ۲۰۱۶ء

کلیم الدین احمد، نشاط خاطر، از حسین عظیم آبادی، پٹنہ، ۱۹۸۰ء

گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ادبی تنقید اور اسلوبیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۹ء

قدیر زماں، سوئے انشائیہ اور سوانحی انشائیے، فورم فار ماڈرن تھاٹ اینڈ لٹریچر، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء

محمد اسد اللہ، انشائیہ کی روایت، مشرق و مغرب کے تناظر میں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء

محمد حسن، مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء

محمد حسنین، ڈاکٹر، سید، محمد، صنف انشائیہ اور انشائیے، ایجوکیشن بُک ہاؤس، علیگڑھ، ۱۹۷۳ء

مشکور حسین یاد، ممکنات انشائیہ، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۸۳

منظر عباس نقوی، پروفیسر، اسلوب اور اس کی تشکیل، ایجوکیشنل بُک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۹ء

نصیر احمد خان، پروفیسر (مرتب) آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ، اردو اکادمی، دہلی ۲۰۰۳ء

وحید قریشی، ڈاکٹر، اردو کا بہترین انشائی ادب، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۴ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، انشائیہ کے خدوخال، نئی آواز جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء

ہاجرہ بانو، ڈاکٹر، اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے اہم انشائیہ نگار، (ایک تجزیاتی مطالعہ) عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۳ء

انگریزی کتب:

Steven Tostoy: Comparative Literature theory, method, Application P15, Amesterdam Atlanta, Ga 1998.

انشائیوں کی کتابوں پر تنقیدی مضامین و مقالے:

احسن فاروقی، محمد، ”فکشن اور تکنیک“ مشمولہ سیپ، کراچی، شمارہ ۱۹۶۳، ۲۹ء

جیلانی اصغر، غلام، انشائیہ کیا ہے؟ اوراق، انشائیہ و افسانہ نمبر مارچ۔ اپریل ۱۹۷۲ء

جیلانی اصغر، غلام، انشائیہ، مشمولہ، اوراق، انشائیہ نمبر، اپریل مئی ۱۹۷۵ء

سعید شباب، ”ارشد میر کا انشائیہ“، مشمولہ، اوراق، لاہور، جولائی اگست ۱۹۸۴ء

سائرہ بتول، پاکستانی انشائیہ نگاروں کے اسالیب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد۔

شہزاد قیصر، ڈاکٹر، پیش لفظ، انشائیہ کانفرنس ۱۹۸۸ء، جہاں نما پبلی کیشنز، لاہور، نومبر ۱۹۸۸ء

ضمیر جعفری، سید، خوش اعترافیاں، مشمولہ ماہنامہ "چہار سو" راولپنڈی، نومبر ۱۹۹۷ء

عبادت بریلوی، ڈاکٹر، ناولٹ کی تکنیک مشمولہ نقوش، کراچی شمارہ ۲۰۰، ۱۹ اپریل ۱۹۵۲ء

عبادت بریلوی، ڈاکٹر، ناولٹ کی تکنیک مشمولہ نقوش، کراچی شمارہ ۲۰۰، ۱۹ اپریل ۱۹۵۲ء

مسعود انور۔ ”انشائیہ کی تکنیک مشمولہ اُردو زبان، انشائیہ نمبر، ۱۹۸۳ء

منور عثمانی، وزیر آغا کی انشائیہ نگاری، مشمولہ ”کاغذی پیرہن“، (وزیر آغا)، مئی جون ۲۰۰۵ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، پڑھنے والوں کے خطوط، ادب لطیف لاہور، ۱۹۵۷ء

ممتاز شیریں، معیار، نیا ادارہ، لاہور، طبع اول، ۱۹۶۳ء

اردو لغات:

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۵ء

سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ (جلد اول)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء

فیروز الدین، مولوی، فیروز الغات، اردو جامع (نیا ایڈیشن) فیروز سنز لمیٹڈ لاہور ۲۰۲۰ء

قاموس الاصطلاحات، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، طبع دوم، ۱۹۸۲ء

وارث سرہندی، علمی اردو لغت (جامع)، علمی کتاب خانہ، لاہور طبع، ۲۰۰۳ء

انگریزی لغات:

Encyclopedia Britannica, Vol.8, P.No.713.
English Dictionary, No.1 Publishing Co.united, London Page 415-116
Oxford Advanced Learner,s Dictionary of Current English",A.S hon by Oxford University Press,1991,4th Edition, Page:1319.

ویب سائٹ:

https://www.wikipedia.org
https://rekhta.org/ebooks

رسائل وجرائد:

اُردو زبان، سرگودھا، انشائیہ نمبر، مارچ اپریل، ۱۹۸۳ء

اوراق، لاہور مارچ۔اپریل ۱۹۷۲ء

اوراق، انشائیہ نمبر، اپریل، مئی ۱۹۷۵ء

اوراق، لاہور، سہ ماہی، جولائی اگست ۱۹۸۴ء

نقوش، کراچی شمارہ نمبر، ۱۹ اپریل ۱۹۵۲ء

ادب لطیف، ماہنامہ، لاہور، ۱۹۵۷ء